پھر چلا مسافر

خیبر پختونخوا

دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

پھر چلا مسافر
خیبر پختونخوا
دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین
ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے کئی خاندانوں کو ان کے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کردیا۔ انہی بدقسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ٹیکسٹائل کے شعبہ کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کے لیے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنی انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی سے ایم بی اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ علم کا اشتیاق بڑھا تو 2008ء میں یونیورسٹی آف مانچسٹر سے ایم فل اور 2012ء میں چیک ریپبلک کی معروف یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی کرلی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فانڈویشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ انہی حالات وواقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو، لیکن پھر بھی اس کی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اس کی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔ اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کی جائے گی، ان شاءاللہ۔

ISBN 978-969-652-219-5
9 789696 522195
Jumhoori Publications

پھر چلا مسافر

دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

پھر چلا مسافر

خیبر پختونخوا
دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

- نام کتاب۔ پھر چلا مسافر
- مصنف۔ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ
- سرورق۔ مصباح سرفراز
- اشاعت۔ 2024ء
- ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور
- جملہ حقوق محفوظ

ISBN:978-969-652-219-5

قیمت 1800 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Phir Chala Musafir

اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی، غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالبعلموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں۔ کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس بات کی آپ کو مکمل اجازت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹس پر موجود ہے۔ اگر ڈاؤنلوڈ کرنے میں کوئی وقت ہو، تو آپ ہمیں ای میل بھیج کر بھی منگوا سکتے ہیں۔

http://taawun.org.pk/downloads
www.archive.org www.scribd.com

Jumhoori Publications
2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 +92-42-36283098
WhatsApp: 0333-4463121
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

/jumhooripublications /jumhooripublications /jumhooripublications /jumhoori

انتساب

مالاکنڈ اور قصہ خوانی کے اُن شہداء کے نام جنھوں نے انگریزوں سے آزادی کی خاطر شہادت کا جام نوش کیا،

بابڑہ کے ان نہتے اور بے گناہ لوگوں کے نام جو اپنے حقوق کی جنگ میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

خان عبدالغفار خان کے نام، جو اپنے عدم تشدد اور مکمل آزادی جیسے نظریات پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے، انگریزوں اور پاکستانی حکمرانوں کے جبر کا شکار ہوئے اور تیس سال تک جیلوں میں قید رہے۔

مفتی سیّد سیاح الدین کاکاخیل جو اپنے وقت کے ایک عظیم محدث اور ولی تھے

قاضی حسین احمد، علامہ اقبال کے کلام کے حافظ، کے نام جو پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں امتِ مسلمہ میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ انھیں ان کی خدمات کے بدلے مجاہدِ افغانستان بھی کہا جاتا ہے۔

صوابی کے عالم زیب شہید کے نام جو افغان جہاد میں میرے کمانڈر تھے۔

رحمان بابا کے نام جن کی شاعری علم، خدمت، روایت اور خودداری کا پیغام رکھتی ہے۔

برادرم خالد وقاص کے نام جن کی وساطت سے خیبر پختونخوا کے دُور دراز سفر ممکن ہوئے۔

رباعی: البم چنار

شاعر: رحمان بابا

چی پیسہ ور سرہ نہ وی خود غریب وی

ماغریب سڑی او بنسیار لیدلی نہ دی

مالداری او دینداری دہ سرہ لری

مامالدارہ ایماندار لیدلی نہ دی

ھر سری تر خپل مطلبہ پوری یار دی

ماد خدای لپارہ یار لیدلی نہ دی

فہرست

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے ربِّ کریم کا بے حد شکر، جس کی توفیق سے یہ کتاب آپ تک پہنچی۔ عدیل زیدی کے بقول:

کہاں کے ماہر و کامل ہو تم ہنر میں عدیؔل

تمہارے کام تو پروردگار کرتا ہے

اس کتاب کو لکھنے کا خیال، بھارت کے چار سفر لکھنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس کام میں میرے کئی دوستوں نے بھرپور تعاون کیا۔ جن میں جناب خالد وقاص، صدر الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخواسرِفہرست ہیں۔ میں نے خیبر پختونخوامیں بہت سے سفر ان کے ساتھ کیے۔ وہ میرے بڑے ہی مہربان دوست بھی ہیں اور بھائی بھی۔ میری درخواست پر انھوں نے اس کتاب پر اپنا تبصرہ بھی لکھا۔ میرے علم کے مطابق انھیں ادب سے بھی کافی لگاؤ ہے۔ سفر میں وہ ہمیں شعر بھی سناتے تھے۔

ان کے علاوہ بھی کئی دوستوں نے مدد کی۔ سبکے نام لکھنا مشکل ہے۔ ان میں سے چند افراد کے نام کچھ یوں ہیں۔ انور خان میرے عزیز دوست اور ٹیکسٹائل کالج میں میرے کلاس فیلو، فدا محمد خان، آصف جمال، شاکر صدیقی، عظمت اکبر، نوید بیگ صدر الخدمت فاؤنڈیشن چترال، محمد نعمان الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا ریجنل دفتر، شکیل احمد الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا ریجنل مینیجر، قاضی وجاہت، جلال شاہ بنوں، عدنان ریاض پشاور، منظر مسعود ڈی آئی خان، نور واحد جدون، فضل محمود دیر، محمد زادہ سوات، سلمان آفریدی کوہاٹ، افتخار بنگش ڈی آئی خان، نواب زادہ وہاب خان ٹانک، ڈی آئی خان، جاوید صاحب بونی اور سعد مرتضیٰ جن کے ساتھ میں نے کئی سفر کیے۔

ان سب حضرات کے ساتھ ساتھ میں جناب خالد وقاص کے ڈرائیور کامران کا، جنھوں نے دورانِ سفر بے شمار کمالات دکھائے، کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جب بھی اس کے ساتھ سفر کیا تو یوں لگا کہ ایک جہاز ہے، جو زمین پر چل رہاہے۔ اس کتاب کی اشاعت

سے پہلے یہ دردناک خبر ملی کہ کامران ایک بیماری کی وجہ سے اپنے رب کے حضور پیش ہو گیا ہے۔

(إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعون۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطافرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے۔ اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطافرمائے۔آمین)

الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخواکے دفتر میں مہمانوں کی خاطر مدارت پر مامور چترال سے تعلق رکھنے والے ایک خوبصورت بزرگ گل شریف صاحب، میں انھیں باباجی کہتا تھا، جو اب دنیا میں نہیں رہے گا، ان کے لئے بے شمار دعائیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطافرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطافرمائے۔آمین۔

ایک اور حقیقت کا بھی میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ مجھے خیبر پختونخوامیں سفر کے دوران تقریباً ہر علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ان تمام اسفار کے دوران مجھے کہیں بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ ہر جگہ حد سے زیادہ احترام اور پیار ملا۔ جس پر میں خیبر پختونخوامیں رہنے والے تمام افراد کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کو بہتر بنانے میں اویس ضیاء، علی احمد لطیف، شعیب حسن اور جناب حمود الرحمان شاہین کی کاوش کا ایک اہم کردار ہے۔ میں ان کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اہلِ خانہ کا بھی بے حد شکریہ جنھوں نے مجھے کئی خطرناک علاقوں میں جانے دیا اور کتاب لکھتے وقت میری عدم توجہی کو معاف بھی کیا۔ اس میں سے سب سے بڑا ہاتھ تو میری اہلیہ محترمہ کا ہی ہے، باقی سب بھی شکریے کے بے حد حق دار ہیں۔

کم ہمتی سے کیوں نہ ہو توہینِ زندگی
انسان کا وقار تو عزمِ جہاں میں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اللہ رب العزت نے پاکستان کو بے شمار نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ جہاں اِس کے جنوب میں سمندر اور وسیع و عریض صحرا موجود ہیں، وہیں اِس کے شمال میں بلند و بالا پہاڑ اور سرسبز وادیاں اپنا حسن بکھیرتی دکھائی دیتی ہیں، جن کے ساتھ پانی کے بے شمار چشمے بھی بہتے ہیں، جو اُن خدادا مناظر کو چار چاند لگادیتے ہیں۔

مجھے خیبر پختون خوا کے اکثر شہروں میں جانے کا موقع ملا۔ باجوڑ، جنوبی وزیرستان اور مہمند ایسے علاقے ہیں، جہاں اب تک جانے کا موقع نہیں ملا۔ اب یہ برادر خالد وقاص پر منحصر ہے کہ وہ کب ان جگہوں پر جانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس سارے اسفار کے دوران میں نے جو دیکھا، جو محسوس کیا اور ان تمام یادوں کے متعلق اب میری کیفیات کیسی ہیں؟ وہ سب میں نے اس کتاب کی صورت میں آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسے پڑھتے وقت، آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ جیسے آپ سفر نامہ نہیں ،تاریخ یا جغرافیہ کی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔یہی اس تصنیف کا مقصد ہے کہ قارئین کو اُن علاقوں کی تاریخ، جغرافیہ، معیشت اور معاشرت سے بھی آگاہ کیا جائے، جہاں لوگ صرف قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے جاتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس سفر نامے کو پڑھنے کے بعد، آپ ناصرف ان علاقہ جات بلکہ وہاں رہنے والے لوگوں کے طرزِ زندگی کو بھی جان سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اِس کتاب سے حاصل کردہ معلومات، آپ میں دور دراز بسے لوگوں سے ملنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ اُن کے علاقوں کی سیر کا شوق بھی پیدا کرے گی۔

اس کتاب میں نے بہت سے تاریخی واقعات کا بھی ذکر کیا ہے اور پوری تحقیق کے بعد ان واقعات کو تحریر کیا ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہوں کہ کوئی بات خلافِ حقیقت ہے، تو ضرور آگاہ کریں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اصلاح کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

قارئین کو مفید معلومات پہنچانا اور اُن کے دلوں میں سیر وسیاحت کا شوق پیدا کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا، اس کا بہترین فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ میری یہ کاوش آپ کی دلچسپی حاصل کرنے کا باعث بنے گی۔

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جنوری 2024ء

لاہور

خالد وقاص

صدر، الخذمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا

محترم ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب کی بہت ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ منفرد خوبی بھی ہے، کہ جہاں پر جس بھی مقصد کے لئے جاتے ہیں، تو لازمی طور پر وہاں کے کلچر، علاقہ، آب و ہوا، تاریخی پس منظر خوبیوں و خامیوں کے حوالے سے معلومات لیتے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں سے ہٹ کر خود ان تمام عوامل کا جائزہ لیتے ہیں۔ لوگوں سے میل ملاپ، سوال جواب اور پھر کرنٹ اور اپ ڈیٹ صورتحال نوٹ کر کے اس پر لکھنا اور دنیا کے سامنے رکھنا، ڈاکٹر صاحب کا ایک مستقل عمل ہے۔

یوں ڈاکٹر صاحب کا ہر سفر ایک بہت اچھی گائیڈ لائن رہنمائی اور دلچسپی کا عنوان بن جاتا ہے۔ خیبر پختونخوا کے وسطی اضلاع، جنوبی اضلاع، ملاکنڈ ریجن، ہزارہ ریجن، قبائلی اضلاع کا کڑی دھوپ کا، ہر سفر مشتاق صاحب کے جیسے ہم سفر کے ہمراہ خوب کٹتا ہے۔

بقول ناصر کاظمیؔ

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر

سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب کے ساتھ سفر ایک اچھی اور مستند صورتِ حال اور لوگوں کے رجحانات پر ایک اچھی انسائیکلوپیڈیا کی مانند ہے۔ ہمارے صوبے کے مختلف علاقوں کی پشتو زبان میں رہن سہن اور تاریخی طور پر کچھ الگ قصے کہانیاں موجود ہیں۔ اتنی گہرائی میں حقیقتِ حال بیان کرنا، واقعی ایک مشکل کام ہے جو انھوں نے کیا ہے۔

میں ذاتی طور پر مشتاق صاحب کے ساتھ ہم سفر رہا ہوں اور کبھی بوریت محسوس نہیں کی۔ شمالی وزیرستان، بنوں، اور چترال جیسے مشکل اضلاع میں، یہ علمی و ادبی مشاہدات کے سفر ہمیشہ دوسرے سفر پر جانے کے شوق کو بڑھاتے ہیں۔ جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔ یہ

سفر ،تذکرہ بھی یاددہانی ، عملی اور زندگی کے سفر میں حقیقی سفر کی طرف رہنمائی کا سامان کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

کہ دنیا میں اس طرح رہو جس طرح مسافر۔

سفر میں کسی بھی جگہ قیام عارضی ہی ہوتا ہے، مستقل نہیں۔ ٹھیک اسی طرح دنیا بھی عارضی قیام کی جگہ ہے مسقل قیام کی نہیں۔ بس تھوڑا قیام وطعام اور آگے کسی اور منزل کی طرف سفر۔

برتر از اندیشہ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ زندگی میں اس طرح کے سفر نامے آپ کے لیے اور ہم سب کے لیے آخرت کا توشہ ثابت ہوں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

ڈاکٹر محمد غیاث

ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب ایک وسیع القلب، معتدل، بہت نفیس اور مخلص انسان ہیں اور یہی چیزیں ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہیں۔

کتاب کی فہرست بہت دلکش اور جاذب نظر ہے۔ ہر عنوان پڑھنے والے کو بے چینی کے ساتھ متعلقہ صفحہ پر پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح ہر عنوان کا اختتام، بہت خوبصورت اور پُر تجسّس انداز میں کیا گیا ہے۔

میں پہلے بھی بعض سفر نامے پڑھ چکا ہوں، اکثر سفر نامے خشک اور خود نمائی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ سفر نامے میں بہت شوق سے بالاستیعاب پڑھ چکا ہوں، جن میں جناب مفتی تقی عثمانی صاحب کا "جہان دیدہ اور دنیا میرے آگے" قابل ذکر ہیں۔

جناب ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب کے سفر نامے کئی حوالوں سے منفرد اور دلچسپ ہیں۔ خود نمائی سے بھی بالاتر ہیں۔ آپ ان سفر ناموں کے پیچھے فقط ایک طالب علم اور ایک مسافر نظر آتے ہیں۔ بالخصوص، اس سفر نامے میں انھوں نے مذاہب، تہذیب، ثقافت، تمدن، تاریخ و تجزیہ، معاشرت و معیشت، جغرافیہ وآثار قدیمہ اور مزارات پر بحث و بیان کے علاوہ، خیبر پختون خواہ کے اقدار و روایات کا بہت شاندار انداز میں احاطہ کیا ہے۔

آپ نے تقریباً پورا خیبر پختون خوا، اس کی تاریخ، اقدار و روایات اس کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات اور احساسات کو بہت ہی دلنشین اور منفرد انداز میں بیان کیے ہیں۔ کتاب کے انتساب سے لے کر اختتام تک اس میں صوبہ خیبر کی باسیوں کے لئے ان کی پوری تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی صورت میں موجود ہے۔ سوشیالوجی کے طلبا کے لئے یہ ایک بہترین کتاب بھی ہے۔ اس میں مختلف حوالوں سے خیبر پختون خوا کو دکھانے، سمجھانے اور سمیٹنے کی کاوش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جگہ جگہ اپنی رائے بھی بہت محتاط انداز میں بیان کی ہے۔ تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے آپ نے اپنی طرف سے بہترین اور قابل عمل تجاویز بھی پیش فرمائی

ہیں۔انھوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کے احوال بیان کرتے ہوئے ان کا تجزیہ بھی کیا ہے۔اس میں خوبصورت بات یہ ہے کہ انھوں نے محتاط انداز کے علاوہ سیاسی رجحان سے بالاتر ہو کر عدل و انصاف کا حق ادا کرتے ہوئے یہ کام کیا ہے۔

بہر حال ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب شاندار اور معتدل قلم کار ہیں،اللہ تعالی ان کی یہ کاوش قبول فرمائے۔۔۔

اس کتاب سے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے جو پھر کسی وقت اِن شاءاللہ قلم بند کروں گا۔

نثار احمد

سینئر منیجر والنٹئر مینجمنٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان

ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب سے پہلا تعارف 2014ء میں ہوا، جب راقم سابقہ فاٹا میں الخدمت فاؤنڈیشن کی ذمہ داری نبھارہا تھا۔ 2018ء میں راقم لاہور منتقل ہوا، اور تب سے اب تک ڈاکٹر صاحب کی صحبت مستقل میسر ہے۔ بہت سارے منصوبوں پر اکٹھے کام کیا اور کئی ایک سفر بھی اکٹھے کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب باذوق انسان ہیں، اور اہل ذوق کے قدردان بھی ہیں۔ خالص کھاتے ہیں، خالص سوچتے ہیں، اور خالص لکھتے ہیں۔ یہی خالص پن آپ کو ڈاکٹر صاحب کی ہر تحریر میں جھلکتا نظر آئے گا۔

راقم نے زیر نظر کتاب ”پھر چلا مسافر — خیبر پختونخوا، دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین“ پڑھنا شروع کیا تو مشاہدے کا معیار پرکھنے کے لئے چترال سے آغاز کیا، کیونکہ چترال راقم کا آبائی علاقہ ہے۔ چترال کے سفر نامے کا آغاز سفر کی ترتیب کے مطابق لواری ٹاپ سے ہوتا ہے۔ سفر کے دوران اپنے مشاہدات، کیفیات اور تاثرات کو ایسے سادہ اور رواں دواں انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو اس مشاہدے کا حصہ سمجھنے لگتا ہے، اور ان کیفیات کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

راقم سفر نامے میں اس قدر محو ہو گیا کہ دن بھر کی تھکاوٹ اور نیند کے غلبے کے باوجود پڑھنا بند کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر میں ہوں، اور اگر میں سو گیا تو ڈاکٹر صاحب رات کے اس پہر لواری ٹاپ کے خطرناک اور سنسان راستے میں اکیلے رہ جائیں گے، جو کہ بحیثیتِ چترالی، میری مہمان نوازی کے شایانِ شان نہیں ہے۔

میں نے یہ ٹھان لی، کہ جب تک ڈاکٹر صاحب کسی ٹھکانے تک نہیں پہنچتے، میں پڑھنا جاری رکھوں گا۔ شکر ہے کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب چترال میں اپنے پہلے پڑاؤ نگر فورٹ پہنچ گئے، تو میں نے بھی سکون کی سانس لی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں، ”جب ہم نگر فورٹ پہنچے تو رات کے ایک بج رہے تھے۔“ میں نے گھڑی دیکھی تو میرے ہاں بھی رات کے ایک بج رہے تھے۔ اب میں مطمئن تھا کہ ڈاکٹر صاحب بخیر و عافیت اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں۔ تب جا کر میں بھی

سو گیا۔ یہ اس سفر نامے کے ایک چھوٹے سے حصے کی مثال تھی، کہ پڑھنے والا کیسے خود کو اس سفر کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

''پھر چلا مسافر – خیبر پختونخوا، دلیر اور بہادر لوگوں کی سرزمین'' کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا اندازہ بیان بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ ہر علاقے میں قابل ذکر اور دلچسپی کے حامل مقامات کی ایسی خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے، کہ پڑھنے والے کے دل میں اس مقام پر جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔اس میں مصنّف نے صرف اپنے مشاہدات اور تاثرات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تاریخی حوالوں کا ایسا موثر استعمال کیا ہے کہ پڑھنے والوں، خصوصاً تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے لطف اور علم کا ایک خوبصورت مجموعہ پیش کیا ہے۔

راقم خود بھی سیر و سیاحت کا شوقین ہے۔ ملازمت کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ زیادہ وقت گھومنے پھرنے میں گزرتا ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام بڑے شہر اور دلچسپی کے حامل مقامات دیکھ چکا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ تمام علاقوں میں بھی متعدد بار جانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن اس سفر نامے کو پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ پھر اُن تمام علاقوں میں جاؤں، اور وہ تمام مقامات ڈاکٹر مشتاق مانگٹ صاحب کی نظر سے دوبارہ دیکھ لوں۔ اللہ کرے ڈاکٹر صاحب اسی طرح صحت و سلامتی کے ساتھ سیر کرتے رہیں، اور ہم جیسے بہت ساروں کو بہت ساری جگہوں کی اپنی تحریروں کے ذریعے سیر کرواتے رہیں۔

آصف جمال

نیشنل پروگرام مینیجر ڈیزاسٹر مینجمنٹ، الخدمت فائونڈیشن پاکستان

پھر چلا مسافر، ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب کا تحریر کردہ سفر نامہ ہے۔ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب نے بڑی باریکی سے تمام علاقوں کا مشاہدہ کیا ہے اور اپنے سفر نامے کو مختلف پہلوؤں سے پڑھنے والوں کے لیے پیش کیا ہے۔ پھر چلا مسافر پڑھنے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر پر موجود ہے اور بذاتِ خود ہی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔

مشتاق مانگٹ صاحب نے کمال خوبصورتی سے پورے سفر نامے میں بہترین منظر کشی کی ہے۔اس سفر نامے میں مختلف علاقوں کی معلومات کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور اسے بہترین انداز میں قارئین کے لیے پیش کیا گیا ہے، جو کہ پڑھنے کے دوران دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ہر علاقے سے جڑے واقعات پر اپنے ایک مخصوص تجزیاتی نُقطۂ نَظَر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی ایک رائے بھی دی ہے، جو قارئین کو اپنا تجزیاتی نُقطۂ نَظَر بڑھانے اور اپنی رائے دینے میں مددگار ثابت ہو گی۔

یہ سفر نامہ بہترین منظر کشی، تاریخی پہلو اور دلچسپ واقعات کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ مفید معلومات کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا باعث بھی بنے گا۔

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ صاحب کے لیے نیک خواہشات۔

خیبر پختونخوا: ایک مختصر تعارف

یہ سفر نامہ، جسے آپ خیبر پختونخوا کی معیشت، معاشرت، تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق ایک کتاب بھی کہہ سکتے ہیں، کا مقصد قارئین تک ایک نئے انداز سے خیبر پختونخوا بارے معلومات فراہم کرنا ہے۔ میں یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اور خاص طور پر نوجوان نسل کو اپنی تاریخ سے واقفیت ہو۔ میں یہ سمجھتا ہوں، کہ ہم تاریخ کے متعلق جتنا جان سکیں، اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تاریخ ہمیں حال میں رہنا اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی میں، بے حد مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔

اس کام کو بہتر انداز سے کرنے کے لیے میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے سفر کی رُوداد بیان کروں، میں آپ کی خدمت میں خیبر پختونخوا کی ایک مختصر تاریخ اور اس کی موجودہ معیشت اور معاشرت کے ساتھ ساتھ اس کے جغرافیے کے متعلق کچھ معلومات پیش کروں۔ مجھے امید ہے کہ ایسا کرنے سے آپ اس سفر نامہ سے ایک بہتر انداز سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

خیبر پختونخوا کا حدود اربعہ

پاکستان میں رقبے کے لحاظ سے بلوچستان سب سے بڑا صوبہ ہے۔ یوں تو خیبر پختونخوا، آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا تیسرا بڑا صوبہ ہے، لیکن رقبے کے لحاظ سے سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔ اس کی آبادی (خیبر پختونخوا کی کی ویب سائٹ کے مطابق) سوا تین کروڑ کے قریب ہے اور اس کا رقبہ ایک لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد ہے۔ یہاں مردوں کی تعداد اکاون فیصد ہے۔ اس صوبہ میں صرف سترہ فیصد کے قریب لوگ شہروں میں رہتے ہیں، باقی سب لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ خیبر پختونخوا کی سرکاری ویب سائٹ کے مطابق انتظامی طور پر خیبر پختونخوا چونتیس اضلاع پر مشتمل ہے۔

انگریزوں کے دور میں، موجودہ خیبر پختونخوا کے علاقے کو انگریزوں نے فرنٹئیر کا نام دیا۔ جب اسے صوبہ کا درجہ دیا گیا، تو اس کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا۔ چند سال قبل یہاں کے لوگوں کے مطالبے پر اس کا نام بدل کر، خیبر پختونخوا کا نام دیا گیا۔ اس کے مغرب

اور شمال میں افغانستان، مشرق اور شمال مشرق میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان، جنوب مشرق میں صوبہ پنجاب اور جنوب مغرب میں صوبہ بلوچستان واقع ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ اس کی مغربی سرحد پر (افغان سرحد کے ساتھ ساتھ) ایک ایسا علاقہ بھی ہے جسے عام طور پر قبائلی علاقہ کہا جاتا تھا۔ اس کا انتظام وفاق کے پاس تھا (اسے فاٹا بھی کہا جاتا تھا)۔ اب اس کی حیثیت میں تبدیلی کر دی گئی ہے اور یہاں پر پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح کا ہی نظام قائم کر دیا گیا ہے۔

خیبر پختونخوا کا نقشہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں تو دوسری طرف وسیع ریگستان اور صحرا بھی واقع ہے۔ مزید دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر پختونخوا کے دو بڑے زون ہیں؛ شمالی زون اور جنوبی زون۔

شمالی زون میں کوہِ ہندوکش سے لے کر پشاور وادی تک کا علاقہ شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس زون کی سطح سمندر سے بلندی اور پہاڑوں کی وجہ سے آب و ہوا برفانی اور سرد ہوتی ہے۔ یہاں سردیوں میں شدید سردی ہوتی ہے اور موسم گرما میں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ زون سیاحوں کے لیے زبردست کشش رکھتا ہے۔

جنوبی زون، جو پشاور سے شروع ہو کر ڈی آئی خان تک کا ہے، اس میں بارشیں بھی کم ہوتی ہیں۔ اونچے پہاڑ بھی کم ہیں۔ میں نے ان علاقوں کے سفر کے دوران یہ جانا ہے کہ یہاں پر اکثر علاقوں میں کاشتکاری نہیں ہوتی، جس کی بڑی وجہ پانی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے اس علاقے میں آبادی بھی کم ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ یہ علاقے صنعتی ترقی سے بھی محروم ہیں۔ جنوبی زون کے اہم شہر کوہاٹ، بنوں، کرک، ٹانک اور ڈی آئی خان ہیں۔ وزیرستان کا علاقہ بھی اسی زون میں آتا ہے، لیکن وہاں پہاڑوں اور سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے بارشیں کافی ہوتی ہیں۔ اوزیرستان کے اکثر علاقے سرسبز اور شاداب ہیں۔ اس زون کے کئی علاقے گرمیوں میں شدید گرم بھی ہوتے ہیں۔

خیبر پختونخوا کا دارالحکومت پشاور ہے، جو دریائے کابل کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ دریا کی وجہ سے، پشاور سے لے کر مشرق میں اٹک تک، کے علاقے کاشت کاری کے لیے بہت موزوں ہیں۔ خیبر پختونخوا کی آبادی کا ایک کثیر حصہ اسی علاقے میں آباد ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پشاور ہی وہ جگہ ہے جہاں اس کے مغرب میں درہ خیبر واقع ہے، جو صدیوں سے افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان ایک آسان اور عام راستہ ہے۔ اگر آپ خیبر پختونخوا

کے شمال سے شروع ہو کر جنوب کی طرف سفر کریں، تو آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ آپ ایک سرد مقام سے گرم مقام کی طرف جا رہے ہیں۔

خیبر پختونخوا کے شمال میں ہندوکش کا سلسلہ بھی موجود ہے، جو گلگت کے قریب سے شروع ہو کر افغانستان تک جاتا ہے اور اپنے قدرتی حسن کے لیے مشہور ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اسے دریائے کنڑ نے دو الگ الگ سلسلوں میں تقسیم کیا ہے: شمالی ہندوکش اور ہندوراج۔

اسی میں ترچ میر پہاڑ بھی واقع ہے جو پچیس ہزار سے زائد بلند ہے (اسے تریچ میر بھی لکھا جاتا ہے)۔ خیبر پختونخوا میں واقع یہ پہاڑ سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ خیبر پختونخوا کے مشرق میں، ہمالیہ سلسلہ کے کچھ ذیلی مقامات بھی پائے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خیبر پختونخوا کے مشرقی علاقے، جو ہمالیہ سے قریب ہیں، زلزلہ کی زد میں آتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کو 2005ء کا زلزلہ یاد ہو تو آپ کو یہ بھی یاد ہو گا، کہ اس زلزلے کے نتیجے میں خیبر پختونخوا کا ہزارہ ڈویژن ایک بڑی تباہی کا شکار ہوا تھا۔

خیبر پختونخوا میں آباد قومیں

خیبر پختونخوا میں اکثریت پختون لوگوں کی ہے۔ اس علاقے میں پختونوں کے کئی قبائل آباد ہیں۔ ان میں سے اکثر کسی ایک خاص علاقے تک محدود ہیں۔ جیسے یوسف زئی سوات میں آباد ہیں۔ اسی طرح بنگش کوہاٹ اور پارا چنار میں رہ رہے ہیں۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے، تو خیبر پختونخوا میں ایک خاص علاقے میں کسی نہ کسی ایک قبیلے کی اکثریت آباد ہے۔ اسی وجہ سے پختون لوگوں کی پشتو زبان ہر علاقے میں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ ہزارہ، پشاور، کوہاٹ اور بنوں میں ہندکو بھی بولی جاتی ہے۔ اسی طرح ڈی آئی خان میں سرائیکی بھی بولی جاتی ہے۔ میرے علم کے مطابق، پنجابی بولنے والے بہت کم لوگ ہیں، ان میں سکھ بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جو پنجاب سے جا کر پشاور یا ہزارہ میں آباد ہوئے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ چترال میں لوگ اپنی چترالی زبان بولتے ہیں، جس میں فارسی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ کالاش کے لوگ بھی اپنی ایک الگ زبان بولتے ہیں۔ اس لیے جب بھی خیبر پختونخوا کی اسمبلی میں کوئی بات کی جاتی ہے، وہ اردو یا انگریزی میں کی جاتی ہے۔ خیبر پختونخوا کی آبادی سوا تین کروڑ کے قریب ہے، جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ بہت تھوڑی تعداد میں ہندو، سکھ اور عیسائی آباد ہیں۔ ان کا تناسب کیا ہے، وہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خیبر پختونخوا، اپنی آبادی اور معیشت دونوں کے لحاظ سے پاکستان کا تیسرا سب سے بڑا صوبہ ہے، لیکن اگر رقبے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کا سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔اس کی آبادی پاکستان کی کل آبادی کا اٹھارہ فیصد ہے۔

اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بدھ مت اور ہندو مت کے ماننے والے آباد تھے۔ گندھارا دور کے وقت کا دارالحکومت پشکلاوتی بھی خیبر پختونخوا کے شہر چارسدہ میں واقع ہے (مجھے اسے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے)۔ یہ خطہ ہمیشہ ہی مختلف سلطنتوں کا مرکز رہا ہے، جس کی بڑی وجہ اس کا درہ خیبر کے پاس ہونا ہے، جو وسطی ایشیاء سے ہندوستان آنے والوں کی ایک اہم گزرگاہ تھی۔

کابل سے، فرنٹیئر، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور اب خیبر پختونخوا

اپریل 2010ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کو "خیبر پختونخوا" کا نام دے دیا گیا۔ یہ یہاں کے لوگوں کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جس طرح سندھیوں کے لیے سندھ، پنجابیوں کے لیے پنجاب اور بلوچوں کے لیے بلوچستان، اسی طرح صوبہ سرحد کا نام بھی پختون نام پر ہونا چاہیے، اس پر ہزارہ کے لوگوں کو اعتراض بھی تھا۔ اسی وجہ سے ہزارہ کے لوگوں نے اپنے لیے ایک الگ صوبے کی مانگ شروع کر رکھی تھی۔ ایک طویل بحث کے بعد صوبہ سرحد کا نام خیبر پختونخوا تجویز ہوا اور اسے نافذ بھی کر دیا گیا۔ اس کے بعد مئی 2018ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک آئینی ترمیم پاس کی جس کی وجہ سے فاٹا کے علاقے کو بھی خیبر پختونخوا میں ضم کر دیا گیا۔

میں مدت سے اس تلاش میں تھا کہ موجودہ کے پی کے کا پرانا نام شمال مغربی صوبہ سرحد تھا، یہ نام اسے انگریزوں نے دیا تھا۔ اس سے پہلے اس علاقے کا کیا نام تھا؟ میں نے اس سوال کے جواب کے لئے کافی کھوج کی۔ اس کا جواب مجھے آئین اکبری سے ملا جسے اکبر نامہ بھی کہا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ آئین اکبری علامہ ابوالفضل کی تصنیف ہے، جو اکبر بادشاہ کا وزیر تھا۔ علامہ نے یہ کتاب اکبر کی بادشاہی کے متعلق لکھی ہے۔ یہ ایک لاجواب اور مفصل کتاب ہے۔ اسے اکبر نامہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے کوئی ساڑھے چودہ سو صفحات ہیں۔ میں نے اسے کافی شوق سے پڑھا اور اس کا خلاصہ بھی لکھا۔ اس کتاب کے مطابق، اکبر نے انتظامی نُقطۂ نَظَر سے اپنی سلطنت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان تمام صوبوں کی تفصیل اور ان کا حدود اربعہ اس

کتاب میں دیا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو بار بار دیکھا، جو مجھے سمجھ آیا، وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اکبر بادشاہ کے بارہ صوبے

سب سے پہلے صوبہ دہلی کی بات کرتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ صوبہ دہلی کی سرحد مشرق میں آگرہ تک تھی، جبکہ مغرب میں یہ لدھیانہ تک تھی، جو دریائے ستلج کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کے جنوب میں ریواڑی واقع تھا اور یہ خضر آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ شمال مشرق میں اودھ موجود تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دریائے ستلج تک کا علاقہ دہلی صوبہ کا حصہ تھا۔ سرہند بھی اسی میں آتا تھا۔

اس کے بعد ہم صوبہ ملتان کی بات کرتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ ملتان کی حد فیروزپور سے شروع ہو کر جیسل میر، ٹھٹھہ اور مکران تک تھی۔ دوسری طرف بھکر اور دریائے سندھ کے مشرق تک کے علاقے اس میں شامل تھے۔ بھکر سے آگے کا علاقہ کابل کے ماتحت تھا، جس میں ہرنائی، لورالائی بھی شامل تھے۔ شمال کی طرف واقع، دیپال پور بھی ملتان کا حصہ تھا۔

یاد رہے کہ اکبر کے دور میں صوبے کو مزید سرکاروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس طرح سے صوبہ ملتان، جہاں ایک طرف پنجاب سے ملا ہوا تھا، دوسری طرف یہ مکران تک یعنی بحیرۂ عرب کے ساحل تک جاتا تھا۔ اس میں بھکر بھی شامل تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ملتان صوبہ میں موجودہ صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور صوبہ پنجاب کے علاقے شامل تھے۔ اس کی مغربی سرحد دریائے سندھ تک جاتی تھی۔

اکبر نے کابل کو بھی ایک صوبہ کا درجہ دے رکھا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موجودہ کشمیر بھی کابل کا ہی حصہ تھا۔ کابل کے شمال مشرق میں کشمیر اور پشاور واقع تھے اور اس کی حد دریائے چناب تک تھی۔ جنوب مشرق میں کوہاٹ، وزیرستان، بنوں ڈی آئی خان، لورالائی، ہرنائی، ژوب اور شمال مشرق میں چترال اور جنوب میں قندھار بھی اسی کا حصہ تھا۔ کشمیر کے علاوہ بونیر، سوات، دیر تک کے علاقے بھی کابل میں شامل تھے۔ آئین اکبری کے مطابق تبت تک کے علاقے بھی، کابل کا حصہ تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ پشاور اور اس کے ارد گرد کے علاقے بھی صوبہ کابل میں شامل تھے۔ اس کا صدر مقام کبھی غزنی اور کبھی قندھار ہوتا تھا۔

ابدالی نے افغانستان کا صدر مقام، قندھار کو بنایا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے کابل کو صدر مقام بنالیا۔ مغل دور میں اسعلاقے کا صدر مقام کابل ہی تھا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اٹک سے لے کر کابل کے مغرب میں کوہِ ہندو کش تک، جنوب میں وزیرستان اور شمال مشرق میں کشمیر اور تبت تک، جس میں موجودہ پشاور بھی شامل تھا، صوبہ کابل میں شامل تھے۔ اس کا صدر مقام پشاور کی بجائے کابل تھا۔

اس سے میں، اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پشاور پر مختلف ادوار میں کئی خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ اگر کابل افغانوں کے پاس تھا، یعنی احمد شاہ ابدالی کے دور میں اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے دور میں تو پشاور بھی انھی کے پاس تھا۔ اور اگر کابل مغلوں کے پاس تھا، تو اس وقت پشاور پر بھی مغلوں کی حکومت تھی۔ اس طرح سے موجودہ خیبر پختونخوا کا کوئی الگ سے نام نہیں تھا۔

اٹک سے لے کر کوہِ ہندو کش تک اور کشمیر سے لے کر اور اس کے ارد گرد جو بھی علاقے موجود تھے، وہ سب کابل کے نام سے ہی جانے جاتے تھے۔ علامہ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے، کہ اس علاقے سے کشمیر جانے کے چھبیس راستے تھے۔

میں نے یہ بات اپنے دوست امجد وڑائچ سے سنی ہے کہ جب 1948ء میں کشمیر پر قبائلی لوگوں نے حملہ کیا تو ان کا کہنا تھا کہ کشمیر تو ہمیشہ سے ہی ہمارا حصہ رہا ہے۔ ان تمام باتوں سے آپ کس قدر اتفاق کرتے ہیں، یہ تو آپ بہتر سمجھتے ہیں، لیکن جو میں نے جانا اس کے مطابق، میں نے بیان کیا ہے۔

ہاں ایک بات اور بھی میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہوں گا کہ جس طرح سے بونیر، چترال اور دیر کے علاقے مدت سے موجود تھے، وہاں پر کسی نہ کسی کی حکومت بھی ہوتی تھی، اس طرح سے پشاور کی حالت ایسی نہیں تھی، یہ ہمیشہ ہی اسی حاکم کے تحت رہا جو کابل کا حاکم تھا، وہ مغل بھی تھے اور افغان بھی۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب رنجیت سنگھ نے پشاور پر قبضہ کیا۔ تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ لاہور پر قبضہ کرنے والا حکمران پشاور کا حاکم بھی بنا۔ یہ مدت کوئی پندرہ سال سے زائد نہیں ہے۔ عام طور پر یہاں کے حکمران وسطی ایشیاء سے آنے والے لوگ تھے یا پھر ایران سے آنے والے نادر شاہ اور افغانستان سے آنے والے افغانی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے، کہ

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد زمینی بندوبست کا نظام قائم کیا اور اس کے مطابق زمین کی پیمائش بھی کی گئی۔ صوبے، ڈویژن، ضلعے اور تحصیلوں کی حد بندی کی گئی۔ اسی دور میں موجودہ خیبر پختونخوا کی حدود کی حد بندی کی گئی، جس میں دریائے سندھ کا مشرقی حصہ، یعنی ہزارہ بھی شامل کیا گیا اور شمال میں یہ گلگت بلتستان کے علاقے میں کوہستان تک پھیلا۔ صوبہ سرحد، جنوب میں ڈیرہ اسماعیل خان تک اور مغرب میں افغانستان کی سرحد تک ہے۔ اسی وجہ سے افغانستان کے ساتھ سرحدی تنازعہ بڑی دیر تک چلتا رہا۔ جسے بعد میں انگریزوں نے کابل کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر حل کیا اور اسے ڈیورنڈ لائن کا نام دیا۔ میں نے پشاور کی تاریخ کے متعلق ایک مختصر تحریر اسی کتاب میں لکھی ہے، جو اس باب میں موجود ہے جس میں، میں نے اٹک سے پشاور تک کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے میں اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ میں یہاں مختصر طور پر خیبر پختونخوا کے نام کی مناسبت سے ضرور کچھ کہنا چاہوں گا۔

اب تک کی گئی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ خیبر پختونخوا نام سے کوئی الگ سے صوبہ نہیں تھا۔ مغل دور میں یہ کابل صوبہ کا ہی حصہ تھا۔ جو بھی کابل کا حاکم ہوتا اسی کا راج پشاور پر ہوتا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ پشاور پر افغانوں کے راج کے خاتمے کے بعد کچھ عرصہ سکھ یہاں کے حاکم رہے اور سو سال تک انگریز یہاں حکومت کرتے رہے۔ دوسری اینگلو افغان وار کے خاتمے پر 1879ء میں، گندمک معاہدہ، جو فغانستان کے بادشاہ یعقوب خان اور سیر لوئیس کیونگری گورنر جنرل ہندوستان کے درمیان ہوا، کے نتیجے میں ایک بڑا پشتون علاقہ ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ اس وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس کا دکھ آج بھی ہر پختون محسوس کرتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر افغانستان نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ سب کیسے ہوا، اس کا ایک مختصر ذکر آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ابدالی، سکھ اور انگریز: پشاور کے حکمران

کابل کے متعلق یہ جاننا بھی دلچسپی کا باعث ہوگا، کہ 1747ء میں درانی سلطنت کا حصہ بننے سے پہلے یہ ایک آزاد اور خود مختار شہر تھا۔ کوئی سو سال تک اس پر ابدالی اور اس کے بعد اس کی اولاد نے اس پر قبضہ کیے رکھا۔ اسی دور میں وہ پشاور پر بھی قابض رہے۔ افغانوں کی آپس کی جنگ کی وجہ سے 1839ء انگریزوں کو پہلی اینگلو افغان جنگ کا موقع ملا۔ وہ کابل تک آ پہنچے۔ پھر 1842ء میں انھیں کابل سے فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد انگریزوں نے 1879ء میں دوسری اینگلو افغان جنگ کے نتیجے میں، کابل شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ایک دفعہ پھر ان کے خلاف بغاوت ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہوئے۔ پھر 1919ء میں، شاہ امان اللہ خان کے دور

میں، تیسری اینگلو افغان جنگ ہوتی ہے۔ برطانوی رائل ایئر فورس نے افغانستان کے دارالحکومت اور اس کے مشرقی شہر جلال آباد پر فضائی حملہ کیا۔ یہ جنگ بھی انگریز نہ جیت سکے لیکن اس جنگ کے بعد امان اللہ خان اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ راولپنڈی ہوتا ہے اور یوں افغانستان کو ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ پہلی افغان وار کے لیے انگریز، کوئٹہ اور قندھار کے راستے افغانستان آتے ہیں جبکہ بقیہ دونوں جنگوں کے وقت قندھار، پاراچنار اور پشاور کی طرف سے حملہ کرتے ہیں۔ اس لیے پشاور ان کے لیے بے حد اہم تھا۔ وہ پشاور اور اس سے ملحق دیگر علاقوں پر کیسے قابض ہوتے ہیں، اس کا ایک مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔ اس تحریر کے لیے میں نے رفیق اللہ خان کے پی ایچ ڈی کے ایک مقالے جس کا عنوان ہے؛

PESHAWAR UNDER THE MUGHALS (1993)

جو یونیورسٹی آف پشاور میں پیش کیا گیا، سے مدد لی ہے[1]۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے، کہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں کابل میں ایک بڑے پیانے پر بغاوت ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں جہانگیر نے کابل کی وادی میں امن قائم کرنے کے لیے کئی دورے بھی کیے۔ لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اسی دور میں کابل پر ازبکوں نے حملے کرنے شروع کر دیے۔ مقامی لوگوں میں خوف پیدا ہوا۔ انھوں نے شاہجہاں کو مدد کے لیے بلایا۔ ازبکوں کو کابل سے نکالنے کے لیے، شاہ جہاں نے کابل کی طرف پیش قدمی کی اور کابل کی حفاظت کو یقینی بنایا۔ اس کامیابی میں افغان لوگوں کا ایک اہم کردار تھا۔ وہ بھی ازبک کو کابل میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے جنگ جیتنے کے بعد شاہجہاں نے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر متعدد افغانوں کی تقرری کی جس سے ایک امن کی فضا قائم کرنے میں مدد ملی۔

میرے خیال میں یہی وہ وجہ ہے، کہ افغانوں کو مغلوں پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا۔ پھر جیسے ہی اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل ریاست کمزور ہوئی، افغانوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مغلوں اور افغانوں کے درمیان ہونے والی کئی جنگیں اس بات کا ثبوت ہیں۔ مغلوں کی یوسف زئیوں سے جنگ اور دوستی، خٹک قبیلے کے کبھی حلیف اور کبھی حریف بھی جیسے واقعات اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس کے نتیجہ میں کابل کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ مغل بادشاہوں نے اپنی سی کوشش کی، لیکن وہ ان ہنگامہ آرائیوں کو کچلنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس کا ایک فطری

[1] https://prr.hec.gov.pk/jspui/handle/123456789/3658

نتیجہ کسی غیر ملکی کا حملہ ہی ہوتا ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب 1738ء میں نادر شاہ افشار کابل پر قبضہ کرتا ہے اور اس طرح مغلوں نے کابل کی وادی کے ساتھ ساتھ دہلی تک کے علاقے بھی کھو دیئے۔ پشاور پر نادر شاہ جو ایک ایرانی جرنیل تھا کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ پشاور پر کس طرح تاج مغلوں کے سر سے اتر کر سکھوں کے سر سے ہوتا ہوا انگریزوں کے سر تک پہنچتا ہے۔

نادر شاہ کے بعد، اس کا ایک جرنیل احمد شاہ ابدالی اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، ہندوستان پر بار بار حملے کرتا ہے۔ وہ دہلی تک جا پہنچتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشین دہلی، پنجاب کے ساتھ ساتھ پشاور اور کابل پر بھی اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے جاتے ہوئے، پنجاب میں اپنا اقتدار سکھوں کے حوالے کرتے ہیں۔ اسی دور میں دہلی پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دریائے ستلج کے مشرق میں انگریز اور ان کی حلیف ریاستیں موجود تھیں اور اس کے مغرب سے لے کر جمرود تک سکھ قابض تھے۔

سکھوں نے یہ سب کچھ کیسے حاصل کیا، اس کی تفصیل اسی کتاب میں کئی اور جگہ بیان کی گئی ہے، اسے دہرانا مناسب نہیں ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جب دہلی میں مراٹھا (مرہٹہ) قبضہ کر لیتے ہیں تو وہ پنجاب سے ہوتے ہوئے پشاور تک آ پہنچتے ہیں۔ یہ 1758-1759ء کی بات ہے۔ وہ یہاں صرف ایک سال ہی ٹک پاتے ہیں۔ انھوں نے پشاور پر قبضہ 1758ء میں پشاور کی جنگ میں درانیوں کو شکست دے کر کیا تھا۔ اس جنگ میں ان کے ساتھ سکھ اور دیگر ہندو ریاستیں بھی شامل تھیں۔ صرف ایک سال بعد، 1759ء کے شروع میں، احمد شاہ ابدالی کی قیادت میں پختونوں کی ایک بڑی فوج نے پشاور پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد 1776ء میں، احمد شاہ کے بیٹے، تیمور شاہ درانی نے پشاور کو اپنا سرمائی دارالخلافہ بنا لیا۔ یعنی پشاور ایک بار پھر افغانوں کے پاس تھا۔ یہ قبضہ سکھوں کی فتح تک رہتا ہے۔ یاد رہے کہ پنجاب پر بھی قبضہ سکھوں نے افغانوں کو شکست دے کر ہی حاصل کیا تھا۔ پشاور میں بھی ایسا ہی ہوا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سکھ یہاں پر پہلی بار 1818ء میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ اسے اپنی سکھ ریاست کا حصہ نہیں بناتے۔ بعد میں ایک مرتبہ سیّد احمد شہیدؒ بھی یہاں تشریف لاتے ہیں۔ ان کے یہاں سے چلے جانے کے بعد آخر کار 1834ء میں سکھوں نے پشاور

پر قبضہ کرکے اسے اپنی ریاست کا حصہ بنالیا۔ اسی دور میں جمرود کا قلعہ بھی دوبارہ سے تعمیر کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ پھر 1835ء میں افغان امیر، دوست محمد خان پشاور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ یہ پشاور پر قبضہ حاصل کرنے کی افغانوں کی آخری کوشش تھی، جو ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کبھی بھی کوئی افغان یا وسطی ایشیاء سے آکر کوئی بھی حملہ آور، اس راستے ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوا۔ یہی انگریزوں کا بھی مقصد تھا، جسے وہ سکھوں کی مدد سے پورا کر پائے۔ یاد رہے کہ یہی وہ راستہ تھا جس سے گزر کر سکندر سے لے کر ابدالی تک لوگ اکیس سو سال تک ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ سکھ لوگ اسے اپنا ایک بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ میرے خیال ہیں یہ کبھی ممکن نہ ہوتا اگر انگریز، سکھوں کو ان کی مشرقی سرحد کی حفاظت کی ضمانت نہ دیتے، جو دریائے ستلج تک تھی۔

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھوں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ پنجاب پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ اسی دوران، وہ پشاور اور موجودہ خیبر پختونخوا پر اپنا قبضہ کر لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ قبضہ انھوں نے سکھوں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا۔

انگریزوں کا دورِ حکومت (1849-1947)

یہ بھی تاریخ کا اہم واقعہ ہے کہ انگریزوں نے کس طرح آج کے خیبر پختونخوا پر بغیر کسی جنگ کے قبضہ کیا۔ اس متعلق ایک مضمون رضیہ سلطانہ نے لکھا ہے، جس میں یہ تمام باتیں بڑی وضاحت سے بیان کی گئیں ہیں۔ اس کا عنوان ہے[1]؛

Peshawar: An Integral Part of Competing Empires of Durranis, Sikhs and British

رضیہ سلطانہ کے بقول انگریزوں نے رنجیت سنگھ کی زندگی میں اس صوبے پر کوئی حملہ نہیں کیا اور نہ ہی اسے اپنے ماتحت کرنے کی کوئی کوشش کی۔

انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

---

[1] http://www.nihcr.edu.pk/Latest_English_Journal/2.%20Peshawar%20An%20Integral%20Part,%20Dr.pdf

میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے، کہ پہلی اینگلو افغان وار جو 39-1838 ہیں ہوئی، کا مقصد روس کی یلغار روکنے کے لیے کابل میں اپنے ہم خیال لوگوں کی حکومت قائم کرنا تھا، تاکہ روس کو افغانستان میں ہی روکا جاسکے۔ اب جب پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہو گئی، تو انھیں خود افغانستان جانے کی ضرورت نہ رہی۔ ہندوستان کی مغربی سرحد کو مزید محفوظ بنانے کے لیے، انھوں نے سکھوں کی مدد کی یا خاموش رہے اور سکھوں اور دُرانیوں کی جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرتے رہے۔ سکھ یہ جنگ جیت گئے اوراس طرح خیبر پختونخوا کا موجودہ علاقے میں ایک ایسی ریاست قائم ہو گئی، جو ان کی خاطر افغانستان کی طرف سے ہونے والے کسی بھی حملے کو روکنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ایسا ہوا بھی۔ جب دوست محمد خان نے پشاور پر حملہ کیا، تو اسے سکھوں نے ہی روکا تھا۔

اس طرح انگریزوں نے بالآخر فرانسیسی اور روسی حکمرانوں کی طرف سے ہونے والے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیا۔ یہ سب کچھ بغیر کسی جانی یا مالی نقصان سے ہوا۔

رنجیت سکھ کی موت جو1839ء میں ہوتی ہے، کے چند سال بعد 1849ء میں سکھوں کے ساتھ انگریزوں کی آخری لڑائی، چیلیانوالا گجرات میں ہوئی اور یوں مغربی پنجاب، موجودہ خیبر پختونخوا اور کشمیر کے ساتھ ساتھ گلگت بلتسان انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ یہ بھی بات اہم ہے کہ اگلے سو سال انگریزوں کو مقامی لوگوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بھی درست ہے کہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد، دس سال تک انگریزوں اور سکھ خالصہ میں کئی بڑی لڑائیاں بھی ہوئیں جس میں انگریزوں نے فتح حاصل کی۔ سکھوں کو مکمل طور پر شکست دینے کے بعد 1849ء میں انگریزوں نے پشاور کا رخ کیا۔

یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے، کہ انگریزوں نے بغیر خونریزی کے موجودہ خیبر پختونخوا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے ساتھسا تھانگریزوں نے سکھ ریاست کے جو لاہور، ملتان، کشمیر اور پشاور پر مشتمل تھی، کا خاتمہ کردیا۔ انھوں نے سب پر قبضہ کرلیا سوائے کشمیر کے۔ جسے انھوں نے ایک کثیر رقم کے عوض گلاب سنگھ کے حوالے کردیا، جس نے انگریزوں کی طرف سے رنجیت سنگھ کی بیوی مائی جنداں پر عائد جرمانہ کی رقم ادا کی تھی۔

کرنل لارنس انگریزوں کی طرف سے بھیجے جانے والا پہلا شخص تھا، جو 1847ء کے اوائل میں پشاور آیا۔ اس کی تقرری سکھوں کی انتظامیہ میں ایک مشیر کے طور پر تھی، نہ کہ انگریزوں کی طرف سے کسی بھی طرح کی حکمرانی کی خاطر۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مقامی لوگ سکھوں کے ڈھائے جانے والے مظالم سے بے حد تنگ بھی تھے، خاص طور پر سکھوں کے مقرر کردہ ایک یورپی گورنر سے۔ اس وقت تک انگریزوں کی طرف سے تعلیم اور صحت کے میدان میں کیے جانے والے کاموں کی خبر بھی پشاور کے لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ اہلِ پشاور نے انگریزوں کا استقبال کیا۔ کسی نے بھی ان کے سامنے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح اہلِ پشاور نے مغلوں سے ابدالی، ابدالی سے سکھ اور پھر سکھوں سے انگریزوں تک کا دور دیکھ لیا۔

میں مدت سے اس تلاش میں تھا کہ انگریزوں نے کس طرح سکھوں سے پشاور چھینا، سکھوں نے مزاحمت کیوں نہ کی؟

ان سب کا جواب مجھے رضیہ سلطانہ کے مضمون سے ملا۔

وہ لکھتی ہیں کہ جب برطانوی عہدیدار پشاور پہنچے، تو انھیں معلوم ہوا کہ سکھوں کے نامزد کردہ گورنر جنرل ایویٹابائل نے ایک سخت گیر نظام قائم کر رکھا تھا۔ بے شمار لوگ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد وہ 1843ء میں واپس یورپ چلا گیا۔ اس وقت لاہور میں سکھوں کی ریاست کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ پشاور کا خزانہ بھی خالی تھا، فوجی تنخواہ کے لیے شور مچا رہے تھے۔ اس وقت تک جنرل گلاب سنگھ کے ماتحت پشاور میں سکھوں کی باقاعدہ فوج چھ ہزار فوجیوں پر مشتمل فوج موجود تھی۔ ایک طرح سے فوج تو تھی، لیکن لڑنے کے قابل نہ تھی۔ دوسری طرف عوام میں بھی کوئی ان کا ہمدرد نہیں تھا۔ لاہور سکھوں کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔

یاد رہے کہ 1849ء تک مائی جنداں، رنجیت سنگھ کے بیٹے دلیپ سنگھ جس کی عمر کوئی پانچ سال تھی، کی نگران کے طور پر لاہور تخت سنبھالے ہوئے تھی۔ اسی وجہ سے کرنل لارنس کو پشاور میں ایک مشیر کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت تک انگریزوں کا پشاور پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔

ایک طرح سے امن تھا، لیکن جلد ہی جب مقامی لوگوں کو سکھوں کی کمزوری کا پتہ چلا، تو کئی قبائل نے بغاوت شروع کردی، جن میں ماشوخیل، ماشوگگر، محمد گاؤں، اور بابوزئی

اہم ہیں ۔ ان قبائل نے سکھ حکومت کی طرف سے عائد کردہ محصول کی ادائیگی سے بھی انکار کردیا۔اس پر انگریزوں اور سکھوں نے مل کر اس بغاوت کو کچل دیا۔

اسی دوران 1849-1848 ء میں پشاور میں موجود سکھ فوج نے بھی بغاوت کردی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر کرنل لارنس، پشاور سے کوہاٹ فرار ہو گیا۔ کوہاٹ میں سردار سلطان محمد خان بارکزئی نے کرنل لارنس کو مہمان بنالیا۔ان کا شاندار استقبال کیا۔ بظاہر سلطان نے کرنل کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ دوسری طرف اس نے لاہور میں سکھ دربار سے مذاکرات بھی شروع کردیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل لارنس اور اس کا خاندان جنگ کے خاتمے تک سکھوں کا قیدی بنارہا۔

پھر وہ وقت بھی آگیا، جب 1849 ء میں سکھوں کی حکومت پنجاب میں ختم ہو گئی، تو موجودہ خیبر پختونخوا میں موجود فوجیوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔یوں تاریخ کا ایک باب ختم ہو گیا۔ اب یہ علاقے بھی برٹش راج کا حصہ بن گئے۔ یاد رہے کہ اس وقت تک ہندوستان پر حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ سکھ فوجیوں کی ہتھیار ڈالنے کی ایک بڑی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ ایک بڑی تعداد میں سکھ فوجی اپنے ہتھیار انگریز فوجی آفیسرز کے سامنے رکھتے رہے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب کرنل لارنس، جسے سکھوں کے ظلم کی وجہ سے پشاور سے فرار ہونا پڑا تھا، کو اپریل 1849ء میں پشاور کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا۔ یوں پشاور سمیت خیبر پختونخوا کے دیگر علاقوں پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

میرے علم کے مطابق موجودہ خیبر پختونخوا، وہ واحد صوبہ ہے جسے انگریزوں نے بغیر کسی گولی چلائے اور بغیر کوئی جنگ لڑے اور کسی بھی جانی یا مالی نقصان کے بغیر حاصل کیا ہے۔ یہ سب صرف اس لیے ہوا، کہ یہاں پر پہلے سے سکھوں کی حکومت تھی جو انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور دوسرا، یہاں کے لوگ سکھوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر کسی مسیحا کی تلاش میں تھے۔ انگریزوں کو اگر کوئی روک سکتا تھا، وہ کوئی افغانی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ بھی اب اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ نہ ہی اپنے پرانے صدر مقام کو سکھوں سے بچاسکے اور نہ ہی انگریزوں سے۔

تقسیم ہند تک انگریز اس علاقے کے حاکم رہے۔ اس دوران انھوں نے کیا کیا کام کیے، ان سب کا ذکر اگلے صفحات میں موجود ہے۔ ابتدائی سالوں میں وہ اسے فرنٹئیر ہی کہتے تھے۔

یہ تک ایک مختصر تذکرہ کہ کس طرح انگریز، پشاور پر قابض ہوئے۔

انگریزوں کا پشاور پر قبضہ

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 1849ء میں پشاور سمیت دیگر علاقوں پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مقامی لوگوں نے انھیں کبھی بھی امن سے رہنے نہ دیا (اس کی تفصیل اگلے صفحات میں موجود ہے)۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب 1857ء کی جنگِ آزادی شروع ہوتی ہے، اس دوران پشاور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں کسی بھی جگہ عام لوگوں یا فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف باغیوں کا ساتھ نہیں دیا[1]۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک افغانستان اور خیبر پختونخواکے درمیان کوئی باضابطہ سرحد نہیں تھی۔ اس وقت انگریزوں نے اس علاقے کو کوئی خاص نام بھی نہیں دیا تھا۔ میں نے بڑی کوشش یہ جاننے کی کہ اس علاقے کا کیا نام تھا، مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ انگریزوں کے دور میں اسے فرنٹئیر کے نام سے جانا جاتا تھا۔

سرحدی تنازعے کا حل کرنے کے لیے سر مورٹیمر ڈیورنڈ اور افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن خان نے ایک بین الاقوامی سرحد پر اتفاق کیا جو ڈیورنڈ لائن کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب یہ بلوچستان، خیبر پختونخوااور فاٹاکے پاکستانی علاقوں کو افغانستان سے الگ کرتی ہے۔

انگریزوں نے کوئی پچاس سال تک حکومت کرنے کے بعد خیبر پختونخواکی بہتری کے لیے اسے ایک صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور گورنر لارڈ کرزن نے 1902 میں شاہی باغ میں، شمال مغربی سرحدی صوبے کا نام دے کر اسے ایک صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ لیکن ابھی بھی اسے باقی صوبوں کی طرح کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ کوئی بیس سال بعد 1931ء میں اسے گورنر کے زیر اقتدار صوبے کا درجہ دے دیا گیا اور خیبر پختونخوا کو 1937ء میں خود مختار صوبائی حکومت کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد یہاں پر الیکشن بھی ہوئے اور صوبائی اسمبلی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کا دیا ہوا یہ نام مقامی لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ ان کہنا تھا کہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کی طرح، اس صوبے کا نام بھی پختونوں کے نام پر ہونا چاہیے۔

---

[1] https://kp.gov.pk/page/history_march_of_time#:~:text=It%20had%20been%20known%20as,province%20was%20re.named%20Khyber%20Pakhtunkhwa

آزادیٔ ہند کے بعد

آزادی کے بعد عبدالغفار خان نے حکومت پر زور دیا کہ صوبے کو ایک ایسا نام دیا جائے، جو پختون شناخت کی عکاسی کرتا ہو۔ اس کے کئی نام تجویز ہوئے۔ بالآخر 2010ء میں صوبے کا نام بدل کر خیبر پختونخوا رکھ دیا گیا۔

یہاں ایک اہم بات کا ذکر بے حد ضروری ہے۔

جب انگریزوں نے اس صوبے کی حدبندی کی، تو انھوں نے ہزارہ اور کوہستان کو اس کا حصہ بنا دیا۔ ہزارہ، اکبر بادشاہ کے دور میں لاہور صوبہ کا حصہ تھا، بعد میں بھی یہ لاہور کا حصہ ہی رہا۔ اس کا پنجاب سے زمینی رابطہ بھی ہے اور زبان، رہن سہن میں بھی یہ خیبر پختونخوا سے زیادہ پنجاب کے قریب ہے۔

پھر ایسا کیوں کیا گیا؟

میرے خیال میں اس کی وجہ سوائے اس کے کوئی اور نہیں، کہ انگریز اس نئے صوبے میں پختونوں کی اکثریت نہیں چاہتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ چمن، لورالائی، ہرنائی، ژوب، جیسے علاقے جہاں ایک بڑی تعداد میں پختون بستے ہیں، کو خیبر پختونخوا کا حصہ ہونا چاہیے تھا، لیکن اسے بلوچستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس سے بھی خیبر پختونخوا میں، پختون آبادی کے تناسب میں کمی ہوئی ہے۔

یہ تھی کہانی کابل صوبہ لے کر خیبر پختونخوا تک کی۔ تقسیم ہند کے بعد خیبر پختونخوا میں کیا ہوا، یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ اس بارے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

امید ہے کہ خیبر پختونخوا کی ایک مختصر تاریخ جاننے کے بعد آپ اس سفر نامے سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوں گے اور آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

کسی بھی علاقے کی تاریخ کے متعلق ہر بات مصدقہ نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ میری معلومات درست نہ ہوں اور میرا قیاس بھی صحیح نہ ہو، جس پر میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔ اگر آپ کو کوئی بات حقیقت کے بر خلاف لگے تو ضرور آگاہ کریں۔

پیشگی شکریہ۔

اٹک سے پشاور تک

میں پہلی مرتبہ 1980ء کی گرمیوں میں، اس وقت رمضان کا مہینہ بھی تھا، پشاور جاتے ہوئے، اٹک میں رکا تھا۔ اس کی یاد اب تک باقی ہے۔ یہ اس وقت کی بات اس وقت میں ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد میں پڑھتا تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ تھا۔ مجھے ایک پروگرام کے لیے قاضی حسین احمد اور جناب مفتی سیاح الدین کاکاخیل صاحب سے پشاور میں ملنا تھا۔

اس وقت ابھی کوچز اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بسیں ہر شہر اور قصبے میں رکتی تھیں۔ اب موٹروے کی وجہ سے اٹک آنا نہیں ہوتا۔ اٹک سے پشاور کے درمیان، خیر آباد، جہانگیرہ، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، پبی کے علاوہ بھی کئی چھوٹے قصبات آباد ہیں۔ میں اس سفر کی داستان اور راستے میں آنے والے ان شہروں کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اگر آپ جی ٹی روڈ سے آرہے ہوں، تو آپ کے لیے پنجاب سے خیبر پختونخوا میں داخل ہونے کے لیے دریائے سندھ عبور کرنا ضروری ہے۔ جی ٹی روڈ پر دریائے سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخوا میں ایک سرحد کا کام کرتا ہے۔ ایسا اور بھی کئی مقامات پر ہے لیکن ہر جگہ نہیں۔ کہیں کہیں پنجاب، دریائے سندھ کے دونوں طرف ہے، جیسے پنجاب کا ایک ضلع تونسہ شریف دریائے سندھ کے مغرب میں آباد ہے۔

ہم جیسے ہی دریائے سندھ کا پل پار کرتے ہیں، جسے عام طور پر اٹک کا پل کہا جاتا ہے، تو خیر آباد میں داخل ہوتے ہیں۔ خیر آباد کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ پُل کے مشرق میں اٹک خورد نامی ایک گاؤں بھی واقع ہے، جو پنجاب کا آخری گاؤں ہے، جبکہ خیر آباد خیبر پختونخوا کا پہلا ایک بڑا قصبہ ہے۔

اٹک پُل: کشتیوں سے پختہ پُل تک

جب میں پہلی مرتبہ 1980ء میں پشاور گیا تھا، اس وقت اٹک کا نیا پل بن چکا تھا مگر پرانا پل بھی موجود تھا۔ پرانے پل کے دو حصے ہیں؛ ایک اوپر اور دوسرا نیچے۔ اوپر والے حصے

میں ریل کی پٹری تھی، جب کہ نیچے والے حصے میں سڑک تھی، جہاں عام گاڑیاں چلتی تھیں۔ مجھے اس پرانے پل پر سے اس وقت گزرنے کا موقع ملا، جب میں 1989ء میں جہادِ افغانستان میں زخمی ہونے کے بعد بذریعہ ریل پشاور سے اپنے گھر ٹوبہ ٹیک سنگھ جا رہا تھا۔

اٹک کا پرانا پل، سر گلڈ فورڈ مولس ورتھ کا ڈیزائن کردہ ہے، جسے 24 مئی 1883ء کو ٹریفک کے لیے کھولا گیا تھا۔ اسے مزید بہتر کرنے کے لئے 1929ء میں اسے دوبارہ سے بنایا گیا۔ اس کی لمبائی 1,395 فٹ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم اس پل کے پار جاتے تھے، تو وہاں پر کئی مضبوط قلعہ نما عمارتیں بنی ہوئی تھیں، جو اب بھی ہیں۔ یہ عمارتیں انگریزوں نے دفاعی نُقطۂ نَظَر سے بنائی تھیں تاکہ یہاں سے قریبی پختون حملہ آوروں کی چھاپہ مار کاروائیوں کا دفاع کیا جاسکے۔ پھر 1979ء میں یہاں ایک نیا پل بنایا گیا، جسے عام ٹریفک کے استعمال کیا جاتا ہے۔ پشاور اسلام آباد موٹروے بننے سے پہلے خیبر پختونخوا جانے کے لیے اسی راستے سے جایا جاتا تھا۔ اب بھی یہ پل اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور اہم بات جاننا بھی ضروری ہے کہ پختون اور پشتون دونوں الفاظ استعمال میں ہیں۔ میں اس کتاب میں لفظ پختون ہی استعمال کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صوبائی حکومت نے صوبے کا نام رکھتے ہوئے پختون لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ پشتون لکھنے والوں سے معذرت۔ البتہ زبان کے متعلق لکھتے ہوئے سب اسے پشتو لکھتے ہیں۔ اس لیے میں زبان کے لیے پشتو کا لفظ ہی استعمال کروں گا۔

اس پل کی کہانی بھی بے حد دلچسپ ہے۔

قدیم دور سے ہی پشاور کی طرف سے آنے والے لوگ اور قافلے دریائے سندھ عبور کرکے ہی پنجاب کی طرف آتے تھے۔ اس وقت یہاں کوئی پل نہیں تھا۔ جس جگہ اب پل ہے، یہاں دریا کی چوڑائی بہت کم ہے اور پانی کا بہاؤ بھی کافی تیز ہے۔ اس جگہ سے شمال کی طرف ایک جگہ ہنڈ نام کی ہے، اس کے پاس دریا کا پاٹ کافی چوڑا ہے اور پانی کا بہاؤ بھی تیز نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے موجودہ پل بننے سے پہلے، کشتیوں کے ذریعے ہنڈ کے مقام سے ہی دریا عبور کیا جاتا تھا۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسی جگہ، یعنی ہنڈ کے نام ہی کی وجہ سے اس سے آگے کے علاقے کو ہند کہا گیا۔ یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی۔

مجھے کچھ معلوم نہیں !

انیسویں صدی کے وسط میں، پہلی مرتبہ انگریزوں نے پشاور کی طرف سے ہونے والے کسی بھی افغان حملے سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے دریائے سندھ پر پل بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ٹیکنالوجی بھی اتنی عام نہیں تھی اور شاید وسائل کی بھی کمی تھی۔ اس لیے ایک بڑا پل بنانے کی بجائے، کشتیوں کا پل بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک فیری بھی چلائی گئی اور ڈاک یا تھوڑے افراد کے لیے ایک چھوٹی کشتی کا بھی بندوبست کیا گیا۔ یہ بات 1853ء کی ہے۔ کشتیوں کا یہ عارضی پل کوئی تیس سال تک کام کرتا رہا[1]۔ اس دوران کئی تجاویز زیرِ غور رہیں۔ ان میں سے ایک یہاں پر ایک سرنگ بنانا بھی تھی۔ اس سرنگ کی چوڑائی، چوبیس فٹ چوڑی اور اونچائی بائیس فٹ تجویز کی گئی۔ اس کے ڈیزائن میں یہ بھی شامل تھا کہ اسے پانی کی سطح سے 82 فٹ نیچے رکھا جائے گا اور اس کی لمبائی 1215 فٹ ہونا تھی۔

اس پر کام بھی شروع ہو گیا اور کئی سو فٹ تک سرنگ بن بھی گئی۔ قریب تھا کہ یہ سرنگ مکمل ہو جاتی، کہ اس کی چھت سے پانی ٹپکنے لگا۔ پانی اس قدر جمع ہو گیا کہ سرنگ بنانے کا منصوبہ بند کر دیا اور سرنگ بند کر دی گئی۔

اور پھر اسی طرح سے کئی سال گزر گئے۔

اس دوران راولپنڈی سے پشاور ریلوے لائن کا منصوبہ بھی بنایا گیا، جس کی وجہ سے پل کی ضرورت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ افغانستان کے ساتھ ایک اور جنگ تھی جس کی بناء پر پشاور تک ریلوے ٹریک کو ہر قیمت پر مکمل کرنا، انگریزوں کی ایک جنگی ضرورت بن گیا تھی۔ یاد رہے کہ یہ بات 1862ء کی ہے۔

پل کی ضرورت اپنی جگہ موجود رہی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار اس مسئلے کے حل کے لیے، سر گلڈ فورڈ مولس ورتھ جو کہ سری لنکا میں ریلوے کے پہلے جنرل مینیجر بھی تھے، کی ذمہ داری لگائی گئی۔ یہ پل کیسے بنا، اس کی بھی ایک دلچسپ تفصیل ہے۔ اس کے لیے اویس مغل کا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ پھر وہ دن آیا کہ جب 24 مئی 1883ء کو اٹک ریلوے پل ٹریفک کے لیے کھول دیا گیا۔ یہ وہی وقت ہے جب راولپنڈی سے پشاور کے لیے ریل گاڑی چلائی گئی۔

[1]Railway Bridge on Indus at Attock
Owais Mughal
http://pakistaniat.com/2009/02/03/railway-bridge-on-indus-at-attock/

اب ایک مدت سے اس پل پر سے گزرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ابھی بھی اس کا منظر یاد ہے، خاص طور اس کے پاس بنی ہوئی چوکیاں ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس جگہ پولیس کی چیک پوسٹ بھی ہے۔ یہاں پولیس نے چوری شدہ گاڑیوں کو پکڑنے کے لیے لوگ بھی متعین کر رکھے ہیں۔ اس نئے پل کے ساتھ ہی پرانے پل کی باقیات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے انھیں اٹک قلعے کی سیاحت کے دوران دیکھا تھا۔

خیر آباد، جہانگیرہ اور اکوڑا خٹک

اٹک پل پار کرنے کے بعد خیر آباد کا قصبہ آتا ہے۔ خیر آباد، پشاور سے اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ کب آباد ہوا، کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جب ہم اس جگہ سے گزرتے تھے، تو ارد گرد ماربل کی فیکٹریاں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا کہ سیّد احمد شہیدؒ کا مقابلہ کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کی فوجوں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا۔

خیر آباد کے بعد جہانگیرہ کا قصبہ آتا ہے۔ یہ ایک مصروف شہر ہے۔ شہر کے بیچ میں سے جی ٹی روڈ گزرتی ہے۔ دریا کی وجہ سے شہر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ یہ ضلع صوابی کے جنوب مغرب میں واقع ایک قصبہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اہم شہر ہے کیونکہ صوابی میں ایک ہی ریلوے اسٹیشن ہے اور وہ اسی شہر میں ہے۔

کیا اس کی بنیاد مغل بادشاہ جہانگیر نے رکھی تھی اور اسی کے نام پر یہ شہر بسایا گیا[1]؟ یہ بات کئی لوگوں نے لکھی ہے لیکن اس کا کوئی مصدقہ ثبوت نہیں ملا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسے جہانگیر خان اعوان نے آباد کیا تھا۔ دونوں میں کیا بات درست ہے، کچھ کہنا مشکل ہے۔ پہلے اسے جہانگیرہ اعوان ہی کہا جاتا تھا۔

دریا کی وجہ سے اس کا مشرقی حصہ صوابی میں اور مغربی حصہ ضلع نوشہرہ کے تحت آتا ہے۔ مشرقی حصے میں زیادہ تر لوگ زراعت سے وابستہ ہیں۔ جبکہ مغربی حصہ میں مارکیٹس، ماربل کی فیکٹریاں، کھانے پینے کی دکانیں، بس اسٹینڈز اور ریلوے اسٹیشن واقع ہیں۔ یہاں پر شیخ بابا کا مقبرہ بھی ہے جو شہر کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ 1834ء میں یہاں ایک بااثر ہندو خاندان نے اسلام قبول کیا تھا، انھی کے نام پر یہ محلّہ آباد ہے۔

---

https://jehangira.webs.com[1]

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس جگہ کا پرانا نام، ڈھیری خٹک تھا۔ قدیم زمانے کا بنا ہوا ایک کنواں اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جہاں قافلے پڑاؤ کرتے تھے۔ اس کے قریب اکوڑہ خٹک، جو کہ خوشحال خان خٹک کی وجہ سے مشہور ہے، بھی واقع ہے۔ ممکن اسی وجہ سے اس کا نام ڈھیری خٹک پڑ گیا ہو۔ ڈھیری کا مطلب ایک چھوٹا سا گاؤں ہی ہوتا ہے۔

اسی علاقے میں دریائے کابل کے کنارے ایک تاریخی جگہ ہے، جہاں سکھوں کی مقامی لوگوں سے ایک جنگ ہوئی تھی، جسے 1823ء نوشہرہ کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں جو سکھ مارے گئے تھے، ان کی یہیں پر آخری رسومات ادا کی گئیں۔ ان میں ایک مشہور سکھ اکالی پھولا سنگھ بھی تھا۔ جس کی یاد میں ایک عمارت بھی بنائی گئ تھی جو اب بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے، اس کی کوئی اچھی حالت نہیں ہے۔ جب 1818ء میں رنجیت سنگھ اس علاقے پر حملہ آور ہوا تو اس دوران جہانگیرہ کو بری طرح نقصان پہنچا تھا۔

اکوڑہ خٹک : جہاں مّلا محمد عمر کا مدرسہ بھی ہے

اکوڑہ خٹک نوشہرہ سے پندرہ کلومیٹر اور پشاور سے ساٹھ کلومیٹر (بذریعہ موٹر وے اسّی کلومیٹر) مشرق میں جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ اکوڑہ خٹک اپنی تاریخ اور ثقافت کے لحاظ سے ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہے، کہ اس کا نام خٹک قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں خٹک قبیلہ ایک بڑی تعداد میں آباد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں خان عبدالغفار خان کی جائے پیدائش ہونا بھی اس کی شناخت کو بڑھا دیتا ہے۔ اسی قصبے میں خوشحال خان خٹک یونیورسٹی بھی واقع ہے۔

جہادِ افغانستان کی وجہ سے، یہاں پر موجود دارالعلوم حقانیہ کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ یہ مدرسہ مولانا عبدالحق (مولانا سمیع الحق کے والد) نے اپنے ساتھی حاجی محمد یوسف کے ساتھ مل کر 1947ء میں بنایا تھا۔ یہاں کوئی آٹھ ہزار کے قریب طالبعلم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یہیں رہائش پذیر ہیں۔ ملا عمر کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی یہاں پڑھتے رہے ہیں۔ میں نے اس مدرسہ کو دیکھا ہے اور کچھ وقت بھی یہاں گزارا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے۔ برلبِ سڑک ہونے کی وجہ سے، ایک اہم مقام پر واقع ہے۔

میری معلومات کے مطابق تقسیم ہند سے پہلے دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی مکاتب فکر کے بڑے بڑے مدارس ہندوستان کے ان علاقوں میں واقع تھے جو بعد میں بھارت کا حصہ بنے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بہت سے علماء کرام انھی مدارس سے پڑھے

ہوئے ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان سے بھارتی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے جانا ایک مشکل مرحلہ تھا، جس کی وجہ سے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے پاکستان کے اندر اپنے اپنے مسلک کی بنیاد پر مدارس قائم کیے، بالکل اسی طرح سے جیسے اپنی اپنی سیاسی جماعتیں بنائیں۔اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کراچی سے لے کر پشاور تک کئی بڑے مدارس کی بنیاد، قیام پاکستان کے بعد کی ہے۔

دارالعلوم حقانیہ کی ضرورت قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی شدت سے محسوس کی گئی۔ جس سال پاکستان کا قیام عمل میں آیا اسی سال اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا نام حقانیہ کیوں ہے؟ میں یہ نہ جان سکا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ نام مولانا عبدالحق کے نام کی وجہ سے ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو، اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ۔ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی اپنے نام کے ساتھ حق لکھا ہے جیسے سمیع الحق، انوارالحق وغیرہ۔ کیا افغانستان میں موجود حقانی گروپ کا نام بھی اسی مدرسے کے نام کی وجہ سے ہے؟ مجھے اس متعلق کچھ معلوم نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ جیسے دیوبند کے پڑھے لوگ اپنے نام کے ساتھ دیوبندی لکھتے ہیں، شاید اسی طرح اس مدرسے سے پڑھے لوگ حقانی لکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک یہ ادارہ دینی تعلیم کے میدان میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو آپ یہ جان سکیں گے، کہ اکوڑہ خٹک جی ٹی روڈ پر واقع ہے اور نوشہرہ سے اس کا فاصلہ کوئی پندرہ کلومیٹر ہے۔اس کے شمال میں دریائے کابل بہتا ہے جو اس سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آپ اسے ایک طرح سے دریائے کابل کا کنارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے شمال میں مغلکیٔ اور مصری بانڈہ واقع ہیں ۔اس کے جنوب میں بہت زیادہ آباد علاقے نہیں ہیں۔ خوشحال خان خٹک کا مزار بھی شہر سے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اس علاقے میں بھی مناسب کاشتکاری ہوتی ہے لیکن جس قدر صوابی کا وہ علاقہ، جو دریا کے پاس ہے سرسبز ہے یہ اتنا سرسبز نہیں ہے۔اس کی بڑی وجہ پانی کی قلّت ہی ہو سکتی ہے۔اکوڑہ خٹک کے پاس ہی سے ایک سڑک مصری بانڈہ کی طرف سے اسلام آباد پشاور موٹروے سے جاملتی ہے ۔یہاں کے لوگ پشاور جانے کے لیے موٹروے کی طرف سے ہی جانا پسند کرتے ہیں۔

اکوڑہ خٹک کے نام کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام ملک اکوڑہ خان خٹک کے نام پر رکھا گیا ہے، جو خوشحال خان خٹک کے پردادا تھے[1]۔ خوشحال خان خٹک کی جائے پیدائش بھی یہی شہر ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اسی علاقے میں واقع زیارت کاکا صاحب میں ایک قبیلہ آباد ہے، جو قاضی کہلاتا ہے۔ قاضی حسین احمد صاحب کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ آپ کی قبر مبارک بھی اسی قصبے میں واقع ہے۔ مجھے اپنے بیٹے عاصم الٰہی مانگٹ کے ہمراہ ان کی قبر پر بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ زیارت کاکا صاحب، نوشہرہ سے کوئی بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے[2]۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ پشاور سے آنے والے قافلے اکوڑہ خٹک سے ہی گزرتے تھے۔ ان کے آرام کے لئے شیر شاہ سوری نے اس جگہ پر دو کنویں بھی کھدوائے اور ایک سرائے بھی بنوائی تھی۔ اسی لیے شروع میں اسے سرائے ملک پورہ بھی کہتے تھے۔

اکوڑہ خٹک کا ذکر مغل بادشاہ اکبر کی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر ایک سرکاری ویب پر دیا گیا ہے[3]۔ اس کے مطابق جب 1651ء میں اکبر، اپنے بھائی مرزا حکیم کی بغاوت کو کچلنے کے لیے پشاور آیا، تو اس نے علاقے کے قبائلی سرادروں کا جرگہ بلوایا۔ اس جرگے میں اسے بتایا گیا کہ اس علاقے میں ملک اکوڑہ خان کے نام کا ایک شخص ہے، جو قافلے لوٹنے کے لیے مشہور ہے۔ اس وقت اس کا ٹھکانہ نیلاب (نظام پور) تھا۔ اکبر نے اس سے جنگ کرنے کی بجائے، اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور اسے کہا وہ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ پر سے گزرنے پر قافلوں سے ٹیکس وصول کرے اور اپنا حصہ رکھنے کے بعد باقی رقم دہلی بھیجے۔

Manzoor Ali[1]
Remembering a revered poet: Ajmal Khattak, a proponent of peace
Locals mull over holding poetry recital to protest attacks on his tomb
https://tribune.com.pk/story/378112/remembering-a-/revered-poet-ajmal-khattak-a-proponent-of-peace
https://pk.top10place.com/akora-khattak-[2]
1803194136.html
/https://www.voiceofkp.pk/akora-khattak-history[3]

اور یوں اکبر نے ایک اہم فرد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ دونوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب لوٹ کا نام ریاستی ٹیکس رکھ دیا گیا۔ ٹیکس لگانے والے اور ٹیکس وصول کرنے والے کے درمیان تقسیم کا فارمولا بھی طے ہوا ہو گا۔ ملک اکوڑہ خان اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے سرائے ملک پورہ آ گیا تاکہ کوئی قافلہ بچ کر نا جا سکے۔ اس طرح اس جگہ کا نام اکوڑہ خٹک پڑ گیا۔

پھر یہ سلسلہ تا دیر چلتا رہا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب ابدالی نے یہ تمام علاقے فتح کیے، تو یہ شہر بھی اسکے قبضے میں آ گیا۔ پھر وہ دور بھی آیا جب 1820ء میں سکھ یہاں قابض ہو گئے۔ اسی مقام پر 1826ء میں سیّد احمد شہید کے ساتھیوں اور سکھوں کے درمیان ایک جنگ بھی ہوئی تھی۔ اس جنگ کی داستان بھی بے حد دلچسپ ہے۔

اس جنگ میں ایک طرف سید احمد شہید اور کئی مقامی پشتون قبائل تھے اور دوسری طرف چار ہزار کی تعداد میں سکھ تھے۔ سیّد احمد شہیدؒ نے ایک گوریلا وار کیا، جس سے سکھوں کا کافی جانی نقصان ہوا۔ یہ ایک باقاعدہ جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک گوریلا کاروائی تھی۔ اس کے بعد سکھ یہاں مکمل طور پر قابض ہو گئے اور 1834ء میں سردار لہنا سنگھ نے دریائے کابل کے قریب اکوڑہ خٹک کا قلعہ بنوایا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب 1849ء میں انگریزوں نے سکھوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انگریز قیامِ پاکستان تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ اکوڑہ خٹک کی چھاؤنی کی بنیاد بھی 1850ء رکھی گئی۔ اکوڑہ خٹک میں پہلا پولیس تھانہ 1916ء میں قائم ہوا۔

اکوڑہ خٹک میں کئی تاریخی مقامات ہیں۔ سب سے اہم خوشحال خان خٹک کا مقبرہ ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ ، آخوند آدیان بابا سلجوقی کا مزار، دارالعلوم حقانیہ، خوشحال خان خٹک میموریل لائبریری ،اجمل خٹک کا مزار اور میوزیم بھی اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مغلیہ دور کا رنگ محل، جو اکوڑہ خٹک کے قریب واقع ہے، جو کبھی مغلوں کا گیسٹ ہاؤس تھا، بھی ایک تاریخی عمارت ہے۔

یہاں کے مشہور لوگوں میں خوشحال خان خٹک جو جنگجو بھی تھے اور ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحق، جنھوں نے دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی۔ ان کے علاوہ اجمل خٹک جو ایک مشہور سیاستدان اور مصنف بھی تھے کافی جانے پہچانے شخص تھے۔

اس شہر سے وابستہ تین اہم افراد کا تفصیلی ذکر بے حد ضروری ہے؛ ایک خوشحال خان خٹک، دوسرے قاضی حسین احمد اور تیسرے اجمل خٹک۔

خوشحال خان خٹک: ایک جنگجو شاعر

خوشحال خان خٹک کی ذات اور ان کی شاعری کے متعلق کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ ان پر کئی یونیورسٹیز میں مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان کے متعلق لکھنے کے لیے کئی کتابوں اور مقالہ جات سے مدد لی۔ جن میں ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی ہے[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طویل مضمون بھی دیکھنے کو ملا[2]۔ ان کے متعلق دوست محمد کامل مہمند کی ایک تحریر بھی ملی جس سے ان کی زندگی متعلق کافی کچھ جاننے کو ملا[3]۔ جو میں نے جانا وہ سب پیشِ خدمت ہے۔

خوشحال خان خٹک 1613ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت خٹک قبائل اور یوسف زئی قبائل میں جنگ ہو رہی تھی۔ اس جنگ میں آپ کے والد شاہ باز خان شدید زخمی ہو گئے تھے۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد 1640ء میں اپنے قبیلے کے سردار بنے۔ یاد رہے کہ اس وقت آپکا خاندان مغل حکمرانوں کے ساتھ تھا۔ مغل بادشاہ، شاہ جہاں نے ان لوگوں کو اٹک سے لے کر پشاور تک شاہی سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری بھی سونپی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ٹیکس کی وصولی کا کام بھی انھی کے ذمہ تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ خٹک قبیلہ مغلوں کا حلیف بھی تھا۔ خوشحال خان خٹک بادشاہ کے بیٹے سلطان مراد بخش کے ساتھ 1645ء میں موجودہ افغانستان کے علاقے بدخشاں میں ایک جنگی مہم پر بھی گئے تھے۔

خدمت کا یہ سلسلہ شاہ جہاں کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ اس دوران کسی وجہ سے، خوشحال خان خٹک اور اورنگزیب کے درمیان ناراضگی ہو گئی۔ اس پر مغل بادشاہ نے خوشحال خان خٹک کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا، جہاں وہ تقریباً سات سال رہے۔ خوشحال خان خٹک نے قید کے دوران ہی شاعری شروع کی۔ کئی پختون سرداروں کی درخواست پر اورنگزیب نے آپ کو رہا کر دیا اور پشاور کی طرف ان کے آبائی علاقے میں بھیج دیا۔ اب کی بار

---

[1]Niaz Muhammad Khushal Khan Khattak's Educational Philosophy
Department of Social Sciences Qurtuba University, Peshawar
https://web.archive.org/web/20011020220450/[2]
http://www.afghanan.net/poets/khushhal.htm
[3]KHushal Khan Khattak

خوشحال خان خٹک بدل چکا تھا۔ اس نے مغل سرداروں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا اور ساتھ ہی مغل ریاست کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔

یہاں سے پھر وہ دور شروع ہوتا ہے جب مغلوں اور پختونوں کے درمیان کھلم کھلا جنگ ہوتی ہے۔

میرے خیال میں بہت کم عرصہ مغل اور پختون متحد رہے ہیں۔ مغلوں نے ابراہیم لودھی کو؛ جو کہ ایک پختون تھا سے 1526ء میں پانی پت کے میدان میں شکست دے کر حکومت چھینی تھی اور پھر دو سو سال سے زائد عرصے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے مغل بادشاہ شاہ عالم کو 1757ء میں شکست دی اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس طرح مغل سلطنت 229 سال تک قائم رہی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے بعد بھی، 1857ء تک مغل دربار قائم رہا، لیکن ان کی بادشاہت عملی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح مغل سلطنت کا کل عرصہ 329 سال کا بنتا ہے۔

خوشحال خان خٹک نے مغل سلطنت کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یاد رہے کہ عالمگیر کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور بھی پڑ چکی تھی۔ خٹک قبیلے نے اپنی دشمنیوں کو بھلا کر دیگر افغان قبائل، جن میں آفریدی سرِ فہرست تھے، کے ساتھ مل کر مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ خوشحال خان خٹک اس میں مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکے، لیکن اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا، کہ اٹک سے لے کر جلال آباد تک کے اکثر افغان قبائل مغلوں کے خلاف متحد ہو گئے اور مغلوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جنگ میں یوسف زئی شامل نہیں تھے ، وہ مغل سلطنت کے وفادار ہی رہے۔

مغلیہ سلطنت شکست قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ جنگی صورتِ حال کی وجہ سے اورنگزیب دو سال تک اٹک میں بھی رہا اور براہِ راست جنگ کی نگرانی کرتا رہا۔ اس نے لالچ اور خوف ، دونوں کو استعمال میں لاتے ہوئے ایمل خان اور دریا خان، جو خوشحال خان خٹک کے سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ قابل اعتماد حامی تھے ، سمیت کئی قبائل کو اپنا مطیع اور فرمان بردار بنا لیا۔ یہ سب دیکھ کر خوشحال خان خٹک بیزار ہو گیا اور ایک طرح سے گوشہ نشین ہو گیا۔ اس کے بعد خٹک قبائل میں باہمی لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ یوں ایک مرتبہ پھر مغل کامیاب ہو گئے۔

اورنگزیب نے ان میں سے ایک سردار اشرف خان کو قیدی بنا کر جنوبی ہندوستان میں بیجاپور کے مضبوط قلعے میں قید کر دیا، جہاں وہ دس سال قید میں رہنے کے بعد فوت ہو گئے۔ اس پر خوشحال خان خٹک نے کئی نظمیں بھی لکھیں۔

اس کے بعد باہمی کشمکش نے خوشحال خان خٹک کی اولاد کو کسی جگہ کا نہ چھوڑا۔ آپس کی لڑائیاں اس قبیلے کو لے ڈوبیں۔ اس سے آگے بھی یہ کہانی کافی طویل ہے۔ جس کا اس سے زیادہ ذکر یہاں مناسب نہیں۔ بہرحال داستان خوشحال خان خٹک، کافی دلچسپ ہے۔

علامہؒ اقبال نے خوشحال خان خٹک کی وصیت کے نام سے بال جبریل میں یہ نظم بھی لکھی ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم

کہ ہو نام افغانیوں کا بلند

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

مغل سے کسی طرح کمتر نہیں

کہستاں کا یہ بچہ ء ارجمند

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات

وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند

اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ

مغل شہسواروں کی گرد سمند

خوشحال خان خٹک نے چالیس ہزار سے زائد اشعار لکھے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد بھی اڑھائی سو سے زائد ہے۔ ان کی شاعری کا انگریزی میں پہلا ترجمہ 1862ء میں ہوا۔ میرے خیال میں علامہ اقبال نے شاہین کا تصور خوشحال خان خٹک کے باز سے لیا ہو گا کیونکہ دونوں پرندوں کی عادات ایک دوسرے سے کافی ملتی ہیں۔

بقول علامہ اقبالؒ

خوش سرود آں شاعر افغان شناس
ہر چہ بنید باز گوید بے ہراس
آں حکیم ملتِ افغانیاں
آں طبیبِ ملتِ افغانیاں
راز قومے دید وبے باکانہ گفت
حرفِ حق باشوخئی رندانہ گفت

یہ میرا قیاس ہے، ہو سکتا ہے درست نہ ہو، یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، جو میں نے سمجھا وہ بیان کر دیا ہے۔

قاضی حسین احمد: ایک اسلامی اسکالر، جماعت اسلامی کے امیر اور جہادِ افغانستان کے پُر جوش حامی

قاضی حسین احمد صاحب سے مجھے بارہا ملنے کا موقع ملا۔ وہ ایک جاندار اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تقریر بھی بے حد پسند کی جاتی تھی۔ انھیں علامہ اقبال کی شاعری کا حافظ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ اسی طرح کا ایک مضمون، قیصر شریف، جو جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین میں شمار ہوتے ہیں، نے بھی لکھا ہے[1]۔ میں نے اپنی یہ تحریر اسی مضمون کی مدد سے لکھی ہے۔

قاضی حسین احمد کی پیدائش 1938ء میں ضلع نوشہرہ کے گاؤں زیارت کاکا صاحب میں ہوئی۔ میں نے یہ گاؤں بھی دیکھا ہے اور اس میں واقع ایک بزرگ کے مزار پر بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسی مزار کی وجہ سے اس گاؤں کا نام زیارت کاکا خیل ہے۔ آپ کے والد مولانا قاضی محمد عبدالرب اپنے زمانے کے ایک معروف ممتاز عالم دین تھے۔ وہ جمعیت علمائے ہند، صوبہ سرحد کے صدر بھی تھے۔ قاضی صاحب اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عتیق الرحمٰن اور قاضی عطاء الرحمٰن کی وجہ سے زمانہ طالبعلمی ہی ہیں اسلامی جمعیت طلبہ سے متعارف ہوئے۔ اس طرح ان کا تعلق جماعت اسلامی سے پیدا ہوا۔ وہ میاں طفیل محمد کے بعد جماعت اسلامی کی امیر بھی بنے۔

خاندانی روایت کے مطابق، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ اسکے بعد انھوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی سے جغرافیہ

---

[1] https://www.islamtimes.org/ur/article/972119/قاضی-حسین-احمد-کے-حالات-زندگی

میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز جہانزیب کالج سیدو شریف میں بحیثیت لیکچرار سے کیا۔ وہ وہاں تین برس تک پڑھاتے رہے۔ اپنے سیاسی نظریات اور فطری رحجان کے باعث انھوں نے ملازمت چھوڑ کر پشاور میں اپنا کاروبار شروع کرلیا (میں نے ان کا یہ دفتر بھی دیکھا ہے)۔ وہ ایک متحرک شخص تھے۔ ایک مرتبہ وہ سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے۔

وہ 1970ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ اس طرح وہ باقاعدہ طور پر سیاست کے میدان میں آگئے اور جماعت اسلامی پشاور شہر کے امیر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ ضلع پشاور کے علاوہ صوبہ سرحد کے امیر بھی بنائے گئے۔ آپ 1978ء میں لاہور منتقل ہوگئے اور جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بنے۔ آپ کوئی نو سال تک جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد 1987ء میں آپ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر منتخب ہوئے اور چار مرتبہ (1994، 1999، 1992، 2004ء) تک امیر رہے۔

قاضی حسین احمد دو مرتبہ سینیٹ آف پاکستان کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ اپنے دوسرے دور میں، انھوں نے نے حکومتی پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے سینیٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ نے 2002ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا اور دو حلقوں سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اپنی صحت کی وجہ سے انھوں نے جماعت اسلامی کی امارت سے معذرت کی۔ اسکے بعد بھی وہ متحرک رہے۔ انھوں نے ملی یکجہتی کونسل قائم کی اور ملک سے فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کیلئے ایک بے مثال جدوجہد کی۔

قاضی حسین احمد کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ مسلمان ایک متحد قوم کی طرح رہیں۔ اس کے لیے دینی پارٹیوں کا اتحاد، متحدہ مجلس عمل کو آپ کے خوابوں کی تعبیر سمجھا جاتا ہے، جس کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی تھے۔ نوارنی صاحب کی وفات کے بعد آپ کو اتفاق رائے سے اس کا صدر بنادیا گیا۔

سیاسی میدان اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام بھی آپ کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ 80 کے عشرے میں جب متحدہ شریعت محاذ وجود میں آیا، تو آپ کو اس کا سیکرٹری جنرل بنایا گیا۔ مجھے یاد ہے، کہ آپ نے کراچی میں لسانی تعصّبات کے شعلے بلند ہوتے دیکھے تو پشاور سے ''کاروانِ دعوت و محبت'' لے کر پورے ملک کا دورہ کیا۔ میں اس وقت فیصل آباد میں تھا۔ میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔

جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تو آپ نے بھرپور طریقے سے افغان مجاہدین کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں آپ نے کئی بار افغانستان کے دورے بھی کیے۔ اس کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو بھی آپ نے اس کی سخت مخالفت کی۔

قاضی حسین احمد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کا پورا گھرانہ جماعت اسلامی سے وابستہ ہے۔آپ کی بیٹی، محترمہ سمعیہ راحیل قاضی، قومی اسمبلی کی رکن بھی رہی ہیں۔آپ کے بڑے بیٹے، آصف لقمان قاضی، اس وقت جماعت اسلامی کے امورِ خارجہ کے سربراہ ہیں۔

قاضی حسین احمد نے ایک سادہ زندگی گزاری۔ آپ عمر بھر منصورہ میں دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے رہے۔ آپ اپنی مادری زبان پشتو کے علاوہ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔آپ کو شاعر اسلام علامہ محمد اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ زبانی یاد تھا اور وہ اپنی تقاریر و گفتگو میں اسے پڑھتے بھی تھے۔

قاضی حسین احمد پانچ اور چھ جنوری (2013ء) کی درمیانی رات، نصف شب کے قریب اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے۔ آمین، ثم آمین۔

اجمل خٹک : ایک عظیم سیاسی کارکن، ایک بے مثال شاعر، ایک باکمال شخص

جب میں 1980ء میں اکوڑہ خٹک سے گزر رہا تھا، اس وقت ابھی اجمل خان خٹک حیات تھے، لیکن جلاوطن تھے۔ ان کے متعلق پڑھتے ہوئے پتہ چلا کہ ان کا تعلق بھی اکوڑہ خٹک سے ہے۔وہ دورِ حاضر کی ایک اہم شخصیت ہیں ۔ مجھے ان کی سادگی، جدوجہد، شاعری اور مقصدیت نے بے حد متاثر کیا۔ جو میں نے ان کے متعلق جانا وہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اپنے نظریات کی وجہ سے کئی لوگ ان کے متعلق ایک اچھی رائے نہیں رکھتے۔ نظریاتی طور پر اختلاف ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس شخص کا کردار کیسا تھا؟

اجمل خان خٹک صاحب کے متعلق ایک طویل مضمون[1] اختر حسین ابدالی نے لکھا ہے۔اس کے علاوہ، ان کے متعلق پاک پیڈیا پر بھی ایک مضمون پڑھنے کو ملا[2]۔ ان کے متعلق پڑھتے ہوئے یہ بھی جاننے کا ملا کہ ان کے مزار پر بم بلاسٹ بھی کیا گیا تھا۔ یہ بات جان کے بے حد افسوس ہوا۔انھیں مرنے کے بعد بھی بخشا نہ گیا۔اختلاف کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟

کسی نے کہا ہے، شاعر کا نام معلوم نہیں؛

جانے والوں سے گلہ کون کرے

یہ تو ویسے بھی برا لگتا ہے

اجمل خان خٹک، جنھیں اجمل خٹک بابا بھی کہا جاتا ہے، 15 ستمبر 1925ء کو حکمت خان کے گھر اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ان سے پہلے ان کی سات بہنیں تھیں۔ اتنی بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا، سب نے بے حد خوشی منائی۔آپ کا نام قبیلے کے سردار محمد زمان خان نے رکھا۔رائج طریقے کے مطابق ابتدائی دینی تعلیم، آبائی گاؤں کی مسجد میں ہی حاصل کی۔آپ کا گھرانہ ایک پڑھا لکھا گھرانہ تھا، اسلیے گھر میں کئی لوگوں نے آپ کی تعلیم میں مدد بھی کی۔ بعد میں ایک اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ بچپن ہی سے موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس لیے حجروں میں جو روایتی موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں، ان میں دلچسپی لینا شروع کردی۔اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک عرصے تک ستار اور رباب سیکھنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ لیکن اس میدان میں آگے نہ جاسکے، البتہ شاعری کا شوق برقرار رہا۔

دورِ طالبعلمی میں ہی ڈرامے لکھنے لگے، کئی نظمیں بھی لکھیں۔ غرض لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آپ کے گاؤں میں کئی خدائی خدمت گار بھی رہتے تھے۔ایک طرح سے آپ کا گاؤں خدائی خدمت گاروں کا مرکز تھا۔ اس دوران، باچا خان بھی ان کے ہاں آئے اور آپ کو ان سے ملنے کا موقع ملا۔ تعلیم

---

[1] اختر حسین ابدالی
کچھ انقلابی شاعر اجمل خٹک کے متعلق
/https://lafzuna.com/history/s-25216

[2] Ajmal Khattak
/https://www.pakpedia.pk/ajmal-khattak

سے فارغ ہو کر 1943ء میں بطورِ معلم زیارت کاکا صاحب میں واقع ایک اسکول سے عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن اس دوران سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انگریزوں کا دور تھا، اس لیے آپ سدا ہی زیرِ عتاب رہے۔

آپ نے قیامِ پاکستان کے بعد، 1948ء میں ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں پر آپ کو احمد ندیم قاسمی، ن م راشدؔ، ناصر انصاری، احمد فرازؔ اور خاطرؔ غزنوی جیسے شعراء و ادباء سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ آپ کی انقلابی شاعری کی وجہ سے، آپ کا سارا گھر ہی زیرِ عتاب رہتا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ کی والدہ نے آپ کی کئی تحریریں تندور میں پھینک کر جلا ڈالیں۔ تقسیم ہند سے قبل ہی، آپ نے آزادی کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں صوبے بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے ساتھ فٹ بال کے مایہ ناز کھلاڑی بھی رہے۔

راج کپور سے آپ کی دوستی اسکول کے زمانے سے ہی ہو گئی تھی۔ یہ وہی دور تھا، جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک چل رہی تھی۔ اسی دور میں آپ نے ''خدائی خدمت گار تحریک'' میں شمولیت اختیار کر لی۔ آپ باچاخان سے بے حد متاثر تھے۔ تحریک میں شریک ہونے سے تعلیم کا حرج بھی ہوا۔ قیامِ پاکستان کے ، آپ نے دورانِ ملازمت پنجاب یونیورسٹی سے پشتو آنرز، منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے اور ساتھ ہی ایف اے، بی اے اور فارسی زبان میں ایم اے بھی کیا۔ یہی وہ دور ہے جب آپ کی ملاقات ترقی پسند نظریات کے حامل لوگوں سے ہوئی اور آپ ان سے بے حد متاثر ہوئے اور پھر انھی کے رنگ میں رنگے گئے۔
اپنے ترقی پسندانہ نظریات کی وجہ سے آپ ایک طویل عرصے تک جیل میں رہے۔ آپ کو حد سے زیادہ ذہنی اور جسمانی تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ دورانِ قید آپ کو ''دازہ پاگل ووم'' جیسی کتاب لکھنے کا موقع بھی ملا۔
اجمل خٹک نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں شامل ہو گئے۔ ایک وقت وہ بھی آیا، جب آپ اس کے مرکزی سیکرٹری جنرل بھی بنے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان، ہری پور اور مچھ جیل میں کئی سالوں تک قید رہے، لیکن ایک دن کے لئے بھی اپنے سیاسی نظریات کو نہیں چھوڑا اور ہمیشہ باچاخان، ولی خان اور اے این پی کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔

ان کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بھی ہے جو مجھے بھی رُلا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن پولیس والے مجھے ہتھکڑیوں میں باندھ کر مارتے پیٹتے زخمی حالت میں جب میرے گھر کی تلاشی لینے کے لیے لائے، تو سامنے چارپائی پر بیٹھی میری والدہ کی نظریں مجھ (لاڈلے بیٹے) پر پڑیں۔ وہ یہ سب دیکھتے ہی پولیس والوں کو بددعائیں دینے لگیں، جس پر پولیس والوں نے میری آنکھوں کی سامنے، میری بوڑھی والدہ کو بالوں سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے گرایا اور اسے زمین پر گھسیٹتے بھی رہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ان پر بے حد مشکل وقت آیا۔ جس پر سب نے مشورہ دیا کہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر چلے جانا چاہیے۔ دوستوں کے مشورے پر آپ نے جلاوطنی کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک دن آپ بڑی مشکل سے افغانستان پہنچ گئے۔ آپ نے پندرہ سال افغانستان میں گزارے اور افغانستان میں ظاہر شاہ کی بادشاہت کے خاتمے، داؤد خان کی حکومت، ثور انقلاب، سوویت یونین کی فوج کی افغانستان آمد اور اس کی پھر شکست و ریخت، پاکستان میں 70ء کی دہائی میں پشتون نوجوانوں کی گوریلا جنگ سمیت جیسے واقعات کو قریب سے دیکھا بھی اور ان کا ایک اہم حصہ بھی رہے۔ اس بات پر کئی لوگ ان پر سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔ میں نے جمعہ خان صوفی کی کتاب میں اس دور کے واقعات کو تفصیل سے پڑھا ہے۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا، جب آپ 1988ء میں پندرہ سال کی جَلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد واپس پاکستان آ گئے اور عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ عوامی نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑا اور اپنے حلقے سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ بعد میں سینیٹ کے ممبر بھی رہے۔

اسی دوران آپ کے اے این پی قیادت سے اختلاف پیدا ہو گئے اور اس کے نتیجے میں پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے نیشنل عوامی پارٹی پاکستان کے نام سے الگ جماعت بنالی۔ ایک دفعہ پھر آپ اے این پی میں شامل ہو گئے۔ آپ سات فروری 2010ء کو 85 سال کی عمر میں وفات پا گئے اور آپ کو اکوڑہ خٹک میں ہی دفن کیا گیا۔

چند اسلام شر پسند عناصر نے 9 مئی، 2012ء کو آپ کے مزار کو مسمار کر دیا۔ یہ واقعہ ہر لحاظ سے قابلِ مذمت ہے۔ اس واقعہ پر کئی لوگوں نے اظہارِ خیال کیا۔

ریاض طوری صاحب نے کہا؛ معاف کیجئے گا اجمل خٹک۔ آپ نے ایک پرامن اور عدم تشدد پر مبنی پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور جدوجہد کی تھی، لیکن یہاں قبروں میں لاشوں پر حملہ کیا جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا ہوا اور اس کے بعد بھی کئی جگہوں پر ایسا ہی ہوا۔۔۔

کاش ایسا ہو نا، رک جائے!

نوشہرہ: جہاں سکھوں اور پختونوں کی فیصلہ کن جنگ ہوئی

جب 1980ء میں پہلی مرتبہ پشاور جا رہا تھا، تو مجھے اس علاقے کے رہن سہن کو قریب سے دیکھنے کا پہلا موقع ملا۔ یاد رہے کہ یہ سفر میں نے کوئی 42 سال پہلے کیا تھا۔ اس وقت بہت ساری چیزیں اپنی علاقائی اور اصلی حالت میں تھیں۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ کے علاوہ بھی کئی شہروں میں بہت سی چیزیں مشترک نظر آتی ہیں۔ جن میں لباس خاص طور پر نوجوانوں کا لباس، کھانے پینے کے بڑے بڑے ریستوران، اشتہارات، یونیورسٹیز، شاپنگ مالز جیسی چیزیں شامل ہیں۔ لیکن آج سے چالیس سال قبل ہر علاقہ دوسرے علاقے سے بالکل مختلف تھا۔ پچھلے چالیس سال میں لوگوں کا آپس میں بے حد ملنا جلنا ہوا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں نے بہت ساری چیزیں ایک دوسرے سے سیکھیں بھی اور انھیں اپنایا بھی۔ اس سفر کی ایک بات مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب بھی کوئی نیا مسافر بس میں بیٹھتا، تو بس کنڈیکٹر اسے پشتو میں پوچھتا

چرتہ زے، یعنی کہاں جانا ہے؟ مجھے یہ لفظ اب تک اچھی طرح سے یاد ہے۔

جب میں نوشہرہ کے قریب آ رہا تھا، تو مجھے نوشہرہ کے متعلق کچھ اور باتیں بھی یاد آ رہی تھی۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ نوشہرہ میں ایک بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی رسالپور میں پاکستان فضائیہ کا ایک ٹریننگ سینٹر بھی ہے، جہاں پر پائلٹس کی ٹریننگ کی جاتی ہے۔ میرے خاندان کے کچھ لوگ فوج میں رہے ہیں۔ یہ لوگ سپاہی اور حوالدار رینک کے لوگ تھے۔ ان سے نوشہرہ کے متعلق پتہ چلتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے میرے نزدیک نوشہرہ کا تصور یہی تھا، کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں بہت بڑی تعداد میں فوجی رہتے ہیں۔ اس سے میرا دوسرا تعارف میرے ایک عزیز دوست منصور جاوید کی وجہ سے تھا، جو ٹیکسٹائل کالج میں میرے کلاس فیلو تھے۔ ان کا تعلق بھی نوشہرہ سے تھا۔

نوشہرہ کا تیسرا تعارف بھی دلچسپ ہے۔ اُس وقت ہی نہیں بلکہ اب بھی یہاں پر ایک بہت بڑی کپڑے کی مارکیٹ ہے، جہاں غیر ملکی کپڑا فروخت کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہمیں کچھ کپڑے چاہیے تھے، تو ہم یہ پلان کر رہے تھے کہ نوشہرہ سے خریدیں، بعد میں پتہ چلا کہ

نوشہرہ کے لوگوں نے لاہور کے لوگوں کی سہولت کے لیے، لاہور ہی میں دکانیں بنالیں ہیں۔ لیکن ابھی بھی نوشہر ہمیں غیر ملکی کپڑے کی ایک بہت بڑی مارکیٹ موجود ہے۔

جب میں پہلی مرتبہ نوشہرہ میں داخل ہوا تو شہر کے دائیں بائیں موجود عمارتوں کو دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر کئی قدیم عمارتیں بھی موجود تھی۔ جن سے لگتا تھا کہ یہ کسی وقت میں بہت بڑی سرائے تھی۔

میں نے یہ بات اکثر نوٹ کی ہے، کہ صرف جی ٹی روڈ ہی نہیں بلکہ ہر بڑی سڑک پر بھی کم و بیش تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر آپ کو کوئی چھوٹا سا قصبہ ملے گا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھی کہ پرانے وقتوں میں قافلے، جو اکثر پیدل چلتے تھے ایک دن میں تیس چالیس کلومیٹر فاصلہ ہی طے کرپاتے تھے۔ اس کے بعد انھیں ٹھہرنے کی جگہ چاہئے ہوتی تھی۔ قافلے کے ٹھہرنے کے لیے ایک سرائے کی ضرورت ہوتی تھی، بعد میں یہ سرائے ایک شہر یا قصبے کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔

پشاور سے نوشہرہ چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نوشہرہ سے ہی ایک سڑک مالاکنڈ (اسے ملاکنڈ بھی لکھا جاتا ہے) کی طرف جاتی ہے، دوسری چارسدہ کی جانب کی۔ اب موٹروے بن جانے کی وجہ سے لوگ نوشہرہ نہیں آتے، بلکہ موٹروے سے گزر کر چلے جاتے ہیں۔

نوشہرہ دریائے کابل کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ آپ کو یہ بات بھی یاد ہوگی، کہ جب جناب ولی خان اور ان کے دوست کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرتے تھے، تو ان کا یہ کہنا تھا، کہ اگر آپ نے کالا باغ ڈیم بنایا تو دریائے کابل کا پانی رک جائے گا اور دریا کی سطح بلند ہو جائے گی، جس سے نوشہرہ ڈوب جائے گا۔ اس وجہ سے بھی نوشہرہ کی اہمیت کا بھی لوگوں کو پتہ چلا۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کالا باغ ڈیم کے حامی تھے، کا کہنا تھا کہ ایسا کچھ نہیں۔ کون سی بات درست ہے، معلوم نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کی تاریخ (2023) تک کالا باغ ڈیم نہ بن سکا۔ آج بھی پاکستان کے بیشتر علاقوں میں بجلی کی سپلائی میں تعطل آتا ہے، جسے عرف عام میں ہم لوڈ شیڈنگ کہتے ہیں۔

نوشہرہ میں موجود مختلف فوجی تنصیبات کا تعارف میں آئندہ صفحات میں پیش کروں گا۔

لیکن ایک بات بہت اہم ہے کہ نوشہرہ کی چھاؤنی، جسے انگریزوں نے بنایا تھا، ایک ایسی جگہ پر واقع ہے، جہاں سے انگریز پنجاب سے رابطے میں بھی تھے اور اسی جگہ سے پشاور، مالاکنڈ، صوابی، چارسدہ جیسے علاقوں کے ساتھ ساتھ موجودہ خیبر پختونخوا کے شمال مغربی علاقہ جات کو بھی کنٹرول کر سکتے تھے۔ایک دفعہ جب میں اپنے بچوں کے ساتھ سوات گیا تھا، واپسی پر ہمیں دیر ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے ہم نوشہرہ میں واقع ایک قدیم ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ یہ ایک بہت ہی قدیم ہوٹل تھا، جس میں پختون بود و باش کے رنگ نمایاں تھے، جو اب تک یاد ہیں۔

نوشہرہ، راولپنڈی سے بذریعہ موٹروے 145 کلومیٹر اور براستہ جی ٹی روڈ 130 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں اکوڑہ خٹک، مغرب میں پبی اور پشاور، شمال میں رسالپور اور مردان، جبکہ جنوب میں مانکی شریف اور زیارت کاکاخیل واقع ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ نوشہرہ کا نام ”نوکھار“ تھا۔اب اسے عام طور پر نوشہرہ ہی کہا جاتا ہے[1]۔ ضلع بننے سے پہلے یہ علاقہ پشاور کی ایک تحصیل تھی۔نوشہرہ میں تین فوجی چھاؤنیاں واقع ہیں ۔ جن کے نام کچھ یوں ہیں؛ چراٹ چھاؤنی، نوشہرہ چھاؤنی اور رسالپور چھاؤنی۔نوشہرہ میں ریلوے لوکو موٹو بنانے والی فیکٹری بھی موجود ہے۔ یہ وہی شہر ہے، جہاں ایک بڑی تعداد میں افغان مہاجرین نے سیاسی پناہ بھی حاصل کی تھی۔

نوشہرہ کے ارد گرد نظام پور سیمنٹ کمپنی (اے ڈبلیو ٹی)، فوجی کارن کمپلیکس، نوشہرہ شیٹ گلاس انڈسٹریز، پاکستان ٹوبیکو کمپنی، ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ، فیروزسنز فارماسیوٹیکل، ریلوے ورکشاپ ،کالونی سرحد ٹیکسٹائل ملز کے علاوہ بھی کئی اہم صنعتیں موجود ہیں۔ مجھے یہاں پر موجود کالونی سرحد ٹیکسٹائل ملز جانے کا بھی موقع ملا۔ یہ مل ساٹھ کی دہائی میں بنائی گئی تھی۔ اس کے مالکان کا تعلق ملتان میں واقع کالونی ٹیکسٹائل ملز سے ہی ہے۔ جس میں ایک بڑی تعداد میں لوگ کام کرتے تھے۔

[1] Britannica, The Editors of Encyclopaedia. "Nowshera". Encyclopedia Britannica, 20 Apr. 2015, https://www.britannica.com/place/Nowshera. Accessed 19 June 2023.

دریائے کابل نوشہرہ کے شمال مشرق میں بہتا ہے۔ دریا کے کنارے بہت سے سرسبز و شاداب پارکس بنائے گئے ہیں۔ دریا کی وجہ سے نوشہرہ کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں دریائے کابل بارے کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

دریائے کابل: افغانستان سے پاکستان میں داخل ہونے والا دریا

دریائے کابل، جس کا آغاز مشرقی افغانستان اور شمال مغربی پاکستان سے ہوتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یہ دریا کابل شہر کے مغرب میں واقع پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے۔ بعد میں کابل اور جلال آباد سے گزرتا ہوا، درہ خیبر کے شمال سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ آگے جا کر یہ دریا، اٹک کے مقام پر دریائے سندھ سے جاملتا ہے[1]۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت اور آوستان میں اس دریا کا نام ''کبھا'' تھا جو بعد میں کابل میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دریائے کابل کی وجہ سے ہی اس کے کنارے آباد شہر کا نام کابل ہو گیا ہوگا۔ یہ میرا خیال ہے، شاید درست نہ ہو۔ قدیم زمانے سے ہی دریائے کابل کے ساتھ ساتھ واقع راستہ ہی افغانستان سے آنے والے لوگ استعمال کرتے تھے۔ میں نے بھی طورخم سے کابل جاتے ہوئے دریائے کابل کو ساتھ ساتھ بہتے دیکھا ہے۔

پاکستان میں داخل ہونے کے بعد یہ دریا پشاور، چارسدہ اور نوشہرہ کے قریب سے گزرتا ہے۔ نقشے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دریائے کابل میں زیادہ تر پانی ضلع چترال میں واقع پہاڑوں سے آتا تھا۔ کبھی کبھار اس میں پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے سیلابی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے علاقے میں واقع آبادیوں کا بے حد نقصان بھی ہوتا ہے۔

اس علاقے میں واقع چند اہم اداروں کا تعارف آپ کی دلچسپی کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

[1]Britannica, The Editors of Encyclopaedia. "Kābul River". Encyclopedia Britannica, 26 Jan. 2015, https://www.britannica.com/place/Kabul-River. Accessed 19 June 2023.

پی اے ایف اکیڈمی اصغر خان

پی اے ایف اکیڈمی اصغر خان (جو کبھی پی اے ایف اکیڈمی رسالپور ہوتی تھی) فائٹر پائلٹس، ایرو ناٹیکل انجینئرز کے ساتھ ساتھ کئی اور طرح کے ماہرین تیار کرنے کا پاکستان بھر میں ایک بہترین ادارہ ہے۔ پی اے ایف اکیڈمی اصغر خان، نوشہرہ سے کوئی آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے کابل کے کنارے واقع ہے۔اس کا محلِ وقوع بھی شاندار ہے۔ دریا کا سرسبز کنارہ اس کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کرتا ہے۔ یہاں پر دو کالجز بھی موجود ہیں؛ ایک کالج آف فلائنگ ٹریننگ (سی ایف ٹی) اور دوسرا کالج آف ایرو ناٹیکل انجینئرنگ (سی اے ای) پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں ادارے جدید ترین آلات کی مدد سے اعلیٰ پائے کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

انگریزوں نے یہ اکیڈمی 1910ء میں بنائی تھی۔ اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ یہاں ایک فوجی اڈہ بنانا چاہتے تھے، تاکہ روس کی طرف سے ہونے والے حملے کو روکنے میں مدد مل سکے۔

قیامِ پاکستان کے بعد 15 اگست 1947ء کو یہ اکیڈمی پر پی اے ایف کا ایئر فیلڈ بن گئی۔ ایوب خان کے دور میں 21 جنوری 1967ء کو اسے اکیڈمی کا درجہ دے دیا گیا۔اس اکیڈمی کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔ اس متعلق کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ جو میں نے جانا، اس کا مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

رسالپور ایئر بیس میں 1910ء میں ایک چھوٹا رن وے تیار کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران رائل فلائنگ کور نے رسالپور میں قیام بھی کیا۔ بعد میں اسے توسیع بھی دی گئی۔ ایک وقت میں، اس جگہ سے افغان سرحد کے ساتھ ساتھ موجود قبائلی حملہ آوروں کے خلاف بھی حملے بھی کیے گئے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ 24 مئی 1919ء کو اسی جگہ سے کابل پر حملہ کرنے کے لیے پہلا جہاز ہوا میں بلند ہوا تھا۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ یہاں صرف ایک کالج ہی نہیں تھا، بلکہ یہ ایک جنگی ہوائی اڈہ بھی تھا جہاں سے حملے کے لیے جہاز جاتے تھے۔

انگریزوں کے جانے کے بعد رسالپور میں کوئی خاص کام نہیں ہو رہا تھا۔ زیادہ تر آفیسر انگریز تھے، جو یہاں سے چلے گئے اور کئی جہاز بھی ساتھ ہی لے گئے۔ پھر پاک فوج نے یہاں پر نئے سرے سے کام شروع کیا اور ایک قلیل مدت میں رسالپور میں فلائنگ ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی، کہ تقسیم ہند کے بعد کوئی ہوائی جہاز،

بھارت نے پاکستان کے حوالے کیا ہو؟ لیکن ایسا ہی ہوا[1]۔ ستمبر 1947ء میں، امبالہ کے فلائنگ ٹریننگ اسکول سے ہارورڈ کے چھ طیارے رسالپور پہنچے۔ جناب اصغر خان اس اکیڈمی کے پہلے کمانڈنگ آفیسر تعینات ہوئے جو بعد میں پی اے ایف کے ائیر چیف بھی بنے۔

پاک بھارت جنگوں کے دوران بھی، اس ہوائی اڈے نے اہم کردار ادا کیا۔ ایران کے بادشاہ محمد رضا پہلوی نے مارچ 1950ء میں اس اکیڈمی کا دورہ کیا تھا۔ یاد رہے کہ وہ خود بھی پائلٹ تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بھی اس اکیڈمی کا دورہ کیا تھا۔ اس طرح سے رسالپور اکیڈمی پاکستان کی واحد ملٹری اکیڈمی بن گئی جس کا دورہ جناح صاحب نے کیا۔

کالج آف فلائنگ ٹریننگ فلائنگ میں طالبعلموں کو چار سالہ انڈر گریجویٹ کورس کروایا جاتا ہے۔ بعد میں منتخب ہو جانے والے کیڈٹس کو فلائنگ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ کالج آف ایرو ناٹیکل انجینئرنگ (CAE) کیڈٹس کو انجینئرنگ کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ایرو ناٹیکل انجینئرنگ کالج جولائی 1965ء میں کورنگی ایئر فیلڈ، کراچی میں امریکی فضائیہ (USAF) کی مدد سے قائم کیا گیا تھا اور یو ایس اے ایف کے رکن کرنل جان ایچ بلیک لاک اس کے پہلے پرنسپل بنے۔ بعد میں اسے کراچی سے رسالپور منتقل کر دیا گیا۔

امریکہ کی اس حد تک مدد یقیناً کسی خاص مقصد کے لیے تھی، جو اب تک ہم پوری کر رہے ہیں۔

اس اکیڈمی کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میں اس کا دورہ نہیں کر سکا ا س لیے کوئی ذاتی تاثر لکھنا مشکل ہے، البتہ رسالپور سے گزرتے ہوئے اس کے بورڈ دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا۔

نوشہرہ چھاؤنی: جہاں کبھی انگریز فوجی رہتے تھے

نوشہرہ میں پاکستان آرمی اسکول آف آرٹلری، اسکول آف ASC، ASC سینٹر، آرمر سینٹر، کے علاوہ بھی کئی اہم فوجی تنصیبات ہیں۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ نوشہرہ پاکستان کا واحد ضلع ہے جس میں تین چھاؤنیاں ہیں، یعنی نوشہرہ چھاؤنی، رسالپور چھاؤنی اور چراٹ چھاؤنی[2]۔

---

[1] Syed Shabbir Hussain, "History of Pakistan Air Force (1947–1984)

[2] Nowshera, Khyber Pakhtunkhwa

برطانوی دور حکومت میں، نوشہرہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جس کے قریب انیسویں صدی کے نصف میں دریا کی جانب چھاؤنی کی بنیاد رکھی گئی۔ چھاؤنی دریائے کابل کے دائیں کنارے واقع ہے۔ دریا کنارے ہونے کی وجہ سے اس کا ماحول بے حد خوبصورت ہے۔ اس کی ضرورت اُس وقت شدت سے محسوس کی گئی، جب انگریزوں کی مالاکنڈ کے پختون قبائل سے جنگ جاری تھی۔ اسی دور میں دریائے کابل پر کشتیوں کا ایک پل بنایا گیا، تاکہ مردان اور چارسدہ کی طرف آسانی سے جایا جاسکے۔ یہ پل یکم دسمبر 1903ء کو کھولا گیا تھا۔

یہ بھی ایک تاریخی بات ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر یہاں پر موجود ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کرنے کی کوشش کی تھی، جسے انگریزوں نے دبا لیا۔ آزادی کی خاطر بغاوت کرنے والے فوجیوں کو نوشہرہ چھاؤنی میں ہی قید کیا گیا تھا اور ایک بڑی تعداد میں ہندوستانی فوجیوں سے ہتھیار بھی واپس لے لیے گئے تھے۔

چیراٹ چھاؤنی: ایک صحت افزاء مقام

میں نے ہندوستان بھر میں کئی مقامات پر یہ دیکھا ہے کہ انگریز اپنے دور حکومت میں جہاں بھی کوئی چھاؤنی بناتے یا کوئی شہر بساتے، تو اس کے قریب کوئی نہ کوئی صحت افزاء مقام کا بھی بندوبست کرتے تھے۔ یہ اس لیے بھی تھا، کہ وہ ایک سرد ملک سے آئے ہوئے تھے اور ہندوستان کی گرمی ان کی برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال شملہ ہے، جہاں پر دہلی سے لوگ جا کر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مری ہے جو راولپنڈی کے قریب واقع ہے، سکیسر کی پہاڑی ہے جہاں پر گرمیوں میں تین اضلاع کے دفاتر چلے جاتے تھے۔ فورٹ منرو بھی ایسی ہی ایک مثال ہے۔ اسی طرح مری کے علاوہ بھی اور کئی مقامات اسی مقصد کے لئے بنائے گئے اور انھیں ترقی بھی دی گئی۔

اسی طرح کا ایک مقام چیراٹ بھی ہے، جو نوشہرہ سے کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑی مقام ہے، جو سطح سمندر سے چار ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ ان پہاڑی مقامات پر چرچ اور اسپتال لازم ہوتے تھے۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقامات بنیادی

https://militaryhistory.fandom.com/wiki/Nowshera,_Khyber_Pakhtunkhwa

طور پر مریضوں کے رہنے کی جگہ ہوتی تھی۔ انگریز جہاں بھی گئے وہاں انھوں نے چرچ ضرور بنائے، جو ان کی اپنے مذہب سے محبت کی ایک نشانی بھی ہے۔

اسی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں چار مذاہب کے لوگوں نے حکومت کی ہے؛ بدھ مت، ہندو مت، اسلام اور عیسائیت۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے کبھی بھی اپنی حکومت کو ایک مذہبی حکومت قرار نہیں دیا، لیکن ان کے آنے سے پہلے شاید ہی چند لوگ عیسائی ہوں۔ ہمیں ہندوستان بھر میں یہاں پر عیسائیوں کی نہ ہی کوئی ریاست ملتی ہے اور نہ کوئی ایسا علاقہ جہاں پر وہ ایک بڑی تعداد میں رہتے ہوں۔ میں کسی بھی ایسے چرچ کو نہیں ڈھونڈ پایا جو انگریزوں یا یورپ کی دیگر اقوام کے آنے سے پہلے کا بنا ہوا ہو۔ جتنے بھی چرچ ہیں وہ یورپین اور برطانوی دور میں ہی بنائے گئے ہیں۔

انگریز اپنے لوگوں کو بیماری کی حالت میں ایک صحت افزا مقام پر لے جاتے تھے۔ گرمیوں میں خاندان سمیت کسی پہاڑی مقام پر رہنے جاتے تھے۔ کم و بیش ہر چھاؤنی کے پاس ایسا کوئی نہ کوئی مقام ضرور ہوتا تھا جہاں انگریز گرمیاں گزارنے جاتے تھے۔ چیراٹ (اسے چراٹ اور چرات بھی لکھا جاتا ہے) بھی ایک ایسا ہی مقام ہے جسے انگریزوں نے آباد کیا۔ اب یہاں پر فوج رہتی ہے۔

میں نے چیراٹ کی بہت سی ویڈیوز دیکھی ہیں، جس سے یہ لگتا ہے کہ یہ بہت ہی صاف ستھرا اور تفریحی مقام ہے۔ میں خود تو یہاں کبھی جا سکا اور نہ ہی کبھی کسی نے اس کا ذکر کیا۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں، کہ یہ ایک فوجی چھاؤنی ہے یا کوئی فوجی کالج ہے اس لئے عام لوگ وہاں پر کم جاتے ہیں۔ شاید جانے کے لیے انھیں اجازت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر ایشیاء کی سب سے طویل زپ لائن بھی موجود ہے۔ اس جگہ کی ویڈیو دیکھ کر یہاں جانے کا ارادہ تو موجود ہے، زندگی رہی تو ضرور جانے کی کوشش کروں گا۔

ایک اور اہم بات جس کا تذکرہ میں یہاں ضرور کرنا چاہتا ہوں۔

اس وقت کامن ویلتھ میں شامل ممالک کی تعداد 54 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت میں برطانیہ کا ان ممالک پر قبضہ تھا اور یہ سلطنتِ برطانیہ کا حصہ تھے۔ انگریز جہاں بھی گئے انھوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں کو کبھی نہ کبھی آزادی دے دی پھر یا تو خود بھی وہاں پر رہے، یا واپس اپنے ملک آ گئے۔ کچھ جگہوں پر وہ وہ رہے، مثال کے طور پر آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ

۔ لیکن کچھ ممالک ایسے بھی ہیں بلکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، جہاں وہ نہیں رہے، بلکہ مکمل طور پر واپس اپنے ملک میں آ گئے، ان میں ہندوستان بھی شامل ہے۔

پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما اور سری لنکا، یہ وہ ممالک ہیں جہاں کبھی انگریزوں کا قبضہ تھا، لیکن وہ انھیں آزادی دینے کے بعد یہاں سے مکمل طور پر واپس چلے گئے۔ آج ہمیں ان ممالک میں ایک بھی انگریز نہیں ملتا جو یہاں رہ گیا ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جہاں پر کئی صدی تک رہے انھیں آزادی دینے کے بعد انھوں نے یہاں رہنا پسند نہیں کیا؟ ایسا ہی اکثر افریقی ممالک میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

میرے نزدیک اس کی تین بڑی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ تو موسم ہے۔ ان ممالک کا بیشتر حصہ شدید گرم ہوتا ہے اور یہ موسم ان کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے، کہ باوجود پوری کوشش کے وہ ان ممالک میں اپنے ہم مذہب لوگوں کی تعداد میں اضافہ نہ کر سکے، جو آج بھی بہت کم تعداد میں ان ممالک میں رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انھوں نے یہاں رہنا پسند نہیں کیا۔ جب کہ جن ممالک میں وہ رہے، جیسے کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ، وہاں پر عیسائی اکثریت میں ہیں۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے ہو سکتی ہے کہ ان ممالک ہیں انھوں نے عام لوگوں پر بے حد ظلم و ستم ڈھایا تھا۔ بے حد زیادتی بھی کی تھی۔ ہندوستان بھر میں ہزاروں لوگوں کا قتلِ عام بھی کیا، پھانسیاں بھی دیں جس کی وجہ سے ان کے خلاف عوام الناس میں ایک شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایک اہم وجہ تھی کہ انگریزوں نے یہاں رہنا پسند نہیں کیا، یا ان ممالک میں رہنے کے لیے ماحول ان کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہی تین وجوہات تھیں جس کی بنا پر انھوں نے ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کیا۔

اب پھر چیراٹ کی طرف آتے ہیں۔ چیراٹ کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

اگر آپ ضلع نوشہرہ کے نقشہ کو دیکھیں، تو آپ جان پائیں گے کہ نوشہرہ کے جنوب میں ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ ہے اور اسی پہاڑی سلسلے کے ایک بلند مقام پر چیراٹ نام کا ایک قصبہ یا آبادی موجود ہے۔ یہ قصبہ کوئی قدیم قصبہ نہیں ہے بلکہ یہ انگریزوں کے دور میں، بیمار لوگوں کو ایک صحت افزاء مقام پر ٹھہرانے کی جگہ تھی۔

یہاں جانے کے لیے بھی سے ایک سڑک جاتی ہے۔ میں نے ایک ویڈیو میں دیکھا ہے کہ ایک بہت ہی خوبصورت سڑک ہے اور اس کا محلِ وقوع بھی بہت اچھا ہے۔ مجھے یہ لگ رہا تھا کہ جیسے میں مری کی پہاڑیوں کی طرف جار رہا ہوں۔

آپ اگر موٹر وے سے آئیں، تو نوشہرہ سے پشاور کی طرف بھی پہنچتے ہیں اور وہاں سے چیراٹ۔ اگر جی ٹی روڈ سے آئیں، تو نوشہرہ کے بعد بھی پھر چیراٹ۔ چیراٹ کے مشرق میں اٹک واقع ہے، جبکہ مغرب میں کئی چھوٹے چھوٹے قصبات پائے جاتے ہیں۔ اس کے جنوب میں تو بہت زیادہ آبادی نہیں ہے۔ بہت دور جا کر آپ کو جنڈ نام کا ایک قصبہ نظر آتا ہے، جو کوہاٹ سے اسلام آباد والی سڑک پر واقع ہے۔

چیراٹ (چیراٹ سیمنٹ بھی اسی نام سے مشہور ہے) کو پہلی مرتبہ 1860ء میں آباد کیا گیا تھا، یعنی اس علاقے پر قبضے کے فوری بعد۔ یہ پشاور کے جنوب مشرق میں خٹک رینج کے پاس واقع ہے۔ یہ ایک طرح سے نوشہرہ اور کوہاٹ کے درمیان ایک سرحد بھی ہے۔

برطانوی دور میں چیراٹ ایک پہاڑی چھاؤنی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا[1]۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی تھا کہ پشاور کے گرم موسم سے بچنے کے لیے اسے برطانوی فوجیوں کے لیے ایک ہیلتھ اسٹیشن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب 1886ء میں اسے باقاعدہ ایک چھاؤنی کی شکل دے دی گئی۔ اس چھاؤنی کے ایک جانب پشاور وادی ہے جبکہ دوسری جانب کوہاٹ کا علاقہ ہے[2]۔ میرے خیال میں دفاعی نُقطۂ نَظَر سے بھی یہ ایک اہم مقام تھا۔ ہندوستان بھر کے پہاڑی مقامات کے متعلق ایک کتاب دیکھنے کو ملی جس کا نام

Highlands of India, جسے D. F. J. Newa نے 1882ء میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں بھی چیراٹ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں چیراٹ کے علاوہ بھی کئی تفریحی مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان متعلق جاننے کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

چیراٹ میں اب بھی انگریزوں کی بنائی ہوئی کئی عمارتیں جن میں اسپتال، ایک چرچ اور چند بنگلے موجود ہیں۔ برطانوی دور میں موسم گرما کے دوران پشاور ڈویژن کمانڈ کا

---

[1] https://dsal.uchicago.edu/reference/gazetteer/pager.html?objectid=DS405.1.I34_V10_199.gif

[2] https://archive.org/details/highlandsindia01newagoog/page/n88/mode/2up?view=theater

ہیڈ کوارٹر بھی یہاں منتقل ہو جاتا تھا۔ بعد میں اسے مزید ترقی بھی دی گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ جگہ پاک فوج کے زیرِ استعمال ہے۔ میرے خیال میں پشاور اوراس کے گردونواح میں رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک اچھا تفریحی مقام ہے۔

یہ تھا نوشہرہ اوراس میں موجود تین بڑے مقامات کا ایک مختصر تذکرہ۔اس سے زیادہ جاننے کے لیے آپ کو سفر کرنا پڑے گا۔

نوشہرہ سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر پبی نام کا ایک قصبہ آتا ہے۔ پبی پشاور سے کوئی بیس کلومیٹر پہلے واقع ہے۔ یہاں پری کاسٹ کنکریٹ کی صنعتیں کام کر رہی ہیں۔اس حوالے سے پبی خیبر پختونخوا میں بے حد جانا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ پبی ہندوکش کے پہاڑی سلسلے اور دریائے کابل کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے ایک خوبصورت علاقے کے طور پر اپنی ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔اس شہر کی ایک خاص بات یہ ہے، کہ سوویت افغان جنگ کے دوران افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد یہاں پر قائم ایک بڑے مہاجر کیمپ میں پناہ گزیں رہی۔اب بھی افغان مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد پبی میں رہائش پذیر ہے۔

پبی میں عبدالولی خان یونیورسٹی مردان کے کیمپس کے علاوہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور کا کیمپس بھی ہے۔اس کے علاوہ بوٹینیکل گارڈن ازاخیل میں پشاور یونیورسٹی کا کیمپس بھی ہے۔اس طرح سے یہ ایک علم دوست شہر بھی مانا جاتا ہے۔

پشاور: پھولوں کا شہر

جب میں پشاور پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک بہت ہی مصروف شہر میں آ گیا ہوں۔ مجھے سب سے پہلے انور خان کے گھر جانا تھا۔ اس روز شدید گرمی تھی اور میں روزے سے بھی تھا۔ ایک اجنبی شہر کا خوف تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی جاننے والا نہ مل جائے یہ خوف برقرار رہتا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔

پشاور جسے پخوز اور پشور بھی کہا جاتا ہے پاکستان کا چھٹا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی تیس لاکھ سے زائد ہے۔ یہ شہر خیبر پختونخوا کا صدر مقام بھی ہے۔ یہاں پر رہنے والوں کی اکثریت پختون ہے۔ ہندکو بولنے والے بھی ایک کثیر تعداد میں یہاں بس رہے ہیں۔ اس پورے علاقے کو پشاور وادی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مغرب میں درہ خیبر واقع ہے۔ افغانستان سے آنے والے راستے پر یہ پہلا بڑا شہر ہے۔ اس کا شمار جنوبی ایشیاء کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدھ مت اور ہندومت کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ گندھارا تہذیب کا مرکز بھی ہوتا تھا۔

اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے، کہ یہ کشان سلطنت کا دارلحکومت بھی رہا ہے۔ ایک وقت میں یہاں ہندوشاہی خاندان بھی حکومت کرتا تھا۔ مغل بھی اس شہر کے حاکم رہے۔ مغل ریاست کے خاتمے کے بعد اس پر ابدالی قابض رہے۔ یہ شہر ابدالیوں کا سرمائی دارلحکومت بھی رہا ہے۔ سکھ بھی اسے فتح کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ پھر 1849ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اس پر قابض ہو گئی۔ تقسیم ہند سے قبل یہاں پر کانگرس کی حکومت تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی پشاور سیاسی ہنگامہ آرائی کا مرکز رہا۔

روس کا افغانستان پر حملہ بھی پشاور کے لیے بے شمار مسائل لے کر آیا۔ جس قدر قیمتی جانوں کا نقصان اس شہر میں ہوا ہے، شاید ہی کسی اور پاکستان کے شہر میں ہوا ہو۔ میں 1980ء میں پہلی مرتبہ پشاور آیا تو اس وقت کے پشاور اور آج کے پشاور میں بے حد فرق ہے۔ یہ کوئی چالیس سال سے زائد عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد بھی بارہا پشاور جانا ہوا۔ پشاور

میں بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ اس کی تاریخ بھی پڑھنے کو ملی۔ پشاور متعلق جو کچھ جانا اور جو کچھ سمجھا دیکھا، سب پیشِ خدمت ہیں۔

جب میں (1981-1976) ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد میں پڑھ رہا تھا تو اس وقت میرے ایک کلاس فیلو اور عزیز دوست محمد انور خان درانی پشاور کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے وعدہ کیا کہ میں گرمی کی چھٹیوں میں پشاور آؤں گا اور ان سے ملنے کے لیے بھی ان کے گھر بھی آؤں گا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کا گھر پشاور کے لاری اڈے سے جو سڑک مشرق کی طرف جاتی ہے اس پر واقع گڑھی رامداد نام کے ایک گاؤں میں ہے۔ اب گڑھی رامداد، جو کہ ایک ہندو نام تھا کو بدل کر گڑھی رحیم داد رکھ دیا گیا ہے۔

ایسا کرنا اس شخص کی کوششوں کی نفی کرنا ہے جس نے یہ بستی آباد کی تھی۔ دوسروں کے کیے گئے کارناموں پر اپنا نام لکھنا، کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟ کیا نام بدلنے سے علاقے میں موجود لوگوں کے کردار میں بھی تبدیلی آتی ہے؟ میں یہ سب سمجھنے سے قاصر ہوں۔

ایسی ہی کوشش بھارت میں بھی ہو رہی ہے۔ ایسا ہی پنجاب کے کئی شہروں میں بھی ہوا ہے۔ میرے آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ جو ایک نیک دل سکھ کے نام پر بسا شہر ہے، کے نام کی تبدیلی کی بھی کوشش کی گئی، جو کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹیک سنگھ نے جو ایک سکھ تھا، تقسیم ہند سے قبل جب یہ علاقے بیابان تھے، اس جگہ پر ایک سرائے بنائی تھی۔ جو بھی اس جگہ سے گزرتا، یہ سکھ اس کے اور اس کے جانوروں کے لیے رہائش اور خوراک کا بندوبست کرتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک تالاب بنا رکھا تھا، جسے پنجابی میں ٹوبہ کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس جگہ کا نام ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑ گیا۔ اسی طرح لائل پور کا نام بھی بدلا گیا۔ لائل ایک انگریز آفیسر تھا جس نے موجودہ فیصل آباد کے ویران علاقے میں ایک بڑا شہر بسایا۔ اس کا نام بدل کر فیصل آباد رکھ دیا گیا۔ میرے علم کے مطابق شاہ فیصل کا اس شہر کی آبادکاری میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہ نام شاہ فیصل کی موت کے بعد رکھا گیا ہے۔

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میں نے 1980ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں پشاور آنے کا پروگرام بنایا۔ اگست 1980ء کے دن تھے اور موسم بھی بے حد سخت تھا۔ میں پہلی مرتبہ پشاور جا رہا تھا۔ اس وقت کوئی ٹیلیفون کا نظام بھی اتنا مضبوط نہیں تھا۔ بس جب کوئی گھر سے جاتا تو پتہ چلتا کہ وہ جا رہا ہے اور جب وہ گھر واپس آتا سب خوشیاں مناتے اور کہتے خیر سے واپسی ہو گئی ہے۔

مجھے یاد ہے، کہ جیسے ہی میں پشاور میں داخل ہوا میرے دائیں طرف لاری اڈا تھا۔ لاری اڈے سے ہی میں نے گڑھی رام داد کا پوچھا، تو ایک صاحب نے میری رہنمائی کی۔ اب یہ مجھے یاد نہیں کہ میں وہاں رکشے میں گیا یا تانگے میں۔ ان دنوں ہر شہر میں حتیٰ کہ کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں بھی تانگے چلتے تھے۔

فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ شاید کوئی تین چار کلومیٹر ہو گا۔ اس لئے میں بہت جلد ہی انور خان کے گھر پہنچ گیا۔ ابھی حال ہی میں اس علاقے میں پھر جانا ہوا۔ پورا علاقہ ایک خوبصورت کالونی میں بدل چکا تھا لیکن اس وقت ایسا نہیں تھا۔ یہ بالکل ایک گاؤں تھا اور اس کے چاروں طرف کھیت تھے۔ اس کے مشرق کی طرف ایک نالہ بھی بہہ رہا تھا، انور خان کا گھر مسجد کے پاس ہی تھا۔ گاؤں میں ایک بڑا سا حجرہ بھی تھا۔ انور خان کے گھر کے پاس ہی، ایک بڑا سا صحن تھا۔ ہم اسی صحن میں بیٹھے تھے۔ ہر طرف ایک دیہاتی منظر تھا۔ انور خان کے والد اسی گاؤں میں کاشتکاری بھی کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے گنے کے کھیت بھی دکھائے۔ میں خود بھی ایک دیہاتی پس منظر رکھتا ہوں اس لیے مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

اس وقت افغان مجاہد مہاجرین آنا شروع ہو گئے تھے۔ پشاور کے گردونواح میں کافی تعداد میں مہاجر آباد ہو رہے تھے۔ میں نے انور خان کے گاؤں کے پاس کئی بزرگوں کو دیکھا اور ان کے متعلق میں نے انور خان سے پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ لوگ افغان مہاجر ہیں۔

یاد رہے کہ روس نے 1979ء میں افغانستان پر حملہ کیا تھا لیکن اس سے کہیں پہلے افغانستان میں ایک خانہ جنگی کی کیفیت تھی، جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں مہاجر پاکستان آ گئے تھے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ انور خان کے گھر کے ساتھ مسجد بھی تھی۔ اس میں ایک کنواں بھی تھا، جس سے پانی نکال کر وضو وغیرہ کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ہمارے ہاں پنجاب میں بھی یہ رواج تھا کہ لوگ مسجد میں جا کر غسل بھی کرتے تھے۔ ایسا ہی اس گاؤں میں بھی ہوتا ہو گا۔ اس کے بعد بھی مجھے کئی مرتبہ انور خان کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انور خان تعلیم مکمل کرکے کراچی چلے گئے۔ ایک مرتبہ جب وہ کراچی میں تھے، تو میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ پشاور گیا، تو ہم ان کے گھر بھی گئے۔ ان کے والد صاحب اور والدہ اور باقی بہن بھائی بھی گھر پر تھے۔ مجھے ان کے والد سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔

اس وقت مجھے ایک دلچسپ روایت کا پتہ چلا جو شاید اب تک بھی ہے، ہمارے پنجاب میں یا کم از کم ہمارے گھر میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ روایت کچھ یوں تھی کہ گھر میں آنے والے مرد اور عورتیں آپس میں ہاتھ ملاتے تھے۔ جیسے ہی میری بیوی اور بچے گھر گئے، انور خان کے والد صاحب نے بچوں کے ساتھ ساتھ میری بیوی سے بھی ہاتھ ملایا اور ساتھ ہی کہا کہ ہمارے ہاں اس کا رواج ہے۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں، معلوم نہیں ---

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں عورتیں اپنے بزرگوں کے آنے پر ان کے پاؤں کو چھوتی تھیں، ایسا اب بھی ہم بھارتی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ بڑوں کی عزت کرنے کا یہ ایک ہندوانہ طریقہ تھا۔ لیکن اب ہمارے ہاں یہ رواج اور ریت ختم ہو چکی ہے۔

جب ہم ان کے گھر تھے تو پتہ چلا کہ انور خان کے والد صاحب کو اردو نہیں آتی اور مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جسے اردو آتی ہو اور ہمیں پشتو نہیں آتی تھی۔

اب یہ دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی---

کیا کہا جائے، کیا سنا جائے؟

یہ میں اس وقت کے پشاور کی بات کر رہا ہوں، اب کی نہیں۔ اب تو پشاور میں رہنے والے ہر فرد کو بہت اچھے طریقے سے اردو بولنا آتی ہے۔

میں نے پاکستان کے ساتھ ساتھ برما، ہندوستان کے ایک بہت بڑے علاقے، افغانستان کے کئی علاقوں کے علاوہ، نیپال میں بھی دیکھا ہے کہ ایک بڑی تعداد میں لوگ اردو بولتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہندی بول رہے ہیں۔ اصل ہندی اور اردو ہیں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن اب بھارتی فلموں کی وجہ سے ہندی اور اردو ہیں کوئی فرق نہیں رہا۔ ہیں نے بھارت کے چار سفر کیے ہیں۔ ان اسفار کے دوران، ہم جب بھی آپس ہیں بات چیت کرتے تھے، تو میں اردو میں بات کرتا تھا، بھارتی لوگ ہندی میں۔ دونوں میں معمولی فرق ہی محسوس ہوتا تھا۔ پاکستان میں تو شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں اردو بولنا لوگ نہ جانتے ہوں۔ ابھی حال ہی میں، میں افغانستان گیا تھا۔ وہاں میں نے کابل سے ہرات، غزنی، جلال آباد، قندھار تک کے علاقوں میں لوگوں کو اردو بولتے دیکھا ہے۔ جلال آباد میں تو ایک کثیر تعداد میں لوگ اردو بولتے ہیں۔

میں نے قندھار میں جب ایک صاحب سے پوچھا تھا، کہ آپ نے اردو کہاں سے سیکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہمارا پاکستان آنا جانا ہے۔ اس لیے ہمیں اردو بولنا آتی ہے۔ لیکن چالیس سال پہلے پشاور شہر کے بالکل ساتھ ایک گاؤں میں واقع ایک گھر میں کوئی بھی اردو بولنے والا نہ تھا۔ اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ ہمسائیوں کی ایک بچی اردو بولنا جانتی ہے۔ اسے مدد کے لیے بلایا گیا اور اس بچی نے ترجمان کے فرائض سرانجام دیے۔ اور یوں ایک مسئلے کو حل کیا گیا۔

اور مجھے اب تک انور خان کے والد صاحب کا روحانی اور روشن چہرہ یاد ہے۔ وہ ایک بڑی عمر کے صاحب تھے، بہت خوبصورت سفید داڑھی، سرخ و سفید رنگ، محبت کرنے والے بزرگ۔ اللہ رب العزت انھیں جنت کے اعلی درجے میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

مجھے اس سفر میں مفتی سیّد سیاح الدین کاکاخیل صاحب اور جناب قاضی حسین احمد صاحب سے جو اس وقت پشاور میں رہتے تھے، ملنا تھا۔ ہم فیصل آباد میں اسلامی جمعیت طلباء کا پروگرام کرنا چاہتے تھے، جس کے لیے میں ان سے وقت لینے کے لئے آیا تھا۔

اب تو یہ بات یاد کرکے ہی عجیب سا لگتا ہے، کہ وہ بھی کیا وقت تھا کہ ٹیلی فون بھی نہیں تھا، اور کوئی اور ذریعہ بھی نہیں جس کی مدد سے بات کی جا سکتی۔ اتنے سے کام کے لیے ایک طویل سفر کرنا پڑتا تھا۔

اگلے دن میں اور انور خان، مفتی سیّد سیاح الدین کاکاخیل صاحب کے گھر چلے گئے۔ ان کا گھر قریبی کسی محلے میں ہی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن ہمارا روزہ بھی تھا۔ جب ہم سیّد صاحب کے گھر گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک سادہ سا گھر تھا جو ایک ترچھی سی گلی میں واقع تھا۔ انھوں نے بے حد محبت اور شفقت کا سلوک کیا۔ وہ فیصل آباد رہتے تھے اس وجہ سے ان سے میرا پہلے سے تعارف بھی تھا۔ مل کر بہت خوش ہوئے، رمضان کی وجہ سے کچھ کھا پی تو نہیں سکتے تھے۔ اٹھنے سے پہلے انھوں نے مجھے ایک حدیث سنائی، جو اب تک یاد ہے۔ حدیث کچھ یوں تھی؛

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک جہاد سے واپس آرہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب ہم جہاد اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف جارہے ہیں[1]۔

جہاد اکبر اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا ہے یہ حدیث میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی جو اب تک یاد ہے۔

اگر کچھ کھایا پیا ہوتا وہ تو چند گھنٹے ہی یاد رہتا لیکن ان کی بتائی ہوئی بات تینتالیس سال بعد بھی یاد ہے۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے۔آمین

میں زندگی میں جن چند لوگوں سے متاثر ہوا ہوں ان میں ایک سیّد سیاح الدین کاکا خیل صاحب بھی ہیں۔ان کے بارے ایک طویل مضمون ڈاکٹر قاری محمد طاہر نے الشریعہ اکادمی پہ لکھا ہے، جو بے حد قابلِ تعریف ہے۔ میں نے اس مضمون کا خلاصہ لکھنے کی بجائے، اسے کتاب کے آخر میں جوں کا توں ہے لکھ دیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے مفتی صاحب بارے لکھے مضمون سے کچھ کم کرنا پسند نہ تھا۔ یہ سب یہ اس لیے کر رہا ہوں، کہ جہاں تک یہ کتاب جائے گی وہاں تک مفتی صاحب کا ذکر بھی جائے۔ یہ بات میرے لیے کسی سعادت سے کم نہیں[2]۔

مجھے یاد ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں، جو میرا آبائی شہر ہے، مفتی عبدالحمید لدھیانوی صاحب رہتے تھے۔وہ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے اور بہت ہی عالم و فاضل آدمی تھے۔ میں ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔جب میں میٹرک کے بعد ایف ایس سی کرنے کے لیے فیصل آباد آنے لگا، تو انھوں نے مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ تم زندگی میں تین لوگوں سے ضرور ملنا۔

---

[1] حدیث: ’’قدمتم خیر مقدم و قدمتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر‘‘ (تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آگئے ہو) میرے علم کے مطابق دو ہی سندیں ہیں:

۱: يحيى بن العلاء قال: حدثنا ليث عن عطاء بن ابى رباح عن جابر قال: قدم النبى صلى الله عليه وسلم من غزاة له فقال لهم.........

تاریخ بغداد ۱۳/۵۲۳، ۵۲۴ ت۳۷۴۵ ومن طریقہ الحافظ ابن الجوزی فی الخ (ذم الهوى ص۳۸، الباب الثالث فى ذكر مجاهدة النفس و محاسب تها و توبيخها)

[2] https://alsharia.org/2013/oct/syed-sayahuddin-aur-mufti-jafar-husain-tazkarah-dr-qari-tahir

ایک میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی، دوسرے سیّد سیّاح الدین کاکاخیل صاحباور تیسرے مولانا چراغ صاحب، جو گجرانوالہ میں رہتے تھے۔

میں نے ان کی نصیحت کو پلے باندھ لیا۔

میں نے ان سے کیے گئے وعدے کو پورا کرنے کے لیے ان تینوں بزرگان سے ملاقات کی۔ ان میں سیّدسیاح الدین کاکاخیل صاحب سے سب سے زیادہ ملاقات رہی۔ باقی دونوں حضرات کو بھی مجھے ملنے کا موقع ملا۔ مولانا چراغ صاحب کو ملنے کے لئے میں ان کے مدرسہ گجرانوالہ میں گیا۔ اس وقت وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا، وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میاں طفیل محمد صاحب سے ملاقات لاہور میں رہتے ہوئے بارہا ہوئی۔

مفتی سید سیاح الدین ایک قابلِ رشک ہستی

مفتی سید سیاح الدین بارے ایک مضمون ڈاکٹر قاری محمد طاہر نے لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب قافلہ محدثین کی ایک فراموش شدہ شخصیت کا نام ہے۔ مفتی سید سیاح الدین 8 اگست 1916ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم حافظ محمد سعد گل اور نانا کا نام محمد مطہر دونوں جید عالم تھے۔

سید سیاح الدین کاکاخیل نے دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ دورۂ حدیث میں آپ کے اساتذہ شیخ الاسلام و شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا میاں اصغرؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، استاد مفتی ریاض الدین اور مولانا شمس الحق افغانی جیسے اکابر شامل تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں ہر کتاب کے نمبر پچاس ہوتے تھے۔ ممتحن کو اس بات اختیار تھا کہ وہ کسی پرچے کو بہت عمدہ خیال کرے تو پچاس نمبر دینے کے بعد ایک دو نمبر مزید بھی دے سکتا تھا۔ ایسا طالب علم کے لیے بڑا اعزاز ہوتا۔ مولانا سید سیاح الدین کو آٹھ کتابوں میں پچاس کی بجائے باون باون نمبر ملے اور مؤطا امام مالک اور نسائی میں ترپین ترپین نمبر دیئے گئے۔

ڈاکٹر قاری محمد طاہر مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے "مولانا سید سیاح الدین کے ایک ہم عصر سے خود یہ بات سنی کہ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ نے اپنے ہونہار شاگرد سید سیاح الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس نے چلتا پھرتا ولی دیکھنا ہو، وہ سید سیاح الدین کو دیکھ لے۔ برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیائے اسلام کی اس عظیم شخصیت کی طرف سے ان اعزازی الفاظ کا ملنا موصوف کے لیے ایسا اعزاز ہے جس کی نظیر پیش کرنے میں بڑی سے بڑی سند بھی ہیچ ہے۔"

یہ بھی ایک تاریخی بات ہے کہ آپ نے 1970ء میں جماعت اسلامی کی طرف سے ایم این اے الیکشن بھی لڑا تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ آپ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض بھی سر انجام دیتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مدرسہ اشاعت العلوم لائل پور بطور صدر مدرس بھی کام کیا۔ بعد میں آپ کو وفاق المدارس کی طرف سے حدیث کا ممتحن مقرر کیا جاتا رہا۔ جب صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلامی نظریاتی کونسل بنائی تو آپ کو اس کا رکن نامزد کیا گیا۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۷ء کا دن پاکستان کی تاریخ کا پریشان کن دن ثابت ہوا۔ اس دن آپ ایک کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے پشاور سے بذریعہ کار اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ حسن ابدال کے قریب آپ کی کار کو حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں آپ اور آپ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اور یوں ہم سب کے لیے قابلِ احترام ایک عظیم شخصیت دنیا سے رخصت ہو گئی۔

مجھے پشاور میں قاضی حسین احمد صاحب سے بھی ملنا تھا۔ میں اور انور خان ان سے ملنے ان کے گھر چلے گئے۔ مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ ایک بہت ہی بڑا علاقہ تھا، شاید یونیورسٹی ٹاؤن یا حیات آباد علاقہ ہو۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ وہ اپنے بھائی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم وہاں پر ان کے گھر گئے۔ وہ ہمیں گھر پر مل گئے اور بیٹھنے کو بھی کہا۔ اس دوران انھوں نے افغانستان سے آنے والے مہاجرین متعلق باتیں سنانا شروع کیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انھوں نے یہ بھی بتایا ایک دفعہ افغان مہاجر میرے گھر میں آئے تو وہ کئی روز کے بھوکے تھے، میں آج بھی ان کی بھوک کا سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ کس طرح ظالموں نے ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالا۔

ان سے ملنے کے بعد میں نے انور خان سے کہا کہ مجھے قدیم پشاور جو ایک چار دیواری میں تھا، کی سیر کے لیے لے چلیں۔ ہم اندرون پشاور چلے گئے۔ اس میں موجود قصہ خوانی بازار بھی گئے۔

جب میں انور خان کے ساتھ قصہ خوانی بازار سے گزر رہا تھا تو مجھے ایک واقعہ یاد آیا، جسے میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے ساتھ ایک ظلم یہ بھی ہوا ہے کہ یہ جلیانوالہ باغ کی طرح کا ہی ایک واقعہ تھا، لیکن اسے ہمارے تاریخ دانوں نے اس لیے بھلا دیا کہ اس میں غفار خان صاحب کا ذکر آتا تھا اور اس وقت کی انگریز حکومت کا ایک ظالمانہ فعل تھا۔ لیکن میں اسے بھول نہ سکا۔

واقعہ کچھ یوں ہے، کہ اپریل 1930ء میں، غفار خان صاحب جو خدائی خدمت گار تحریک کے بانی اور سربراہ تھے، نے انگریزوں کے بنائے ہوئے امتیازی قوانین کے خلاف قصہ خوانی بازار پشاور میں ایک پرامن احتجاج کا منصوبہ بنایا۔ اس پروگرام میں کئی ہزار لوگ شریک ہوئے۔ اس احتجاج کو روکنے کے انگریزوں نے مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں چلا دیں اور سینکڑوں افراد کو شہید کر دیا گیا۔ یہی نہیں، بلکہ ایک بکتر بند گاڑی بھی مظاہرین پر چڑھا دی جس سے کئی لوگ کچلے گئے۔ (مجھے غفار خان صاحب کی قبر پر جلال آباد جانے کا بھی موقع ملا ہے۔)

یاد رہے کہ اس سے پہلے 13 اپریل 1919ء کو جلیانوالہ باغ میں ایک جلسے پر، جہاں آزادی کے حامیوں کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ کیا جا رہا تھا، پر. بریگیڈیئر جنرل ڈائر کے حکم پر گورکھا، بلوچ، راجپوت اور سکھ فوجیوں (یہ سب ہندوستانی سپاہی تھے جو اپنے ہم وطنوں پر گولیاں چلا رہے تھے) نے مظاہرین کو گھیر لیا اور اندھا دھند نہتے ہجوم پر گولی چلا دی۔ حتیٰ کہ بھاگتے لوگوں پر بھی گولی چلانا جاری رکھا۔ ظلم کی حد ہے کہ یہ ہندوستانی فوجی اپنے ہم وطنوں پر اس وقت تک گولیاں چلاتے رہے جب تک کہ ان کا گولہ بارود ختم نہ ہو گیا۔

اس کامیاب آپریشن پر ان ہندوستانی سپاہیوں کی ترقی بھی ہوئی ہو گی۔۔۔۔ یقیناً۔۔۔

انگریز اپنے وفاداروں کو ان کی وفاداری (قوم سے غداری) کا صلہ تو ضرور دیتے تھے۔۔۔

چاہے وہ کوئی عام سپاہی ہوتا یا کوئی سردار، نواب، ملک، چوہدری یا وڈیرہ۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شہید ہونے والوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔ اسی ظلم کا بدلہ لینے کے لیے اودھم سنگھ، جو ایک سکھ تھا جس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی تھی، نے 1940ء میں اس واقعہ کے کوئی بیس سال بعد لندن میں جنرل ڈائر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اودھم سنگھ کو پھانسی ہوئی تھی۔ امرتسر میں واقع جلیانوالا باغ میں، اس واقعے کی یاد میں ایک بڑی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔

میری نگاہیں قصہ خوانی بازار میں پختون شہداء کے نام کی کوئی چھوٹی موٹی تختی ہی ڈھونڈتی رہیں، لیکن کہیں ایسا کچھ نہیں تھا، نہ ہی کتابوں میں اور نہ ہی قصہ خوانی بازار میں، جہاں سینکڑوں لوگوں کا خون بہا جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ بس دو مینار نما یادگاریں تھیں، جو ان چار سو آزادی کے شہیدوں کی یاد کے لیے کافی سمجھی گئیں۔

یہ برطانوی ہندوستان میں دوسرا بڑا تصادم مانا جاتا ہے۔ اس واقعے کی نتیجے میں چار سو سے زائد لوگ شہید ہوئے تھے۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اس بار بھی گولی چلانے والے ہندوستانی سپاہی ہی تھے، جن میں دیگر اقوام کے ساتھ ساتھ پختون فوجی بھی شامل تھے۔ خدائی خدمتگاروں کے مظاہرے پر برٹش انڈین آرمی (بی آئی اے) کی دو بکتر بند گاڑیاں مظاہرین پر چڑھ دوڑیں، جس سے متعدد افراد شہید ہو گئے۔ اس کے بعد بھی ہجوم عدم تشدد کی پالیسی پر قائم رہا۔ صرف اپنے شہید اور زخمی ہی اٹھاتے رہے۔ پھر وہی ہوا جو ظالم کرتے ہیں۔ انگریز آفیسر ز نے اپنے دستوں کو غیر مسلح ہجوم پر مشین گنوں سے فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے باوجود بھی خدائی خدمتگاروں نے کوئی گولی نہیں چلائی۔ خوشی اور دلیری سے گولیوں کا سامنا کیا۔ اس موقع پر بہت سے لوگوں نے اللہ اکبر کے نعرے بھی لگائے اور قرآن کو بھی پکڑے رکھا۔

میں اگر اتنے بڑے سانحے کا ذکر نہ کرتا تو ان شہداء کا ضرور قصور وار ہوتا۔

اس متعلق مزید جاننے کے لیے فٹ نوٹ میں دیے گئے حوالے، آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں[1]۔

یادگار چوک بھی دیکھا، جو 1930ء میں انگریزوں نے ایک جنگ جیتنے کی خوشی میں بنایا تھا۔ پھر اس کے بعد صدر بھی جانا ہوا اس وقت صدر نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ بہت اچھی دکانیں موجود تھیں۔ جو غیر ملکی سامان لاہور میں نہیں ملتا تھا، وہ پشاور میں میسر تھا۔ وہ مجھے باڑہ مارکیٹ میں لے کر گئے جو اس وقت کی ایک مشہور ترین مارکیٹ تھی۔

اس طرح سے میرا پشاور کا پہلا دورہ مکمل ہوا۔

اس کے بعد کئی بار جانا ہوا اور شہر کی مختلف تاریخی عمارتوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔

---

[1] https://www.thefridaytimes.com/2017/04/28/massacre-at-qissa-khwani-bazaar-1930
https://web.archive.org/web/20180410201709/https://www.dawn.com/news/299566

جب میں دوسری مرتبہ انور خان سے ملنے کے لیے گیا، مجھے یاد ہے کہ میں ان کے گاؤں کا نام بھول گیا۔ میں اسے کچھ اور ہی کہتا رہا۔ پھر ایک دکاندار سے میں نے کہا کہ اس علاقے میں واقع جو اہم گاؤں ہیں، ذرا ان کے نام لیں۔ اس طرح سے مجھے گڑھی رام داد یاد آ گیا۔

اس کے بعد انور خان کراچی چلے گئے۔ اب وہ کراچی سے واپس آ کر پشاور ہی میں رہ رہے ہیں۔ مجھے اب بھی ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب میں نے دیکھا کہ اب وہاں پر گاؤں نام کی چیز نہیں ہے، بلکہ وہاں پر ہر جگہ پر کالونیز بن چکی ہیں۔ پشاور بھی ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ شہر کے گرد سرکلر روڈ بھی بن چکا ہے۔ شہر میں بسوں کا جدید نظام بھی کام کر رہا ہے۔

آئندہ صفحات میں، میں پشاور میں مختلف اوقات میں دیکھی گئی عمارتوں اور مختلف شخصیات سے جو ملاقات ہوئی، ان کا ایک مختصر تذکرہ کروں گا۔

پشاور کی ایک مختصر تاریخ

پشاور ایک قدیم شہر ہے۔ اس کا شمار ان شہروں ہیں ہوتا ہے جو قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ آباد بھی ہیں۔ اس کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔ یہ ہر دور میں حکمرانوں کی ایک پسندیدہ جگہ رہا ہے۔ اس کی ایک مختصر تاریخ ان صفحات میں بیان کرنے کو کوشش کی گئی ہے۔

پشاور نام کی ابتداء

پشاور کے موجودہ نام کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس بارے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ جو میں سمجھا ہوں اس کے مطابق مغل شہنشاہ اکبر کے وقت اس کا نام پراشاور تھا، جو شاید اس شہر کے ایک ہندو حکمران پروش کی وجہ سے تھا۔ اسی سے یہ نام بگڑتا ہوا پوشاپورہ بن گیا جس کا مطلب پھولوں کا شہر تھا۔ کئی اور لوگوں نے اس کا نام اسی سے ملتا جلتا لکھا ہے جیسے شاپور وغیرہ۔ ایک عرب مؤرخ اور جغرافیہ دان المسعودی نے اسے پراشاور بھی لکھا ہے۔ اسپر اکثر لوگ متفق ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے اسے پشاور کا نام دیا تھا، تب سے یہ شہر پشاور کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔

پشاور کی بنیاد کے متعلق اکثر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس شہر کی بنیاد ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر پانچ سو سال قبل مسیح میں رکھی گئی۔ شروع میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسی دور میں اس کے قریب گندھارا کا دارالحکومت پشکلاوتی موجود تھا، جس کی وجہ سے یہاں پر بھی بدھ مت کے اثرات پھیل گئے۔

میرے خیال میں اسی دور میں افغانستان کے دور دراز علاقوں میں بدھ مت کی تعلیمات پھیلانے کے لیے پشاور کو ایک مرکزی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہو گی۔ اسی راستے آریا لوگ ہندوستان آئے۔ بعد میں چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم بھی اسی راستے ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور پشاور کی وادی اس کی سلطنت کا حصہ بن گئی۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کا حملہ مغرب سے آنے والے کسی بھی حملہ آور کا اس شہر پر پہلا حملہ تھا۔

میرے خیال میں یہ درست نہیں۔ کیونکہ تاریخ میں کئی اور بھی ایرانی اور یونانی حملہ آوروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ متھرا میں ایرانیوں کی قائم کردہ ریاست کا ذکر بھی تاریخ کی

کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ سکندر سے پہلے کے حملے اس قدر اہمیت کے حامل نہ ہوں، اس لیے ان کا ذکر کم ملتا ہے۔

پشاور کے حکمران

میں پشاور کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا دور جسے ہم ایک قدیم دور کہہ سکتے ہیں۔ یہ سکندر کے دور سے شروع ہو کر ہندو شاہی تک کا دور ہے۔ دوسرا دور محمود غزنوی سے لے کر مغلوں کی آمد سے پہلے کا ہے۔ تیسرا دور مغلوں اور پختونوں کا دور ہے جس میں سکھ دور بھی شامل ہے۔ چوتھا انگریزوں کا دور ہے جب ہندوستان، برطانیہ کی ایک کالونی تھا۔ یاد رہے کہ تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات بیان کرتے ہوئے میں لفظ ہندوستان استعمال کرتا ہوں، جس سے مراد آج کا پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کا علاقہ ہے۔ جبکہ تقسیم ہند کے بعد کے واقعات بیان کرنے کے لیے میں لفظ بھارت استعمال کرتا ہوں۔ اس وقت بھارت کی سرکاری ویب پر اس کا یہی نام لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھارتی، اسے انڈیا لکھتے ہیں۔

پہلے دور میں سکندر کے جانے کے بعد اس کے جانشین یہاں حکمران رہے۔ موریہ سلطنت کے بانی چندر گپت موریہ نے اس ریاست کو ختم کیا۔ موریہ خاندان کے زوال کے بعد ہند یونانیوں نے اس خطے پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ اسی دور میں ہمیں ہند یونانی دور کے سکے ملتے ہیں۔ پھر یہ بھی تاریخ کا حصہ بن گئے۔

پھر یہ شہر کشان حکمرانوں نے فتح کر لیا۔ وہ یہاں دوسری صدی عیسوی میں حاکم تھے۔ اسی دور میں پشکلاوتی کو ایک ریاستی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہی وہ دور ہے جب بدھ مت کو اس علاقے میں عروج ملا۔ کشانوں کے بدھ مت قبول کر لینے کی وجہ سے، پشاور بدھ مت کی تعلیم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ بدھ مت کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد چین، برما، سری لنکا، تھائی لینڈ اور بھارت کے علاوہ بھی کئی ممالک میں آباد ہے۔ اس کا ایک مختصر تعارف یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

بدھ مت کی بنیاد کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے رکھی گئی۔ اس کی بنیاد رکھنے والے کا نام سدھارتھ گوتم تھا، جسے اب مہاتما بدھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس وقت یہ دنیا کا چوتھا بڑا مذہب ہے۔ اس مذہب کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ ہر شخص چاہے تو کچھ مخصوص

طریقوں پر عمل کرکے اپنی بشری کمزوریوں پر قابو پا کر اپنی پوری صلاحیتوں کو پورے طور پر بروئے کار لا سکتا ہے۔ بدھ مت کے چار بنیادی اصول ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی خوشی اور غم کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی طرح کے غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر غم اور دکھ شکست خوردگی اور مایوسی لے کر آتا ہے۔ ان پر قابو پانا ہی اصل کام ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ مسائل بے حد پیچیدہ ہوتے ہیں، ہم انھیں حالات اور واقعات میں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری حقیقت سے لاعلمی ہے۔ غم کی کوئی وجہ نہیں ہوتی یہ سب کچھ بہت سے ناممکن طریقوں کا تصور کرکے اپنے اوپر لازم کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ ہر طریقہ ممکن نہیں ہو سکتا، تو مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ مشکلات کی صحیح روک تھام، تمام مسائل سے نجات، اسباب کا قلع قمع کرنے سے ہی ممکن ہے۔ اگر اسباب ختم ہو جائیں گے تو ممکن ہے کہ ہم مسائل سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیں۔

بدھ مت کا چوتھا اصول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسائل ختم کرنے کے لئے اس بات کا صحیح ادراک ہو جائے کہ ہم سب ایک معاشرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے دست نگر بھی ہیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ ہم سب اس بات کا عہد کریں کہ ہم سب برابر کا پیار اور دردمندی چاہتے ہیں۔ اسی بات کی بنیاد پر ہم اپنے اور غیروں کے لیے نیکی، بھلائی اور فلاح کے کام کر سکتے ہیں۔ اب پھر ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی بدھ مت کا پشاور میں مرکز۔

اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ پشاور کے ارد گرد بھی کئی اسٹوپا اور بدھ مت کے دور کی عمارتیں بھی ہیں۔ جن میں سے تخت بھائی میں بدھ مت کی عمارتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار اور قدیم مقامات بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ کبھی پشاور بدھ مت کا مرکز بھی تھا۔ یہ بھی تاریخ سے ملتا ہے، کہ بدھ مت کے لوگ افغانستان، ترکمانستان اور شمال مشرقی ایران تک پہنچے تھے۔ اس کا ایک ثبوت تو بامیان میں دیو قامت مجسمے بھی ہیں۔ مجھے یہ مجسمے بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ عظیم الجثہ مجسمے کسی فرد کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے، جب ایسے منصوبوں کے پیچھے ایک بڑی ریاست کے وسائل ہوں۔

کشان سلطنت کا زوال بھی ہو گیا۔ ان کے بعد نویں صدی عیسوی آخر تک بدھ شاہی اور ہندو شاہی نام کی حکومت رہی۔ یہ عرصہ کوئی سات سو سال سے زیادہ تک کا ہے۔ اس دور میں کابل شاہان بھی کسی سے سے پیچھے نہیں رہے۔ اس دور کا آخری حکمران جے پال تھا۔ اسے غزنویوں سے خطرہ محسوس ہوا اور اسنے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے غزنی پر حملہ کر دیا۔ میرے خیال میں یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی ہندوستانی نے ہندوستان سے باہر حملہ نہیں کیا، درست بات نہیں ہے۔ اس جنگ میں جے پال کو شکست ہوئی اور وہ سبتگین کو معاوضہ ادا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

جے پال جو ایک سندھو جاٹ تھا جس نے پنجابی ہندوؤں کی مدد سے ایک بڑی فوج کھڑی کرلی تھی (اسے کئی لوگوں نے جے پالا بھی لکھا ہے، کئی لوگوں نے اسے کابل شاہی کا ایک کھٹانہ گجر حکمران بھی کہا ہے)[1]۔

یہ جنگ سبکتگین کے خلاف لڑی گئی۔ اس جنگ کی تفصیل بے حد دلچسپ ہے۔ جے پال ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی دوران سبکتگین کے بعد محمود غزنوی بادشاہ بنتا ہے۔

یاد رہے کہ تاریخ کی کتابوں میں موجودہ خیبر پختونخوا کے علاقے کو کسی الگ نام سے نہیں پہچانا جاتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے دور میں یہ علاقے اس کی حکومت کا حصہ تھے۔ اس نے اپنی وسیع سلطنت کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان کے نام کچھ اس طرح سے تھے:

الٰہ آباد، آگرہ، ایودھیا (اودھ)، اجمیر، احمد آباد، بہار، بنگال، دہلی، کابل، لاہور، ملتان، ملکہ، کندیش، برار، اور احمد نگر۔ میرے خیال میں پشاور تک کے علاقے یا اٹک تک کے علاقے لاہور میں شامل تھے اور اس کے بعد کے علاقے کو کابل کا نام دیا گیا تھا۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

آریانا " افغانستان کا پرانا "" .(مندیگک، ادارہ (فروری 18، 2020 1
.اخذ شدہ بتاریخ 30 نومبر 2022 .mundigak com .مندیگک ."نام

1. .مختصر تاریخ گجر .(حسن چوہان، رانا علی (1998
.چوہان پبلشرز. صفحہ 143
ISBN 978-0521200929.

اسے انگریزوں نے پہلے مغربی سرحد کہا بعد میں اسے صوبہ بنایا تو اسے شمال مغربی سرحد صوبہ کہا۔انگریزی میں نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پروونس (NWFP)۔ بعد میں اسے خیبر پختون خوا کا نام دیا گیا۔اسی لیے میں پشتون کی بجائے پختون لکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

سلطان محمود نے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد، جے پال کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور ہندو کش کے شمال میں واقع کئی علاقے فتح بھی کر لیے۔ پھر ایک آخری جنگ جے پال اور محمود غزنوی کے درمیان پشاور کے قریب ہوتی ہے۔اس جنگ میں جے پال کو شکست ہوتی ہے اور وہ جنگ کے بعد خود کشی کر لیتا ہے۔ اس خود کشی کیوجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ اس کی رعایا کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے ہندوشاہی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے۔ یہ بات وہ برداشت نہ کر سکا۔

اس کے بعد بیٹے آنند پال نے بھی غزنویوں کے خلاف جنگ جاری رکھی، لیکن اسے کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس طرح پشاور سے ہندوشاہی ریاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہندو لوگ ایک بڑی تعداد میں پنجاب اور کشمیر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ان کے جانے کی وجہ یہاں پر ایک بڑی تعداد میں کابل، وسط ایشیاء اور ایران کی طرف سے آنے والے مسلمانوں کی آباد کاری تھی۔ اس علاقے میں آنے والے مسلمان یہ چاہتے تھے ہندو یا تو مسلمان ہو جائیں یا پھر جنگ کے لیے تیار۔ ہندو شاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی پنجاب اور اس کے مشرق میں ہندو اکثریت سے آباد تھے اور وہاں کوئی مسلمان حکومت بھی نہیں تھی۔ اس طرح ہندو اس علاقے سے نکل گئے اور اپنے آپ کو محفوظ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اسے تاریخ کی ایک بڑی نقل مکانی کہا جاتا ہے۔ جو رہ گئے تھے، وہ اگلے ایک ہزار سال تک رہتے رہے۔غزنوی دور سے لے کر (گیارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک) آج تک پشاور کے حاکم مسلمان ہی رہے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک تھوڑے عرصے کے لیے سکھ اور مراٹھے بھی یہاں کے حاکم رہے۔انگریزوں کی پشاور پر حکمرانی بھی کوئی سو سال پر محیط ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں پہلی نقل مکانی کے کوئی ساڑھے نو سو سال بعد، ہندو اور سکھ ایک دفعہ پھر یہاں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس دفعہ بھی انھیں مسلمانوں کی طرف سے ظلم و زیادتی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک دردناک داستان ہے، کہ کس طرح پاکستان سے ہندو اور سکھ نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور بھارت سے مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور۔ یہ کوئی پرامن نقل مکانی نہیں تھی۔ اس میں پندرہ لاکھ بے گناہ عام ہندو، سکھ اور مسلمان مارے گئے، ڈیڑھ کروڑ لوگ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے، صدیوں پر محیط ایک معاشرے کی تباہی ہوئی، بے حد و حساب مالی نقصان ہوا، دو ممالک جو ہمسائے بھی ہیں، کے درمیان مستقل دشمنی کی فضاء قائم ہوئی، جس کے نتیجے میں ان کے درمیان کئی جنگیں بھی ہوئی، عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر، وسائل خرچ کرنے کی بجائے اسلحہ کے ڈھیر لگانے کا مقابلہ شروع ہوا۔

تقسیم ہند، نقل مکانی اور جنگ و جدل کے بغیر بھی ممکن تھی۔۔۔ پھر یہ سب کیوں ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار ہے؟

یہ سب روکا جاسکتا تھا۔۔۔

پھر کیوں نہ روکا جاسکا؟

کوئی تو ہے جو اس کا ذمہ دار ہے۔۔۔

وہ کون ہے۔۔۔ تاریخ اسے ضرور بیان کرے گی۔۔۔ آج نہیں تو کل۔۔۔

یہ میرا ذاتی خیال ہے۔۔۔ آپ کیا سوچتے ہیں؟

ضرور بتائیں۔۔۔

تقسیم ہند کے وقت کسی بھی عیسائی نے کسی بھی طرف سے نقل مکانی نہیں کی۔ نہ ہی انھیں کوئی تشدد کا نشانہ بنا سکا۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ حاکم وقت (انگریز) ان کے ہم مذہب تھے۔ انھیں کون ہاتھ لگا سکتا تھا؟

پشاور کی تاریخ کے تیسرے دور کا آغاز محمود غزنوی کی فتح سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس علاقے میں غزنوی کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے۔

یاد رہے محمود غزنوی پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے لاہور میں ایاز کو اپنا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد سکھوں نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں ابدالی حکمرانوں سے لاہور چھینا تھا۔ اس طرح کوئی ساڑھے سات سو سال لاہور پر مسلمان ہی قابض رہے۔ ابدالی حکمرانوں کے بعد اسی سال تک سکھ یہاں پر حاکم رہے۔ رنجیت سنگھ کی ریاست کے خاتمے کے بعد سو سال کے لیے انگریز بھی لاہور کے حاکم رہے۔ اس کے بعد پھر یہاں کے حاکم مسلمان ہی ہیں۔

اس طرح گیارہویں صدی سے لے کر اب تک کوئی ہزار سال سے زیادہ عرصے میں لاہور میں ساڑھے آٹھ سو سال مسلمان ہی حاکم رہے۔ پھر اسی لاہور میں سکھوں کی پہلی ایک بڑی ریاست قائم ہوئی جس کا سہرا رنجیت سنگھ کے سر ہے۔ اسطرح کوئی ساڑے سات سو سال تک لاہور کا گورنر ہر دور میں مسلمان ہی رہا۔

پختون اور مغل حکومت (1451-1758)

کیا محمود غزنوی ایک پختون تھا؟ اس کے متعلق اکثر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ پختون نہیں تھا۔ اس کا تعلق وسط ایشیاء سے تھا۔ یہ ضرور ہے کہ غزنی، جہاں سے وہ آیا تھا، آج افغانستان کا حصہ ہے اور اس علاقے میں واقع ہے جہاں ایک بڑی تعداد میں پختون بستے ہیں۔ مجھے دو مرتبہ محمود غزنوی کے مزار پر، غزنی جانے کا بھی موقع ملا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں، کہ پہلی مرتبہ پشاور پر ایک پختون، بہلول لودھی حملہ کرتا ہے اور 1451ء میں یہاں اپنی ریاست قائم کرتا ہے۔ اس وقت تک دہلی میں سلاطین دہلی کے نام سے کئی لوگ، وسط ایشیاء سے آکر اپنی ریاست قائم کر چکے ہوتے ہیں۔ جن میں تغلق کافی مشہور ہیں۔ بعد میں لودھی خاندانپشاور سے لے کر دہلی اور آگرہ تک اپنی ریاست قائم کر لیتا ہے۔

ابھی لودھی خاندان کی حکومت قائم ہی تھی، کہ سولہویں صدی کے آغاز میں بابر ہندوستان کا رخ کرتا ہے اور پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغل سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسی بابر کے پوتے، اکبر بادشاہ نے اس شہر کا نام پشاور رکھا تھا۔ مغل دور میں اس وقت اس علاقے میں بسنے والے پختون بھی مغل سلطنت کے وفادار رہے۔ کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ جیسے خوشحال خان خٹک مغلوں کا وفادار تھا، بعد میں ان کا مخالف ہو گیا۔ اسی طرح یوسف زئی قبائل نے بھی مغلوں کے خلاف جنگ لڑی۔

پھر جب مغل کمزور پڑ گئے، تو ابدالی ان کی مدد کو آ پہنچا۔ اس نے مغلوں کی مدد بھی کی اور ایک طرح سے مغلوں سے اقتدار بھی چھین لیا۔ اس طرح اس نے ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت بھی کی، خاص طور پر شاملی ہندوستان پر۔ مجھے احمد شاہ ابدالی کے مزار پر بھی دو دفعہ جانے کا موقع ملا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی موت کے بعد سکھ ایک طاقت بن کر ابھرے اور انھوں نے پشاور سمیت، موجودہ خیبر پختونخوا کئی علاقے فتح کر لیے۔

مغل، ابدالی، مراٹھا اور سکھ

سکھوں کے مکمل قبضے سے پہلے ایک ناقابلِ یقین واقعہ پیش آتا ہے۔ یہ بات شاید آپ کے لیے بھی بے حد عجیب و غریب ہو کہ کبھی پشاور پر مراٹھہ (مرہٹہ) جن کا تعلق جنوب مغربی ہندوستان سے تھا، بھی قابض رہے۔

واقع کچھ یوں ہے کہ جب مغل سلطنت کمزور ہو گئی، تو مراٹھوں نے سر اٹھایا اور گجرات سے لے کر دہلی تک کی تمام مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کو فتح کرتے ہوئے دہلی تک آن پہنچے۔ اس کے بعد انھوں نے پشاور تک ابدالی فوجوں کا پیچھا کیا اور 1758ء میں پشاور کی جنگ میں ابدالیوں کے نامزد کردہ پنجاب کے گورنر عدینہ کو شکست دی۔ اس جنگ میں ایک طرف جب رگھوناتھ راؤ، ملہار راؤ ہولکر اور چرت سنگھ اور جسا سنگھ اہلوwalia تھے اور دوسری طرف ابدالی فوج تھی، جبکہ مغل پہلے ہی زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ اب کی بار پشاور پر توکوجی راؤ ہولکر گورنر بنا۔ ان کی کئی بار افغان فوج سے جنگیں بھی ہوئیں۔ مراٹھا اپنے مرکز سے بہت دور تھے اور کوئی زیادہ منظّم بھی نہیں تھے۔ اسلیے کچھ ہی عرصہ بعد مقامی لوگوں کی طرف سے سخت مزاحمت کے بعد وہ پشاور اور بعد میں پنجاب کے ساتھ ساتھ دہلی بھی چھوڑ کر واپس گجرات چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ابدالی پشاور کے حاکم بن گئے، جبکہ پنجاب میں سکھ راج کا آغاز ہو گیا۔

پھر ایک دن آیا جب ابدالی بھی شکست کھا گئے اور 1818ء میں سکھوں نے پشاور فتح کر لیا۔

سکھوں کی فتح (1818-1849)

سکھ صرف اکتیس سال تک پشاور اور ارد گرد کے کئی علاقوں پر قابض رہے۔ اس دوران وہ صرف جمرود تک ہی جا سکے۔ اس سے آگے انھیں افغانوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامان کرنا پڑ رہا تھا۔ سکھوں کے دور میں پشاور شہر میں واقع کئی مساجد اور باغات کو سکھوں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس کی ایک دلخراش داستان ہے کہ کس طرح سکھوں نے شہر کو برباد کیا۔ اسی دور میں گوردوارہ بھائی جوگا سنگھ اور گوردوارہ بھائی بیبا سنگھ بھی بنایا گیا۔

میں اس موقع پر ایک اور بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔

سکھوں نے ایک عرصہ تک مغل سلطنت کے ساتھ جنگ کی۔ جب ایک مرتبہ انھیں پنجاب اور صوبہ سرحد میں کچھ دیر کے لیے اقتدار ملا، تو انھوں نے مسلمانوں پر بے حد مظالم ڈھائے اور ساتھ ہی مساجد کی بے حرمتی بھی کی۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ سب کچھ اس دور یں ہوا جب ابھی رنجیت سنگھ کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک افراتفری کا دور تھا۔ اسی دور میں مغل گورنر نے سکھوں کے سر کی قیمت رکھی تھی۔ میں نے جو پڑھا ہے، اس کے مطابق جب سکھ ریاست کا وجود عمل میں آگیا تو اس طرح کے واقعات میں بے حد کمی واقع ہوئی۔ رنجیت سنگھ کے دربار میں کئی مسلمان بھی موجود تھے۔ اس بارے میں صدف بٹ اور ان کے ساتھیوں کا ایک مقالہ بے حد مفید ہے۔ میں نے بھی اسی مقالہ سے استفادہ کیا ہے[1]۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1707ء سے لے کر 1799ء تک کے عرصے میں پنجاب میں افراتفری کا دور رہا ہے۔ یاد رہے کہ عالمگیر جس کی موت 1707ء میں ہوتی ہے، کے بعد ہی مغل سلطنت زوال کا شکار ہوتی ہے۔ ابدالی واپس جا رہے تھے۔ علاقائی طاقتیں ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ خطے میں طاقت کا خلا پیدا ہو چکا تھا جس سے دل خالصہ کے سکھوں کو موقع مل گیا۔ اس دور میں جو کچھ بھی ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ایک طرف مغل گورنر ظلم کی انتہا کر رہے تھے تو دوسری طرف دل خالصہ کے سکھوں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کی ہوئی تھی۔

پنجاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان پینتیس سال تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں رہے۔ اس دور میں مسلمانوں کو نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا گیا بلکہ ریاست کے مذہبی اور سیاسی معاملات پر بھی ان کا بہت اثر تھا۔ رنجیت سنگھ سے پہلے بعد کے حالات مسلمانوں کے لیے ایک المیہ سے کم نہ تھے۔

---

[1] Sadaf Butt1 , Saad Jaffar2 , Dr. Muhammad Waseem Mukhtar3 , Waqar Ahmed4 , Dr. Babar Khan Jadoon5 , Badshah khan6
Muslims Under Sikh Rules During 19th Century: A Study Of Punjab Till Annexation
Journal of Positive School Psychology
http://journalppw.com 2023, Vol. 7,

میں نے جب اس پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ جہانگیر، اورنگزیب اور ابدالیوں نے سکھوں کے ساتھ بے حد ظلم و ستم روا رکھا۔ ان میں سکھ، اورنگزیب اور اس کے گورنر وزیر خان کا نام سرِ فہرست رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی نام ہیں۔ جنگوں میں سکھوں کو شکست دینا تو ایک جنگی معاملہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان بادشاہوں نے سکھوں کے مقدس ترین مقامات، جن میں گولڈن ٹیمپل بھی شامل ہے، کی بے حرمتی بھی کی ہے۔ جو کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ اس کا نہ کوئی جواز تھا اور نہ ہی ہمارا دین اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب مذہبی مقامات کو جنگی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا تو اس طرح کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی اندرا گاندھی نے کہا تھا، جب اس نے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا تھا۔

پھر جب سکھوں کو موقع ملا، تو انھوں نے اپنے مقدس مقامات کی بے حرمتی کا بدلہ لیا۔ ان کا یہ عمل بھی کسی طرح سے قابلِ معافی نہیں ہے۔ یہی وہ معاملات تھے جن کی وجہ سے تقسیم پنجاب کے وقت سکھوں نے پاکستان کے ساتھ رہنے کی بجائے بھارت کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ حالانکہ ان کے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب گردوارے پاکستان میں تھے۔ بابا گرو نانک صاحب کی پیدائش کی جگہ بھی پاکستان میں ہے۔

یہاں پر میں ایک ایسے مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں جو شاید میرے بہت سے دوستوں کا پسند نہ ہو۔ پسند یا ناپسند کو ایک طرف رکھتے ہوئے وہ میری بات سے اختلاف نہیں کر پائیں گے۔ یہ میرا خیال ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے مندر اور گردوارے تباہ بھی کیے اور ان سے سامان نکال کر مساجد بھی تعمیر کی۔ انھیں گرا کر اس جگہ پر عبادت گاہیں بھی بنائیں۔ اس کی مثال دلی میں موجود مسجد قوت الاسلام ہے، جس کے ستونوں پر اب بھی مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ میں نے خود دیکھی ہیں۔ ایسی ہی ایک مسجد نگر پار کر، کے پاس تھرپارکر سندھ میں بھی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی مندر یا گردوارہ کی جگہ پر کوئی درگا نہیں بنی اور نہ ہی کسی درگاہ کی کسی بھی ہندو یا سکھ نے کبھی بے حرمتی کی۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اب بھی اور ایک مدت سے ان درگاہوں پر جہاں مسلمان جاتے ہیں، وہیں ایک بڑی تعداد میں سکھ اور ہندو بھی جاتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ سکھوں اور ہندوؤں دونوں نے مل کر مساجد کی سخت بے حرمتی کی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت ایک اہم واقعہ ہے۔ پنجاب میں سکھ

دور میں ایسے بے شمار واقعات ہوئے ہیں۔ میں نے ایک تصویر بھی دیکھی ہے جو ہریانہ میں ایک قصبے کی ہے جہاں پر قائم مسجد کو گردوارہ میں تبدیل کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم ہند کے بعد کا واقعہ ہے۔ جب اس شہر میں بسنے والے مسلمان پاکستان آ گئے تھے۔ اب اس شہر میں کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ ایسی کئی ویران مساجد اب بھی قائم ہیں۔ میرے والدین کے آبائی گھر کے قریب جو مشرقی پنجاب کے شہر سرہند میں واقع ہے میں سدنا قصائی مسجد ابھی بھی موجود ہے۔ یہ مسجد ایک عرصے تک ویران رہی۔ اسی سال یعنی 2023ء میں یہ مسجد آباد ہو گئی ہے۔ اس میں پنج گانہ نماز بھی ہوتی ہے۔ اس میں بہت بڑا ہاتھ تو سید محمد شعیب صاحب کا ہے جو مجدد الف ثانی کے مزار کے ذمہ دار ہیں۔ مجھے بھی اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ جس پر میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اس پر ہم سب اللہ کا بے حد شکر ادا کرتے ہیں۔

یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جن سکھوں نے مساجد کی بے حرمتی کی، آج کے دن تک کسی بھی سکھ نے ان کے اس فعل کی تعریف نہیں کی، بلکہ اس کی سخت مذمت کی ہے۔ وہ کسی بھی کتاب میں ایسے واقعات کی تعریف نہیں کرتے۔ جبکہ دوسری طرف مسلمان ایسے تمام لوگوں کو اپنا ہیرو تسلیم کرتے ہیں، جنھوں نے مندر اور گردوارے گرائے بھی اور ان کی بے حرمتی بھی کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم میں سے اکثر انھیں بت شکن کا خطاب دیتے ہیں۔ اورنگزیب کو تو ایک ولی کا درجہ دیتے ہیں۔ میں نے کسی بھی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب میں واضح طور پر ایسے لوگوں کے ان کارناموں کی مذمت لکھی نہیں دیکھی۔ آپ نے اگر دیکھی ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔

میں یہ سب جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ میرا مذہب اسلام جو میں نے پڑھا ہے وہ کسی بھی فرقے کی عبادت گاہ کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ محمود غزنوی کے اور بہت سے کارنامے ہوں گے، لیکن مندر گرانا، اس کا ایسا فعل ہے جس کی میں تعریف نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں مغل گورنر کا گولڈن ٹیمپل کے تالاب کو گندہ کرنے جیسے عمل کو پسند کر سکتا ہوں، نہ مسجد قوت الاسلام بنانے کے لیے قطب الدین ایبک کا کئی مندر گرانے جیسے فعل کو درست سمجھتا ہوں۔ جہاں میں سکھوں اور ہندوؤں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے جیسے فعل کی مذمت کرتا ہوں، وہیں پر میں مندروں اور گردواروں کی بے حرمتی کی بھی مذمت کرتا ہوں۔ وہ خواہ کسی نے بھی کی ہو۔

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس سارے عرصے میں کہیں بھی چرچ کی بے حرمتی کا واقعہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

سوائے اس کے کوئی اور کچھ نہیں کہ اس وقت چرچ کے رکھوالے ہاتھ میں بندوق بھی رکھتے تھے اور گلے پر انگوٹھا بھی!

چرچ کی بے حرمتی کا حوصلہ نہ کسی سکھ کو ہوا، نہ ہی کسی مسلمان کو اور نہ کسی ہند کو۔ حتیٰ کی تقسیم ہند کے وقت، بے حد و حساب قتل ہوئے، مال و دولت لوٹا گیا، لیکن دونوں ممالک میں عیسائی ہر طرح سے محفوظ رہے، کیونکہ اس وقت حاکم عیسائی تھے۔

اب ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جب پشاور پر ایک دفعہ سکھوں کا قبضہ ہو گیا، تو اس کے بعد امیر دوست محمد خان کی طرف سے شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ اس سلسلے میں کئی جنگیں بھی ہوئیں لیکن افغان، کبھی بھی پشاور پر دوبارہ قابض نہ ہو سکے۔ پنجاب پر رنجیت سنگھ کی حکومت کے بعد، کبھی بھی افغانوں میں ہندوستان پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔ دوسری اینگلو سکھ جنگ میں سکھوں کی شکست کے بعد اور خاص طور پر مہاراجا رنجیت سنگھ کی موت کے بعد برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے پشاور کو برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا، اور پشاور کا چوتھا دور شروع ہو گیا۔ اس وقت تک تاج برطانیہ کی حکومت کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ انگریزوں کی ایک تجارتی کمپنی کر رہی تھی۔ یعنی ہمارے حاکم وہ تھے، جو ایک تاجر کے روپ میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کی سامان کی بوریوں کے نیچے بندوق بھی تھی، جو ہمارے حکمرانوں کو نظر نہ آئی۔

سکھوں کی حکومت اس وقت تک برقرار رہی جب تک رنجیت سنگھ زندہ رہا۔ اس کی موت کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو ہر میدان میں شکست دی اور پشاور پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے دور میں ایک بڑی تعداد میں سکھ پشاور میں آباد ہو گئے۔ اب بھی سکھ ایک مناسب تعداد میں پشاور میں رہ رہے ہیں۔

پشاور، انگریز اور قیامِ پاکستان

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ 1849ء میں دوسری اینگلو سکھ جنگ میں سکھوں کی شکست کے بعد پنجاب کے ساتھ ساتھ پشاور کے ارد گرد کے علاقے بھی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آ گئے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے اس علاقے میں اپنی فوجی چھاؤنی قائم کی اور ایک بڑی تعداد میں اپنے فوجی یہاں رکھے۔ یاد رہے کہ برطانوی فوج میں اکثریت ہندوستانی فوجیوں کی ہوتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر افسر انگریز ہی ہوتے تھے۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں پشاور میں چالیس ہزار سے زائد ہندوستانی فوجیوں کو غیر مسلح کیا گیا تھا۔ اس لیے اس جنگ میں یہاں پر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مقامی سرداروں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ ایسا تو ہندوستان بھر میں ہوا تھا۔

یہ بات بھی جاننے کے لائق ہے کہ انگریزوں کا قبضہ صرف شہر تک محدود تھا۔ ارد گرد کے وسیع علاقوں پر کابل ریاست کا ہی قبضہ تھا۔ یہ تو آپ کو یاد ہو گا، کہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا فیصلہ کرنے کی خاطر برطانوی ہندوستانی حکومت کے خارجہ سکریٹری سر مورٹیمر ڈیورنڈ کو ذمہ داری دی گئی تھی۔ اس نے اس وقت کے افغان حکمران عبدالرحمٰن خان کے ساتھ مل کر برطانوی زیر کنٹرول علاقوں اور افغانستان کے درمیان ایک سرحد کا فیصلہ کیا تھا، جسے ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے۔

انگریزوں نے جس طرح ہندوستان کے دیگر شہروں میں ترقیاتی کام کیے، اسی طرح انھوں نے پشاور میں بھی کیے۔ شہر کے مغرب میں ایک وسیع چھاؤنی قائم کی، پشاور تک ریلوے لائن بچھائی، محبت خان مسجد کی تزئین و آرائش کی، جسے سکھوں نے بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کی خوشی میں ایک کلاک ٹاور بھی تعمیر کیا اور 1906ء اسی طرح وکٹوریہ ہال (جو اب پشاور میوزیم کا گھر ہے) بھی تعمیر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایڈورڈز کالج اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر اسلامیہ کالج کی بنیاد بھی رکھی۔ ایک وقت وہ بھی آیا

جب انگریزوں نے اس علاقے کی اہمیت جانتے ہوئے اور روس کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے اور علاقے کے لوگوں کے دل جیتنے کے لیے 1901ء پشاور اور اس سے ملحقہ اضلاع کو صوبہ پنجاب سے الگ کرکے ایک نیا صوبہ بنادیا گیا اور اسے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا(NWFP) نام دے دیا گیا، جسے بعدہیں بدل دیا گیا اور اب یہ خیبر پختون خوا کہلاتا ہے۔

ہندو مسلم فسادت

پشاور میں ہونے والا ایک اہم واقعہ یہاں 1910ء کے آغاز میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات بھی ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ ہندوؤں کا سالانہ تہوار ہولی اور بارہ ربیع الاوّل کی تاریخ ایک ہی دن آ گئی۔ اس موقعے پر انتظامیہ فسادات رکوانے میں ناکام رہی اور ایک بڑی تعداد لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہوا اور کافی مالی و جانی نقصان بھی ہوا۔ اس موقع پر مسلم اور ہندو برادری کے رہنماؤں کی جانب سے پُرامن رہنے کی اپیل بھی کی گئی، لیکن کچھ شر پسند لوگ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے فسادات کو بڑھانے میں آگے آگے تھے۔ حتیٰ کہ دور دراز کے قبائلی علاقوں کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔

میں نے پاکستان بھر کے شہروں کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ دیکھا کہ ہر شہر میں کبھی نہ کبھی فرقہ وارانہ فسادات ضرور ہوئے ہیں۔ اس طرح کے فسادات کو بنیاد بنا کر دو قومی نظریہ کو پروان چڑھایا گیا، جس نے تقسیم ہند کی مانگ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد

قیامِ پاکستان کے بعد ایک بڑی تعداد میں پشاور سے ہندکو بولنے والے ہندو اور سکھ چلے گئے، جس سے پشاور کی معیشت کو کافی نقصان پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پشاور میں کاروبار کا بڑا حصہ ہندوؤ ں اور سکھوں کے پاس تھا۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ہی پشاور یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ تقسیم کے وقت پشاور شہر کا بیشتر حصہ ایک فصیل کے اندر واقع تھا۔ اس فصیل میں سولہ دروازے تھے۔

پشاور کی اہمیت اسوقت بے حد بڑھ گئی جب 1960ء کی دہائی میں، پشاور میں امریکہ نے سوویت یونین کی جاسوسی کے لیے سی آئی اے کا ایک اڈہ بڈھ بیر کے مقام پر بنایا۔ (اس کا تفصیل سے ذکر اگلے صفحات میں پیش کیا جائے گا)۔

اگر آپ کو یاد ہو کہ 1970ء کے آس پاس یورپ سے ہپی لوگوں کا پاکستان میں آنا شروع ہوا، ان کا پہلا پڑاؤ پشاور ہی ہوتا تھا۔ روس کے خلاف جنگ کے دوران پشاور میں ایک

بڑی تعداد میں افغان مہاجرین کے کیمپ قائم کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی تربیت کے لیے کئی مرکز بھی بنائے گے۔ مجاہدین کی ہر بڑی تنظیم کا ایک دفتر پشاور میں بھی ہوتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق افغانستان سے آنے والے مہاجرین کی ایک چوتھائی ضلع پشاور میں آباد تھی جس سے شہر میں کئی قسم کے مسائل بھی پیدا ہوئے۔

اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا سال ہو جب پشاور شہر پر قیامت نہ ٹوٹی ہو۔ اس دوران مزارات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے، چرچوں پر بھی حملے ہوئے۔ حتیٰ کہ 2014ء میں پشاور میں آرمی پبلک اسکول میں ایک بڑی تعداد میں بچوں کو شہید بھی کیا گیا۔ شیعہ مساجد پر بھی حملے کیے گئے۔ حال ہی (جنوری 2023ء) میں پشاور پولیس لائن پر حملہ ہوا جس میں سو سے زائد لوگ شہید ہو گئے۔ آرمی پبلک سکول کے بچوں کی شہادت پر عظیم حیدر سید کی ایک نظم:

سکونِ دل گیا نظروں سے سب قطارے گئے

چمن میں کھلتے ہوئے جب سے پھول مارے گئے

ہوائے موت ذرا دیر کیا ادھر آئی

کہ میرے ہاتھ سے اڑ کر مرے غبارے گئے

یہ کیسی کربلا برپا ہوئی پشاور میں

لہو میں ڈوبے ہوئے میرے بچے مارے گئے

انہیں ہی مرتبہ ملتا ہے جا کے جنت میں

حصولِ علم کی خاطر جو جان وارے گئے

چمن اجاڑنے والو تمہیں خدا سمجھے

تمہیں نہ آئی حیا پھول تو ہمارے گئے

رہے گا یاد ہمیں آنے والی نسلوں تک

وہ نقشِ پا جو یہاں خون سے ابھارے گئے

سلام میرا عظیمؔ ان شہید بچوں کو

جو اپنی جیت کی خاطر بھی جان ہارے گئے

پشاور جو کبھی پھولوں کا شہر تھا اس پر وہ وقت بھی آیا کہ شہید ہونے والے لوگوں کی میتوں پر ڈالنے کے لیے پھول بھی دستیاب نہیں تھے۔۔۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کسی بھی شہر کی اتنی بری قسمت نہ ہو جتنی پشاور کی ہے۔۔۔

اللہ کرے کہ پشاور پھر سے پھولوں کا ایک شہر بن جائے! آمین!

ساغر صدیقی نے ایسے ہی کسی شہر بارے کہا تھا؛

اب شہر آرزو میں وہ رعنائیاں کہاں

ہیں گل کدے نڈھال بڑی تیز دھوپ ہے

قدیم دَور کا پشاور جو اب بھی قائم ہے

میں نے ہندوستان میں واقع اکثر پرانے شہروں کو دیکھا ہے کہ وہ ایک چار دیواری میں بسائے گئے تھے، جیسے دہلی، ملتان، آگرہ، پشاور، بنوں اور اس کے علاوہ بھی کئی۔ اسی طرح پشاور کے بھی چاروں طرف ایک دیوار ہے اور اس کے ایک کونے میں ایک قلعہ بھی واقع ہے۔ لاہور اور دہلی کی طرح یہ کسی بڑے دریا کے کنارے تو نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کسی وقت یہاں ایک ندی ضرور موجود تھی۔ (اس کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے)۔ دریائے کابل، اس کے مشرق میں کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر بہتا ہے۔

ایک ناشتہ اندرون پشاور

مارچ 2023ء میں پشاور جانا ہوا۔ اس بار میرے ساتھ عزیزم شعیب ہاشمی بھی تھے۔ ان کے ایک دوست حسنین رضا صاحب پشاور میں رہتے ہیں۔ حسنین رضا صاحب کا تعلق اندورن پشاور سے ہے۔ اب تو انھوں نے بھی اپنا گھر شہر سے باہر ایک نئی کالونی میں بنا لیا ہے۔ ان کے ساتھ طے ہوا کہ ایک روز ناشتے کے لیے اندرون پشاور جایا جائے اور ناشتے کے بعد اندرون پشاور کی سیر بھی کی جائے۔

ہم کوئی نو بجے کے قریب ان کے ساتھ اندرون پشاور چلے گئے۔ انھوں نے ایک زیرِ تعمیر پلازہ میں گاڑی پارک کی، اور ہم قریب ہی ایک چوک میں موجود حلوہ پوری (اندرون لاہور کے لوگ اپنے ڑکے تلفظ کی وجہ سے اسے پوڑی کہتے ہیں) کی دکان پر چلے گئے، وہاں کافی رش تھا۔ ہم قریب ہی ایک ڈھابہ نما ریستوران میں فرش پر بچھے قالین پر بیٹھ گئے۔ وہیں ہم نے ناشتہ کیا اور اس کے بعد شہر کی سیر کرنے چل پڑے۔ پرانی عمارتیں، تنگ گلیاں اور خوبصورت چھجے، یہ سب دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں، جس گھر میں میری پیدائش ہوئی تھی، وہ بھی ایک ہندو کا بنایا ہوا ہی گھر تھا۔ اس گھر کی لکڑی کی بنی بالکونی اب بھی موجود ہے۔ اندرون پشاور میں ایسے گھر دیکھ کر اپنا گھر بھی یاد آ گیا۔

یہ سب دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں لاہور، پشاور، ملتان اور دیگر قدیم شہروں میں ایک ہی طرز کے مکان بنائے جاتے تھے۔ یہ اس دور کا ہندوستانی طرزِ تعمیر تھا۔ ابھی انگریزوں کے طرزِ تعمیر یا اٹالین طرزِ تعمیر سے متاثر ہو کر گھر بننے شروع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ اس وقت مغلیہ طرزِ تعمیر بھی عام نہیں ہوا تھا۔

اندرون پشاور میں کیا کچھ دیکھا، اس کا تذکرہ بھی اور جو نہیں دیکھ سکے اس کا تذکرہ بھی پیشِ خدمت ہے۔

اندرون پشاور اور دلکش قدیم عمارتیں اور بازار

اندرون پشاور کے متعلق ایک انتہائی مفید مضمون احمد سہیل نے لکھا ہے [1]۔ ان کے علاوہ مجھے مرتضیٰ کمال کا ایک مضمون بھی پڑھنے کا موقع ملا [2]۔ میں نے ان مضامین کے علاوہ بھی کئی اور لوگوں کی تحریروں اور اندرون پشاور کی سیر کے دوران اپنے مشاہدے کی بنیاد پر جو کچھ جان سکا، آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

نمک منڈی جو لاہور کی فوڈ سٹریٹ جیسی ہے

یہاں کا سب سے قدیم بازار قصہ خوانی بازار ہے۔ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہاں قصہ سنانے والے بیٹھے تھے۔ اس کے قریب ہی نمک منڈی واقع ہے۔ اب بھی جب پشاور جانا ہوتا ہے، تو جناب خالد وقاص صاحب صدر الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا، ہمیں نمک منڈی ہی میں کھانا کھلانے لے کر جاتے ہیں۔ اب یہ بازار بے حد مصروف ہو گیا ہے اور خاص طور پر یہاں کھانے پینے کی بہت زیادہ دکانیں بن چکی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارا شہر یہاں گوشت کھانے آیا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ آپ کو اس بازار میں ڈھونڈے سے بھی سبزی یا دال نہیں ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر ڈرائی فروٹ کی بھی ایک بڑی مارکیٹ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں کوئی پندرہ سال پہلے اندرون پشاور آیا تھا، اس وقت میرے ساتھ ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل صاحب بھی تھے۔ ہم نے نمک منڈی میں موجود ایک پرانی

---

[1] قصہ مختصر: سیر بازار قصہ خوانی کی---سہیل احمد
/https://www.mukaalma.com/42150

[2] https://urdu.app.com.pk/urdu/پشاور-کا-قصہ-خوانی-بازار-قافلے-اور-قصہ-گو

سرائے میں بیٹھ کر کچھ وقت بھی گزارا تھا اور قہوہ بھی پیا تھا۔ میں نے اس وقت کی نمک منڈی اور اب کی نمک منڈی میں بہت زیادہ فرق محسوس کیا۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں ۔۔۔

جب ترقی ہو گی تو کچھ تو ڈھانا پڑے گا!

نمک منڈی اور قصہ خوانی کے بازار میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اگر آپ اندرون پشاور میں کسی ایک طرف سے داخل ہو جائیں تو دوسری طرف تک جانے کے لیے کوئی زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا۔ میرے خیال میں اندرون پشاور رقبے کے لحاظ سے ایک کافی چھوٹا علاقہ ہے۔

نمک منڈی میں جو گوشت کھانے کو ملتا ہے، اس میں بھیڑ، بکرے اور دنبے کا گوشت سب سے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ مجھے افغانستان اور ایران میں کئی شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کے گوشت پکانے اور پشاور میں گوشت پکانے میں بے حد فرق ہے۔ افغانستان اور ایران میں مرچ مصالحے نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ گھی یا تیل بھی بہت ہی کم ہوتا ہے، جبکہ ہمارے ہاں اس کے الٹ ہوتا ہے۔

یہاں میں ایک دلچسپ بات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ ہندو، سکھ، بدھ اور جین لوگ گوشت نہیں کھاتے (یہ بات مذہبی طور پر منع ہے لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ کھاتے ہیں) ۔ اسی وجہ سے تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ہاں پنجاب میں بھی گوشت کا استعمال بہت کم تھا۔ ہندو اور سکھ متحدہ پنجاب کا کوئی پینتالیس فیصد تھے۔

یہ بات شاید آپ ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، لیکن میں اس کا عینی شاہد ہوں کہ تقسیم پنجاب سے پہلے پنجاب کے دیہات میں بہت کم سالن پکایا جاتا تھا۔ لوگ دودھ، دہی، لسی ، چٹنی وغیرہ کے ساتھ روٹی کھاتے تھے۔ اگر سالن بنتا بھی تھا تو اس میں کوئی زیادہ مصالحے نہیں ہوتے تھے۔ نمک، مرچ اور ہلدی ہی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ میری والدہ محترمہ بھی ایسے ہی کھانے بناتی تھیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد میں لوگ دہلی، یوپی، سی پی، بہار اور دیگر مقامات سے آئے۔ یہ لوگ تیز مرچ مصالحے والے کھانے شوق سے کھاتے تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تیز مرچ مصالحے والے کھانے بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مقامی لوگوں نے تیز مرچ مصالحے والے کھانے پکانے شروع کر دیے۔

میں جب 1980ء میں پشاور گیا تھا اس وقت اتنی زیادہ کڑاہی گوشت کی دکانیں نہیں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت ہم نے ایک جگہ سے کھانا کھایا تھا۔ باورچی نے گوشت کی چربی ہی میں گوشت بھونا تھا اور اس میں صرف نمک ڈالا تھا۔ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تیز مرچ مصالحے والے کھانے دہلی اور ارد گرد سے ہجرت کرکے آنے والوں کی بدولت ہی اب پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ حتیٰ کہ پشاور میں اب ایسا ہی کھانا ملتا ہے۔ میں نے کئی جگہ یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی کبھی خشک گوشت پر میوہ جات بھی چھڑکائے جاتے ہیں۔

عام طور پر تکہ، کڑاہی (تلا ہوا گوشت) اور دمپخت (ابلا ہوا گوشت) اور کباب پسندیدہ ڈشز ہیں۔ یہاں پشاور کی روایتی چپلی کباب (قیمہ بنایا ہوا گوشت) اور کابلی پلاؤ (گوشت کے ساتھ چاول، خشک میوہ جات، اور بھنی ہوئی گاجر) کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی اور آج سے پہلے بھی دنیا بھر کا ہر ڈاکٹر تیز مرچ مصالحے، برگر، شوارما، سینڈوچ وغیرہ کھانے سے پرہیز ہی بتاتا ہے۔۔۔

لیکن جب سب تیز مرچ مصالحے والے کھانوں کی خوشبو ہو، تو پھر ڈاکٹر کی کون سنتا ہے!

اسی بازار میں کھانے کے بعد آپ کے معدے میں مرچ کی جلن دور کرنے لے لیے قلفی اور فالودہ کی دکانیں بھی موجود ہیں۔

ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ لاہور میں آج بھی لوگ کھانا کھانے کے لئے اندرون لاہور جاتے ہیں۔ اسی طرح سے جب بھی ہم پشاور گئے، تو دوست ہمیں اندرون پشاور یعنی نمک منڈی ہی لے کر گئے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تو معلوم نہیں لیکن یہ ایک وجہ کہی جا سکتی ہے کہ یہاں پر قدیم دور سے یہ دکانیں موجود تھیں، آبادی بھی زیادہ تھی اور لوگ کھانے پینے کے بھی شوقین تھے، اس لیے دکانیں ایک عرصہ سے چل رہی ہیں۔ قصہ خوانی بازار میں ایک خاندان کوئی سو سال سے اپنی قہوے کی دکان چلا رہا ہے۔ ہمارے ہاں لاہور میں بھی ایسی بے شمار کھانے پینے کی دکانیں ہیں، جو سو سال پہلے قائم کی گئی تھیں۔

ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت پشاور میں ہندکو بولنے والے ایک کثیر تعداد میں رہتے تھے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت پشاور کی بولی ہندکو ہی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر اندرون پشاور ہی میں رہتے تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی تھی، جو یہاں سے نقل مکانی کرکے بھارت چلے گئے یا کسی نے انھیں زبردستی

بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد بہت سے لوگ خیبر پختونخوا کے دیگر علاقوں سے پشاور میں نقل مکانی کر کے آ گئے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، اب قصہ خوانی بازار اور نمک منڈی، جدید مارکیٹیں بن گئی ہیں۔

نہ کوئی قصہ گو ہیں اور نہ کوئی سننے والے،

نہ کوئی نمک بیچنے والا نہ کوئی خریدنے والا،

نہ کوئی یہاں قافلہ رکتا ہے،

نہ کوئی یہاں اپنے گھوڑے اور اونٹ بٹھاتا ہے،

سب کچھ بدل گیا ہے،

دنیا نام ہی بدلاؤ کا ہے،

وہ جو ہمارے علامہؒ اقبال صاحب نے کہا ہے:

سکُوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

پوری نظم کچھ یوں ہے:

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحَر تجھ کو
مآلِ حُسن کی کیا مِل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نُور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھّی سی جان ڈرتی ہے!
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے، دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل
عدم، عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے!
سکُوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

سیٹھی محلّہ: جہاں ایک انتہائی خوبصورت گھر بھی ہے

ہم حسنین رضا صاحب کے ساتھ چلتے چلتے اس محلے میں پہنچے، جہاں مجھے جانے کا بے حد شوق تھا، یعنی سیٹھی ہاؤسز۔

ہم ناشتے سے فارغ ہو کر سیٹھی محلے کی طرف چل پڑے۔ سیٹھی محلے پہنچ کر ہم نے یہاں پر واقع ایک بڑے مکان کو اندر سے دیکھنے کی کوشش کی جس کا ذکر بارہا سنا تھا۔ جہاں کلچر شو بھی منعقد ہوتے ہیں اور اس کی بے شمار ویڈیوز بھی دیکھنے کا موقع بھی ملا، جسے سیٹھی ہاؤس کہتے ہیں۔اس دن چھٹی تھی جس کی وجہ سے ہم اس عمارت کو اندر سے تو نہ دیکھ سکے۔ چوکیدار نے اپنا فرض ادا کیا اور ہمیں اندر سے اس کی ایک جھلک دیکھنے کی بھی اجازت نہ دی۔ البتہ ہم اس کے باہر کافی دیر تک کھڑے رہے۔ باہر سے منظر بھی کوئی کم لاجواب نہ تھا۔

اس دوران ہم نے گلی میں دیکھا کہ کئی مکانات پہلی، دوسری اور تیسری منزل سے گلی کے اوپر سے ایک دوسرے سے ایک لکڑی کے پل کی مدد سے ملے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بالکل یہ احساس نہ ہوا کہ میں لاہور میں ہوں یا اندرون دلی۔ مجھے ان تینوں شہروں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان شہروں کا اس دور کا طرز تعمیر بالکل ایک ہی جیسا ہے۔ درحقیقت یہ ایک ہندوستانی طرز تعمیر ہے۔ بعد میں وسط ایشیاء سے آنے والے مغلوں نے ایک نیا طرز تعمیر متعارف کروایا۔ پختون لوگوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کو مجھے زیادہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا، شاید بنائی ہی کم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مغلوں کے طرزِ تعمیر کو ہم نے اسلامی طرزِ تعمیر کا نام دیا ہے۔ جبکہ یہ وسط ایشیاء کا طرز تعمیر ہے۔ کیونکہ اسے متعارف کروانے والے مسلمان تھے، اس لیے ہم نے اسے اسلامی کا نام دے دیا۔ مغلوں کی اکثر عمارتوں کے ڈیزائنر وسط ایشیاء یا ایران سے آئے

ہوئے لوگ تھے۔ جبکہ اسلام کا آغاز تو عرب سے ہوتا ہے۔ وہاں کے طرزِ تعمیر کو اسلامی کہا جانا چاہیے۔ اس لیے میں مغلوں کے دور کی بنی ہوئی عمارتوں کو مغلیہ طرزِ تعمیر کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کرتے ہوں۔

سکھوں نے زیادہ تر اپنے گردوارے ہی بنائے۔ ان کے ہاں بہت زیادہ باغات اور بڑے محلات کم ہی ملتے ہیں۔ ہندوؤں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ البتہ ان کے بنائے ہوئے کئی محلات بے حد قابلِ دید ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں بے شمار عمارتیں بنائی۔ جن میں کئی سو کے قریب تو ریلوے اسٹیشن ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار یونیورسٹیز اور کالجز کی عمارات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عدالتوں اور ڈاک خانے کی عمارتیں بھی شامل ہیں۔ دور دراز علاقوں میں ٹھہرنے کے لئے گیسٹ ہاؤسز بھی بنائے۔ اس طرح سے انگریزوں کے دور کی بے شمار عمارتیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

سیٹھی ایک برادری کا نام ہے۔ اس نام کے کئی لوگ لاہور میں بھی رہتے ہیں۔ اس خاندان کا پشاور کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تجارت اور فلاحی کاموں میں ایک اہم کردار رہا ہے۔ یہ ایک کامیاب تاجر مانے جاتے تھے۔ اس خاندان نے شہر بھر میں کئی فلاحی اداروں کے ساتھ تعاون کیا ہے، جن میں لیڈی ریڈنگ اسپتال، اسلامیہ کالج مسجد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ضرورت مندوں کی خدمت میں بھی آگے آگے تھے۔

سیٹھی محلّہ در حقیقت سیٹھی برادری کے انیسویں صدی کے ایک نہایت ہی سلیقے اور ترتیب سے بنائے گئے گھروں کا محلّہ ہے۔ سیٹھی محلے کے متعلق میر ثناءاللہ خان کا ایک مضمون بہت مفید ہے[1]۔ وہ کہتے ہیں کہ محلے میں سات بڑے گھر تھے۔ یاد رہے کہ پنجاب میں بڑے گھر کو حویلی کا نام دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے بعد اس طرح کے گھروں کو کوٹھی کہا جانے لگا۔ دیہات میں اسے ڈیرہ بھی کہتے تھے۔ پختون لوگ حجرہ کہتے ہیں۔

میر ثناءاللہ خان لکھتے کہ سیٹھی، پنجاب سے آکر یہاں بسنے والا ایک ہندو تاجر خاندان تھا۔ اس کا آبائی وطن جہلم تھا۔ جہاں سے یہ لوگ انیسویں صدی میں پشاور منتقل ہوگئے۔ یاد رہے کہ یہ وہی دور ہے جب انگریز پشاور پر قابض ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ لاہور، راولپنڈی اور جہلم وغیرہ میں اپنی فوجی چھاؤنیاں بنا چکے تھے۔ اس دور میں وہ پشاور میں

---

[1] https://www.youlinmagazine.com/article/reminiscent-of-a-glorious-past-sethi-mohallah-peshawar/NDUz

چھاؤنی بنا رہے تھے، جس کے لیے وہ مقامی لوگوں کی بجائے ان علاقوں سے لوگوں کو لا کر بساتے تھے، جو ان کے ساتھ پہلے سے کام کرتے آ رہے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا کہ انگریزوں نے لاہور، جہلم اور راولپنڈی سے لوگوں کو یہاں لا کر بسایا اور ان کی مدد بھی کی۔ میرا خیال ہے کہ سیٹھی لوگ بھی اسی طرح سے پشاور آئے۔ اسی کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں ہندکو بولنے والے پشاور کا حصہ بنے۔ میرے ایک عزیز دوست صوفی خلیق بٹ صاحب جن کا سارا خاندان لاہور میں رہتا ہے، کے کئی رشتہ دار پشاور میں رہتے ہیں۔ میں ان کے گھر بھی گیا ہوں۔ یہ لوگ انگریزوں کے دور سے ہی پشاور میں آباد ہیں۔

یہ میرا خیال ہے۔۔۔ کہاں تک درست ہے، معلوم نہیں۔۔۔

سیٹھی لوگ اُس وقت روس اور وسطی ایشیاء تک تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ میں نے محترم ڈاکٹر فرید پراچہ کی آپ بیتی میں پڑھا ہے، کہ ان کے دادا کی مزار شریف میں دکانیں تھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ اس وقت پنجاب سے تاجر افغانستان سمیت وسطی ریاستوں تک کاروبار کے لیے جاتے تھے۔ سیٹھی خاندان کے برطانوی حکمرانوں سے اچھے تعلقات تھے۔ جس کی وجہ سے انگریزوں نے انھیں تجارتی لائسنس بھی دے رکھے تھے۔ ان کا اصل کام لکڑی کی تجارت تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ بہت بڑی بڑی کوٹھیاں بنانے کے لیے بھی مشہور تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامیہ کالج پشاور کے ڈیزائن میں بھی ان کا بے حد عمل دخل ہے۔

پھر ایسا کیا ہوا، کہ سیٹھی خاندان کو ایک بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی وجہ بنی روسی انقلاب، جس کی وجہ سے وہ دیوالیہ ہو گئے۔ سیٹھی محلے میں وہ گھر جہاں ڈائریکٹوریٹ آف آرکیالوجی کا دفتر قائم ہے، سیٹھی کریم بخش نے بنایا تھا۔ یہ گھر کوئی ڈیڑھ کنال پر پھیلا ہوا ہے۔ گھر کی تین منزلیں ہیں؛ تہہ خانہ، دالان اور بالاخانہ۔ کہتے ہیں کہ اس گھر کی تعمیر میں کوئی پچاس سال لگے۔ مجھے یہ بات مبالغہ لگتی ہے۔

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ میر ثناء اللہ خان کے بقول سیٹھی لوگ ہندو تھے، جبکہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس حویلی کی تعمیر سیٹھی کریم بخش نے کی۔ اس میں کچھ مغالطہ لگتا ہے۔ شاید یہ لوگ بعد میں مسلمان ہوئے۔

یہاں میں ایک اور بات بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ایسی بہت سی برادریاں اور ذاتیں ہیں جو آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں پائی جاتی ہیں، جیسے میرا

قبیلہ یا ذات تو جاٹ ہے اور گوت (جسے ہم انگلش میں سر نیم بھی کہتے ہیں) مانگٹ ہے۔ مانگٹ نام کے بے شمار لوگ ہندو بھی ہیں اور سکھ بھی۔ اسی طرح اور بہت سے نام ہیں، مثال کے طور پر راجپوت، چوہان، چیمے، باجوہ، کمبوہ وغیرہ جو مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں سب میں ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے ہندو تھے بعد میں یہ لوگ مسلمان یا سکھ ہو گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ کئی سکھ بھی بعد میں مسلمان ہوئے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی ہندو یا سکھ کا تعلق کسی بھی پختوں قبیلے سے نہیں ہے، یعنی کوئی مشترکہ گوت یا سر نیم نہیں ہے۔ جیسا پنجاب، گجرات، بنگال، راجستان کے علاوہ بھی لوگوں میں ہے، نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو، اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ۔

اسی طرح سیٹھی خاندان متعلق بھی جاننے کو ملا (نجم سیٹھی ایک مشہور صحافی بھی ہیں)۔ سیٹھی قوم متعلق جاٹ لینڈ پر ایک مضمون پڑھنے کو ملا[1]۔ اس کے مطابق سیٹھی جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ یہ سیٹھ سے نکلا ہوا ایک لفظ ہے۔ عام طور پر پنجاب اور راجستھان میں جاٹ سکھ قبیلوں میں سیٹھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے، کہ یہ ہندو سیٹھی کا گھر، کسی مسلمان سیٹھی نے بنایا ہو۔ ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی وہ بھی سیٹھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ راجپوت قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قلعہ بالا حصار: ایک پُر شکوہ قلعہ

ایک مرتبہ میں ڈاکٹر اشتیاق گوندل صاحب کے ساتھ پشاور گیا تھا، اس دن ہمیں قلعہ بالا حصار دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یہ ایک بہت ہی شاندار قلعہ ہے۔ میں نے اب تک جتنے بھی قلعے دیکھے ہیں، ان میں سے قلعہ بالا حصار ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔اس کی وسعت، مضبوطی، خوبصورتی اور دفاعی لحاظ سے اس کا محفوظ ہونا اسے ایک انفرادیت بخشتا ہے۔

اس کے بعد بھی کئی بار پشاور جانے کا موقع ملا۔ ایک دفعہ اسے دوبارہ دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن اجازت نہ ملی۔اب بھی شاید ایک یا دو دن کے لیے یہ قلعہ عوام الناس کے لئے کھولا جاتا ہے۔ یہاں پر اب فوج کے کچھ لوگ رہے ہیں۔

---

[1] https://www.jatland.com/home/Jat_History_Dalip_Singh_Ahlawat/Parishisht-I

میرے خیال میں فوج تو کہیں بھی رہ سکتی ہے، ایسی عمارتوں کو عوام الناس کے لئے کھول دینا چاہیے۔ اس کا مطالبہ خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلی نے بھی کیا ہے۔ اس سے جہاں لوگوں کی تفریح کا موقع ملے گا، وہیں پر اس سے اپنی تاریخ سے شناسائی بھی ہو گی۔

ہم قلعے کے مین دروازے سے اندر چلے گئے۔ اسکی چھت بے حد وسیع ہے۔ ہم نے چھت پر کھڑے ہو کر اس کے جنوب کی طرف دیکھا۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ یہ وہی سمت ہے جہاں سے قبائلی لوگ حملہ کرتے تھے۔ یہیں پر آزادی کے متوالوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔

یہ سب یاد کر کے۔۔۔

دل ایک مرتبہ افسردہ تو ہوا۔۔۔

ان شہیدوں کے لیے دعا تو ہر وقت کی جا سکتی ہے۔۔۔

سو وہ تو کی!

قلعہ بالا حصار کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

قلعہ بالا حصار کے متعلق کئی مضامین دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے سب سے زیادہ معلومات history.fandom.com سے ملیں [1]۔ جو پڑھا، جو دیکھا اور جو سمجھا وہ سب پیشِ خدمت ہے۔

بالا حصار، ایک فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ایک اونچا حصار (حصار کو دیوار بھی کہا جاتا ہے)۔ عام طور پر حصار کا لفظ قلعے کے لیے استعمال نہیں ہوتا، لیکن یہاں اس سے یہی مراد ہے۔

قلعہ بالا حصار، سرخ اینٹوں سے بنا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ پندرہ ایکڑ پر محیط ہے (لاہور کا بادشاہی قلعہ انچاس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے)۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسے مغل شہنشاہ ہمایوں نے بنوایا تھا۔ میرے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں حکمران بنتا ہے، لیکن اس کا زیادہ وقت تو شیر شاہ سوری کے ڈر سے ہندوستان سے باہر ہی گزرتا ہے۔ دوبارہ اقتدار ملنے کے چند سال بعد ہی اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اس کی تعمیر کا آغاز

---

[1] https://military-history.fandom.com/wiki/Bala_Hissar,_Peshawar

اس کے دور میں ہوا ہوگا۔ یہ بھی درست ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ابدالی خاندان جس کا سرمائی صدر مقام پشاور ہوتا تھا، اس قلعے کو رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بعد میں کئی لوگوں نے اس کی تعمیر میں بہتری کی اور کئی لوگوں نے اسے تباہ کرنے کی کوشش بھی کی۔

ہم نے اس کے اندر آرٹلری میوزیم بھی دیکھا جس میں اس دور میں فرنٹیئر کور کے زیرِ استعمال یونیفارم اور ہتھیاروں کو رکھا گیا ہے۔ جس سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ وہ ہتھیار ہیں، جن کی مدد سے انگریزوں نے حریت پسند مجاہدین کو شہید کیا۔

یاد رہے یہ ہتھیار تو ولائتی تھے، لیکن انھیں چلانے والے سبھی لوگ ہندوستانی تھے، جن میں اس علاقے کے پختون بھی شامل تھے۔

حکم انگریز کا، ہتھیار انگریز کا، گولی انگریز کی، چلانے والا ہندوستانی سپاہی جس کی تنخواہ ہندوستان کے خزانے سے جو مقامی لوگوں سے ٹیکس اکٹھا کرکے بنایا گیا تھا، دی جاتی تھی ۔۔۔

سامنے گولی کھانے والا بھی ایک ہندوستانی ۔۔۔

جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔۔۔

پھر بھی کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ انگریزوں کا دور اچھا تھا۔۔۔

یعنی دورِ غلامی ۔۔۔

مجھے تو بھوک پسند ہے، مگر اس حالت میں جب میں ایک آزاد زندگی گزار رہا ہوں۔۔۔ غلامی کی روٹی سے، آزادی کی بھوک بہتر ہے۔۔۔ یہ میری ایک سوچی سمجھی رائے ہے ۔۔۔ آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ۔۔۔

جنہیں غلامی پسند ہے ان کے لیے صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے۔۔۔

بد قسمتی یہ بھی ہے کہ اسی سوچ کے حامل افراد کی ایک بڑی تعداد قیامِ پاکستان سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ہم پر حاکم ہے !

ایسے لوگوں کو وہ تصویر دیکھنی چاہیے جب انگریز کے دربار میں پیش ہونے کے لیے اس کے مرتبے کے مطابق کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ملتی تھی، کچھ لوگوں کے بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ قلعہ بالا حصار کا نام پختون بادشاہ تیمور شاہ ابدالی (1773–1793) نے رکھا تھا۔ جب پشاور پر سکھوں کا راج تھا تو ہری سنگھ نلوا نے اس کا نام سمیر گڑھ رکھا، لیکن یہ نام زیادہ دیر تک چل نہ سکا (سمیر گڑھ کس وجہ سے رکھا، اس کا ذکر آگے آئے گا)۔

جب ہم قلعے کے مین دروازے سے گزر کر اندر گئے، تو ہمیں یہ پتہ چلا کہ یہ قلعہ پشاور شہر کے شمال مغرب کی طرف واقع ایک اونچے ٹیلے پر بنایا گیا قلعہ ہے۔ کسی وقت میں تو یہ اندرون پشاور سے دور تھا، اب تو اندرون شہر پشاور کا ایک حصہ ہی لگتا ہے۔ اگر آپ دن کے وقت اسے دیکھیں تو آپ پشاور کے آس پاس پہاڑوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ قلعہ بالا حصار کی اونچائی سطح زمین سے کوئی نوے فٹ ہے۔

history.fandom.com کے مطابق معروف مورخ ڈاکٹر اے ایچ دانی نے اپنی ایک کتاب پشاور۔ ہسٹورک سٹی آف فرنٹیئر میں لکھا ہے، کہ یہ جگہ اس وقت بھی موجود تھی جب چینی سیاح ہیوین سانگ نے 630ء میں پشاور کا دورہ کیا تھا۔ اس وقت یہ جگہ ایک شاہی رہائش گاہ تھی۔ ہیوین سانگ کے مطابق یہ قلعہ چاروں طرف سے بند نہیں تھا، بلکہ اس کے ایک طرف کھائی بنائی گئی تھی۔

میں نے اب تک جتنے بھی قدیم شہر دیکھے ہیں، جیسے ملتان، حیدرآباد، سکھر، دہلی، لاہور، پشاور، آگرہ اور اس کے علاوہ بھی کئی، یا تو وہ کسی دریا یا ندی کے کنارے واقع ہیں یا سمندر کے کنارے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اونچی جگہ پر بنائے جاتے تھے۔ ان کی گلیاں بھی تنگ ہوتی ہیں اور گھر بھی ساتھ ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ حفاظتی نُقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا۔

پشاور کے متعلق بھی میرا یہی خیال تھا۔ لیکن مجھے اس کے قریب کوئی دریا یا ندی نہیں ملی۔ اس بارے ڈاکٹر دانی کی یہ بات کہ کسی وقت میں دریائے باڑہ کا ایک حصہ یہاں بہتا تھا، جو قلعہ بالا حصار کے قریب سے گزرتا تھا، جاننے کو ملی۔ اسی وجہ سے ایک اونچے ٹیلے پر یہ قلعہ بنایا گیا، جسے اسی وجہ سے بالا کہا جاتا ہے۔ اس سے میرا یہ گمان بھی درست ثابت ہوا، کہ پشاور بھی جب بسایا گیا تھا، اس وقت اس کے قریب بھی ایک ندی بہتی تھی، جو باڑہ دریا کا حصہ تھی۔ اب ایسا کچھ نہیں۔ پشاور جو چند مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا تھا، اب اندرون پشاور سے باہر کافی دور تک پھیل چکا ہے۔

اس ایک بڑے شہر میں، قدیم پشاور اپنی شناخت کھو رہا ہے، لوگ یہاں سے باہر جا کر آباد ہو رہے ہیں، کلچر بھی اب وہ نہیں رہا۔

اسی کو بدلاؤ کہا جاتا ہے!

بقول history.fandom.com کے ڈاکٹر تاج علی لکھتے ہیں کہ جب ہندو شاہی خاندان کے آخری راجا، جے پال کو محمود غزنوی نے شکست دی تھی، تو محمود غزنوی نے اپنی فوج کے ساتھ اس قلعے کا گھیراؤ کیا تھا۔ اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ مغلوں سے کہیں پہلے آباد تھا۔ ایک مرتبہ افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں بھی یہ قلعہ تباہ ہوا۔ اسی وجہ سے شاید ہمایوں نے اس کی دوبارہ سے تعمیر کی۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی جاننے کو ملی، کہ قلعے کے پاس شالیمار باغ بھی تھا، جو اب اس کے شمال کی جانب واقع تھا اب جسے جناح پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

نام بدلنا تو کوئی ہم سے سیکھے، نیا کچھ نہیں بنانا، بنے ہوئے پر تختی لگانا سبھی جانتے ہیں۔

کیا ہی خوبصورت بات ہے جو مجھے پہلے سے معلوم نہ تھی۔ ایک شالامار (جسے شالیمار بھی لکھا جاتا ہے) لاہور میں ہے، ایک سری نگر میں اور ایک پشاور میں مغلوں کے تعمیر کیے ہوئے باغ ہیں۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب سکھوں نے 1823ء میں نوشہرہ کی جنگ میں جیت حاصل کی اور اس کے بعد قلعہ بالا حصار بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سکھوں نے قلعہ بالا حصار کے کئی حصوں کو تباہ بھی کیا۔ ایک برطانوی افسر کے بقول یہاں ایک کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اس کی کھدائی کر کے یہاں سے ایک بڑی مقدار میں قیمتی اشیاء کو لے جایا گیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا جیسا سکھوں نے لاہور میں بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کے ساتھ کیا۔

یہ کوئی لالچ تھا، انتقام تھا یا پھر ایک پاگل پن، یا پھر تینوں چیزیں۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے، بلکہ آثار قدیمہ کا ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ 1834ء میں جب سکھ پشاور پر قابض ہو گئے تو ان کے سردار ہری سنگھ نلوا نے قلعہ کی تعمیر نو کا آغاز کیا اور اسے سمیر گڑھ کا نام بھی دے دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کے پہلے گرو گرو نانک دیو جی نے اپنے ایک سفر کے دوران کوہ سمر کا دورہ کیا تھا (یہ پہاڑ کہاں واقع ہے، میں کوشش

کے باوجود نہ جان سکا)۔اس لیے اس قلعے کا نام اس پہاڑ کے نام پر رکھا گیا، جو ان کے نزدیک ایک مقدس پہاڑ ہے۔ ہری سنگھ نلوا نے قلعے پر ایک تختی بھی لگوائی، جس پر لکھا تھا:

یہ سمیر گڑھ پشاور شہر میں بلند پایہ مہاراجا رنجیت سنگھ بہادر نے راجا بکرمجیت سمبت 1891 (بکرمجیت یعنی دیسی کیلنڈر) میں اللہ تعالیٰ کی عنایت سے تعمیر کیا تھا۔

ایک بار مئی 1835 میں رنجیت سنگھ نے نئے تعمیر شدہ قلعے کا دورہ بھی کیا، جسے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ انگریزوں نے اس قلعے کو اپنی فوجی مہمات کے لیے استعمال کیا اور اسکی بیرونی دیواروں کی دوبارہ سے تعمیر کی۔اب جب بھی پشاور جانا ہوتا ہے، تو قلعے کے پاس سے گزر تو ہوتا ہے۔اسے دوبارہ سے دیکھنے کی خواہش تو ہے، دیکھتے ہیں کہ خالد و قاص صاحب اسے کب پورا کرنے کا بندوبست کرتے ہیں۔

قلعے کو دیکھ کر بس اتنا کہا جاسکتا ہے؛ بقول آتش علی حیدر

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

پوری غزل کچھ یوں ہے۔

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے

کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں

گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں

مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن

لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

تپ ہجر کی کاہشوں نے کئے ہیں

جدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا

تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد

خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا

توانا کئے ناتواں کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے

تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ترے کلک قدرت کے قربان آنکھیں

دکھائے ہیں خوش روجواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے

مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

یادگار چوک: جسے پشاور کے پہلے انگریز کمشنر نے بنوایا

اندرون پشاور، یادگار چوک بھی ایک اہم جگہ ہے۔ یہ پاکستان بھر میں کرنسی کی ایک بڑی مارکیٹ ہے۔ ہم پشاور کی گلیوں میں چلتے ہوئے ایک بڑے چوک میں پہنچ گئے، جسے یادگار چوک کہا جاتا ہے۔ یادگار بہت بڑے چوک میں واقع ہے۔

یہاں کئی بازار آ کر ملتے ہیں اور اس کے قریب ہی پاکستان کی ایک بہت بڑی کرنسی مارکیٹ بھی موجود ہے۔ اگر آپ یہاں سے گزریں تو آپ جان سکیں گے، کہ یہ شہر کے وسط میں ایک کھلا مقام ہے، جس سے شہر کی آب و ہوا بھی بہتر رہتی ہے۔ اس جگہ پر جلسے جلوس بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے پشاور کا ہائیڈ پارک ہے، جہاں جس کا جو جی چاہے کہے، اسے مکمل آزادی ہے۔ اب اسے کافی بہتر حالت میں بنا لیا گیا ہے۔ یہاں لوگ فارغ اوقات میں آ کر بیٹھے بھی ہیں اور بچوں کے کھیلنے کے لئے بھی جگہ موجود ہے۔

میں نے یہ بات قدیم شہروں میں دیکھی ہے، کہ شہر کے وسط میں ایک کھلا میدان ضرور ہوتا ہے۔ ایسا میدان اس شہر کی پلاننگ کرتے وقت رکھا گیا لگتا ہے۔ اس کا مقصد شہر کو صاف ہوا مہیا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور اس لیے بھی لوگوں کو تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر ایک کھلی جگہ بیٹھنے کا موقع بھی مل سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی جگہ پر حملہ کرنے سے پہلے یہاں فوجوں کو اکٹھا کیا جاتا ہو۔ کبھی یہاں جرگے بھی ہوتے تھے۔ ایسا ہی ایک میدان یہ یادگار چوک ہے۔

اسے پشاور کے پہلے انگریز کمشنر Colonel E C Hastings,d.1884 کے نام پر بنایا گیا تھا۔ یہ یادگار 1883ء کی بنی ہوئی ہے جب کہ کرنل کی موت اس کے ایک سال بعد ہوتی ہے۔ جس سے یہ لگتا ہے اس نے اس یادگار کو اپنی زندگی میں ہی بنوا لیا تھا۔ بعد میں اس جگہ کو 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے شہداء کے نام سے بھی منسوب کیا گیا۔

اس یادگار کا طرزِ تعمیر انگریزوں کی ہندوستان بھر میں بنائی گئی دیگر یادگاروں سے مختلف نہیں ہے۔ یہ ایک اونچے چبوترے پر چاروں طرف دروازے رکھ کر ستون بنائے گئے ہیں، جیسے عام طور پر بارہ دری کے ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک گنبد بنایا جاتا ہے۔ اگر آپ کا تعلق فیصل آباد سے ہے، تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ ریلوے بازار کے باہر اسی طرح کا ایک گنبد بنا ہوا ہے، جسے گمٹی کہا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک مقام آپ کو دہلی میں بھی مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ

بھی کئی اور شہروں میں آپ کو ایسے مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔اس یادگار کا ایک مختصر تذکرہ یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا۔

اس بارے ایک مفید مضمون مجھے ڈان میں پڑھنے کو ملا[1]۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے، اس کے ساتھ ساتھ میں نے کئی اور تحریروں سے بھی مدد لی ہے۔

چوک یادگار میں بنائی گئی یادگار، پشاور کے پہلے برطانوی کمشنر کرنل ای سی ہیسٹنگز نے 1883ء میں تعمیر کی تھی۔ اس کے بعد اسے 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے ہیروز کی یاد میں، پھر سے تعمیر کیا گیا۔ چوک یادگار کا محل وقوع بہت ہی احتیاط سے چنا گیا تھا۔ اس کے قریب کئی اہم بازار جیسے مینا بازار، صرافہ بازار، ادیر شیر، گھنٹہ گھر اور اشرف روڈ موجود ہیں۔

معروف ماہر آثار قدیمہ، مرحوم احمد حسن دانی کے مطابق، اصل یادگار ایک گنبد نما پویلین پر مشتمل تھی، جہاں سیڑھیوں کی مدد سے اوپر جایا جاتا تھا۔ اس وقت یہاں ایک فوارہ بھی تھا۔ چوک یادگار کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہاں کئی نامور شخصیات نے مختلف مذہبی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل پر عوامی جلسے، ریلیاں اور احتجاجی مظاہرے بھی کیے ہیں۔

اس مضمون میں یہ بھی لکھا ہوا ہے، جو میرے لیے بھی ایک حیرانی کا باعث بنا، کہ (ڈاکٹر عادل کے ریفرنس سے) ایک وقت میں یہاں ایک اونچا قدیم درخت تھا، جو بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے بے حد اہم تھا۔ ایک بڑی تعداد میں غیر ملکی بالخصوص جاپانی اور کورین لوگ یہاں آ کر پوجا کرتے تھے۔ پھر ایک دن نئی تعمیرات کی خاطر اس قدیم درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا، یوں ایک مذہبی مقام کو ختم کر دیا گیا۔

کبھی موقع ملے تو اس جگہ جا کر اپنی تاریخ اور قدیم ثقافت ڈھونڈنے کی کوشش کرنا، ہوسکے تو اسے بچانے میں بھی اپنا کردار ادا کرنا، یہ ہم سب پر فرض ہے، بالخصوص اہلِ پشاور پر۔

گور کھتری اور بدھ مت کی باقیات

میں اور شعیب ہاشمی صاحب اپنے میزبان اور دوست حسنین رضا کی قیادت میں، ناشتے کے بعد دائیں طرف سے ہوتے ہوئے تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں سے گزرتے

[1] Remembrance Square forgotten and neglected
https://www.dawn.com/news/581784/remembrance-square-forgotten-and-neglected

ہوتے ہوئے، سیٹھی محلے پہنچے۔ وہاں سے ہم ایک بڑے بازار میں پہنچ گئے۔ اس بازار سے گزرتے ہوئے حسنین صاحب نے بتایا کہ جناب شاکر صدیقی صاحب کا پرانا گھر، اسی علاقے میں ایک گلی میں تھا۔ جناب شاکر صدیقی میرے بڑے مہربان دوست ہیں اور الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا کے سیکریٹری جنرل بھی ہیں۔

بازار میں داخل ہونے کے بعد ہم نے اپنی بائیں طرف دیکھا، ہمیں ایک بڑا گیٹ نظر آیا جو کہ بند تھا۔ گیٹ پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ حسنین صاحب نے بتایا کہ اسے تحصیل گور گھٹڑی کہتے ہیں۔ (میں نے بعد میں اس کے متعلق جب مزید جانا تو پتہ چلا کہ لفظ گور کھتری ہے)۔ ہم دروازے کے پاس کچھ دیر کھڑے رہے۔ ہم نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑا میدان ہے، جس میں باغات کے ساتھ ساتھ کئی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے بعد ہم بائیں مڑ کر واپس آنے لگے، تو ایک جگہ رکے، جہاں لکھا ہوا تھا:

1912

Fire Brigade Municipal Committee, Peshawar

میرے لیے ہر عمارت ہی دلچسپی کا سامان لیے ہوتی ہے، لیکن اگر قدیم بھی ہو تو کیا کہنے۔ یہ عمارت دیکھ کر اس بات کا بھی پتہ چلا کہ انگریزوں نے اپنے دور میں، ہر شہر میں آگ بجھانے کا بندوبست کیا ہوتا تھا۔ میں نے جب عمارت اور اس کے ارد گرد واقع علاقوں متعلق جاننے کی کوشش کی، تو بہت کچھ جاننے کو ملا۔ یہ آپ کو بھی دلچسپ لگے گا۔ اس علاقے متعلق شاہد شبیر کی بنائی ہوئی یوٹیوب پر ایک فلم بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا[1]۔ اس کا نام ہے؛

Historical Gor Khatri & Buddhist Ruins more than1800
years old Peshawar Pakistan

اس فلم سے پتہ چلا، کہ اسی گور کھتری میں ایک جگہ پر ایک بڑے مندر اور بدھ مت کے سٹوپا کے آثار ملے ہیں۔ اب ان کی بحالی کی کوشش ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ بات کوئی نئی نہیں تھی، اس کی وجہ کچھ یوں ہے۔

مسلمانوں کی پشاور آمد، انفرادی طور پر کب شروع ہوئی، یہ تو معلوم نہیں لیکن بڑی تعداد میں مسلمان یہاں اس وقت آباد ہوئے، جب محمود غزنوی نے 1001ء میں جے پال کو

---

https://www.youtube.com/watch?v=KO6-rlFhcC8[1]

شکست دے کر، پشاور میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس وقت کے ہندوستان ہیں تین بڑے مذاہب تھے؛ ہندومت، بدھ مت اور جین مت۔ ان میں جین مت کے ماننے والے تھوڑے تھے، میرے علم کے مطابق ان کی کوئی ریاست بھی نہیں تھی۔ البتہ ہندو اور بدھ دونوں کسی نہ کسی وقت میں حکمران بھی رہے ہیں۔ لاہور میں جین مندر کی موجودگی یہ بتاتی ہے، کہ لاہور میں بھی جین رہتے تھے۔ اس لیے ہمیں پاکستان کے کئی شہروں میں بدھ مت اور ہندومت کی تعمیرات ملتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے، کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے پشاور میں بھی ہندو اور بدھ ہی رہتے تھے۔ عیسائی بھی انگریزوں کے آنے کے بعد ہی یہاں آئے اور کچھ مقامی لوگوں نے بھی عیسائی مذہب اختیار کیا۔

یاد رہے کہ میں لفظ ہندوستان اس علاقے کے لیے استعمال کرتا ہوں، جس میں اب بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان واقع ہیں۔ بھارت کا لفظ موجودہ بھارت کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ بھارت اور انڈیا موجودہ بھارت کے دو نام ہیں[1]۔ ان کی سرکاری ویب پر بھی لکھے ہوئے ہیں۔

Republic of India; Bharat Ganrajya

میں یہ وضاحت کسی مغالطے سے بچنے کے لیے کر رہا ہوں۔

میں نے تین مشہور اولیاء اکرام کے متعلق جاننے کی کوشش کی، کہ وہ کب ہندوستان تشریف لائے۔ تاریخ سے پتہ چلا کہ سب سے پہلے سید علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رحمت اللہ علیہ، گیارہویں صدی کے وسط میں غزنی سے لاہور آئے (وہ غزنی میں پیدا ہوئے اور ان کی تاریخ پیدائش 1009ء ہے۔ وہ 1072ء میں لاہور میں وفات پاتے ہیں)۔ ان کے بعد معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ جو 1143ء میں ہرات میں پیدا ہوئے اور 1236ء میں اجمیر میں وفات پائی۔ تیسرے مشہور بزرگ نظام الدین اولیاء رحمت اللہ علیہ ہیں، جو 1238ء میں بدایوں میں پیدا ہوتے ہیں اور 1325ء میں دہلی میں وفات پاتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ محمود غزنوی کے بعد ہی، ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

اس لیے پشاور میں گور کھتری کے نام کا ایک مندر پایا جانا، کوئی حیران کر دینے والی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کا ذکر کبھی بھی کسی بھی مقامی ساتھی نے نہیں کیا۔ اسی لیے میں اس

[1]https://www.india.gov.in/india-glance/profile

جگہ کو تفصیل سے نہ دیکھ سکا، صرف دو ہی عمارتیں دیکھ سکا؛ ایک جہاں انگریزوں نے آگ بجھانے کا اسٹیشن بنایا تھا اور وہ سرائے، جو شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آراء نے بنوائی تھی۔ البتہ شاہد شبیر کی بنائی ہوئی وڈیو میں اسے تفصیل سے ضرور دیکھا، اس قدیم عمارت کا ایک مختصر تذکرہ یقیناً آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

گور کھتری کا ترجمہ ہے، جنگجو لوگوں کا مقبرہ۔ ہندومت کے مطابق، کھتری لوگ جنگ اور کاروبار کرتے تھے۔ برہمن صرف پوجا پاٹ کے لیے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی نے بھی اپنے ساتھیوں سے مل کر اندرون پشاور (اندرون پشاور سے مراد قدیم پشاور جو سب سے پہلے آباد ہوا، پشاور سے مراد قدیم اور جدید دونوں علاقے ہیں) میں اس گور کھتری میدان میں ہندوستانی بادشاہ کنشک عظیم کا دیو ہیکل اسٹوپا کی جگہ دریافت کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جگہ بھی، جہاں کبھی بدھ پیالے کا مشہور مینار تھا (الٹا رکھا ہوا پیالہ بھی بدھ مت کی شناخت ہے۔ اس لیے ان کے اسٹوپا کی شکل الٹے رکھے ہوئے پیالے جیسی ہوتی ہے)۔

گور کھتری بارے، ہدایت خان نے بھی ایک مضمون لکھا ہے[1]۔ اس مضمون کے مطابق، ساتویں صدی عیسوی میں گندھارا کا دورہ کرنے والے مشہور چینی سیاح زوان زنگ، نے بھی پشاور میں کنشک اسٹوپا کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ اس نے بدھ کے دیو ہیکل پیالہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مغل شہنشاہ بابر نے اپنی سوانح عمری میں بھی اس جگہ کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ سترہویں صدی میں مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی بیٹی جہان آراء بیگم نے اسی علاقے میں ایک عمارت کی تعمیر کروائی تھی، بعد میں جسے ایک کاروان سرائے میں تبدیل کر دیا گیا۔ یاد رہے یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے چاندنی چوک دلی کے علاوہ بھی کئی عمارتیں بنوائیں تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں کی عمارتوں کی تعمیر میں اس کا ایک بڑا کردار ہے۔ یہی وہ بیٹی تھی، جو شاہجہاں کی زندگی کے آخری دنوں میں، جب وہ آگرہ کے قلعے میں اورنگ زیب کے قیدی تھے، تو ان کے پاس تھیں۔ اس کے نام پر ہی اس سرائے کا نام، سرائے جہاں آباد رکھا۔ یہاں پر مسافروں کی سہولت کے لیے ایک جامع مسجد، غسل کی جگہ اور دو کنویں بھی بنائے تھے۔

---

[1] https://www.youlinmagazine.com/article/within-the-walls-of-gor-khatri/MTY4Ng
Within the Walls of Gor Khatri

پھر سکھ یہاں کے حاکم بن گئے۔ انھوں نے اس جگہ کو یعنی جہاں آراء کی بنائی ہوئی سرائے کو اپنے یورپی جنرل پاولو ایوٹا بیل کی رہائش گاہ اور سرکاری ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر دیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ رنجیت سنگھ کی فوج میں کئی کمانڈر یورپین تھے۔ پشاور پر قبضے کے بعد رنجیت سنگھ نے یہاں کا گورنر بھی اسی جرنیل کو بنایا، جس نے اسے پشاور فتح کر کے دیا تھا۔ اس طرح جنرل پاولو ایوٹا بیل پشاور کا پہلا یورپی گورنر بنا۔ اس کا تعلق اٹلی سے تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان سونے کی چڑیا تھا اور اٹلی کا ایک تربیت یافتہ جرنیل، رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہم اب اٹلی جاتے ہیں اور اب تک سینکڑوں نوجوان اس سفر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

وقت وقت کی بات ہے!

سکھوں کے دور میں ہی، یہاں شیو کے لیے ایک ہندو مندر بھی تعمیر کیا۔ پروفیسر ایس ایم جعفر نے اپنی یادگار کتاب "پشاور: ماضی اور حال میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے مطابق، یہی وہ مقام ہے، جہاں ہندو یاتریوں کے سر منڈوانے کی رسم ادا کی جاتی تھی۔

شاہد شبیر کے مضمون کے مطابق، ماہرین آثار قدیمہ نے یہاں پر موجود ایک جگہ کھدائی کی ہے اور انھیں کوئی 2300 سال سے زیادہ پرانی اشیاء ملی ہیں۔ یہاں پر سب سے پہلے پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر ایف اے درانی نے 1990ء کی دہائی میں کھدائی کی۔ اس کے بعد اب تک یہ کام جاری ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق، پشاور ہندوستان کے قدیم ترین ان شہروں میں سے ایک ہے، جو آج بھی آباد ہیں۔

پھر کیا ہوا؟ اس ایک عظیم سرائے میں انگریز فوجی رہنے لگے۔ اس کے ایک حصے میں آگ بجھانے کے لیے ایک اسٹیشن بنایا جس کے ماتھے پر لکھا ہوا ہے؛

1912

Fire Brigade Municipal Committee, Peshawar

یہ تھی وہ کہانی اس جگہ کی، جہاں آج سے کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے بھی لوگ آباد تھے اور آج بھی ہیں، یہ بات اہلِ پشاور کے لیے ضرور قابلِ فخر ہونی چاہیے، اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ ذمہ داری بھی بنتی ہے کہ اس کی حفاظت بھی کریں۔

مہابت خان مسجد - مغل دور کی ایک یادگار مسجد

مہابت خان مسجد کا ذکر کیے بغیر پشاور کا ذکر مکمل نہیں ہوتا۔ بہت ہی پُرسکون مسجد ہے۔اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ علاقے میں قائم مساجد میں سے ایک قدیم مسجد ہے۔ یہ مسجد، ہمیں مغلیہ دور کی یاد دلاتی ہے۔ اسے سترہویں صدی عیسوی میں شاہ جہاں کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ اُسی دور کی مسجد ہے، جب ٹھٹھہ سندھ میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد کا نام، اس وقت کے مغل گورنر نواب مہابت خان کے نام پر رکھا گیا تھا۔

اس مسجد میں داخل ہوتے وقت آپ کو یہ ضرور محسوس ہو گا، کہ مغل دور میں بنائی گئی مساجد اور اس مسجد کے طرزِ تعمیر میں بے حد مماثلت ہے۔ جیسے ہی آپ مہابت خان مسجد میں داخل ہوتے ہیں، تو آپ کو سامنے ایک بڑا صحن ملتا ہے۔ اس کے بعد ایک بڑا ہال، جس پر دو مینار اور تین گنبد بھی بنائے گئے ہیں۔ جب میں نے اس کے ہال میں بنے نقش و نگار دیکھے، تو مجھے ایک لمحے کے لیے یہ محسوس ہوا کہ میں لاہور کی بادشاہی مسجد میں کھڑا ہوں۔ دیواروں اور چھت پر خوبصورت خطاطی کے ساتھ ساتھ مختلف ڈیزائن بھی بنے ہوئے تھے۔ مہابت خان مسجد کے متعلق ایک خوبصورت مضمون شیر عالم شنواری نے ڈان میں لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے[1]؛

AROUND TOWN: Masjid Mahabat Khan: Splendour of Mughal art

میں نے اس مضمون کو شوق سے پڑھا، جو جان سکا پیش ہے۔

مہابت خان مسجد، مغل دور کی شاندار مسجد ہے جو پشاور شہر کے ایک حصے میں ایک تنگ گلی میں واقع ہے۔ یہاں ایک جیولری مارکیٹ بھی ہے۔ اس کی تعمیر شاہ جہاں کے دور میں تو ضرور ہوئی ہے لیکن اس کی تعمیر کا سہرا نواب مہابت خان کے سر ہی جاتا ہے۔ نام تو بادشاہ ہی کا لیا جاتا ہے۔ مہابت خان، شاہ جہاں اور اورنگزیب عالمگیر دونوں کے دور میں پشاور کے گورنر رہے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے رقم کی فراہمی اور اس کی نگرانی بھی مہابت خان نے خود ہی کی۔

---

[1] https://www.dawn.com/news/432286

یہ کب مکمل ہوئی؟ اس متعلق کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے، کہ اس کی تعمیر کا آغاز شاہجہاں کے دور میں ہوا اور شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں یہ مکمل ہوئی۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ یہ مسجد اندرون شہر ایک اونچی جگہ پر واقع ہے۔

شیر عالم شنواری مزید لکھتے ہیں کہ مستطیل شکل میں بنی اس مسجد کا رقبہ تیس ہزار مربع فٹ ہے۔ اس کے تین خوبصورت گنبد اور دو میناروں نے بھی اس کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس کا محراب بھی قابلِ دید ہے۔ اس کی دیواروں پر رنگوں سے مزین مختلف اشکال اور سائز کے پینل بنائے گئے ہیں۔ پھولوں کے نمونوں کے ساتھ قرآنی آیات بھی لکھی گئی ہیں۔

مہابت خان مسجد میں سفید رنگ کے پتھر کا زیادہ استعمال کیا ہے، جب کہ لاہور کی بادشاہی مسجد میں سرخ پتھر زیادہ ستعمال ہوا ہے، جو راجستھان سے لایا گیا تھا۔ جب سکھ یہاں پر قابض ہوئے، توانھوں جس طرح لاہور کی بادشاہی مسجد کو نقصان پہنچایا، اسی طرح اس مسجد کو مسمار کرنے اور لوٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن مسجد میں کبھی بھی نماز کا سلسلہ نہ رکا۔

سکھوں نے مسجدوں کو کیوں نشانہ بنایا؟

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محمود غزنوی، جس نے سومنات کا مندر تباہ کیا تھا۔ قطب الدین ایبک جس نے دہلی میں مسجد قوت الاسلام بنوائی تھی، اس کے لیے کئی مندر تباہ کیے گئے تھے (میں خود اس مسجد میں ستونوں پر بتوں کی تصاویر دیکھیں ہیں، اسی لیے اس مسجد میں اب نماز ادا نہیں کی جاتی)۔ پھر مغل دور میں اور اس کے بعد ابدالی کی فوجوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے مقدس مقامات کی بہت زیادہ بے حرمتی کی تھی۔ اسی بناء پر سکھوں اور ہندوؤں نے مساجد کو نقصان پہنچایا۔

یہ بات بھی درست ہے کہ کئی مسلمان حکمرانوں نے مندروں کی تعمیر بھی کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ امرتسر میں گوردوارہ کی تعمیر کے لیے اکبر بادشاہ نے زمین بھی تھی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ہندوستان کی تاریخ میں دونوں طرح کے واقعات ملتے ہیں۔

میں یہ سب جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عبادت گاہوں کی بے حرمتی، بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام اور اسی طرح کے دیگر ظالمانہ اقدام، جس نے بھی یہ کام کیے خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو ہو یا سکھ، یہ سب ان کے ذاتی فعل تھے۔ یہ سب کچھ اپنے تخت و تاج کو قائم رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس کا کسی بھی دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی مسلمان بادشاہ کا عبادت گاہوں کی بے حرمتی جیسے فعل کو اسلام سے جوڑنا درست نہیں۔ میں نے جس قدر سکھ

مذہب کا مطالعہ کیا ہے اس کے مطابق بھی سکھوں کا مساجد کی بے حرمتی، ان کا ذاتی فعل ہی مانا جاتا ہے، اس کا سکھ مذہب کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی بھی مذہب وہ سکھ ہو یا ہندو، ایسے کسی بھی کام کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ہندوستان کی تاریخ میں ایسے جتنے بھی واقعات رو پذیر ہوئے ہیں، ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے جوڑنا درست نہیں ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اکثر حکمرانوں نے اپنے اقتدار کی خاطر مذہب کا سہارا ضرور لیا ہے۔

میرے نزدیک وہ بھی قابلِ مذمت تھا اور نہیں ہونا چاہیے تھا، اور سکھوں کا مساجد کے ساتھ سلوک بھی قابلِ مذمت ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھے۔ بابری مسجد کی شہادت بھی ہندومت کے لوگوں کا اسی دور میں ہونے والے واقعات کا بدلہ لینے کی ایک کوشش کہی جاتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک داستان ہے اور قابلِ مذمت بھی۔

ہر مذہب کی عبادت گاہ کا احترام سب پر لازم ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں (1895ء) میں اس مسجد کا ایک مینار آگ لگنے سے تباہ ہو گیا۔

ایک اور بھی قابلِ افسوس بلکہ افسوس ناک ترین واقعہ ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ سکھ دور کے گورنر پاؤلو بارٹولومیو ایویٹابیل[1] (ابوتبیلا) جس کا تعلق اٹلی سے تھا، وہ رنجیت سنگھ کے ماتحت پشاور کا گورنر بھی تھا، نے اہلِ پشاور پر بے حد ظلم کیا۔ وہ ہر روز ایک مقامی قبائلی مسلمان کو مینار کے اوپر لٹکایا کرتا تھا، تاکہ اس کی دہشت قائم رہے اور کوئی سر اٹھا کر نہ چل سکے۔ پھر وہ وقت بھی آیا، جب سکھوں کو یہاں سے جانا پڑا اور انگریز یہاں کے حاکم بن گئے۔ انھوں نے مقامی لوگوں سے مل کر اس تاریخی مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ایسا رنجیت سنگھ کے علم میں تھا۔ اس لیے اس کا قصور وار رنجیت سنگھ بھی ہے۔

میرے علم کے مطابق برٹش دور میں کسی بھی جگہ مندر، مسجد یا گوردوارہ کے ساتھ کبھی بھی برا سلوک نہیں کیا گیا۔ انگریزوں نے پنجاب اور خیبر پختونخوا میں بے شمار مساجد، جنہیں سکھوں نے نقصان پہنچایا تھا، کی بحالی کے لیے مدد بھی کی اور اس کے لیے کوشش بھی کی۔ ممکن ہے کہ میری بات درست نہ ہو، لیکن میں نے ایسا ہی پڑھا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے۔ مہابت خان مسجد اور بادشاہی مسجد لاہور اس کی دو مثالیں ہیں۔

---

[1] Paolo Bartolomeo Avitabile

اندرون پشاور میں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی ہر گلی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ کئی دوسرے ہندوستانی شہروں کی طرح اندرون پشاور میں بھی ایک گھنٹہ گھر جسے کلاک ٹاور بھی کہتے ہیں، بنایا گیا تھا۔ گھنٹہ گھر اسی سال بنایا گیا تھا، جس سال فیصل آباد کا گھنٹہ گھر بنایا گیا تھا۔ یہ ٹاور برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر بنایا گیا تھا۔ اس کا نام سر جارج کننگھم کے نام پر رکھا گیا۔ اسے 1900ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سر جارج کننگھم اس وقت صوبے کا گورنر بھی تھا اور پولیٹیکل ایجنٹ بھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں اس ٹاور کو بھی نقصان پہنچا تھا پھر اسے 2003ء میں دوبارہ تعمیر کیا۔ (یہ کیسے ہوا، کیا بھارت کے طیارے یہاں تک آئے تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا) اس ٹاور کا قطر 31 فٹ ہے اور اس کی اونچائی 85 فٹ ہے۔

یاد رہے کہ ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی سرکاری طور پر 22 جون 1897ء کو اس کے تخت پر بیٹھنے کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر منائی گئی۔ اس وقت تک ملکہ وکٹوریہ پہلی برطانوی بادشاہ تھیں، جنھوں نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ اس دور میں بے شمار عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ جن میں ایک اہم ترین عمارت کلکتہ میں ایک ہال ہے۔ اسی طرح کا ایک ہال پشاور میں گورنر ہاؤس کے سامنے صدر روڈ پر بنایا گیا، جسے وکٹوریہ ہال کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس ہال میں پشاور میوزیم بنایا گیا۔ کلاک ٹاور کی ضرورت شاید اس لیے بھی تھی تاکہ لوگوں کو وقت کا احساس ہو۔۔۔

اس میں انگریز کتنے کامیاب ہوئے، معلوم نہیں!

اس سے زیادہ معلومات کے لیے آپ کو حسنین رضا جیسے ایک دوست کی ضرورت ہے جو آپ کو ناشتہ بھی کروائے اور سیر بھی اور اس کے ساتھ ساتھ شعیب ہاشمی جیسے ایک اچھے ساتھی کی بھی۔

پشاور میں چند اہم عمارتیں

پشاور جتنا قدیم شہر ہے اسی حساب سے یہاں پر کئی تاریخی عمارتیں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر پیشِ خدمت ہے۔

پشاور میوزیم: جہاں ایک تاریخ نظر آتی ہے

مجھے باوجود خواہش کے پشاور میوزیم دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ البتہ اس کے سامنے سے گزرنے کا کئی مرتبہ موقع ملا۔ اس کی عمارت انتہائی متاثر کن ہے۔ کسی وقت میں یہ وکٹوریہ ہال تھا۔ میں نے جتنے بھی شہر دیکھے ہیں، ان میں کسی میں بھی، برطانوی دور سے پہلے کا کوئی بھی میوزیم نہیں ملا (ہو سکتا ہو لیکن مجھے کسی بھی بڑے شہر میں کوئی بھی میوزیم برطانوی دور سے قبل کا نہیں ملا)۔ پشاور میوزیم کے متعلق جو پڑھا اور جو جانا وہ سب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ میں نے اس تحریر کے لیے خیبر پختونخوا کی سرکاری ویب سے مدد لی ہے[1]۔

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے، کہ ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی یاد میں ہندوستان بھر میں بے شمار عمارتیں بنائی گئیں جو عوام الناس کے فائدے یا ان کی تفریح کے لیے تھیں۔ پشاور میوزیم کا موجودہ مرکزی ہال بھی 1907ء میں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کے لیے تمام تر رقم ہندوستانی خزانے سے خرچ کی گئی تھی۔ پشاور میوزیم میں، مردان ضلع میں شاہ جی کی ڈھیری، ساحری بہلول، تخت بہلول اور بعد ازاں گندھارا سے متعلق کئی مقامات پر کھدائی گئی اور وہاں سے حاصل ہونے والے نوادرات، پرانی اشیاء اور مجسمے لا کر رکھے گئے۔

پشاور میوزیم دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ اس کا طرزِ تعمیر برطانوی اور مغل فن تعمیر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کی 1970ء میں توسیع بھی کی گئی۔ پہلے کی طرح کے دو ہال نئے بنائے گئے۔ اس کے بعد بھی اس کی توسیع کا کام جاری ہے۔ اب دو گیلریوں کے ساتھ ایک بلاک بھی بنایا گیا، جہاں اسلامی دور کی اشیاء رکھی گئی ہیں۔

---

[1] https://aboutkp.kp.gov.pk/page/peshawar_museaum

قیامِ پاکستان سے پہلے اس کا انتظام پشاور میونسپلٹی کے پاس تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ میوزیم، پبلک انسٹرکشنز، حکومت خیبر پختونخواکے کنٹرول میں رہا۔ پھر میوزیم کی اہمیت کے پیشِ نظر 1971ء میں اس کے معاملات دیکھنے کے لیے ایک بورڈ آف گورنرز تشکیل دے دیا گیا، جس کی سربراہی پہلے گورنر نے کی اور بعد میں چیف سیکرٹری خیبر پختونخوانے کی۔

پشاور میوزیم میں کیا کچھ رکھا ہوا، اسکی تفصیل اسی ویب پر دی گئی ہے جو کہ بہت دلچسپ ہے۔ اگر موقع ملا، تو میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گا۔ انشاءاللہ

اس کے لیے جناب خالد وقاص کی نظرِ کرم کی ضرورت ہو گی!

اسلامیہ کالج پشاور: علم دوستی کی ایک خوبصورت مثال

جب بھی کبھی آپ کو جمرود روڈ پر جانا ہو، تو آپ کو راستے میں اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے سے گزرنا پڑے گا۔ یہ عمارت اپنے حسن، وسعت اور اپنی تاریخ کے لحاظ سے اپنے اندر بے حد کشش رکھتی ہے۔ مجھے بھی ایک مرتبہ یہاں جانے کا موقع ملا۔ یہ کب بنا، کس نے بنایا، اس کے متعلق بعد میں بات ہو گی، سب سے پہلے ان کے لیے دعا جنھوں نے اس مادرِ علمی کو تعمیر کیا۔

اس کالج کی تاریخ بے حد دلچسپ اور حوصلہ دینے والی ہے۔ میں نے اس تحریر کی تیاری کے لیے کئی وڈیوز اور مضامین سے مدد لی ہے۔ جن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور کی ویب سائٹ[1]

طارق مجید کی بنائی ہوئی وڈیو جس کا نام ہے[2]

ISLAMIA COLLEGE Peshawar ICUP Documentary | History of Peshawar Pakistan

درج ذیل نام سے اردو پوانٹ پر شائع ایک مضمون[3]

---

[1] https://icp.edu.pk/page.php?abc=201506230501115
[2] https://www.youtube.com/watch?v=ioaY7taqJDs
[3] https://www.urdupoint.com/en/pakistan/islamia-college-peshawar-a-historic-educatio-997660.html

Islamia College Peshawar- A Historic Educational Institution Played Key Role In Completion Of Quaid's Mission For Pakistan

مشاہد حیدر کی ایک وڈیو جس کا عنوان ہے[1]

Islamia College Peshawar/Reform Movement/Pakistan Ideology/Pakistan Affairs CSS/PMS

اس کے علاوہ بھی کئی اور مضامین سے بھی مدد لی۔ جو جانا، جو سمجھا سب پیشِ خدمت ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور، پاکستان بھر میں اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پُر شکوہ عمارت پاکستان کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیاء میں مسلم طرزِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ بھی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے، کہ جب جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد، یہ بات سامنے آ گئی، کہ اب ایک طاقتور حکمران یعنی انگریز کے ساتھ جنگ کے میدان میں مقابلہ نہیں ہو سکتا، تو مسلمان رہنماؤں نے طے کیا، کہ مسلمانوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ اس کے بعد ہی دیوبند کی بنیاد رکھی گئی، اس کے بعد ہی علی گڑھ کی، جبکہ ایم اے او کالج بھی اسی دور میں بنا۔اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں (آریہ سماج، دیو سماج) اور سکھوں (خالصہ) نے بھی اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے شروع کر دیے۔ یہ وہی دور ہے جب انگریزوں نے بھی تعلیمی ادارے بنانے شروع کیے۔ پنجاب یونیورسٹی، اسی دور کی ایک نشانی ہے۔ پشاور میں ایڈورڈ کالج بھی اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔

انگریز کے بنائے ہوئے تعلیمی اداروں کے متعلق ہندو، مسلم اور سکھ سب ہی شاکی تھے۔ ان سب کا خیال تھا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے تعلیمی اداروں میں، ان کے بچوں کے مذہبی عقائد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی سوچ کا نتیجہ اسلامیہ کالج پشاور بھی ہے، جس کا پہلا نام دارالعلوم اسلامیہ کالج پشاور تھا۔

---

[1] https://www.youtube.com/watch?v=kv77gBjHQMg

اس وقت بعض ایسے تعلیمی ادارے، جو انگریزوں نے بنائے تھے، ان میں بائبل کا مطالعہ لازم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے شمار مشنری اسکول اور کالجز بھی قائم کیے جارہے تھے۔ اس نے مقامی مسلمانوں کو بھی اپنے تعلیمی ادارے بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور بھی ایک طرح سے علی گڑھ اور دیوبند مکاتب فکر کا حسین امتزاج تھا۔ اس کی ابتداء کیسے ہوتی ہے، یہ بھی ایک خوبصورت داستان ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اسلامیہ کالج پشاور کے متعلق کچھ بیان کروں، میں چاہوں گا کہ اس شخص کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے اس کالج کی بنیاد رکھی یعنی حاجی ترنگزئی۔

حاجی صاحب ترنگزئی

حاجی صاحب ترنگزئی کا اصلی نام سید فضل واحد تھا۔ ان کی پہچان ایک پختون مجاہد اور سلسلہ قادریہ کے ایک عظیم روحانی صوفی بزرگ کی ہے۔ آپ 1846ء میں ترنگزئی (ضلع چارسدہ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اس کی خاطر، وہ ہندوستان اور افغانستان میں کئی جگہوں پر بھی گئے۔ ایک طویل عرصے تک جہاد کرتے رہے، لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ اس کے بعد وہ حج کے لیے چلے گئے اور واپسی پر تعلیم و تربیت میں مصروف ہوگئے، اسی دوران وہ خان عبدالغفار خان کے ساتھ مختلف دیہات کے دورے کرنے لگے۔ ان دونوں حضرات نے مل کر پانچ سال میں کوئی 120 درسگاہیں قائم کیں۔ ایک دفعہ انگریزوں نے حاجی صاحب اور عبدالغفار خان صاحب پر بغاوت کا مقدمہ بھی چلایا، جس میں وہ عدم ثبوت کی بناء پر بری کر دیے گئے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ صوبہ سرحد کا قیام 1901ء میں عمل میں آیا۔ اس سے ایک سال قبل ہی 1900ء میں پہلا تعلیمی ادارہ (ایڈورڈ کالج) پشاور میں ایک کرسچین مشن نے قائم کر لیا تھا۔ یہ ایک مشنری ادارہ تھا، س لیے اس میں مسلمان طلباء بہت کم تعداد میں داخل ہوئے۔

سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے حاجی صاحب کو دارالعلوم اسلامیہ پشاور (اسلامیہ کالج) کا سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی، جو آپ نے قبول کرلی۔ اس طرح، اس عظیم درس گاہ کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد ایک بار پھر انھوں نے برطانوی فوج سے ٹکر لی۔ آخر کار انگریزوں نے حاجی صاحب سے ایک معاہدہ کیا اور یوں ایک امن و امان کی ایک فضاء قائم ہوئی۔ حاجی صاحب نے کالج کے ساتھ ساتھ ایک مسجد کی بنیاد بھی رکھی۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم چیف کمشنر سر جارج روز کیپل Sir George Roos Kepple)) کے ہمراہ کلکتہ کے دورے پر گئے، واپسی پر وہ علی گڑھ یونیورسٹی بھی گئے۔ علی گڑھ میں موجود پختون طلبہ نے نواب صاحب کا استقبال کیا اور ساتھ ہی درخواست کہ صوبہ سرحد میں بھی کالج بنایا جائے۔ یہ سب دیکھ کر صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب نے پشاور میں ایک کالج بنانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے واپس آکر پشاور میں موجود لوگوں کے سامنے کالج کے قیام کی تجویز رکھی، جسے بے حد پزیرائی ملی۔

اب جس جگہ اسلامیہ کالج پشاور قائم ہے وہاں کسی وقت میں بدھ مت کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی۔ کسی کی عبادت گاہ کو مسمار کرکے کالج کی عمارت تعمیر کی گئی۔ یقیناً بدھ مت کے ماننے والے اس علاقے سے چلے گئے تھے۔ اس وقت کوئی بھی بدھ پشاور میں نہیں تھا۔ اس لیے یہ جگہ استعمال میں نہیں ہوگی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ اس جگہ پر صدیوں سے بدھ مذہب کی عبادت گاہ تو موجود رہی ہے۔ انھیں ختم کرکے کالج بنایا گیا، مجھے یہ مناسب نہیں لگا۔ بدھ مت کی عبادت گاہ کو قائم رکھا جانا چاہیے تھا۔

یہ میرا خیال ہے، ممکن ہیں آپ اتفاق نہ کریں۔

کالج، مسجد اور دیگر عمارتوں کے لیے تین سو ایکڑ اراضی حاصل کی گئی۔ پھر وہ خوبصورت دن آیا جب مارچ 1913ء میں اسکول نے کام کرنا شروع کیا اور اس میں پچیس طلباء داخل ہوئے۔ جن میں تقریباً ہر پختون قبیلے کی نمائندگی تھی۔ اس کے چھ ماہ بعد یکم اکتوبر 1913ء کو کالج میں بھی تعلیمی سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعد میں کئی ہاسٹلز بھی بنائے گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح اور اسلامیہ کالج پشاور

قائداعظم محمد علی جناح نے تین مرتبہ اسلامیہ کالجپشاور کا دورہ کیا؛ پہلی مرتبہ 1936ء میں، دوسری مرتبہ 1945ء اور تیسری مرتبہ 1948ء میں۔ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کواسلامیہ کالج پشاور سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اسی لیے، انھوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی وراثت کا تیسرا حصہ اس کالج کو دیا جائے۔ (باقی دو حصوں میں ایک حصہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے تھا اور ایک حصہ سندھ مدرسہ اسکول کے لیے تھا) یعنی مکمل جائیداد، تین اہم مسلمانوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے لئے۔

یہ ایک بہت ہی خوب صورت بات ہے، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح،اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء اساتذہ، فاٹا کے لوگوں کو پاکستان کی آزادی کے لیے اپنی آئینی، قانونی، سیاسی اور جمہوری جدوجہد میں ایک فرنٹ لائن طاقت گردانتے تھے۔ جب وہ الیکشن (1946) سے پہلے 1945ء میں اسلامیہ کالج پشاور آئے، تو ان کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ اسی طرح جس طرح علی گڑھ میں ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ اس دورے میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے انھیں تحریک پاکستان کے لیے آٹھ ہزار روپے بطور فنڈ بھی پیش کیے۔ اس کے بعد مسلم لیگ صوبہ سرحد کی تحریک میں کافی تیزی آگئی۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے، کہ اسلامیہ کالج پشاور کے اخراجات کے لیے مخیّر حضرات نے ضلع چارسدہ کے علاقے، ہری چند رائے کلی اور ترناب میں واقع قابل کاشت رقبہ بھی کالج کو وقف کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صدر بازار پشاور اور چارسدہ میں چار سو کے قریب دکانیں اور فلیٹس بھی کالج کی ملکیت ہیں۔ پاکستان حکومت نے پہلے ایک سو کے نوٹ اور اب ایک ہزار کے کرنسی نوٹ پر، اسلامیہ کالج پشاور کی تصویر بھی چھاپی ہے۔

یہ تھی اسلامیہ کالج پشاور کی ایک مختصر تاریخ۔ اس موقع پر میں ان دونوں حضرات کا بھی ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی کاوشوں سے یہ کالج بنا۔

سر جارج روز کیپل : اسلامیہ کالج پشاور کا ایک بانی

سر جارج روز کیپل (1866-1921) ایک برطانوی فوجی افسر تھے اور وہ کرُم اور خیبر میں گورنر جنرل کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے تھے۔ بعد میں وہ چیف کمشنر صوبہ سرحد بھی تعینات ہوئے۔ انھوں نے تیسری افغان جنگ میں بھی حصہ لیا۔ وہ ترقی کرتے کرتے 1912ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر بھی پہنچ گئے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے آغاز پر انھوں نے ایک نہایت ہی قابل نوجوان عنایت اللہ خان کو اسلامیہ کالج (پشاور) کا وائس پرنسپل تعینات کیا گیا، چار سال بعد انھوں نے (1917ء میں) انھیں پرنسپل بھی مقرر کردیا۔

میرے علم کے مطابق، ہندوستان میں رہتے ہوئے کئی انگریزوں نے مقامی زبان سیکھی بھی اور اس میں لکھا بھی۔ ان میں سے ایک سر جارج بھی ہیں۔ انھوں نے میں گنج پشتو اور تاریخ سلطان محمود غزنوی کے نئے انگریزی تراجم تیار کیے، جو پہلے سے موجود تراجم سے کہیں بہتر تھے۔ بعد میں یہ تراجم فوجی افسران کے نصاب میں بھی شامل کر لیے گئے۔ وہ بہت اچھے

انداز سے پشتو بول لیتے تھے، یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ انھوں نے 1901ء میں پشتو زبان پر ایک کتاب، گائیڈ بک کے طور پر 'دی پشتو مینول' بھی لکھی۔

سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان : اسلامیہ کالج پشاور کا بانی

نواب خان بہادر صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان (1863-1937) ٹوپی، صوابی ضلع، سے تعلق رکھنے والے ماہر تعلیم اور سیاست دان تھے۔ان کے اہم کارناموں میں 1893ء میں افغانستان کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کے معاہدے پر کامیاب مذاکرات کے لیے مورٹیمر ڈیورنڈ کی مدد کرنا بھی شامل ہے۔ وہ یکم اپریل 1937ء کو شمال مغربی سرحدی صوبے کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔انھوں نے زندگی کا آغاز ایک سرکاری ملازم کے طور پر کیا۔ بعد میں انھوں نے تعلیم اور سیاست میں قدم رکھا اور کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

یہ بھی افسوس ناک بات ہے کہ ان کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا ۔جب وہ ابھی دس سال کے تھے، کہ ان کے والد کو حریفوں نے قتل کر دیا۔ ان کی پرورش ان کے ماموں سیّد احمد باچا نے کی۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ایک مرتبہ ایک عیسائی مشنری ریورنڈ ہیوز ان کے ہاں آیا۔ ان کی ریورنڈ ہیوز سے بات چیت بھی ہوئی اور ریورنڈ ہیوز کی سیّد احمد باچا سے دوستی بھی ہو گئی۔ اسی دوستی کی بناء پر انھیں جدید تعلیم کے لیے پشاور میں قائم میونسپل بورڈ مڈل اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں سے آپ نے 1880ء میں ورناکولر اسکول کا امتحان پاس کیا (اسے شاید پرائمری امتحان کہتے تھے)۔ بعد میں ایڈورڈز مشن ہائی اسکول سے 1883ء میں انگریزی میں مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے ستمبر 1886ء میں نائب تحصیلدار کا امتحان دیا، اور سرکاری ملازم ہو گئے۔

اس کے بعد وہ کئی اہم عہدوں پر فائز بھی رہے۔ اسی دور میں وہ، ہزارہ قبیلوں کے خلاف ایک مہم کا حصہ بھی رہے، جن پر الزام تھا کہ انھوں نے کئی برطانوی افسران کا قتل کیا ہے۔انگریز ان کے کام سے بے حد خوش تھے اور انھیں بارہا انعامات سے بھی نوازا۔ وہ ترقی کرتے کرتے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے تک پہنچ گئے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جب 1893ء میں افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن خان کے دور میں افغانستان اور برطانوی ہندوستانی سلطنت کے درمیان ڈیورنڈ لائن ہندافغان سرحد پر بات چیت جاری تھی وہ اس کمیشن کا حصہ تھے، جو انگریزوں کی طرف سے بنایا گیا تھا، جس کی سربراہی سر ہنری مورٹیمر ڈیورنڈ کر رہے تھے۔ یہ مذاکرات پاراچنار میں ہو رہے تھے۔ میں

نے اپنے پارا چنار کے سفر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ان مذاکرات کی کامیابی میں صاحبزادہ صاحب کا ایک اہم کردار ہے۔

صاحبزادہ صاحب کو 1924ء میں ہندوستانی قانون ساز اسمبلی کے ایک غیر سرکاری رکن کے طور پر لیا گیا۔ یہ ایک اہم عہدہ تھا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی اہم عہدوں پر رہے۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے نتیجے میں صوبہ سرحد کی حیثیت کو بڑھا کر ایک ایسے صوبے کا درجہ دیا گیا، جہاں گورنر کا ہونا ضروری تھا، اس کے لیے ایک الگ قانون ساز اسمبلی کی بھی ضروری تھی۔ اسی دوران صاحبزادہ صاحب نے اپنی ایک سیاسی جماعت بھی بنائی۔ صوبہ سرحد میں پہلے الیکشن، 1937ء میں ہوئے۔ کوئی بھی پارٹی واضح اکثریت نہ حاصل کر سکی۔ کانگریس کی پچاس میں سے انیس سیٹیں تھیں جبکہ اکیس لوگ آزاد حیثیت میں جیتے تھے۔ اس صورتِ حال میں صاحبزادہ عبدالقیوم یکم اپریل 1937ء کو صوبہ سرحد کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ لیکن ان کی حکومت صرف چھ ماہ چل سکی۔کانگرس نے ان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا، ڈاکٹر عبدالجبار خان عرف ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا۔ان کے اہم کارناموں میں اسلامیہ کالج پشاور کے علاوہ صوبے میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا خاتمہ بھی ہے۔

ایک اہم بات کا مجھے پتہ چلا کہ اس وقت انگریزوں نے ان اسکولوں میں جن کی مدد حکومت کرتی تھی اردو یا انگریزی کو لازمی زبان قرار دیا ہوا تھا، صاحبزادہ صاحب نے اسے ختم کروایا۔ یقیناً یہ پشتو زبان کی بہتری کے لیے کیا ہوگا۔

یہ متحرک اور علم دوست شخص دسمبر 1937ء کو اپنے گاؤں میں ایک مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔

پشاور میں واقع گورنر ہاؤس

ہندوستان کے ہر صوبائی دارالحکومت میں، انگریزوں نے جہاں اپنا گورنر مقرر کیا، وہیں ایک گورنر ہاؤس بھی بنایا۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں آپ کو گورنر ہاؤسز ملیں گے۔ ایسا ہی پشاور میں بھی ہے۔ جیسے ہی آپ ریلوے لائن سے سر جھکا کر کینٹ میں داخل ہوتے ہیں، تو آپ کو پشاور میوزیم اور گورنر ہاؤس آمنے سامنے نظر آتے ہیں۔ مجھے اس میں کبھی بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ انگریزوں نے کئی اور جگہوں پر گورنر ہاؤسز بنائے ہیں۔ جیسے خیبر پختونخوا کے گورنر کے لیے نتھیا گلی میں 1923ء میں آٹھ ہزار فٹ کی

بلندی پر بنایا گیا گورنر ہاؤس، جو گرمیوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اسی طرح زیارت میں بنایا گیا گورنر ہاؤس، جو گرمیوں میں استعمال ہوتا تھا، مری میں پنجاب گورنر ہاؤس بھی گرمیوں میں استعمال کے لیے بنایا گیا تھا۔

پشاور کے گورنر ہاؤس متعلق ایک معلومات سے بھرپور مضمون جسے محمد وقار نے لکھا پڑھنے کو ملا۔ اس کا عنوان ہے[1] :

Darbār Hall of the Governor House, Peshāwar: Preliminary Report on its Recent Restoration and Conservation

میں نے اس مضمون کی مدد سے جو جانا وہ پیشِ خدمت ہے۔ پشاور کے گورنر ہاؤس کی تصاویر سے لگتا ہے، کہ یہ لاہور کے گورنر ہاؤس سے بھی مماثلت رکھتا ہے، جسے دیکھنے کا مجھے بارہا موقع ملا۔ پشاور کے گورنر ہاؤس کبھی جانے کا موقع نہیں ملا، لیکن ہم جائیں یا نہ جائیں، اس کی خوبصورتی اس کا معیار اور وقار تو اپنی جگہ پر۔

محمد وقار لکھتے ہیں کہ گورنر ہاؤس پشاور کا پہلا نام گورنمنٹ ہاؤس تھا۔ یہ چیف کمشنر شمال مغربی سرحدی صوبہ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑی تقریبات کے لیے بھی اسے ستعمال کیا جاتا تھا، جیسے استقبالیہ وغیرہ۔ جب 1901ء میں صوبہ سرحد کا قیام عمل میں آیا، تو اس کے بعد یہ عمارت تعمیر کی گئی۔

سر ہیرالڈ آرتھر ڈین جو اس وقت اس علاقے کے کمشنر تھے، نے چیف کمشنر ہاؤس کی تعمیر کی ضرورت پر زور دیا۔ اس عمارت کے لیے بجٹ 1902ء میں منظور ہوا۔ اس کے بعد تعمیر شروع ہوئی جو ڈیڑھ سال میں مکمل ہوئی اور یوں گورنر ہاؤس اکتوبر 1903ء میں تیار ہو گیا۔

گورنر ہاؤس پشاور صوبہ خیبر پختونخوا کے گورنر کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے خان بہادر نواب عبدالحمید خان آف بدرشی نے تعمیر کیا تھا، جو انگریز دور کے ایک مشہور ٹھیکیدار تھے۔ اس کی طرزِ تعمیر روایتی گریکو-رومن ڈیزائن کے مطابق ہے۔ یہ طرزِ تعمیر جسے ہم انگریزوں کا طرزِ تعمیر کہتے ہیں، ہندوستان میں اکثر عمارتیں، جو انگریزوں نے بنائی

---

[1] https://tehqeeqat.com/downloadpdf/4984

ہیں، وہ اسی طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتی ہیں۔ گورنر ہاؤس پشاور کو فرنٹیئر کا وائسرائے ہاؤس بھی کہا جاتا تھا۔

وہ اس ملک کے بادشاہ تھے جو چاہتے سو کرتے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے:

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

ترجمہ: صاحبِ نعمت (یعنی بادشاہ) جنگل اور صحرا میں جاکے بھی غریب نہیں ہوتا ،وہ جہاں بھی خیمہ لگالے وہیں دربار لگ جاتا ہے۔

گورنر ہاؤس پشاور کی عمارت ایک شاندار سفید خوبصورت عمارت ہے۔جس کے چاروں طرف سے فوارے اور سرسبز و شاداب لان ہیں۔اس میں اور بھی بہت کچھ ہیں، موقع ملے تو ضرور دیکھنے جائیں۔ابھی میں ایک خبر سن رہا تھا کہ عید کے موقع پر اسے ان لوگوں کے لیے کھولا گیا ہے جن کے آباؤاجداد سے رقم لے کر یہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

ان کا اتنا تو حق بنتا ہے کہ عید کے موقع پر وہ اسے دیکھ سکیں، رہ تو وہ کبھی بھی نہیں سکتے۔

پشاور میں اس کے علاوہ بھی دیکھنے کی بہت سی جگہیں ہیں؛ جیسے صوبائی اسمبلی کی عمارت، کینٹ اسٹیشن، جوگا بھائی گردوارہ، جمرود قلعہ، باب خیبر، باڑا مارکیٹ، شاہی باغ، ہائی کورٹ، صدر وغیرہ۔

مجھے جوگا بھائی گردوارے کے ذکر سے ایک بات یاد آئی۔ میری پیدائش تقسیم ہند کے گیارہ سال بعد 1958ء میں ہوئی۔ ہم ریاست پٹیالہ سے پاکستان آئے تھے، جو کہ ایک سکھ ریاست تھی۔ اس لیے ہمارے بزرگوں کو ابھی سکھوں اور ہندوؤں کے نام بھی یاد تھے۔ سکھوں میں جوگا ایک معروف نام تھا۔ شاید اسی وجہ سے میرا نک نام جوگا بولتے وقت یہ جُگا بولا جاتا ہے، رکھا گیا تھا۔ مجھے اب بھی کئی دوست اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح میرے چھوٹے بھائی لطیف کا نام میرے دادا جان نے صوبہ رکھا تھا، جو اس وقت بھی سکھوں میں ایک معروف نام تھا۔ پشاور میں تمام اہم مقامات کا تذکرہ ایک مشکل کام ہے، جو اس سفر نامے کو ایک تاریخ

کی ایک کتاب بنا سکتا ہے۔کافی حد تک تو سفر نامہ ایک تاریخ کی کتاب تو بن ہی چکا ہے۔ بہر حال پشاور کی تاریخ کو مزید جاننے کے لیے آپ کو خود کوشش کرنی چاہیے۔

کوئی تو ہو گا جو اب کے پشاور کی کہانی لکھے گا۔ پرانی تاریخ تو کئی لوگوں نے لکھی ہے۔

ایک بات شاید پشاور کے دوستوں کو اچھی نہ لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پشاور جسے پھولوں کا شہر کہتے تھے، اب یہاں پھول کم ہی ملتے ہیں۔البتہ پھولوں جیسے لوگ بے شمار ہیں۔

میرے خیال میں جب ہم نے ترقی شروع کی تو کھیتوں اور کھلیانوں کو عمارات میں تبدیل کیا، صاف ستھری فضا کو کارخانوں کی چمنیوں سے آلودہ کیا، نئی تہذیب نئے طور طریقوں نے قدیم تہذیب و تمدن باتوں کو بھلا دیا، تو پھر اس کا یہ نتیجہ تو ہونا ہی تھا کہ؛

اب ہمیں نہ ہی وہ ماضی کا لاہور نظر آتا ہے اور نہ ہی پشاور، نہ ہی پنڈی، نہ ہی کراچی، نہ ہی کوئٹہ۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اگر قدیم تہذیب کو بچانے کی کوشش کی جاتی، تو یہ کام احسن انداز سے ہو سکتا تھا۔ ہم ترقی بھی کرتے، لیکن ساتھ ساتھ پرانی چیزوں کو بچا کر رکھتے اور ان کی حفاظت بھی کرتے۔

ایسا ہر جگہ ہی ہوا ہے لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ اب آہستہ آہستہ لوگوں میں یہ شعور بیدار ہو رہا ہے، کہ پرانی چیزوں کو بھی سنبھالنا چاہیے۔ جیسا کہ لاہور میں یہ طے کیا گیا ہے، کہ مال روڈ پر بنی ہوئی تمام عمارتوں کو کوئی بھی نئے سرے سے بنانا چاہے، وہ اس کے فرنٹ کو تبدیل نہیں کرے گا۔ اس کے پیچھے جو کچھ بنانا چاہے بنا لے۔

ہاں یاد آیا کہ ہمیں حسنین صاحب نے کپور خاندان کی حویلی بھی دکھائی تھی۔ ہم یوسف خان صاحب عرف دلیپ کمار کا گھر تو نہیں دیکھ سکے جو کافی دور تھا۔

میں نے شاہ رخ خان جو بھارت کے ایک مشہور اداکار ہیں اور دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں، کا ایک انٹرویو سنا تھا۔انھوں نے اپنے والد کے متعلق بات کرتے ہوئے اپنے والد کے الفاظ ہند کو میں کہے تھے۔ جس سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا تعلق بھی پشاور ہی سے تھا۔

یہ تھا سفر جو میں نے 1980ء میں اٹک سے شروع کیا اور پشاور تک پہنچا۔ اس راستے میں جو بھی اہم مقامات آئے ان کے متعلق جو بھی جان سکا وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ تاریخی واقعات میں اختلاف ایک فطری بات ہے۔اس کے ساتھ ساتھ میں نے جو اپنے

مشاہدے سے سیکھا وہ بھی پیش کیا۔ البتہ اپنی رائے دینے میں کنجوسی سے کام لیا۔ آپ سے یہی درخواست ہے کہ آپ اس تحریر کو بہتر بنانے کے لیے اپنی آراء سے ضرور آگاہ کریں۔

پشاور سے پاراچنار: جہادِ افغانستان کی غرض سے

میں برادرم شیخ عبدالحفیظ کے ساتھ جون 1989ء افغان جہاد میں شرکت کے لیے پہلی بار افغانستان گیا۔ پشاور سے پارا چنار (اسے بولتے وقت پاڑا چنار بھی بولتے ہیں) تک کے سفر کی رُوداد پیشِ خدمت ہے۔ میں نے یہ تحریر افغانستان کے پانچ اسفار میں بھی لکھی ہے ،جہاں جہادِ افغانستان متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں صرف پشاور سے پاراچنار تک کے سفر متعلق ہی لکھا ہے۔

جون 1989ء کا آخری ہفتہ تھا، شدید گرمی اور حبس نے زندگی اجیرن کر رکھی تھی، یہ موسم گرم علاقوں کا سب سے بدترین موسم مانا جاتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو سب چیزیں خوبصورت لگتی ہیں اور جب بارش نہ ہو تو حبس اور گرمی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ اس وقت افغانستان پر ابھی روسی قبضہ جاری تھا۔ ہر طرف جہاد کی بات ہو رہی تھی۔ اُس وقت میری عمر اکتیس سال تھی، اور میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا والد بھی تھا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش جہاد سے واپس آنے کے چھ ماہ بعد ہوئی۔ میرے تینوں چھوٹے بھائی اسکولز میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ والد صاحب ایک طویل عرصے تک مزدوری کرکے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ میں فیصل آباد میں کچھ لوگوں کے ساتھ ایک ورکنگ پارٹنر کے طور پر، ایک فیکٹری میں کام کر رہا تھا اور فیصل آباد میں ہی کرائے کے ایک مکان میں رہ رہا تھا۔

جہاد کا جوش اس قدر بڑھا، کہ میں نے جہاد پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں برادرم شیخ عبدالحفیظ نے میرا ساتھ دیا۔ جہاد پر جانے سے پہلے، بیوی بچوں کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اپنے والدین کے پاس چھوڑا۔ ہم دونوں گھر والوں کو بتائے بغیر جہادِ افغانستان میں حصہ لینے کی خاطر پشاور روانہ ہوگئے۔ میں نے احتیاط کے نُقطۂ نَظَر سے اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کو بتا دیا تھا۔ وہ ہمیں لاری اڈے تک چھوڑنے بھی آئے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی جہاد پر گئے تھے۔ یہ تھا اس سفر کا پس منظر۔

ہم جہاد کی نیت سے فیصل آباد سے چل کر پشاور آئے تھے۔ جناب شبیر احمد خان (سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ اور اس وقت کے امیر جماعت اسلامی پشاور) کی ہدایت پر ہم حیات آباد میں ایک گھر میں ٹھہرے۔ ایک بڑی عمر کے صاحب نے ہماری رہنمائی فرمائی۔ پھر اگلے دن وہ ہمیں ایک سوزوکی وین میں بٹھا کر پاراچنار جانے والے ویگن کے اڈے تک لے گئے۔

ہمارے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، جن کی عمر کوئی چالیس سال سے زائد تھی، ان کا تعلق صادق آباد یا رحیم یار خان سے تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک صحافی تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ افغان جہاد میں شریک ہونے جارہے تھے۔ ہمارے میزبان نے ہمارے لیے ٹکٹ خرید کر ہمیں ایک ویگن میں بٹھا دیا۔ یاد رہے کہ یہ 1989ء کی بات ہے، ابھی موبائل پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے ہم گھر والوں سے کسی بھی طرح کے رابطے میں بھی نہیں تھے۔

شاید ان دنوں میں رابطہ نہ ہونا ہی، خیریت سمجھا جاتا تھا۔

ہم کوئی صبح دس بجے کے قریب پشاور سے چلے۔ ویگن نے پہلا سٹاپ کوہاٹ کے قریب کیا، جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ (میں نے الگ سے اسی کتاب میں کوہاٹ کے سفر متعلق بھی لکھا ہے) اس کے بعد پاراچنار تک کا سفر ہم نے شدید گرمی میں طے کیا۔ ایک جگہ پر ڈرائیور نے ویگن روکی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک ٹیوب ویل چل رہا ہے اور اس میں سے نکلنے والے ٹھنڈے پانی میں بہت سے لوگ نہا رہے تھے۔ اس موسم میں تربوز بھی عام ہوتا ہے، پہلے تربوز ٹھنڈا کیا جا رہا ہے، پھر کچھ لوگ بیٹھے کھا رہے ہیں۔ ہم بھی زمانہ تعلیمی میں اپنے کالج کے قریب ایک نہر پر جا کر ایسا ہی کرتے تھے، یہ دیکھ کر مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ تمام مسافر ویگن سے باہر آگئے، یاد رہے اس وقت اس علاقے میں ائیر کنڈیشن ویگن کا تصور تک بھی نہیں تھا۔ سب نے ٹھنڈا پانی پیا اور منہ ہاتھ دھویا اس طرح تھوڑی دیر کے لیے ہماری گرمی سے جان چھوٹی۔

اس موقع پر یاد آیا کہ ہم بچپن میں ایک نظم پڑھا کرتے تھے۔ اس کا ایک شعر کچھ یوں تھا؛

چڑی وچاری کی کرے، ٹھنڈا پانی پی مرے؟

ہمارے ساتھ جو صحافی بھائی تھے، انھوں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور اپنے کپڑوں سمیت نہانا شروع کر دیا۔ وہ ایک مزاحیہ طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ کافی دیر تک نہاتے رہے۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ گیلے کپڑے پہن کر ویگن میں کیسے بیٹھیں گے؟ انھوں نے کہا کہ کوئی

مسئلہ نہیں ہے سائیں ، میں جس علاقے سے آیا ہوں (رحیم یار خان) وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں صرف پانچ منٹ دھوپ میں کھڑا ہوں گا، میرے سارے کپڑے خشک ہو جائیں گے، کسی کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔

ایسا ہی ہوا۔۔۔ تجربہ تجربہ ہی ہوتا ہے۔۔۔

ہم کوئی عصر کے وقت پاراچنار پہنچ گئے۔ ہم نے کچھ لوگوں سے حزب اسلامی کے دفتر کے متعلق پوچھا، جو ہمیں بتا دیا گیا۔ دفتر میں جا کر ہم نے پشاور سے دیا جانے والا خط پیش کیا، جو ہمیں جماعت اسلامی پشاور کی طرف سے دیا گیا تھا۔ انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ رہنے کے لیے ایک جگہ بھی دی اور کہا کہ کل صبح ایک گاڑی آپ کو اس کیمپ تک لے جائے گی، جہاں آپ کی جنگی تربیت کی جائے گی۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد آپ کو روسی فوجوں سے لڑنے کے لیے اگلے مورچوں پر بھیجا جائے گا۔

ہمیں بتایا گیا، کہ پاراچنار سے کچھ فاصلے پر افغانستان کی سرزمین پر غنڈا الفتح کے نام سے حزب اسلامی کا بہت بڑا کیمپ اور اس سے آگے ایک پہاڑی کی چوٹی پر پوسٹ فیض (اسے پوست فیض بھی کہتے تھے) کے نام سے ایک چوکی ہے، جہاں کوئی پچاس کے قریب مجاہد رہتے تھے۔ اس چوکی پر صرف پاکستان سے آنے والے لوگ ہی رہتے تھے۔ جس سے یہ محسوس ہوا کہ مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کو ایک جگہ رکھا جاتا تھا، تاکہ انھیں کھانے پینے اور رہنے میں آسانی ہو۔

میں نے پاراچنار سے پوست فیض تک کے ایک مشکل سفر جو پہاڑوں پر سے گزر کر ہم نے طے کیا، جہاں سڑک تو دور کی بات ہے، راستہ نام کی بھی کوئی چیز نہیں تھی، رُوداد بیان اپنے افغانستان کے پانچ سفر نامی کتاب میں لکھی ہے۔ اس کا یہاں تذکرہ مناسب نہیں۔ یہاں میں صرف پشاور سے پاراچنار کے درمیان سفر اور اس علاقے کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

پشاور سے پاراچنار کا فاصلہ، اڑھائی سو کلومیٹر ہے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں، تو آپ جان سکیں گے کہ پشاور اور پاراچنار کے درمیان سیدھی سڑک نہیں ہے، بلکہ پہلے ہم پشاور سے نکل کر جنوب کی طرف جاتے ہیں اور کوہاٹ پہنچتے ہیں۔ پھر کوہاٹ سے مغرب کی طرف چلتے ہوئے، ایک بڑا شہر ہنگو آتا ہے۔ ہنگو کے بعد تھل پہنچ کر ہم شمال کی طرف جاتے ہیں اور پارا چنار پہنچتے ہیں۔ اس طرح سے ایک لوپ کی شکل میں ہم پشاور سے پاراچنار پہنچتے ہیں۔ اس کی

بنیادی وجہ یہ ہے کہ افغانستان اور کوہاٹ کے درمیان زیادہ تر پہاڑی علاقے ہیں، جن میں سفر ممکن نہیں ہے اور کوئی سڑک بھی نہیں بنائی گئی۔اس لیے یہ ایک طویل سفر کرنا پڑتا ہے۔اگر براہ راست کوئی سڑک ہو تو شاید یہ فاصلہ ایک سو کلومیٹر سے بھی زائد نہ ہو۔ پشاور سے ستر کلو میٹر کے فاصلے پر کوہاٹ واقع ہے۔ کوہاٹ سے پہلے درہ آدم خیل آتا ہے، جو دنیا بھر میں اسلحہ سازی کے لیے مشہور ہے۔

کوہاٹ سے ذرا پہلے ایک بڑا پہاڑ ہے، اب تو وہاں پر ایک سرنگ بن چکی ہے لیکن اس سے پہلے کوہاٹ جانے کے لیے اس پہاڑ کے اوپر سے گزرنا پڑتا تھا جو کہ بہت ہی ایک خطرناک راستہ تھا۔ پشاور سے کوہاٹ تک کے سفر متعلق نے ایک الگ سے تحریر لکھی ہے جو اگلے صفحات میں موجود ہے۔ یہاں میں کوہاٹ سے آگے آنے والے واقعات متعلق ہی لکھ رہا ہوں۔ یہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں اس سفر کے بعد کبھی بھی کوہاٹ سے آگے ہنگو کی طرف نہیں گیا، جبکہ کوہاٹ کئی بار جانا ہوا۔

کوہاٹ کے بعد ہنگو شہر آتا ہے۔جب میں نے ہنگو کا نام سنا تو یوں لگا کہ یہ ایک مختلف نام ہے۔ اس شہر متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد پتہ چلا یہ وہ شہر ہے جس کا نام چینیوں نے رکھا تھا۔

ہنگو: جس کا نام چینیوں نے رکھا

ہنگو بارے ایک طویل تحریر مجھے [1] Archive.org پر ملی۔ میں نے ہنگو کے متعلق لکھنے کے لیے کافی حد تک اسی تحریر پر انحصار کیا ہے۔ یہ تحریر دراصل ہنگو سے تعلق رکھنے والے پروفیسر اسیر منگل جو کہ ایک مشہور شاعر، ادیب، اور اسکالر کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں، کے ایک انٹرویو پر مشتمل ہے۔

برٹش دور میں (بیسویں صدی کے آغاز میں ہی) ہنگو کو ایک تحصیل کا درجہ دیا گیا تھا اور پھر 1989ء میں یہ ایک ضلع بن گیا۔ بنگش قبائل اس علاقے میں سب سے زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے علاوہ اورکزئی اور خٹک قبائل کے لوگ بھی ایک مناسب تعداد میں بستے ہیں۔ اس ضلع کا سب سے اہم قصبہ تھل ہے۔

---

[1] https://archive.org/details/HistoryCultureAndBeautyOfHangukhyberPakhtunkhwaGuestProfessor

تاریخ سے پتہ چلتا ہے، کہ اسلام کی آمد سے پہلے، یہاں پر گندھارا تہذیب غالب تھی۔ یہ لوگ بدھ مت کے پیروکار تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے بدھ مت کے ماننے والے افغانستان اور ہندوستان کے طول و عرض میں آباد تھے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے، کہ یہاں ایک گاؤں تھا جس کے ایک سردار کا نام ہنگو تھا شاید اسی وجہ سے اسے ہنگو کہا جاتا ہے۔ چین میں ہنگو پاس نام کا ایک درہ ہے، جو چینی تہذیب کا گہوارہ اور اس کے دیرینہ صوبہ ژیان کا صدر مقام بھی ہے۔ بدھ مت کے ماننے والے دونوں جگہ آباد تھے۔ چین سے آنے والے چینی لوگوں نے اس جگہ کا نام ہنگو رکھا۔ کیا صحیح ہے کیا غلط، اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

یہ میرا قیاس ہے، ہوسکتا ہے کہ درست نہ ہو، اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔

پھر ایک وقت آیا جب چودھویں صدی میں، بنگش قبیلے کی اس علاقے میں حکومت قائم ہوئی۔ بنگش قبیلے کے بزرگوں اور سرداروں کی حیثیت ایک بادشاہ جیسی ہوتی تھی۔ اس علاقے کے ایک طرف کرُم ایجنسی ہے اور یہاں کرمے ٹویا نام کا ایک دریا بھی بہتا ہے۔ اس وقت ہنگو ایک آزاد ریاست تھی۔ ہنگو میں سمانہ نام کا ایک بہت ہی خوبصورت علاقہ بھی ہے اور اس علاقے کا موسم بالکل مری کے موسم جیسا ہے۔ ایک کثیر تعداد میں لوگ یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔

اس مضمون کے مطابق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ بنگش قوم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ان لوگوں کو 'افغان' بھی کہا جاتا تھا۔ بنگش لوگ ایران سے ملتان آئے، پھر کرُم اور پھر ہنگو میں آباد ہوئے۔

ہنگو سے تعلق رکھنے والی چند قابل ذکر شخصیات انسپکٹر جنرل مظفر خان بنگش، گورنر عارف بنگش سابق وزیر غنی الرحمان شامل ہیں۔ ہنگو میں کئی تاریخی عمارات بھی ہیں، ان میں اکثر برطانوی دورِ حکومت میں بنائی گئی ہیں، جن میں 1935ء میں بنایا گیا ایک گورنمنٹ ہائی اسکول بھی ہے۔ اس کے علاوہ اسپتال، پولیس ٹریننگ کالج، پولیس اسٹیشن بھی اہم ہیں۔ یہاں ایف سی فورٹ جو 1913ء میں بنایا گیا تھا، بھی ایک اہم عمارت ہے۔ اس کے علاوہ سمانہ میں لوکھارت قلعہ اور گلستان قلعہ تاریخی مقامات میں شامل ہیں۔ یاد رہے کہ سمانا، کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں دسمبر اور جنوری میں کئی فٹ برف

باری بھی ہوتی ہے۔ لوگ سیاحت کے لیے سریاب ڈیم اور جوزاری بھی جاتے ہیں۔ صالح محمد کمبوہ نے اپنی کتاب ''شاہ جہاں'' میں لکھا ہے کہ جب شاہ جہاں نے 1639ء میں ،افغانستان سے ہندوستان کا سفر شروع کیا، تو وہ چشمہ کے قریب ٹھہرا تھا۔ وہ جگہ اب بھی ایک مشہور پکنک پوائنٹ ہے۔ ہنگو کے علاقے کی اہم شخصیتوں میں جنرل جہان داد خان اور صدر غلام اسحاق خان کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

وکی پیڈیا کے مطابق (اس کا کوئی ریفرنس نہیں دیا گیا) 1540ء سے 1893ء کے دوران ہنگو پر یہاں کے دو خانوں، ملک خیل اور ہنگو کے خانوں کی حکومت تھی۔ میرا خیال ہے، کہ اس کے بعد انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

چند سال قبل تک سردیوں کے دوران افغانستان سے خانہ بدوش ہنگو کی طرف آجاتے تھے۔ اب سخت سرحدی کنٹرول کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا۔ ہم جب ہنگو سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ ہر طرف پھلوں کی دکانیں تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس علاقے میں پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہنگو میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا، جس پر اہلِ ہنگو بے حد فخر کرتے ہیں۔ یہ جنوری 2014ء کی بات ہے، کہ پندرہ سالہ اعتزاز حسن اسکول کے باہر دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان بچوں نے دیکھا کہ ایک شخص خود کش جیکٹ پہنے اسکول کی طرف جا رہا ہے۔ سب بچے خوف زدہ ہو گئے، لیکن اعتزاز حسن نے بمبار کا مقابلہ کرنے اور اسے پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران بمبار نے دھماکہ کر دیا، جس میں اعتزاز حسن شہید ہو گیا۔ بمبار اسکول کو تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر وہ ایسا کر گزرتا تو یقیناً بے شمار بچوں کی جان چلی جاتی۔ اس پر اعتزاز حسن کو ایک ہیرو کے طور پر جانا جانے لگا۔

ہنگو کے بعد تھل ایک بڑا قصبہ آتا ہے۔ ہم نے یہاں رک کر پانی پیا اور پاراچنار کی طرف چل پڑے۔

پاراچنار ایک تاریخی مقام

پاراچنار کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسی سرزمین کا تصور آتا ہے، جہاں ایک کثیر تعداد میں چنار کے درخت پائے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ چنار کا درخت کافی حد تک میپل لیف سے ملتا جلتا ہے، چنار کو میپل لیف کا کزن بھی کہا جاتا ہے۔

چنار کا درخت اپنی شان و شوکت، قد و قامت اور حُسن کی وجہ سے درختوں کی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ درخت کئی صدیوں تک قائم رہتا ہے۔ اس کے پتے سائز میں کافی بڑے ہوتے ہیں اور انسانی پنجے سے کافی حد تک مشابہت بھی رکھتے ہیں۔ اس درخت کی لمبائی سو فٹ تک ہو سکتی ہے اور اس کی موٹائی بھی پچاس فٹ کے قریب ہوتی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ موسمِ گرما میں اس کے پتے سرسبز ہوتے ہیں۔ جیسے ہی موسمِ خزاں شروع ہوتا ہے یہ پتے سرخ رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے درخت میں آگ لگی ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے؛

آ گئی لو خزاں کی پربت تک۔ وادیوں میں چنار جلتے ہیں!

چنار کشمیر کا قومی نشان بھی ہے، اسے کشمیر کا شاہی درخت بھی کہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے شیخ عبداللہ نے بھی اپنی سوانحِ حیات کا نام آتشِ چنار رکھا ہے۔ ڈاکٹر علامہؒ اقبال نے چنار کے درخت کو ایک استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں؛

جِس خاک کے خمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

جیسے ہی آپ پاراچنار میں داخل ہوتے ہیں، چناروں کی ایک لمبی قطار آپ کا استقبال کرتی ہے۔ موسمِ خزاں میں اس کے سرخ پتے ایک خوبصورت نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جب ہم پاراچنار آئے تو اس وقت جون کا مہینہ تھا، ابھی پتوں کا رنگ سرخ نہیں ہوا تھا۔

پاراچنار جو پاکستان ضلع کرم (سابقہ کرُم ایجنسی) کا صدر مقام ہے

پاراچنار، پشاور کے مغرب میں واقع ہے، اس کی سرحد افغانستان کے لوگر اور ننگرہار صوبوں سے ملتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے، کہ پاراچنار افغان دارالحکومت کابل سے اڑھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں توری، بنگش، مقبل، پارا چمکنی، زازی اور منگل قبائل آباد ہیں۔ کابل سے جنوب کی طرف دو سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک سڑک میدان شہر کی طرف۔ وہاں سے آپ بامیان جا سکتے ہیں اور اگر سیدھے چلتے جائیں تو غزنی سے ہوتے ہوئے قندھار پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے اس سڑک پر سفر کرنے اور ان تینوں شہروں؛ بامیان، غزنی اور قندھار جانے کا بھی موقع ملا ہے۔ دوسری سڑک گردیز کی طرف جاتی ہے۔ گردیز سے ایک راستہ پاراچنار کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ خوست سے ہوتا ہوا پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد کا ہے۔ عام

طور پر گردیز سے براہِ راست پاراچنار جایا جاتا ہے۔ دوسری اینگلو افغان وار کے وقت، انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے یہ راستہ بھی اختیار کیا تھا۔

جب میں نے پاراچنار کی تاریخ بارے جاننے کی کوشش کی تو مجھے ایک انگریز فوجی آفیسر کی کتاب پڑھنے کو ملی[1]۔اس کتاب کے مطابق پارے پاراچمکنی قبیلہ اس علاقے میں آباد تھا۔آج سے دو صدیاں قبل، اس علاقے میں پہلی مرتبہ ایران سے آنے والے کچھ لوگوں نے چنار کے درخت لگائے تھے۔ ان کے آنے سے ہی اس علاقے میں شیعہ مسلک کو فروغ ملا۔اس سے پہلے، یہاں کے لوگ زیادہ تر سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں ایک قدیم چنار کا درخت تھا، جس کی باقیات ابھی بھی ہیں، جو ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔اس جگہ اب کرُم ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ قدیم چنار کے درخت اور اس کے آس پاس کی زمین پاراخیل قبیلے کی ہے۔ اسی درخت کے سائے تلے جرگے بھی ہوتے تھے۔ پاراچنار کا نام، پاراچنار ہونے کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس درخت کی ملکیت کی خاطر پارے لوگوں کا آپس میں جھگڑا تھا، یعنی چنار سے پار۔ یہ درخت انگریزوں کے قائم کردہ دفاتر اور کرُم ملیشیا کے درمیان واقع تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ جب کرُم وادی کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آتے، تو وہ اس درخت کے نیچے جمع ہوتے تھے۔اس جگہ کا نام تونکئی بازار، لیکن چنار درخت کی وجہ سے اسے پاراچنار کہا جانے لگا۔

ہو سکتا ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو، اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ۔

پاراچنار کی ایک اور بھی تاریخی اہمیت ہے۔ جب 1893ء میں افغانستان کے بادشاہ عبدالرحمٰن خان کے دور میں، افغان حکومت اور ہندوستان پر قابض برطانوی حکومت کے زیر انتظام، ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا تعین کیا گیا، اس وقت ڈیورنڈ لائن پر بات چیت کے لیے، ہندوستان اور افغانستان کے ذمہ داران نے پاراچنار میں ہی مذاکرات کیے تھے۔

---

[1]The Pathan borderland : a consecutive account of the country and people on and beyond the Indian frontier from Chitral to Dera Ismail Khan ---

By Enriquez, C- M- (Colin Metcalfe), 1884

Publication date: 1921
Available on: https://archive-org

ان میں برطانیہ کی طرف سے سر مورٹیمر ڈیورنڈ اور صاحبزادہ عبدالقیوم، اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ خیبرا یجنسی (جو صوبہ سرحد کے پہلے وزیر اعلیٰ تھے اور ان کا نام اسلامیہ کالج پشاور کے بانیوں میں بھی شامل ہے۔ ان کے متعلق، میں پچھلے صفحات میں لکھ آیا ہوں) اور افغانستان کی طرف سے صاحبزادہ عبداللطیف اور خوست کے گورنر سردار شیر ندیل خان نے، امیر عبدالرحمٰن خان کی نمائندگی کی تھی۔

آج میں اس شہر میں تھا جہاں صدیوں سے اکٹھے رہنے والے لوگوں کے درمیان ایک لائن کھینچی گئی اور جو اس کے بعد سے لے کر آج تک پاکستان اور افغانستان کے درمیان وجہ تنازعہ بنی ہوئی ہے۔

اس علاقے کے لوگوں کی درخواست پر 1892ء میں کرُم وادی کا الحاق ہندوستان سے کیا گیا اور ایک پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر ہوا جس کا ہیڈ کوارٹر اپر کرُم میں پاراچنار میں بنایا گیا۔ اس وقت یہاں پر ہندوستانی قانون کا کچھ حصہ لاگو بھی کیا گیا۔ زمانہ قدیم سے خانہ بدوش قبائل موسم گرما میں پاراچنار آتے تھے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے مغل بادشاہ بھی اگر اس علاقے میں آتے، تو وہ بھی موسم گرما میں پاراچنار میں رہائش رکھتے تھے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ پاراچنار کا علاقہ 1878ء کی دوسری اینگلو افغان جنگ سے پہلے ابدالی سلطنت کا حصہ تھا۔ اس دور میں بلوچستان کا ایک بڑا حصہ بھی قندھار سے منسلک تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب 1892ء میں انگریزوں نے اس علاقے میں اپنے قدم جمائے۔ اس کے بعد ہی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کا منصوبہ مکمل کیا گیا۔

پاراچنار سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے جو اس وقت آسٹریلیا میں رہ رہے ہیں، ضلع کرُم کی تاریخ متعلق ایک مضمون شائع کیا ہے[1]۔ اس کے لیے انھوں نے صوبہ سرحد کے گزٹیئر 1907ء کے علاوہ BritishGazetteer Shias of Pakistan سے بھی مدد لی ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ضلع کرُم کی مستند تاریخ 1148ء سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب غزنی کے بادشاہ، بہرام شاہ کو غور کے سیف دین کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اس نے کرُم

---

[1] https://www.facebook.com/ParachinarGuloona/posts/history-of-kurram-district-gazetteer-of-the-nwfp-province-1907-p-238-the-authent/2764048680273119/

میں پناہ لی۔ ایک دفعہ پھر اس نے غزنی کی طرف چڑھائی کی اور غزنی پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد کئی لڑائیاں ہوئیں، جن میں کرُم نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس کی تفصیل بے حد دلچسپ ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے، کہ جب بھی محمد غوری ہندوستان جاتا، وہ یہاں ضرور رکتا تھا۔ اس نے تاج الدین کو یہاں کا اپنا جانشین مقرر کیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا، جب 1206ء میں قطب الدین ایبک نے اسے شکست دی اور یوں کرُم کا علاقہ تاج الدین کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

کسی وقت میں کرُم پر سلطان محمد خوارزم شاہ بھی حاکم رہا۔ ایک وقت آیا کہ اس پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب ہندوستان میں مغل حکمران تھے، اس وقت ان کی حکومت قندھار تک تھی۔ اسی دور میں کرُم بھی ان کے ماتحت تھا۔ یہاں رہنے والے افغانوں کو کرلرنی افغان کہا جاتا ہے۔ وہ سب پیر روشن کے شاگرد تھے، اس لیے روشانیوں کے نام سے جانے جاتے تھے۔

ان لوگوں نے مغل حکومت کے خلاف بغاوت کی قیادت کی، اور ان کا مرکز کرُم تھا۔ ہندوستان میں مغل حکومت کے خاتمے کے بعد، مغلوں کا کرُم پر کنٹرول کمزور پڑ گیا اور کوہاٹ کے بنگش قبائل نے مغلوں سے آزادی کا اعلان کرکے ایک آزاد ریاست قائم کر لی۔ مغل سلطنت کے ٹوٹنے پر کرُم افغانستان کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

ایسا ہندوستان بھر میں ہوا ہے۔ جب مغلوں کی حکومت کمزور ہوئی تو مقامی لوگوں نے بغاوت کی اور اپنی اپنی ریاستیں قائم کیں۔ ایسا ہی یہاں بھی ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت، ہندوستان بھر میں کم و بیش کوئی ساڑھے پانچ سو مقامی ریاستیں تھیں۔ ان میں سے پیشتر مغلوں کے زوال کے بعد معرضِ وجود میں آئیں۔

اس کے بعد ایک عرصے تک، کرُم کا علاقہ جنگ و جدل کا میدان بنا رہا۔ جس کی زیادہ تفصیل یہاں مناسب نہیں ہے۔ مختلف قبیلوں کی لڑائیوں نے کسی تیسرے فریق کی راہ ہموار کر دی اور یوں ایک دن 1856ء میں بریگیڈیئر جنرل نیویل چیمبرلین کی سربراہی میں انگریزوں کی فوج وادی میں داخل ہوتی ہے (چیمبرلین کے نام کی ایک سڑک لاہور میں بھی ہے)۔ یاد رہے اس وقت تک انگریز سکھوں سے پنجاب اور سرحد کے کئی علاقے چھین چکے تھے۔ مقامی افغان گورنر غلام جان کی ضمانت پر، یہاں آباد ترک باشندے پانچ ہزار روپے تاوان ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ بعد میں انگریزوں نے کابل خیل وزیروں کے خلاف ایک مہم شروع کی۔ پھر

ایک ایسا وقت آتا ہے، کہ اس علاقے کے غیور لوگ انگریزوں کے خلاف ایک بڑے پیمانے پر جنگ شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد ایک طویل عرصے تک مقامی لوگوں اور انگریزوں کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں۔ کبھی کوئی جیتا، کبھی کوئی ہارا۔ کئی مقامی قبائل انگریزوں کے حامی بھی تھے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ افغانوں کے مظالم سے تنگ آ کر توریوں اور بنگش قبائل نے مل کر انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ آ کر انھیں افغانوں سے آزادی دلائیں۔

میں نے ہندوستان بھر میں یہ بات دیکھی ہے، کہ انگریز کسی بھی جگہ بن بلائے نہیں گئے۔ جب مقامی لوگ آپس میں جنگ وجدل میں مشغول ہوتے، تو کمزور گروہ انگریزوں کو آواز دیتا، وہ آتے اور مستقل قابض ہو جاتے۔ ایسا ہی ہر جگہ ہوا ہے اور ایسا ہی کرُم میں بھی ہوا۔

پھر تاریخ نے وہ دن بھی دیکھا جب برطانوی حکومت نے 1892ء میں خود توریوں کی درخواست پر کرُم پر اپنا حکم چلانا شروع کر دیا۔

وہ دن گیا اور آج کا دن آیا!

صدیوں سے آزاد لوگ نیم آزاد لوگ بن کر رہ گئے۔ وہ آج بھی اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کب تک یہ جنگ چلے گی، معلوم نہیں!

لیکن یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ جنگ جاری ہے!

اس کے بعد ہم ایک رات پاراچنار میں رک کر افغانستان میں واقع حزب اسلامی کے کیمپ غنڈ ال فتح کے پاس پوست فیض پر چلے گئے۔ آگے کیا ہوا، کیسے زخمی ہوا، کس طرح جہادی بن کر زندگی کے دن گزارے، کا تذکرہ میں نے افغانستان کے اسفار بارے سفر نامے میں کیا ہے۔ یہاں صرف پاراچنار تک کے ہی سفر کی رُوداد بیان کرنا مقصود تھا۔

مانسہرہ سے کاغان اور ناران: جسے دیکھنے کی حسرت مدت سے تھی

اپنے بچپن ہی سے ناران اور کاغان کے متعلق لوگوں سے بہت کچھ سننے کو ملتا تھا۔ کوئی انھیں پریوں کا دیس کہتا، اور کوئی جھیل سیف الملوک کا ذکر کرتا، کسی نے یہاں پر واقع بے شمار وادیوں کا ذکر کیا۔ یہ سب سن کر ہمیشہ دل میں یہ خواہش رہتی تھی، کہ کب وہ دن آئے گا، کہ میں ان علاقوں کی سیر کو جاؤں گا۔ زمانہ طالب علمی میں صرف ایبٹ آباد تک جانے کا موقع ملا۔ اس کے بعد عملی زندگی شروع ہو گئی، جس کے اپنے تقاضے تھے۔ کبھی مالی وسائل کی کمی اور کبھی وقت کا نہ ہونا۔ یہ وہ چند وجوہات تھیں جن کی بناء پر میں ان حسین وادیوں کو نہ دیکھ سکا۔

جب بچے تھوڑے بڑے ہوئے تو یہ فرض جانتے ہوئے کہ بچوں کو پاکستان کے خوبصورت علاقوں کی سیر کروانی چاہیے۔ سب سے پہلے ناران اور کاغان جانے کا پروگرام بنایا۔ اس پروگرام میں میرے ساتھ میری اہلیہ اور تینوں بچے؛ آمنہ، آصف اور عاصم، بھی شامل تھے۔ ہم نے یہ سفر اپنی گاڑی پر کیا۔ یہ 1994ء کی گرمیوں کی بات ہے۔

ہم لاہور سے چل کر رات مانسہرہ ٹھہرے، اس سے اگلے دن ہم بالاکوٹ سے ہوتے ہوئے ناران پہنچ گئے۔ راستے میں کاغان بھی رکے۔ ناران میں ہم نے جھیل سیف الملوک کا دیدار بھی کیا۔ جو اب تک ہمارے بچوں کی یادداشت میں ایک خوبصورت یاد کے طور پر موجود ہے۔ اس سفر کی رُوداد ایک عرصہ کے بعد لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس کا مقصد اس سفر میں آنے والے تمام اہم مقامات کے متعلق آپ کو کچھ بتانا ہے۔

یاد رہے، کہ اس وقت سڑکوں کا حال بہت اچھا نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود بھی کوئی زیادہ مسائل بھی نہیں تھے۔ میں نے مانسہرہ تک آنے والے تمام اہم قصبہ جات کے متعلق اگلے صفحات میں لکھا ہے۔ اب میں مانسہرہ سے آگے ناران تک کے سفر کی رُوداد ہی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

یاد رہے کہ ناران، کاغان، مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پور یہ سب موجودہ خیبر پختونخواکے ہزارہ ڈویژن میں واقع ہیں۔ ہم رات مانسہرہ میں گزار کر اگلے دن مانسہرہ سے ناران کے لیے روانہ ہوئے۔

مانسہرہ: اشوک کے دور کا قصبہ

اس سے پہلے، کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ مانسہرہ کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس سے آپ کو اس شہر متعلق جاننے کو ضرور کچھ نہ کچھ ملے گا، جو امید ہے کہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مانسہرہ متعلقدرج ذیل مضامین اور تحریروں سے مدد لی ہے:

کے پی کی ٹورسٹ گائڈ [1]

ہزارہ یونیورسٹی [2]

اشفاق احمد گلف نیوز [3]

یونیسکو [4]

ریحان علوی Beyond Dreams [5]

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا [6]

امپریل گزٹ کے مطابق [7] (جس کی تاریخ کا معلوم نہیں، لیکن یہ انگریزوں کے دور ہی کی ایک دستاویز ہے) اس علاقے میں مانسہرہ گاؤں آباد تھا۔ یہ گاؤں ایبٹ آباد کے شمال میں

---

[1] https://www.kptourism.com
[2] https://www.hu.edu.pk
[3] https://gulfnews.com/world/asia/pakistan/pakistan-prepares-to-hold-a-major-hindu-festival-maha-shivaratri-from-february-20-1.69531510
[4] https://whc.unesco.org/en/tentativelists/1881/
[5] https://books.google.com.pk/books?id=aT26BwAAQBAJ&pg=PA92&redir_esc=y#v=onepage&q&f=false
[6] https://www.britannica.com/place/Mansehra
[7] https://dsal.uchicago.edu/reference/gazetteer/pager.html?objectid=DS405.1.I34_V17_209.gif

اور کالا کی سرائے سے کشمیر کی سرحد تک ایک مرکزی سڑک پر واقع ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں (1901ء) اس شہر کی آبادی پانچ ہزار تھی۔ یہاں پر چند رہائش پذیر کھتری، تاجر اناج اور دیگر اشیاء کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس وقت، اس شہر میں ایک اینگلو ورناکولر مڈل اسکول بھی موجود تھا، جسے ڈسٹرکٹ بورڈ چلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی دو چٹانیں بھی تھیں جن پر اشوک کے احکام کندہ تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ شہر رنجیت سنگھ کے ایک جرنیل مان سنگھ کے نام پر بنا تھا۔ مجھے اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملا۔ اس لیے میرے خیال میں امپریل گزٹ کی بات زیادہ درست ہے، کہ یہاں مانسہرہ نام کا ایک گاؤں تھا، جہاں اب یہ شہر موجود ہے۔

یہ میرا خیال ہے، ہو سکتا ہے کہ میری یہ بات درست نہ ہو۔

ہمارا قیام مانسہرہ کے شروع میں واقع ایک ہوٹل میں تھا۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے سے ایک سڑک گلگت کو جاتی تھی، جسے شاہراہِ قراقرم کہتے ہیں۔ دوسری سڑک شہر کے بیچ سے گزر کر ناران کی طرف جاتی تھی (اب ہزارہ موٹر وے بننے سے نقشہ میں کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے)۔ مانسہرہ میں اشوک کے دور کا ایک پتھر بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ کسی وقت میں یہ تمام علاقے اشوک کی سلطنت کا حصہ تھے۔ میں نے بھی یہ پتھر دیکھا ہے۔

اگر آپ مانسہرہ کو نقشہ میں دیکھیں، تو آپ جان سکیں گے کہ ایبٹ آباد کے بعد اکثر مقامات پر چڑھائی ملتی ہے۔ مانسہرہ شہر بھی اونچے نیچے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے ساڑھے تین ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ مانسہرہ سے چار سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک تو وہی سڑک ہے جس سے گزرتے ہوئے ہم ایبٹ آباد سے مانسہرہ پہنچے تھے۔ دوسری سڑک مانسہرہ سے گلگت کی جانب جاتی ہے جسے شاہراہ قراقرم کہتے ہیں۔ تیسری سڑک بالاکوٹ سے ہوتی ہوئی ناران اور کاغان تک جاتی ہے اور یہی سڑک آگے جا کر چلاس کے پاس شاہراہ قراقرم سے مل جاتی ہے۔ چوتھی سڑک جنگلات میں سے ہوتی ہوئی مظفرآباد جاتی ہے۔ مجھے ایک دفعہ اس سڑک پر بھی جانے کا موقع ملا۔ مظفرآباد سے آگے آپ کشمیر کی طرف جا سکتے ہیں۔ اس طرح سے مانسہرہ دفاعی نُقطۂ نَظر کے ساتھ ساتھ معاشی نُقطۂ نَظر سے بھی اہم سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے۔

اسی وجہ سے جو لوگ جی ٹی روڈ کے راستے سے ہوتے ہوئے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے تھے، ان کے بائیں جانب یہ پہاڑی علاقہ تھا جبکہ ان کے دائیں طرف ایک وسیع میدان تھا، جس میں زیادہ تر علاقے ویران اور خشک تھے۔ اس لیے سب سے پہلے جو علاقے آباد ہوئے، وہ جی ٹی روڈ کے شمال مشرق میں واقع تھے۔

اس کا یہ مطلب بھی بنتا ہے، کہ جو بھی کشمیر سے آ کر بٹگرام سے ہوتا ہوا بشام سے نکلتا ہوا گلگت کی طرف جانا چاہتا تھا، اسے مانسہرہ سے ہی گزرنا پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ بشام سے ایک سڑک مغرب کی طرف نکلتی ہے جو مٹہ کے مقام پر سوات تک جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مانسہرہ شہر ایک اہم ترین مقام پر واقع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قدیم دور کے مندر، اسٹوپا اور اشوکا کی پتھروں پر لکھی نشانیاں ملتی ہیں۔

مانسہرہ چندر گپت موریہ کے عروج کے زمانے میں، اس کی سلطنت ایک حصہ تھا۔ ایک دور میں اشوک جب وہ ایک شہزادے کی زندگی گزار رہا تھا، نے اسی علاقے پر حکومت کی۔ بعد میں اشوک (اسے اشوکا بھی لکھا جاتا ہے) نے اسی مقام پر اپنی ایک قیام گاہ بھی بنائی۔

میرے علم کے مطابق پاکستان کے کسی اور علاقے میں پتھروں پر کندہ اشوک کے چودہ فرامین نہیں ملتے، سوائے مانسہرہ کے۔ اب انھیں کافی حد تک محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ تحریر تیسری صدی قبل مسیح کی ہے۔ بعد میں یہاں پارتھی، سیتھیائی اور کشان بھی حاکم رہے۔ اس خطے کو عروج بدھ مت کے حکمران کنشک عظیم کے دور میں ملا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اشوک نے جب فتح حاصل کر لی تو وہ جنگوں کے دوران ہونے والی تباہی سے بڑا دکھی ہوا۔ اس پر اس نے بدھ مت اختیار کر لیا اور بقیہ زندگی بدھ مت کی ترویج کے لیے وقف کر دی۔ اس کے بعد اس نے پوری سلطنت میں بدھ مت کے مقدس مقامات کا دورہ کیا اور ایک نئے اخلاقی قانون کی بنیاد بھی رکھی۔ قوانین کی تشہیر کے لیے متعدد ستون کھڑے کیے، جن کی تعداد کوئی تینتیس کے قریب ہے، ان میں سے ایک مانسہرہ میں واقع ہے۔

گپتا شاہی کے زوال کے بعد، ہندو شاہی اس علاقے پر حکومت کرنے آئے۔ انھوں نے یہاں دو بڑے قلعے بھی بنوائے۔ اسی دور میں ہندوؤں نے یہاں پر بہت سے ہندو مندر بھی بنائے۔ ہندو شاہی کا خاتمہ 1001ء میں ہوا، جب اسے غزنویوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ پھر اس کے بعد سے لے کر سکھوں کے دور تک یعنی 1818ء تک کوئی آٹھ سو سال اس علاقے پر مسلمان ہی حاکم رہے۔ جن میں غزنوی، غوری، سلاطین دہلی، مغل اور ابدالی شامل ہیں۔

احمد شاہ ابدالی نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں مغلوں سے حکومت چھین لی اور اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی کی موت کے بعد رگھوناتھ راؤ نے اسے مراٹھا سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا۔ بعد میں ایک دفعہ پھر احمد شاہ ابدالی نے

مراٹھوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جب ابدالی حکومت کمزور ہوئی تو سکھوں نے 1818ء میں اس علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

سکھوں نے بھی یہاں تیس سال تک حکومت کی (1818-1848)۔ پھر انگریز (1849-1947) قیامِ پاکستان تک سو سال تک اس علاقے کے حاکم بنے رہے۔ بعد میں مانسہرہ تحصیل کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا یا وریوں مانسہرہ کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

ابھی حال ہی میں مانسہرہ کے شیو مندر میں ایک بڑا تہوار 'مہا شیوارتری' منایا گیا۔ اس تہوار میں شرکت کے لیے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد پاکستان آئی۔

مانسہرہ سے بالاکوٹ

مانسہرہ سے بالاکوٹ کا فاصلہ چالیس کلومیٹر ہے۔ بالاکوٹ، مانسہرہ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ بالاکوٹ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے، کہ یہاں سے وادی کاغان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی علاقے میں واقع جھیل لولوسر سے نکلنے والا ایک خوبصورت دریا، دریائے کنہار بھی ہے ،جس نے اس وادی کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کیا ہے ، دریا کنارے چلتے ہوئے ہم بالاکوٹ پہنچ گئے۔ شہر دریا کے دونوں طرف واقع ہے۔

اب تک میں نے پاکستان میں جتنے بھی دریا دیکھے ہیں، ان میں دریائے کنہار کا شمار خوبصورت دریاؤں میں ہوتا ہے۔ اس کے لینڈ سکیپ کا اپنا ہی ایک حسن ہے۔ یہ دریا، وادی ناران میں لولوسر جھیل سے شروع ہو کر ملکہ پربت، جھیل سیف الملوک، مکڑا چوٹی اور وادی کاغان کے ندی نالوں کا پانی لے کر ہری پور سے پہلے دریائے جہلم سے جاملتا ہے۔ پانی انتہائی ٹھنڈا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں عمدہ ٹراؤٹ مچھلی پائی جاتی ہے۔

میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آیا تھا۔اُس وقت میرے ساتھ میرے ایک دوست زاہد مشتاق تھے۔ ہم نے سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید کی قبروں پر حاضری بھی دی تھی۔ یہ بھی آپ کو یاد ہو گا کہ 2005ء میں زلزلہ کی وجہ سے یہ شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ ہم نے جس ہوٹل میں کھانا کھایا تھا، وہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ بالاکوٹ ان شہروں میں سے ایک تھا، جہاں زلزلہ کی وجہ سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ باہمت لوگوں نے شہر کو دوبارہ سے تعمیر کیا ہے، جو ان کی ہمت کی ایک زندہ مثال ہے۔

چٹہ بٹہ: برلب دریا واقع ایک قصبہ

بالاکوٹ جاتے ہوئے راستہ میں چٹہ بٹہ نام کا ایک قصبہ واقع ہے، جو بالکل دریا کے ساتھ واقع ہے۔ اس علاقے کے متعلق ایک کہانی مشہور ہے کہ تلہٹہ نامی گاؤں میں سیّد احمد شہیدؒ کا سر مبارک دفن کیا گیا تھا۔ اس واقعے کی تصدیق کسی کتاب سے نہیں ہوتی، مگر علاقے کے اکثر لوگ یہ بات بیان کرتے ہیں۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چٹہ بٹہ کے آباد لوگ سوات سے آئے تھے۔ علاقے کی خوبصورتی انھیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ یہ صدیوں پرانی بات ہے، یہ لوگ باہمت اور دلیر تھے۔ انھوں نے یہاں کی زمینوں اور کاروبار پر قبضہ کیا۔ سواتی لوگ اب بھی اپنی دولت اور عقلمندی کی وجہ سے اس علاقے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھیں عام طور پر خان کے نام سے جانا جاتا ہے، نسل کے اعتبار سے یہ لوگ پختون ہیں۔

یہاں پر ایک ہاتھی گٹ (ہاتھی کی چٹان) کے نام سے ایک چٹان بھی ہے۔ جس کے متعلق ایک افسانوی کہانی مشہور ہے۔ علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ ایک جادو گر نے اپنے جادو کے زور پر ایک شادی کے قافلے کو پتھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس قافلے میں ایک ہاتھی بھی تھا، جس کا مجسمہ اب بھی گاؤں کے دروازے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک لوک داستان ہیں، جس کی کوئی تصدیق کسی کتاب سے نہیں ہوتی۔ دریا کا کنارہ ہونے اور خوبصورت منظر نے ہمیں یہاں رکنے پر مجبور کیا۔ اس جگہ کا تصور اب تک ذہن کے خانوں میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔

چٹہ بٹہ سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر مین روڈ سے ہٹ کر، گڑھی حبیب اللہ نام کا ایک قصبہ ہے۔ اس قصبہ سے ایک راستہ مظفر آباد کشمیر کو جاتا ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جسے اپنا کر گلگت کے لوگ کشمیر جاتے تھے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ ہم گڑھی حبیب اللہ تو نہ جا سکے لیکن کچھ دلچسپ باتوں کا پتہ چلا جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

گڑھی حبیب اللہ

گڑھی حبیب اللہ تحصیل مانسہرہ میں واقع ہے، اس کے مشرق میں کشمیر واقع ہے۔ اس قصبہ کا نام چیف آف سواتی قبیلہ سردار حبیب اللہ خان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس کا نام گڑھی سعادت خان تھا، جو اس قصبے کے بانی مانے جاتے ہیں۔ وہ اٹھارہویں صدی میں یہاں کے حکمران تھے۔ اس علاقے میں سوات کے لوگ کب آئے اور کس طرح انھوں نے اس

علاقے میں پہلے سے موجود حکمرانوں کو شکست دے کر علاقے پر قبضہ کیا؟ اس متعلق تاریخ میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے ۔ میں اس سارے واقعہ کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تاریخ ہزارہ نام کی کتاب جسے ڈاکٹر شیر بہادر نے لکھا ہے، اس علاقے کی تاریخ جاننے کے لیے ایک مفید کتاب ہے[1]۔

سواتی قبیلہ، سوات کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ اہل سوات نے اس علاقے سمیت کشمیر پر چودھویں سے سولہویں صدی عیسوی تک کامیابی سے حکومت کی۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کشمیر کے پہلے مسلمان حکمران شاہ میر بابا کا تعلق بھی سواتی قبیلہ سے ہی تھا۔ ان کے متعلق کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ افغانستان سے سوات آئے تھے اور پھر وہاں سے کشمیر پہنچے تھے۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے کشمیر میں اسلام پھیلا۔ سواتی لوگوں کے حملوں کی وجہ سے مقامی لوگ خاص طور پر ترکوں اور ہندوؤں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ بابر کے دور میں، یوسف زئیوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغلوں کا ساتھ دیا۔ اس دوران انھوں نے مقامی قبائل سے جنگ بھی کی۔ یہ لوگ مختلف ادوار میں یہاں قدم جمانے میں لگے رہے، لیکن ہر بار انھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے، کہ سواتی لوگ ہزارہ کے سب سے بڑے زمیندار قبائل میں سے ایک ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مانسہرہ، گڑھی حبیب اللہ، بالاکوٹ، کاغان، بٹگرام اور ہزارہ کے علاقوں میں رہتے ہیں۔ سعادت خان سواتی نے علاقے میں ابدالیوں کے دور حکومت میں پکھلی کی ریاست قائم کی تھی۔ ان کا ایک بیٹا نجیب اللہ خان سواتی، سکھوں کے خلاف لڑتا ہوا، منگل کی مشہور جنگ میں شہید ہوگیا تھا جو تاریخ کا ایک بڑا واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ سواتی لوگوں نے سکھوں کی حکمرانی کے خلاف سخت جدو جہد کی۔ پشتو ان کی روزمرہ کی زبان ہے۔

Sher Bahadur Khan Punni -Tarikh e Hazara (Original) By Dr[1]
((Complete First Edition
by Dr. Sher Bahadur Khan Panni
available at
https://archive-org/details/TarikhEHazaraByDr-SherBahadurKhanPunni

بالا کوٹ اور سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار

زمانہ طالبعلمی میں بالا کوٹ کی تاریخ، سیّد احمد شہیدؒ اور سکھوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کی داستان کے علاوہ بھی اس علاقے بارے کافی کچھ پڑھنے کو ملا۔ اب ہم اس شہر میں آرہے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آیا تھا۔ لیکن اس کی کوئی یاد میرے ذہن میں واضح نہیں تھی۔ اب کی بار جذبات اوراحساسات کی کیفیت مختلف تھی۔ اس سے پہلے، کہ میں آپ کو اگلے سفر کی رُوداد سناؤں، میں چاہوں گا کہ اس تاریخی قصبہ کے متعلق کچھ اہم معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ بالا کوٹ کے متعلق گزیٹیر 1907 ء میں کافی تفصیل ملتی ہے[1]۔

بالا کوٹ کی اصل وجہ شہرت یہاں پر ہونے والی لڑائی ہے جو 6 مئی 1831ء کو سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کی قیادت میں سکھوں کے خلاف لڑی گئی۔ سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جدوجہد کو تحریک مجاہدین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں عظیم ہستیوں کے مزارات بھی اسی شہر میں واقع ہیں۔ بالا کوٹ کی مرکزی مسجد سیّد احمد شہیدؒ کے مزار سے ملحق دریائے کنہار کے کنارے پر ہے۔ مجھے بھی ان کے مزار پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جبکہ شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مزار دریا سے ہٹ کر، ایک اونچی جگہ واقع ہے۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ کون جیتا کون ہارا؟اس کا مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

اس تحریر کے لیے میں نے دو مضامین سے مدد لی ہے۔ایک مضمون سید منظور الحسن کا ''سیّد احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک جہاد'' کے نام سے غامدی ٹی وی نے شائع کیا ہے[2]۔ دوسرا مضمون محسن فارانی صاحب نے ''بالا کوٹ کے شہید'' کے نام سے لکھا ہے جو نوائے وقت میں دو مئی 2014ء کو شائع ہوا ہے[3]۔

---

[1] Gazetteer Of The Hazara District, 1907
by Watson, H Ed D
https://archive.org/details/in.ernet.dli.2015.31463

[2] http://alsharia.org/2015/dec/syed-ahmad-shaheed-tehrrek-jihad-dr-irfan-shehzad

[3] https://www.nawaiwaqt.com.pk/02-May-2014/299969

تحریک مجاہدین اور بالا کوٹ کی جنگ

سیّد احمد شہیدؒ 1786ء، میں بریلی میں ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی علاقے میں واقع ایک مدرسہ سے حاصل کی۔ ان کی ابتدائی زندگی کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں تعلیم میں دلچسپی کم اور سپاہیانہ کھیلوں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کا میلان بھی واضح تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذوق شوق سے عبادت کرتے تھے اور تہجد کی نماز بھی ان کا معمول بن گئی تھی۔

بریلی، بھارتی ریاست اتر پردیش کے مغرب میں واقع ایک بڑا شہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ روہیل کھنڈ جیسے ایک تاریخی علاقے کا مرکز بھی مانا جاتا ہے۔ یہ اتر پردیش کے دارالحکومت لکھنؤ کے شمال مغرب میں اڑھائی سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کا دہلی سے فاصلہ بھی اتنا ہی ہے، دہلی اس کے مغرب میں واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد 1537ء میں جگت سنگھ کٹھریا نے رکھی تھی۔ جگت سنگھ کے دو بیٹے تھے جن کے نام بنسل دیو اور بریل دیو تھے۔ اسی بنیاد پر اس شہر کا نام 'بنس بریلی' رکھا تھا، جو بعد میں صرف بریلی رہ گیا۔ یاد رہے کہ احمد رضا خان بریلوی صاحب، بریلوی مکتبہ فکر کے بانی، کا تعلق بھی اسی قصبہ سے ہے۔

مغل دور میں یہ علاقے مغلوں کی حکمرانی میں آ گئے۔ اس شہر کی دلچسپ بات یہ بھی ہے، کہ بریلی کے مجاہدین نے خان بہادر خان کی قیادت میں 1857ء کی جنگ آزادی کے نتیجہ میں اس شہر کو آزاد کرایا تھا۔ ایک سال کے بعد اسے انگریزوں نے اسے دوبارہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے، کہ جنگِ آزادی کے نتیجہ میں جس ایک شہر کو آزادی ملی تھی، وہ یہی شہر تھا۔

سیّد احمد شہیدؒ اوائل جوانی میں معاش کی خاطر لکھنؤ بھی گئے۔ وہیں سے انھیں حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ آپ اس غرض سے دہلی تشریف لے آئے اور شاہ صاحب کی شاگردی میں آ گئے۔ شاہ صاحب کے بھائی شاہ عبدالقادر کا شمار بھی آپ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ کچھ عرصہ یہاں گزارنے کے بعد واپس آ گئے اور نواب امیر احمد خان کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہاں پر انھوں نے سپاہیوں میں دین کی دعوت کا کام شروع کیا۔

امیر خان انگریزوں کے خلاف تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ امیر خان انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ مصالحت پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات سیّد احمد شہیدؒ کو پسند نہ تھی اور آپ نے امیر خان کو خدا حافظ کہا اور دوبارہ شاہ عبدالعزیز کے پاس آ گئے۔ اس وقت سیّد احمد شہیدؒ کی عمر تیس سال سے زائد تھی۔ آپ نے سلسلۂ بیعت شروع کر دیا۔ اولین بیعت کرنے والے لوگوں میں مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل جیسے علماء شامل تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ایک کثیر تعداد میں لوگوں نے، آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کر دی۔

اس کے بعد آپ نے ہندوستان کے کئی علاقوں کا دورہ کیا۔ اس دورے کے نتیجہ میں ایک بڑی تعداد نے آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اسی عرصہ میں سیّد احمد شہیدؒ اپنے رفقاء کے ہمراہ ایک بڑے قافلے کی قیادت کرتے ہوئے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ حج کے دوران ہی آپ نے اپنے رفقاء سے جہاد کے لیے بیعت لی۔ آپ نے حج سے واپس آ کر بریلی میں مجاہدین کی جنگی تربیت کا کام شروع کر دیا۔

سیّد صاحب مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغل ریاست کا زوال ہو رہا تھا اور پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ ایک طرح سے سکھوں نے پنجاب سے مغل اور ابدالی کے وارثوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ دریائے ستلج کے مشرق میں انگریز اور مغرب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ پنجاب میں سکھ مظالم کی انتہا کر رہے تھے۔ وہ گن گن کر مسلمانوں سے بدلے لے رہے تھے۔ مساجد کی بے حرمتی عام تھی۔ یہ دور مسلمانوں پر ایک سخت دور تھا۔ سکھوں کے مظالم میں ابدالی کے ہندوستان سے جانے کے بعد بے حد تیزی آ گئی تھی۔ کوئی بھی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا۔ سکھوں نے مسلمانوں پر جو بدترین مظالم کیے، ان کے بقول، یہ سب کچھ مغل حکمرانوں کے سکھوں پر مظالم کا بدلہ تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پنجاب میں سکھوں نے حکومت ابدالی کے نامزد کردہ گورنر سے چھینی تھی۔

ان حالات میں سیّد صاحب نے دو کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک مسلمانوں میں رائج فضول رسومات کو ختم کرنا اور دوسرا مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کا سدِ باب کرنا۔ انھوں نے اسے تحریک مجاہدین کا نام دیا۔ سیّد احمد نے لشکر میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کا مثبت اثر ہوا۔ اسی دوران انھوں نے دینی میدان میں اپنا نام پیدا کیا۔ شاہ اسماعیل، محمد یوسف اور شاہ عبدالحیٔ آپ کی جماعت میں شامل ہو گئے۔

مجاہدین اور سکھوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ اکوڑہ کے مقام پر ہوئی، جس میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ دوسری لڑائی حضرو میں ہوئی جو مجاہدین نے جیت لی۔ اس طرح وہ وقت بھی آگیا جب 1830ء میں پشاور پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا۔ یہ سب رنجیت سنگھ کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔

مہاراجا رنجیت سنگھ نے سیّد صاحب کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سیّد احمد شہیدؒ اور سکھوں کے درمیان آخری جنگ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر ہوئی۔ جس میں سید احمد، شاہ اسماعیل اور کئی دوسرے اکابر نے جام شہادت نوش کیا اور یوں سکھ اس تحریک کو دبانے میں کامیاب ہوئے۔ اس جنگ کے بعد مجاہدین قریبی پہاڑوں پر چلے گئے اور ایک گوریلا جنگ کی شکل میں اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ تحریک مجاہدین کو پٹنہ کے ولایت علی نے جاری رکھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ پنجاب سے سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی اور پنجاب انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

بعد میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ایبٹ جیمز کا نام ان لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اس علاقے میں برٹش راج کا آغاز کیا۔ ایبٹ آباد اس سلسلے کا پہلا شہر ہے، جسے انگریزوں نے آباد کیا۔

اس لیے مدت تک کوئی بھی انگریزوں کے خلاف تحریک نہ چلا سکا۔ سب نے ان کے آگے سر جھکا کر چلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اِکادُکا لوگ اپنی سی کوشش ضرور کرتے رہے۔

یہ بھی کیا خوب بات ہے، کہ اب بھی تحریک مجاہدین کا دفتر مزنگ روڈ لاہور پر موجود ہے اور ڈاکٹر راشد رندھاوا صاحب اس کے امیر تھے، جن کی حال ہی میں وفات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں ہی صوفی عائش صاحب کو قائم مقام امیر مقرر کر دیا تھا۔ ان کے دفتر میں موجود جناب اسامہ راجپوت صاحب کا نمبر مجھے ملا میں نے ان سے بات بھی کی اور ان کے دفتر جانے کا وعدہ کیا۔ اسامہ صاحب کا نمبر 03048087842 ہے۔ آپ بھی ان سے بات کر کے تحریک کے متعلق مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

اسامہ صاحب نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تحریک کا دفتر موجود ہے اور کام بھی کر رہا ہے۔ اس طرح سے ایک تحریک، جو انیسویں صدی کے آغاز میں اتر پردیش سے شروع ہوئی، دو سو سال بعد بھی قائم ہے۔ یہ سب سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کے اخلاص کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان عظیم لوگوں کے اجر میں بے حد اضافہ کرے۔ آج ہم ان عظیم لوگوں کے مرقد پر حاضر تھے، جنھوں نے دین کی خاطر ہزاروں میل کا سفر کرکے، اس ویرانے میں جنگ کی اور شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ اس تحریک کے متعلق عام لوگوں کی معلومات بہت کم ہے، جسے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

پھر ایک مدت بعد، چند مسلمان حریت پسند مجاہدین، انگریزوں کے خلاف جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال جنگِ عظیم دوم کے بعد ریشمی رومال تحریک کا آغاز ہے جس کی قیادت دیوبندی علماء کرتے ہیں۔ یہ تحریک 1913ء سے 1920ء کے درمیان ایک طاقت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کا ہندوستان سے خاتمہ تھا۔ اس مقصد کے لیے سلطنت عثمانیہ اور امارات افغانستان کو ساتھ ملانے کا بھی منصوبہ تھا۔ انگریزوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ انھوں نے جناب عبید اللہ سندھی کے خطوط پکڑے، جو اس وقت افغانستان میں تھے اور وہ ایک دیوبندی رہنما تھے۔ ان کے ساتھ جناب مولانا محمود الحسن دیوبندی بھی شامل تھے۔ یہ خطوط ریشمی کپڑے پر لکھے جاتے تھے، اسی لیے اس تحریک کا نام ریشمی رومال تحریک رکھا گیا۔

بہت ہی قابلِ تعریف بات یہ بھی ہے، کہ اس تحریک کے سو سال بعد جنوری 2013ء میں، ہندوستان کے صدر، پرناب مکھرجی نے ریشمی رومال تحریک کی یاد میں ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اس ٹکٹ پر ریشمی رومال کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ ان کا ریشمی رومال تحریک کو ایک خراج عقیدت پیش کرنے کا خوبصورت انداز ہے۔ جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ میرے علم کے مطابق پاکستان میں ریشمی رومال کی تحریک کی یاد میں کوئی یادگار نہیں بنائی گئی۔

یہ تو وہ بات تھی جو میں نے سیّد احمد شہیدؒ متعلق آپ کے سامنے رکھی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات بھی بالاکوٹ متعلق بے حد دلچسپ ہے جس کا ذکر آپ کی کے لیے بے حد دلچسپ ہوگا۔

سیّد احمد شہیدؒ اور بالاکوٹ

میں مدت سے اس بات کی تلاش میں تھا کہ سیّد احمد شہیدؒ تو دہلی اور یو پی کے علاقوں سے چل کر پشاور پہنچے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس سفر کے لیے جنوبی پنجاب کا راستہ اپنایا ہوگا، کیونکہ مرکزی اور شمالی پنجاب پر تو سکھوں کا قبضہ تھا۔ وہ 1826ء میں پشاور پہنچے اور

کوئی چار سال تک پشاور میں رہے۔ اس دوران انھوں نے کئی اصلاحات بھی کیں۔ بعد میں کئی مقامی سردار اور صوفی و علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ اس پر انھوں نے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کے ساتھ دس ہزار مجاہد تھے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ اس وقت کا موضوع نہیں ہے۔ اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ مجاہدین کی تعداد کے متعلق بھی تاریخ دانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اگر آپ نقشے کو دیکھیں تو جان سکیں گے کہ پشاور سے بالا کوٹ جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ جی ٹی روڈ کے ذریعے ہری پور، مانسہرہ اور بالا کوٹ ۔ یہ راستہ اڑھائی سو کلومیٹر سے زائد طویل ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت یہ تمام علاقے سکھوں کے قبضے میں تھے اس لیے، سید صاحب اس راستے سے بالا کوٹ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دوسرا راستہ پشاور سے مردان، مینگورہ، مٹہ ، بشام، بٹگرام اور پہاڑوں سے ہوتے ہوئے بالا کوٹ ۔ یہ ایک طویل راستہ بھی تھا اور مشکل بھی۔ تیسرا راستہ پہاڑی راستہ ہی ہو سکتا ہے۔ سید صاحب کا ارادہ کشمیر جانے کا تھا۔ اس وقت کشمیر پر بھی سکھ قابض ہو چکے تھے۔ اس لیے انھیں کشمیر میں بھی سکھوں کا ہی سامنا کرنا پڑنا تھا۔

اس دوران ایک سکھ شیر سنگھ نے جو مہاراجا رنجیت سنگھ کا بیٹا تھا، انھیں بالا کوٹ میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف بارہ ہزار سکھ تھے، تو دوسری طرف دس ہزار مجاہد تھے۔ کچھ لوگ اس سے مختلف تعداد بتاتے ہیں۔ سکھوں کو مقامی مدد اور کمک بھی حاصل تھی، جب کہ مجاہدین اپنے وطن سے ہزاروں میل دور تھے۔ ان کی فوج میں مقامی لوگ بھی تھے، لیکن ان کی تعداد کتنی تھی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں ۔

بالا کوٹ میں ایسا کیا تھا جس کی وجہ سے سکھوں نے مجاہدین کو یہاں روکنا ضروری سمجھا؟ ایسا کون سا واقعہ ہو گیا تھا؟ میں مدت سے اس کے جواب کی تلاش میں تھا۔ بہت سے مصنفین کو پڑھا۔ پھر مجھے ایک مضمون ملا جس میں اس متعلق کافی معلومات دی گئی تھیں۔

بالا کوٹ میں بالا پیر کا مزار اور بھائی بالا کی بیٹھک

ایبٹ آباد کے پاس ایک جگہ کھوتا قبر کے نام سے مشہور ہے۔ جس متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کھوتا (گدھا) مجاہدین کے لیے رات کی تاریکی میں سامان لے کر جاتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس جگہ کا نام کھوتا قبر پڑ گیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ یہ ایک ضمنی سی بات تھی۔

بالا کوٹ میں بالا پیر کا ایک مزار ہے۔ بالا کوٹ کا نام بالا پیر کے نام کی وجہ سے ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔اس متعلق جو جان سکا وہ پیش خدمت ہے۔

جب میں نے اس کے متعلق مزید جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ سکھوں کے نزدیک بالا پیر جنہیں وہ بھائی بالا کہتے ہیں، کا تعلق سکھ دھرم سے تھا۔ میں نے اس کے متعلق کئی مضامین بھی دیکھے۔ ایک مضمون جسے ہارون خالد نے لکھا ہے اس کا عنوان ہے

The little-known religious history of Balakot

Today, the city of Balakot espouses uniquely

SouthAsian religious traditions

جو ڈان اخبار میں شائع ہوا میں اس متعلق کافی معلومات ملیں [1]۔

اس مضمون کے مطابق سکھوں کے بابا گورو نانک صاحب کے دو شاگرد تھے؛ ایک کا نام بھائی مردانہ اور دوسرے کا نام بھائی بالا تھا۔ بالا کوٹ شہر کے وسط میں بالا پیر کا مزار ہے، یہیں پر بالا پیر کا چشمہ بھی ہے۔اس پانی کے متعلق لوگوں کا خیال ہے، کہ اس پانی سے جذام کا مرض دور ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مطابق یہ ایک صوفی بزرگ بالا پیر کا مزار ہے۔دوسری طرف سکھوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق بابا گرو نانک کے دو شاگردوں میں شامل ایک شاگرد بھائی بالا سے ہے۔ دوسرے شاگرد کا نام بھائی مردانہ تھا۔

سکھوں کے بابا گرو نانک جی نے اپنی زندگی کے کئی سال سفر کرنے میں گزارے۔ انھوں نے کوئی اٹھائیس ہزار کلومیٹر سے زائد پیدل سفر کیا جس میں مکّہ مکرمہ بھی شامل ہے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں شاگرد بھی ہوتے تھے۔ جب وہ بالا کوٹ پہنچے تو کسی وجہ سے بھائی بالا نے آگے جانے سے انکار کر دیا اور وہ یہیں پر رک گئے۔ جبکہ بابا گرو نانک جی اور مردانہ آگے روانہ ہو گئے۔

ایک عرصے بعد سکھوں نے ہر اس جگہ پر یادگار تعمیر کرنا شروع کر دی جہاں سے بابا گرو نانک جی گزرے تھے۔ اسی طرح بالا کوٹ کے مقام پر بھی بابا گرو نانک جی کے عقیدت مندوں نے گرو کے دورے کی یاد میں ایک عمارت تعمیر کی، جسے بھائی بالا کی بیٹھک کہا جانے

---

https://www.dawn.com/news/1467977[1]

لگا۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا، جو بھائی بالا کی بیٹھنے کی جگہ تھی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ بھائی مردانہ کا تعلق ایک مسلم خاندان سے تھا جب کہ بھائی بالا کی پیدائش ایک ہندو خاندان میں ہوئی تھی۔ بابا گرو نانک جی بھی ایک ہندو ہی کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ، بابا گرو نانک جی سے بھائی بالا اور بھائی مردانہ نے پوچھا کہ ان کے سچے پیروکار بننے کے لیے انھیں کون سا مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ بابا گرو نانک جی نے جواب دیا کہ اگر کوئی ہندو ہے تو اسے اچھا ہندو ہونا چاہیے اور اگر کوئی مسلمان ہے، تو اسے اچھا مسلمان ہونا چاہیے۔

یہ تھا بابا گرو نانک کی تعلیمات کا نچوڑ!

سکھوں کے مطابق بھائی بالا، بابا گرو نانک جی کے ساتھ دورانِ سفر جو وہ کہتے، اسے لکھ لیتے تھے۔ بعد میں اسے ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا، جسے بھائی بالا کی جنم ساکھیاں کہا جاتا ہے۔ یہ جنم ساکھیاں بابا گرو نانک جی کی زندگی کے متعلق ایک معلومات کا ایک اہم ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ کئی سکھ سکالرز کا اس سے اختلاف بھی ہے۔ لیکن عام طور پر یہی بات مشہور ہے۔

بابا گرو نانک جی کی تعلیمات پھیلانے کے لیے، بالا کی بیٹھک ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ایک روحانی مرکز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف سکھ بلکہ مسلمان اور ہندو بھی آتے ہیں۔ اس جگہ پر سالانہ تہوار بھی منایا جاتا ہے جس میں تمام مذاہب کے ہزاروں عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ایک بڑی تعداد میں سکھ اور ہندو، بھارت نقل مکانی کر گئے، جس سے ان کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی۔

علامہ اقبال نے بابا گرو نانک بارے بانگِ درا میں ایک شعر لکھا ہے، جو کچھ یوں ہے۔

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہِند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے!

ایک سوال جس کا جواب مجھے ابھی تک نہیں ملا، کیا بھائی بالا مسلمان بزرگ بالا پیر ایک شخص کے دو نام ہیں یا دونوں الگ الگ تھے؟ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی نہ جان سکا کہ سید احمدؒ نے کشمیر جانے کا فیصلہ کیوں کیا جبکہ راستے میں بھی سکھوں کی حکومت تھی اور کشمیر پر بھی سکھ قابض تھے۔

سید احمدؒ اپنے علاقے سے ہزاروں میل دور تھے۔ واپسی کا کوئی بھی راستہ محفوظ نہ تھا۔اس لیے سکھوں کے ساتھ جنگ انھوں نے اپنی آخری جنگ سمجھ کر لڑی۔اس جنگ میں نو ہزار مجاہد شہید ہوئے جبکہ پانچ ہزار سکھ بھی مارے گئے۔ تعداد بارے بھی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔

میرے خیال میں سکھوں کے نزدیک بالاکوٹ ایک مقدس مقام تھا، جب انھیں پتہ چلا کہ سید صاحب وہاں آگئے ہیں، تو انھیں یہ ڈر لگا کہ کہیں سید صاحب ان کے مقدس مقام کو نقصان نہ پہنچائیں تو انھوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ یاد رہے کہ بالاکوٹ کی جنگ میں سکھ حملہ آور تھے۔ وہ مانسہرہ سے چل کر آئے تھے جبکہ سید صاحب پشاور سے چل کر کشمیر کی طرف جارہے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو، جو میں سمجھ سکا وہ بیان کر دیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں، سکھوں کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ کچھ تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں، کہ انگریز اس جنگ کے حامی تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اب جبکہ مغل شکست کھا چکے ہیں، ان کا مقابلہ سکھوں سے ہی ہوگا۔ اس لیے وہ یہ چاہتے تھے، کہ سیّد احمدؒ سکھوں کے خلاف اپنی جدو جہد جاری رکھیں تاکہ سکھ کمزور پڑ جائیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے دونوں ہی دشمن تھے۔ ایک وقت میں کسی ایک کے ساتھ ہی جنگ کی جا سکتی تھی۔ اس لیے سید صاحبؒ نے سکھوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ بھی تھا۔ ایک دریائے ستلج کے مشرق میں تھا اور دوسرا، اس کے مغرب میں۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے بیٹے کی شادی میں شرکت بھی کی تھی۔ یہ سب جاننے کے لیے سید محمد لطیف کی کتاب تاریخِ پنجاب بے حد مفید ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھی مجاہدین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کوئی اسی سال بعد 1913ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بھی جہاد کیا تھا، جسے ریشمی رومال کی تحریک کا نام دیا گیا تھا۔

دوسری طرف کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے، کہ یوپی میں واقع مسلمان راجے بھی یہ چاہتے تھے، کہ سید صاحبؒ ان کے ہاں سے چلے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سید صاحبؒ کے مریدوں میں اضافہ ہوتا رہا، تو ان کی اپنی حکمرانی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے

سید صاحبؒ کی مالی مدد بھی کی۔ یہ بات بھی کوئی زیادہ درست ثابت نہیں ہوتی، لیکن کئی تاریخ دانوں نے ایسا بھی لکھا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیدؒ کی تحریک نے ایک ایسے جذبے کو جنم دیا جس کی تپش آج تک محسوس کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

علامہ اقبالؒ کے چند اشعار جو سید احمدؒ جیسے عظیم لوگوں کے لیے ہیں۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے

کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے

قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت

گفتند کار تو بہ نگاہِ خرد خطاست

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟

ترک سبب زروئے شریعت کجا رواست

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

ترجمہ: طارق نے جب ساحلِ اندلس پر اپنی کشتیاں جلا ڈالیں تو اس کے ہمراہیوں نے کہا کہ:

تیرا یہ کام عقل و شعور کے لحاظ سے غلط ہے۔

ہم اپنے وطن کی سرزمین سے بہت دور ہیں، واپس کیسے پہنچیں گے؟

شریعت میں اسباب کو ترک کرنے کی اجازت کہاں ہے؟

طارق مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھا اور یوں گویا ہوا:

ہر ملک ہماری مِلک میں ہے کیونکہ ہر ملک ہمارے خدا کا ملک ہے۔

یہ بھی آپ کو یاد ہوگا، کہ 2005ء میں کشمیر اور اس سے ملحقہ علاقوں میں ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، جس سے بے حد جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ اسی زلزلہ میں بالا کوٹ میں ناقابلِ بیان تباہی ہوئی تھی۔ زلزلے کے بعد ایک مرتبہ بالا کوٹ جانا ہوا، دریا کنارے، ہم بچوں سمیت جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اب ماشاءاللہ بالا کوٹ کی پھر سے رونقیں بحال ہو گئیں ہیں۔ الحمدُللہ۔

کیوائی: وادیٔ کاغان کا ایک مرکزی علاقہ

ہم بالا کوٹ سے نکل کر آگے چل پڑے، اب چڑھائی بھی تھی جو خطرناک بھی تھی۔ یاد رہے کہ میں کوئی تیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت سڑکوں کی حالت کوئی زیادہ بہتر نہیں تھی، بہر حال سفر تو سفر ہی ہوتا ہے۔ ہماری اگلی منزل کیوائی تھی۔ کیوائی ایک خوبصورت چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے یہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

بالاکوٹ سے اس کا فاصلہ کوئی بیس کلومیٹر ہے۔ کیوائی سطح سمندر سے کوئی چھ ہزار فٹ سے زائد بلندی پر آباد ہے۔ میں تو اسے وادی ناران کاغان کا دروازہ بھی کہتا ہوں۔ ایک اچھی اونچائی پر ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم کافی معتدل ہوتا ہے اور بارش بھی پورے سال ہوتی رہتی ہے۔ اس علاقے میں کئی تاریخی مقامات بھی ہیں جو اب یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل ہیں۔ کیوائی ہی سے ایک سڑک سری پائے اور شوگران کو بھی جاتی ہے۔

کیوائی میں سب سے خوبصورت جگہ، اس میں واقع آبشار ہے، جس کی وجہ سے کیوائی میں ایک کثیر تعداد میں لوگ ٹھہرتے ہیں۔ آبشار کے پاس کئی ریستوران بن چکے، جو ہر آنے جانے والے کو یہاں رکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کچھ ریستوران تو آبشار کے درمیان بنے ہوئے ہیں۔ ہم کچھ دیر کیوائی میں رک کر ناران کی طرف چل پڑے۔ واپسی پر ہم شوگران بھی گئے۔

وادئ کاغان، پریوں کا دیس

کیوائی سے ہم نے اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کیا، اب ہماری منزل کاغان تھی۔ پاکستان بھر میں کئی بے حد خوبصورت اور دلکش علاقے پائے جاتے ہیں، لیکن وادی ناران اور کاغان کی اپنی ہی ایک شان ہے۔ اس کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے، کہ یہ وادی میدانی علاقوں کے قریب واقع ہے، جس کی وجہ سے یہاں جانا آسان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہترین سفری اور رہائشی سہولتوں کی وجہ سے سال کے ہر موسم میں سیاحوں کی ایک بڑی تعداد یہاں آتی ہے۔

یوں تو پہاڑی سلسلہ ہری پور کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے، مانسہرہ میں بھی کئی پہاڑ دیکھنے کو ملتے ہیں، بالاکوٹ تک بھی کئی پہاڑی سلسلے ہیں، مگر اونچے پہاڑ بالاکوٹ کے بعد ہی پائے جاتے ہیں۔ ہم شوگران میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کاغان کی طرف چل پڑے۔ ارد گرد کے مناظر ہم سب کے لیے بہت ہی دلکش تھے، ہم پہلی مرتبہ اس وادی میں آئے تھے، ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، خاص طور پر بچے بے حد لطف اٹھا رہے تھے۔ اسلام آباد سے وادی کاغان پونے تین سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے (ہزارہ موٹر وے کی وجہ سے اب سفر بے حد آسان ہو گیا ہے)۔

پاکستان میں کئی طویل پہاڑی سلسلے اور خوبصورت وادیاں پائی جاتی ہیں، ان میں ناران اور کاغان کا اپنا ہی ایک مقام ہے۔ اس علاقے کے متعلق پتہ چلا کہ پاکستان کی آلو اور مٹر کی

ستر فیصد ضرورت صرف ناران سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ حکومت بھی اس سلسلہ میں یہاں کے کاشتکاروں کو مٹر اور آلو کی کاشت کے جدید طریقوں تک رسائی کے لیے کئی پروگرام چلا رہی ہے۔

ہم نے کئی جگہ دیکھا، کہ سڑک کنارے لکڑیوں کے ڈبے پڑے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا، کہ یہ ڈبے شہد کی مکھیوں والے ڈبے ہیں۔ شہد کا کام کرنے والے لوگ یہ ڈبے موسم گرما میں یہاں لے آتے ہیں اور مکھیاں اس علاقے کے سرسبز و نایاب پھولوں کا رس چوس کر بہترین شہد تیار کرتی ہیں۔

تم اپنے رب کی کون سی کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤگے !

وادی کاغان میں سات ہزار فٹ سے سترہ ہزار فٹ تک کے بلند پہاڑ موجود ہیں، جن کے درمیان حسین وادیاں ہر کسی کو اپنی طرف کھینچ لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ وادی کاغان میں واقع بے شمار دلکش جھیلیں، قدرتی آبشاریں، گرم اور سرد پانی کے چشمے، وسیع و عریض سرسبز چراگاہیں، گلیشیئرز، ندی نالے، دریا اور ساتھ ساتھ گھنے جنگلات کی سیر ایک خواب تھا، جو اب پورا ہو رہا تھا، جس پر ہم سب اللہ تعالیٰ کے بے حد شکر گزار تھے۔ وادی کاغان، بالاکوٹ سے شروع ہو کر بابوسر ٹاپ تک جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ڈیڑھ سو کلومیٹر سے بھی زائد ہے۔ اس کے درمیان لہراتا اور بل کھاتا دریائے کنہار، اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

وادی کاغان کا نام، کاغان نامی قصبے سے پڑا ہے، جو دریائے کنہار کے کنارے واقع ہے۔ دریائے کنہار اس وادی کے بیچ میں بہتا ہے۔ اس وادی کی سطح سمندر سے بلندی چھ ہزار فٹ سے زائد ہے۔ اس علاقے میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں ہندکو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ اس علاقے میں مکڑا چوٹی اور ملکہ پربت اپنی ہی ایک شان رکھتی ہیں۔

اس سفر کے دوران جتنے بھی لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ان میں سے اکثریت کی زبان ہندکو تھی۔ اس کے علاوہ کچھ دیہاتی لوگ بھی ملے، جو گجر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، وہ گجری زبان بولتے تھے، جو ہندکو سے کافی مختلف ہے، لیکن پنجابی بولنے والے کو سمجھ آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پشتو بولنے والے بھی یہاں ایک بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔

کیا انگریز کاغان اور ناران آئے تھے؟ میں اس کا کوئی جواب نہ ڈھونڈ پایا۔ یہ میرا خیال ہے کہ وہ مانسہرہ سے بٹگرام کی طرف سے ہوتے ہوئے گلگت گئے تھے۔ انھوں نے کاغان کا راستہ نہیں اپنایا، کیونکہ یہ راستہ سال کے آٹھ ماہ بند رہتا ہے۔ اس لیے انگریز کاغان کی وادی

سے دور ہی رہے۔ البتہ یہ بات دلچسپ ہے کہ یہاں بہت سے قبائل مختلف اوقات میں آئے، اس لیے ہمیں یہاں سواتی، اعوان، کشمیری، دورانی، مغل اور قریش کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی زبانیں بھی سننے کو ملتی ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے، کہ مانسہرہ کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں پر بھی کئی تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کا ہونا ایک فطری بات ہے، جن میں اسٹوپا، اسلامی دور کی یادگاریں، ہندو اور سکھوں کے مندر اور بدھ خانقاہیں اہم ہیں۔ یہاں کی اکثریت گجر قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وادی کے مکین بہت مہمان نواز اور فیاض ہیں۔ دوسرے قریبی علاقوں کی طرح یہاں کا لباس بھی شلوار قمیض ہی ہے۔ خواتین دوپٹہ بھی پہنتی ہیں اور بڑی عمر کے لوگ پگڑیاں بھی باندھتے ہیں۔

میں نے اس علاقے کی تاریخ جاننے کی کوشش کی، تو مجھے مانسہرہ کی تاریخ کے نام سے یاسر شہزاد تنولی صاحب کی ایک تحریر ملی، جو باغی ٹی وی کی ویب سائٹ پر موجود ہے[1]۔

یاسر شہزاد تنولی کے مطابق کاغان وادی میں تین بڑی جھیلیں ہیں، جن کے نام لولوسر، آنسو جھیل اور جھیل سیف الملوک ہیں۔ اس علاقے کی خوبصورتی کی وجہ سے یہ علاقے ہمیشہ سے مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کی پسندیدہ جگہ رہے ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر اعظم بھی اس جگہ آیا تھا۔ اس نے اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد اسے پونچھ ریاست کے راجا کے حوالے کر دیا تھا۔ تاریخ سے اس بات کا بھی معلوم پڑتا ہے، کہ دوسری صدی میں ایک درویش صوفی منش ہندو بادشاہ راجا رسالو، جو سیالکوٹ کے راجا کا بیٹا، نے اس علاقے پر حکمرانی کی۔ آج بھی مقامی لوگ اس کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے ہیں۔ والدین اپنے بچوں کو راجا رسالو اور ان کی بیوی رانی کونکلان کی کہانیاں سنا کر اس عظیم انسان کو یاد کرتے ہیں۔

یہ بھی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس علاقے پر ترک شاہی اور ہندو شاہی خاندانوں کی حکومت بھی رہی ہے۔ گیارہویں صدی میں، ہندو شاہی خاندان کے خاتمے کے بعد کشمیر کے راجا نے اس علاقے پر حکمرانی کی۔ اس کے بعد غوری، اور غوری کے بعد شہزادہ شاہد الدین نے ایک آزاد ریاست کی بنیاد رکھی۔ پھر قسمت نے پلٹا کھایا اور 1703ء میں سید جلال بابا نے ترکوں کو نکال دیا اور اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔

---

[1] https://baaghitv.com/mansehra-ke-tareekh-by-yasir-/shazad

راجا رنجیت سنگھ نے 1818ء میں مانسہرہ پر قبضہ کیا تھا۔ سکھ ریاست کے خاتمہ کے بعد 1849ء انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا اور 1901ء میں اسے صوبہ سرحد کا حصہ بنایا گیا۔ اس سے پہلے یہ علاقے، ہمیشہ پنجاب میں ہی شامل تھے۔

انگریزوں کے خلاف کئی مقامی لوگوں نے جنگیں لڑیں جن کی تفصیل ضرور پڑھنی چاہیے۔ ان میں سے ایک اہم نام زمان شاہ صاحب کا ہے، جنھوں نے 1852ء میں انگریزوں کے خلاف جنگیں لڑیں۔ اس وقت جیمز ایبٹ انگریزوں کی طرف سے فوج کا سپہ سالار تھا۔ (ایبٹ روڈ لاہور اور ایبٹ آباد شہر بھی اسی کے نام پر ہے) ۔ زمان شاہ صاحب کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے انھیں ملک بدر کر دیا۔ بعد میں زمان شاہ صاحب نے انگریزوں سے صلح کر لیا اور انھیں وطن واپس آنے کی اجازت مل گئی۔

یہ بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا اس کے نام پر شہر آباد ہے، جس نے وطن کی آزادی کی خاطر جنگ کی اس کی قبر کا نشان بھی نہیں ملتا!

کیا دنیا آزادی کی خاطر جان دینے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے؟

نہیں ایسا نہیں ہے!

پھر ہمارا رویہ مختلف کیوں ہے؟ کوئی تو اس کا جواب دے!

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہمیں آزادی کی قدر نہیں!

اس علاقے میں ریاست امب بھی موجود تھی جس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ پھر اس ریاست کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو پاکستان میں موجود باقی ریاستوں کے ساتھ ہوا۔ بھٹو دور میں اسے پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔ کاغان تک جاتے جاتے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ سب نے مل کر یہی سوچا کہ ہمیں کاغان میں کچھ دیر رکنا چاہیے، بچوں کے آگے کس کی چلتی ہے، سو ہم رک گئے۔

کاغان اور ٹراؤٹ مچھلی

ہم کاغان میں دریا کے کنارے ایک ریستوران پر رکے اور ان سے ٹراؤٹ مچھلی کھانے کی فرمائش کی۔ جواب ملا کہ ابھی دریا سے تازہ مچھلی پکڑ کر آپ کو تیار کر دیتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے حیران کن تھی، لیکن حقیقت میں ایسا ہی تھا۔

ہم نے دیکھا، کہ ریستوران والوں نے دریا میں ایک جال لگایا ہوا تھا اور اس میں ٹرائوٹ مچھلی تیر رہی تھی۔ انھوں نے بتایا، کہ ہم ٹرائوٹ مچھلی کے بچے اس جال میں چھوڑ دیتے ہیں اور یہیں سے پکڑ کر آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، یہ انتظام ہمیں اچھا لگا۔

اب بھی وہ منظر یاد ہے، دریا کا کنارہ، خوبصورت پہاڑی مناظر، دریا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تفریح۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔

کاغان کی مشہور چیزوں میں ٹراوٹ مچھلی ایک اہم چیز ہے۔ حال ہی میں اس کی نسل بچانے کے لیے اس کے شکار اور خرید وفروخت پر دو سال کے لیے مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے متعلق حکام کا کہنا ہے کہ بے دریغ شکار کی وجہ سے ٹراوٹ کی تعداد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ وہ اسے محفوظ بنا کر اسپورٹس ٹرافی فشنگ کے طور پر متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو !

ٹراوٹ میٹھے پانی کی مچھلیوں کی ایک قسم ہے، اس کا تعلق سولمان مچھلی سے ملتا جلتا ہے، یہ زیادہ تر میٹھے پانی کی جھیلوں اور دریاؤں میں پائی جاتی ہے۔ اسے انسانوں کے ساتھ ساتھ جنگلی حیات جیسے بھورے ریچھ، شکاری پرندے، عقاب اور دیگر جانور بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کا تیل بھی بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے تازہ مچھلی کا لطف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

ناران : جہاں جانے کو سبھی کا جی چاہتا ہے

کاغان میں کچھ دیر رک کر ہم ناران کی طرف چل پڑے۔ جونہی ہم کاغان سے نکلے ہمیں تیز بارش نے آلیا، چھوٹے بچے ساتھ تھے، شام کا وقت ہو رہا تھا، سڑک زیرِ تعمیر تھی، ان سب نے مل کر ایک خوف کی کیفیت پیدا کر دی۔

بچے تو نڈر ہوتے ہیں۔ مسئلہ تو ان کا ہوتا ہے جو صورتِ حال کو سمجھتے ہیں۔ اللہ اللہ کرکے، ہم ناران پہنچ گئے۔

میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہماری زندگی تو بذاتِ خود ایک سفر مسلسل ہے، جو آخری سانس تک جاری رہتا ہے اور کاٹنا ہی پڑتا ہے، جیسا بھی ہو، نشیب ہو یا فراز۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ ناران کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس سے آپ کو اس شہر متعلق جاننے کو ضرور کچھ نہ کچھ ملے گا، جو امید ہے کہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

وادی ناران کاغان لمبائی کے رخ واقع ہے، اس کی لمبائی کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کے قریب ہے۔ عام طور پر اسے الپائن وادی بھی کہا جاتا ہے۔ میں اسے جھیلوں والی وادی کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ شروع میں اس کی اونچائی کوئی دو ہزار فٹ ہو گی، لیکن جیسے جیسے آپ آگے بابوسر ٹاپ کی طرف جاتے جاتے ہیں، اس کی اونچائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

بابوسر ٹاپ تک پہنچتے پہنچتے یہ اونچائی کوئی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ تک جا پہنچتی ہے۔ وادی ناران کاغان کے بعد کوہِ ہمالیہ شروع ہوتا ہے۔ اس طرح وادی ناران کاغان کوہِ ہمالیہ کے قدموں میں واقع ہے۔ مانسہرہ کے بعد ہی سے سڑک دریائے کنہار کے ساتھ جاتی ہے۔ دریا اسی وادی کے درمیان میں ہی بہتا ہے۔ میرے خیال میں یہ دریا پاکستان کا ایک خوبصورت ترین دریا ہے۔ اس علاقے میں بے شمار جنگلات بھی پائے جاتے ہیں، جہاں قسم قسم کی نباتات کی موجودگی کی وجہ سے اسے ''نباتات کے ماہرین کی جنت'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔

اس وقت ناران سے بابو سر ٹاپ کی سڑک پختہ نہ تھی، اس لیے ہماری منزل صرف ناران ہی تھا۔ بابوسر ٹاپ ناران سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے کوئی چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ (میں فیری میڈوز کے سفر میں بابو سر ٹاپ گیا تھا، بہت ہی خوبصورت جگہ ہے)۔ بابو سر ٹاپ سے آگے چلاس (جسے چیلاس بھی لکھا جاتا ہے۔) واقع ہے جہاں سے گلگت 180 کلومیٹر، خنجراب 384 کلومیٹر اور اسلام آباد 326 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گرمیوں میں بابوسر ٹاپ کا راستہ کھلا ہوتا ہے، جبکہ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے یہ راستہ بند ہو جاتا ہے اور گلگت سے مانسہرہ جانے کے لیے کوہستان کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہم تو ناران تک ہی جانا چاہتے تھے۔ راستے میں کوئی خاص قصبہ نہیں تھا، یاد رہے کہ ہم نے یہ سفر 1994ء میں کیا تھا۔

اللہ کا شکر ادا کیا اور ہم ناران پہنچ گئے۔ اب بھی جب اس منظر کی یاد آتی ہے، ایک مرتبہ تو دل کانپ جاتا ہے۔ ناران میں ہماری سب سے بڑی خواہش جھیل سیف الملوک کی سیر کرنا تھی۔ ناران میں ہمیں ایک مناسب ہوٹل مل گیا۔ ان دنوں انٹرنیٹ نہیں ہوتا تھا اور ہوٹل بھی تھوڑے ہی تھے۔

رات ہم نے ہوٹل میں بسر کی، بچے سیف الملوک کی سیر کے لیے بیتاب تھے، اس لیے وہ صبح جلد ہی تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک جیپ والے سے بات کی اور اس سے حسب عادت کرائے پر بحث کرنے لگے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو اب تک مجھے یاد ہے۔

ہم ایک جیپ ڈرائیور سے ریٹ طے کر رہے تھے۔ اس نے ہماری بات سن کر کہا، کہ سر ہمارا یہ روزگار چند ماہ کے لیے ہوتا ہے۔ یہی ہماری روٹی روزی ہے۔ آپ اتنے پیسے خرچ کر کے سیر کے لیے آئے ہیں اور ہم مزوروں سے چند روپوں کی خاطر بحث کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے یہ رقم کوئی زیادہ نہیں ہے، لیکن ہمارے لیے یہ رقم بہت اہم ہے۔ ہم نے اس کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ نے درست فرمایا۔ اس کے بعد میں نے شاید ہی کبھی کسی مزدور سے مزدوری کے مسئلے پر بحث کی ہو۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود بھی ایک مزدور کی اولاد ہوں، جو چار من کی روئی کی گانٹھ کمر پر اٹھاتا تھا، تاکہ اس کے بچوں کی روٹی اور تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو سکے۔ اس لیے میں مزدور کی قدر اور اس کی ضرورت کو زیادہ اچھے طریقہ سے سمجھتا ہوں۔

ناران شہر سے جھیل سیف الملوک تک جیپ ٹریک ہے، شاید اب بھی ایسا ہی ہے۔ اسے راستہ کہنا، راستہ کی توہین ہے۔ پتھروں کا ایک بستر ہے جس پر وہاں کی جیپیں بھی خدا کی پناہ مانگتی ہیں۔ یہاں پھر وہی معاملہ تھا، بچے خوش اور بڑے خوفزدہ۔

جھیل کے کنارے، گھڑ سواری کی سہولت بھی میسر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سیف الملوک کی داستان سنانے والے بے شمار داستان گو بھی۔ ان کے ہاتھوں میں ایک سرمہ بھی تھا، جس کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ یہ آنکھوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے لوگ گھوڑوں کی سواری سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ یہ بھی جاننے کو ملا کہ کئی لوگ پیدل یا پھر گھڑ سواری کرتے ہوئے آنسو جھیل تک بھی جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سفر اس وقت بھی مشکل ہے، آج سے پچیس سال پہلے تو بہت حد ہی کٹھن راستہ تھا۔

ہم جیپ لے کر جھیل سیف الملوک کی طرف چل پڑے، جو دس ہزار فٹ سے زائد بلندی پر واقع ہے۔ یہ بھی بات اہم ہے کہ اس راستے پر بے شمار سرسبز پہاڑ بھی ہیں اور ساتھ ساتھ گلیشئرز بھی۔ ناران کی نسبت جھیل کے آس پاس سردی زیادہ ہوتی ہے۔ سیف الملوک واقعی ایک خوبصورت جھیل ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

جھیل سیف الملوک: ایک دلچسپ تاریخ

جھیل سیف الملوک بنیادی طور پر ایک پہاڑی جھیل ہے۔ یہ جھیل وادی کاغان کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ یاد رہے کہ یہ جھیل اتنی بلند ہے کہ یہاں پر درخت نہیں ہوتے۔ ایک لحاظ سے یہ پاکستان کی بلند ترین جھیلوں میں سے ایک ہے۔ مختلف کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ صدیوں قبل ایک برفانی تودہ گرنے کی وجہ سے وادی سے گزرنے والا پانی رک گیا، جو بعد میں ایک جھیل کی شکل اختیار کر گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ تین لاکھ سال پرانی جھیل ہے۔

جھیل سیف الملوک کا نام ایک مشہور شہزادے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ مشہور پنجابی صوفی شاعر، میاں محمد بخش صاحب نے سیف الملوک کے نام سے ایک پریوں کی کہانی لکھی ہے۔ اس کہانی میں مصری شہزادے سیف الملوک کا ذکر ہے، جو اس جھیل میں موجود شہزادی بدرالجمال نامی پری کے پیار میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ یہ بات کئی مقامی لوگ بھی سیاحوں کو سناتے ہیں۔ ہم نے بھی یہ کہانی کئی مقامی لوگوں سے سنی۔ اس داستان کے سنانے والوں کا داستان سنانا روزگار ہے۔

دو دن ناران میں گزار کر ہم واپس شوگران کی طرف چل پڑے۔ شوگران ایک اونچائی پر موجود مقام کا نام ہے۔ اس سے آگے ایک سڑک سری پائے کی طرف جاتی ہے۔ مجھے اور میرے اہل و عیال کو اس پر کیا ہوا سفر اب تک یاد ہے۔ اس وقت کیمرہ بہت زیادہ عام نہیں تھا۔ اس دورے کی ایک تصویر اب بھی ہمارے ٹی وی لاؤنج میں دیوار پر لگی ہوئی ہے۔

ناران میں کئی اور بے حد خوبصورت مقامات ہیں، جن میں جھیلیں بھی ہیں اور بڑے بڑے کھلے میدان بھی۔ ان میں سے اکثر کافی فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ کئی مقامات پر جیپ بھی نہیں جاتی۔ پیدل ہی جانا پڑتا ہے۔ یہ کام بچوں کے ساتھ مشکل ہوتا ہے۔

اس وادی کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ ربّ کائنات کا پاکستان کو ایک بہترین تحفہ ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔

شوگران: آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک مقام

ناران میں دو دن ٹھہرنے کے بعد ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ سب بچوں کی خواہش تھی کہ ہم شوگران ضرور جائیں، اس کے ساتھ ساتھ سری پائے بھی دیکھنے کا شوق بھی موجود تھا۔ سری پائے کا نام بہت ہی مختلف اور دلچسپ ہے۔ لاہور سے گئے لوگوں کو تو اس نام

سے بے حد الفت ہے۔ اس کی وجہ لاہور میں موجود سری پائے کی مشہور دکانیں ہیں، جہاں سے لاہوریوں کو بہترین سری پائے کا ناشتہ ملتا ہے۔

کیوائی کے پاس ہی ہم شوگران کی طرف چل پڑے۔ شوگران تک جاتے ہوئے مسلسل چڑھائی ہے۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ شوگران کوئی آٹھ ہزار کلومیٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ بلندی پر جا کر ایک وسیع میدان ملا۔ شوگران، بالا کوٹ سے کوئی پینتیس کلومیٹر ہے۔ یہاں صرف گرمیوں میں جایا جاسکتا ہے۔ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے راستہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں یہ علاقے عام طور پر برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ شوگران میں ایک مناسب تعداد میں ہوٹل بھی موجود ہیں۔ اب موبائل سگنلز کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔

شوگران کے لیے کیوائی سے ہی راستہ جاتا ہے۔ شوگران تک تو کار بھی جا سکتی تھی، اس لیے ہم نے اپنی کار ہی کو تکلیف دی، البتہ شوگران کے بعد سری پائے تک جیپ ہی بہتر تھی۔ اس دورے میں تو ہم صرف شوگران تک ہی گئے۔ بعد میں، میں یونیورسٹی کے طلبہ کے ساتھ سری پائے تک بھی گیا تھا۔ شوگران، وادی کاغان کا ہی حصہ ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی آٹھ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ سری پائے اس سے بھی بلند ہے۔ آخر میں جا کر یہ ایک سطح مرتفع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہم گرمیوں میں گئے تھے۔ یہاں ایک خوبصورت ہوٹل بھی واقع تھا، جس کے متعلق پتہ چلا کہ وہ زلزلہ میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس مقام پر میری اپنی بیٹی کے ساتھ بنائی گئی ایک تصویر اب تک ہمارے گھر میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ٹھہرنا ضرور چاہیے۔

مجھے یاد ہے کہ واپسی پر ہم ایک جگہ رکے، جہاں ایک بزرگ نے ایک سادہ سا کھوکھا بنایا ہوا تھا، انھوں نے ہمیں ایک دیسی مرغ کا سالن بنا کر کھلایا۔ جو اب تک ہمارے بچوں کو یاد ہے۔ مجھے اس قدر یاد ہے کہ میں اب بھی تصور میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ وہ شخص ہی اتنا بھلا تھا اور منظر بھی ناقابلِ فراموش۔۔۔

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔

وہ عظیم ہے، اس کی تخلیق بھی عظیم تر ہے!

شوگران سے سری پائے تک ایک ٹریک بھی بنایا گیا ہے۔ یہ ٹریک آج سے تیس سال قبل نہیں تھا۔ شوگران سے سری پائے تک کا پیدل سفر کوئی چار گھنٹے کا ہے۔ سری پائے کے مقام پر ایک بڑا میدان ہے جو بے حد سرسبز ہے۔ یہ سطح سمندر سے کوئی ساڑھے نو ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے درمیان پائے نامی جھیل بھی موجود ہے، جس کی وجہ سے اس علاقے کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ سری پائے کے ارد گرد مکڑا چوٹی، ملکہ پربت، موسیٰ کا مصلیٰ اور کشمیر کے پہاڑ ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا مشکل ہے، کیونکہ بلندی کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔

سری پائے میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔

شوگران کے بعد واپسی لاہور کی راہ لی۔

جب بھی کوئی لاہوریا واپسی کا سفر اختیار کرتا ہے، وہ راستے میں رکنا بالکل پسند نہیں کرتا۔۔۔

وہ لاہور سے ایک دو روز سے زیادہ دور رہنا پسند نہیں کرتا۔۔

یہ لاہور کی اور لاہوریے کی محبت کی نشانی ہے اور لاہوریے کی پہچان بھی ہے۔ ۔۔ایسے ہی تو نہیں کہا جاتا کہ

لاہور، لاہور، اے۔۔۔

دنیا بھر میں جب کوئی لاہوریا ملتا ہے تو ہر طرح کی پریشانی دور ہو جاتی ہے کیونکہ لاہوریا کہتا ہے؛

گل ای کوئی نئیں، ایہ کیڑا مسئلہ اے بادشاہو، پہلے نان چنے کھاؤ تے فیر گل کراں گے۔۔۔

بس پھر دوستی شروع، مسئلہ حل۔۔۔

بابوسر پاس: جسے بابوسر ٹاپ بھی کہتے ہیں

بابوسر پاس، اس نام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، کہ یہ نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس درہ کو کیا کہتے تھے، مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ یاد رہے ہم اس سفر میں ناران سے

آگے نہیں گئے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی، کہ میں ایک گروپ کے ساتھ فیری میڈوز جاتے ہوئے یہاں سے ضرور گزرا تھا۔ اس کا تذکرہ میں نے فیری میڈوز کے سفر نامہ میں کیا ہے۔

بابوسر پاس ساڑھے تیرہ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ موسم سرما میں برف باری کی وجہ سے یہ راستہ بند ہو جاتا ہے۔ یہ درہ وادئ کاغان کے شمال میں واقع ہے اور قراقرم ہائی وے تک جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ قراقرم ہائی وے وادی کاغان کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ ایک طرف خیبر پختونخوا ہے اور دوسری طرف گلگت بلتستان واقع ہے۔ یہ درہ پاکستان کے خطرناک ترین دروں میں سے ایک درہ ہے۔

یہ بات بھی مشہور ہے، کہ بابوسر پاس دراصل بابر درہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کبھی یہ درہ بابر بھی کہلاتا تھا کیوں کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل بادشاہ بابر اس علاقے سے گزرا کرتا تھا۔ صدیوں سے موسم گرما میں یہ درہ کشمیر سے ضلع مانسہرہ میں داخل ہونے والے لوگ اپناتے تھے۔ برف باری کی وجہ سے بند ہو جانے کے سبب، انگریزوں کے دور میں شاہراہِ قراقرم کی بنیاد رکھی گئی۔ جب انگریزوں کا دور آیا تو انھوں نے اس کے نام کے ساتھ پاس اور ٹاپ کے الفاظ جوڑ دیے، جو دونوں انگریزی کے الفاظ ہیں۔

اسی علاقے میں ملکہ پربت نامی ایک پہاڑ بھی موجود ہے، جس کی بلندی سترہ ہزار فٹ سے بھی زائد ہے۔ ان وادیوں میں گھاس کے میدان بھی پائے جاتے ہیں، جہاں گجر اور دوسرے خانہ بدوش گرمیوں میں اپنی بھیڑوں، بکریوں اور دوسرے جانوروں کو چرانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ سردی کا موسم شروع ہوتے ہی یہ لوگ واپس آجاتے ہیں۔

اس سے آگے گلگت بلتستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے گلگت بلتستان کا الگ سے ایک سفر نامہ لکھا ہے، جس میں، میں نے اس سے آگے کے شہروں میں گزرے وقت کی داستان بیان کی گئی ہے۔

وادئ سوات: پریوں کا مسکن

گرمیوں کی چھٹیاں جہاں بچوں کے لیے خوشی لے کر آتی ہیں، وہیں والدین کے سامنے بچوں کو سیر و تفریح کے لیے بھی لے جانا ہوتا ہے۔ ایسا ہی 2000ء میں ہوا۔ ہم نے بچوں کے ساتھ، گرمیوں کی چھٹیوں میں سوات جانے کا فیصلہ کیا۔ سب بچوں کا خیال تھا کہ سوات ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، سوات ایک علاقے کا نام ہے، اس کا صدر مقام سیدو شریف ہے اور مرکزی شہر مینگورہ ہے۔ پہلی مرتبہ، 2000ء میں ہم اپنی گاڑی میں لاہور سے موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے، نوشہرہ سے گزر کر مینگورہ، بحرین اور کالام تک گئے۔ اس کے بعد فروری، 2023ء میں اپنے پوتے محمد یوسف مانگٹ اور اپنی اہلیہ اور بہو رمشہ عاصم کے ساتھ کالام تک کا سفر کیا۔ اس سفر کا مقصد محمد یوسف مانگٹ کو برف باری دکھانا تھا۔ اس کے بعد مارچ، 2023ء سوات میں الخدمت فاؤنڈیشن کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ ان اسفار کی ایک مختصر رُوداد اور سوات کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

وادی سوات، پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کے شمال مغربی پہاڑوں میں واقع ہے۔ اس کا اسلام آباد سے فاصلہ اڑھائی سو کلومیٹر ہے۔ موٹر وے بننے کی وجہ سے اب سفر کافی آسان ہو گیا ہے۔ جیسے ہی ہم مالا کنڈ کے پہاڑوں سے اترتے ہیں، آپ کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک راستہ دیر اور چترال کی طرف اور دوسرا سوات وادی کی طرف جاتا ہے۔

ایک طرح سے سوات جغرافیائی طور پر پشاور سے الگ تھلگ لگتا ہے، جو کہ درست بھی ہے۔ سوات کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے، کہ زمانہ قدیم سے یہ وادی اس علاقے کی اہم تہذیبوں کے درمیان، ایک مرکزی مقام کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ سوات کے جنوبی علاقوں سے ہی گزر کر سکندر اعظم، محمود غزنوی، وسطی ایشیاء آنے والے حملہ آور اور مغل بادشاہ ہندوستان جاتے تھے۔

یاد رہے کہ تقسیم ہند سے پہلے سوات ایک آزاد ریاست تھی، جس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تھا۔ ریاست سوات کا شمار ایک خوشحال اور خود مختار ریاست کے طور پر ہوتا تھا، بعد میں اسے پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔

اگر آپ نقشہ دیکھیں، تو جان سکیں گے، کہ سوات کی سرحدیں شمال مغرب میں چترال، مغرب میں دیر، جنوب میں مالاکنڈ، جنوب مشرق میں بونیر سے ملتی ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ اس کے مشرق میں شانگلہ، شمال مشرق میں کوہستان اور شمال میں گلگت بلتستان۔ شانگلہ سے بھی ایک راستہ سوات آتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں نے کوہستان پر حملہ کیا تھا اور اس پر قابض ہوئے تھے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ قدیم دور سے لوگ ہندوکش پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد موجودہ شانگلہ کے راستے سے وادی سوات آیا کرتے تھے۔ اس دور کے سفر ناموں میں اسے ایسے علاقے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جہاں زرخیز زمین کی وجہ سے کثرت سے مختلف قسم کے پھل، اناج اور سبزیاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہاں پر موجود بدھ مت کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ کسی وقت میں بدھ مت کے پیروکار یہاں رہتے تھے۔ کئی چٹانوں پر اشوکا کے دور کے احکام کندہ کیے ہوئے بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ وادی سوات میں کئی اسٹوپا، خانقاہیں اور قلعے وغیرہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں۔ بہت سے آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ سوات کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔

سوات ان علاقوں میں سے ایک ہے، جہاں کا برطانوی ملکہ الزبتھ دوم نے 1961ء میں دورہ کیا تھا اور اسے مشرق کا سوئٹزرلینڈ کہا۔ اس کی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے ہم اسے ''زمین پر جنت'' کہتے ہیں۔ ہم اس جنت میں پہنچ چکے تھے۔ ایک سے ایک منظر خوبصورت تھا۔ راستے میں ہم ایک باغ میں بھی گئے اور یوں ہمیں ایک خوبصورت باغ بھی دیکھنے کو ملا۔

سوات کا صدر مقام سیدو شریف ہے، جو کہ راستہ سے ہٹ کر ہے۔ اس وقت بھی کئی سرکاری دفاتر پیشہ وارانہ تعلیمی ادارے، اسپتال وغیرہ اسی جگہ واقع ہیں۔ سیدو شریف میں واقع اسٹوپا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ اب یہاں سوات میوزیم بھی بنایا گیا ہے، جہاں بدھ دور کی ہزاروں اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔

سوات میں یوسف زئی قبیلہ اور ریاست

سوات میں یہ ریاست کب قائم ہوئی، یہ ایک دلچسپ تاریخ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر پشتون لوگ آباد ہیں جن کا تعلق افغان یوسف زئی قبیلہ سے ہے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ یہ لوگ پانچ سو سال پہلے افغانستان سے ہجرت کرکے سوات میں آباد ہوئے۔ ان سے پہلے یہاں کون لوگ آباد تھے، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ ہمارا قیام کالام میں تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ یہ 1986ء کی بات ہے۔ اب بہت تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ مزمل حسین صاحب [1] نے سوات سے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھ رہا ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ پروفیسر شاہ نذر خان، سابق ڈائریکٹر آثار قدیمہ اور عجائب گھر، حکومت خیبر پختونخوا کے مطابق، سوات کا پرانا نام اڈیانہ تھا، جس کا مطلب ہے باغ۔ اسے گندھارا تہذیب کا حصہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں وسطی ایشیاء کے خانہ بدوش جنھیں کشانہ کہتے تھے، نے اس علاقے میں ڈیرے ڈالے۔ اس دور میں یہاں اسٹوپوں، مندروں، رہائشی عمارتوں اور بڑے پیمانے پر تراشے ہوئے پتھروں سے بنے قلعے بنائے گئے تھے۔ البتہ اس علاقے میں، بدھ مت کا عروج ساتویں صدی عیسوی میں ہوا۔ بدھ مت کے لیے سوات کی سرزمین مقدس تھی۔ اسی وجہ سے چین، تبت اور بہت سے دوسرے علاقوں کے لوگ، سوات میں اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے کے لیے آتے تھے۔

مزمل حسین صاحب مزید لکھتے ہیں، کہ ڈاکٹر لوکا ماریا، جس نے پچیس سال سے زائد عرصہ تک سوات میں اطالوی آثار قدیمہ کے مشن کے لیے کام کیا اور انھیں سوات کے متعلق

---

[1] https://www-worldfootprints-com/swat-valley-the-switzerland-of-pakistan

ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے، کے مطابق سوات ایک تاریخی مقام ہے، لیکن یہاں آثار قدیمہ کے نوادرات بہت کم ملے ہیں۔

میں پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں، کہ سوات کا علاقہ ہمیشہ سے حملہ آوروں کی پسندیدہ جگہ رہا ہے۔ سکندر اعظم ہو یا وسطی ایشیاء اور افغانستان کی قبائلی فوجیں، سب اسی علاقے سے گزر کر آگے جاتے تھے۔مزمل صاحب کے مطابق، یہاں پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک مشہور محل ہے، جو کہ سفید محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ عمارت مکمل طور پر سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے۔ سوات کئی اور حوالوں سے بھی مشہور ہے جن میں سب سے زیادہ یہاں بننے والا اونی کمبل، شالیں، قالین اور کڑھائی وغیرہ شامل ہیں۔ موقع ملے، تو اس کی سیر ضرور کرنی چاہیے۔

سوات میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت پشتون قبائل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، گجر برادری کے لوگ بھی قابلِ ذکر تعداد میں آباد ہیں۔ گجر لوگ چترال میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ اس بات کی تلاش میں تھا کہ گجر لوگ یہاں کہاں سے آئے؟ ان کا اصلی وطن راجستھان اور پنجاب ہے۔

ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہوئے پتہ چلا، کہ یہ لوگ انگریزوں کے سخت خلاف تھے۔ ہریانہ میں ان کی ایک ریاست بھی تھی۔ ان کی ریاست اُن چند ریاستوں میں شمار ہوتی تھی، جس نے بطورِ ریاست 1857ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔جنگ آزادی میں شکست ہو جانے کے، بعد یہ لوگ جان بچانے کی غرض سے ان علاقوں میں آ گئے اور گلہ بانی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہندو اور سکھ برادریوں کے کچھ لوگ بھی صدیوں سے اس علاقے میں آباد ہیں، جو تجارت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

سیدو بابا: ایک علم اور انسان دوست ریاست سوات کی بنیاد رکھنے والا کلیدی کردار

سیدو شریف سے گزریں اور سیدو بابا کا ذکر نہ کیا جائے، یہ ممکن نہیں۔ سیدو بابا کے متعلق ایک مضمون سوات انسائیکلو پیڈیا پر موجود ہے۔ میں نے اس تحریر کے لیے اس مضمون سے بھی مدد لی ہے[1]۔

[1] https://swatencyclopedia.com/2020/10/2942/

سیدو بابا کے متعلق کئی لوگوں نے لکھا ہے جن میں فضل ربی راہیؔ بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''سوات سیاحوں کی جنت'' میں سیدو بابا کے متعلق لکھتے ہیں کہ سیدو بابا کا اصل نام عبدالغفور اور ولد عبدالواحد تھا۔ آپ 1794ء میں سوات کے علاقے شامیزئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق مہمند قبیلے صافی سے تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت کہ آپ کی شخصیت اس قدر شاندار تھی، کہ نہ صرف سوات بلکہ پورے خیبر پختونخوا میں، آپ کو سیدو بابا کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ آپ ہی کے نام پر سیدو کو سیدو شریف کہا جانے لگا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسا لاہور کے قریب شرق پور کو شرق پور شریف کہا جاتا ہے۔

سیدو بابا کے کئی کارنامے ہیں۔ ان میں سے ایک 1835ء میں پشاور کے قریب شیخان کے مقام پر امیرِ کابل دوست محمد خان کی معیت میں سکھوں کے خلاف جنگ ہے۔ کچھ لوگ اس جنگ کی تاریخ مئی 1834ء لکھتے ہیں۔

آپ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کر لیا، تو آپ نے سوات، مالاکنڈ اور بونیر کو انگریزوں کے قبضے میں جانے سے بچانے کے لیے علاقے کے پختونوں کی باہمی دشمنی ختم کروا کر ایک مضبوط و مستحکم محافظ فوج ترتیب دینے کے لیے بے حد کوشش کی۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے؟ یہ سب جانتے ہیں۔

لیکن اس ایک یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ستھانہ سے تعلق رکھنے والے سید اکبر شاہ کی نگرانی میں 1849ء میں اس علاقے میں ایک ریاست قائم ہو گئی۔ اس کے چند سال بعد 1857ء میں سید اکبر شاہ وفات پا گئے جس کی وجہ سے یہ ریاست مستحکم نہ ہو سکی۔

سیدو بابا نے ایک بار پھر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ اب کی بار وہ معرکہ ہوا، جس کا ذکر میں آگے صفحات میں کروں گا، یعنی امبیلہ اور ملکا وادی، بونیر کے پہاڑی مورچوں میں 20 اکتوبر 1863ء سے شروع ہو کر 27 دسمبر 1863ء تک جاری رہنے والی ایک تاریخی جنگ۔ جس میں انگریزوں کو بے حد نقصان ہوا۔ خود چیمبرلین بھی شدید زخمی ہوا۔ مجاہدین بھی ایک کثیر تعداد میں شہید ہوئے۔ سیدو بابا 21 جنوری 1887ء کو وفات پاتے ہیں۔ آپ کا مزار سیدو شریف میں واقع ہے۔

سوات انسائیکلو پیڈیا میں اسی مضمون میں سیدو بابا کی وفات پر تین مختلف انگریز شعرا نے مرثیے بھی لکھے ہیں جو اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایسا شاید کسی اور کے لیے کبھی بھی نہیں ہوا۔ جارج ٹی لینیگن (1846-1886) کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ ہو:

WHAT, what, what

What's the news from Swat?

,Sad news

,Bad news

Comes by the cable led

,Through the Indian Ocean's bed

Through the Persian Gulf, the Red

-Sea and the Med

iterranean he's dead

!The Ahkoond is dead

کیا کیا کیا؟
سوات سے کیا خبر ہے؟
افسوسناک خبر
بری خبر
تار کے ذریعے آئی ہے
بحرِ ہند سے ہوتی ہوئی
خلیجِ فارس سے ہوتی ہوئی،
بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم سے ہوتی ہوئی
کہ آخوند اب نہیں رہے

بعد میں جب ریاست سوات مستحکم ہوئی تو سیدو بابا کے پوتے میاں گل عبدالودود المعروف بادشاہ صاحب نے 1943ء میں آپ کا مزار تعمیر کیا۔ یہ مزار فنِ تعمیر میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے، اس کے پاس ہی مسجد بھی ہے۔ یہ دونوں عمارتیں، سوات کا ایک حسین چہرہ ہیں۔

مسجد کے ساتھ ہی ایک چشمہ بھی موجود ہے۔ جسے پشتو میں ''سیدو باباچینہ'' کہا جاتا ہے۔ سیدو بابا کے مزار پر بے شمار لوگ آتے ہیں۔ ایک روایت جس کا ذکر اسی مضمون میں کیا گیا ہے، کافی دلچسپ ہے۔ یہ روایت کچھ یوں ہے کہ لڑکیاں اپنی شادی سے پہلے اپنی سہیلیوں کے ساتھ آتی تھیں۔ اسے مقامی طور پر ''کور بن والے'' کہا جاتا ہے۔

مزار پر باقاعدہ لنگر خانہ، مہمان خانہ، سیدو بابا کا کمرۂ خاص اور دیگر تبرکات بھی ہیں۔
میرے نزدیک انگریزوں اور سکھوں کے خلاف ان کی جنگ ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کا بے حد احترام ہے۔

ریاست سوات کب اور کیسے وجود میں آئی

ریاست سوات کا آغاز کب ہوتا ہے اور کب اس کا خاتمہ ہوتا ہے؟ اس کے متعلق کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ سوات انسائیکلوپیڈیا پر پڑے ایک مضمون "بادشاہِ سوات سید اکبر شاہ کا مختصر تعارف" کے عنوان سے ہے پڑھنے کو ملا جو میں جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

میں نے سیدو بابا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ستھانہ سے تعلق رکھنے والے سید اکبر شاہ کو ایک ریاست بنانے میں مدد دی تھی۔ سید اکبر بادشاہ کی وفات جلد ہی ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ ریاست مستحکم نہ ہو سکی۔

اسی مضمون میں وسیم اعجاز صاحب کے ایک مضمون "مجاہد کبیر سید اکبر شاہ ترمذی" کے حوالے سے لکھا ہوا ہے کہ سید اکبر شاہ، پیر باباؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو 1793ء کو ستھانہ میں سید گل شاہ تھا، جو شاہ جی کے نام سے پہچانے جاتے تھے، کے گھر پیدا ہوئے۔

سید اکبر شاہ نے سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا۔ آپ تحریکِ مجاہدین کے سرگرم رکن تھے اور ان کے ساتھ مل کر 1824ء میں نوشہرہ میں ہونے والی سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔ سیدو بابا یہ چاہتے تھے کہ سوات میں ایک ریاست قائم کی جائے اور اس کی سربراہی کے لیے آپ نے 1849ء میں سوات اور بونیر کے سرکردہ لوگوں کے مشورہ سے سید اکبر شاہ کو چنا۔ اس طرح ریاست سوات کا آغاز ہوتا ہے۔ ریاست سوات کا صدر مقام غالیگے تھا۔ اس ریاست نے اپنی فوج بھی ترتیب دی جس میں آٹھ سو سوار, تین ہزار پیادہ اور پانچ تا چھ بندوقوں والے افراد شامل تھے۔ سید اکبر بادشاہ کی 1857ء کو وفات ہوتی ہے۔ انھیں ان کے آبائی علاقے ستھانہ میں ہی دفن کیا گیا۔

اُن کی وفات سے جہاں ایک طرف سوات میں دوبارہ خانہ جنگی کا آغاز ہوا، دوسری طرف تحریکِ مجاہدین کو بھی نقصان پہنچا۔ یاد رہے کہ اس وقت تک بالاکوٹ میں سیّد احمد شہیدؒ کی شہادت ہو چکی تھی۔ سید اکبر بادشاہ کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے سید مبارک شاہ سوات

کے بادشاہ بنے جو ایک سال سے بھی کم عرصے تک ریاست سوات کا والی رہے۔ یہ تھا آغاز ریاست سوات کا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک ریاست سوات کا کوئی وجود نہیں ملتا۔

سید عبدالجبار شاہ اور انگریز حکومت

سوات انسائیکلوپیڈیا پر ایک مضمون سید عبدالجبار شاہ اور انگریز حکومت کے عنوان سے پڑھنے کو ملا[1]۔ اس مضمون میں یہ لکھا گیا ہے، کہ سید عبدالجبار شاہ کا تعلق سوات کی سرزمین سے نہیں تھا۔ وہ کہاں سے آئے تھے۔ یہ بھی اہم ہے کہ ان کی حکمرانی کا دور محض ڈھائی سال پر محیط رہا۔ ان کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس مضمون میں ایک خط جو کہ سید عبد الجبار شاہ نے اس وقت کے چیف کمشنر، صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کو 2 اکتوبر 1914ء کو لکھا تھا درج ہے۔ اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک انھوں نے سوات کے حکمران کے طور پر ذمہ داری نہیں سنبھالی تھی۔ یہ ایک دلچسپ خط ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس سے جو میں جان سکا اس کے مطابق اس وقت سوات میں کوئی حکومت نہیں تھی۔

سید عبدالجبار شاہ نے اس خط میں یہ درخواست کی تھی کہ میرے نانا سید اکبر شاہ انگریزوں کی حکمرانی کے آغاز سے پہلے ہزارہ کے حکمران تھے اور اس کے بعد سوات کے حکمران بھی رہے۔ بعد میں میرے خاندان اور برطانوی حکومت کے درمیان دشمنی کا آغاز ہوتا ہے۔ یاد رہے، کہ سید اکبر بادشاہ نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی تھی۔ وہ اپنی درخواست میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعد میں میرے والد شہزادہ سید محمود شاہ نے 1858ء میں بطورِ رسالدار برطانوی حکومت میں نوکری بھی کی تھی۔

سید عبدالجبار شاہ مزید لکھتے ہیں، کہ اب علاقے کے لوگ مجھے اپنا سربراہ مقرر کرنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ میں اس وقت کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا، جب تک آپ کی آشیر باد حاصل نہیں ہو جاتی۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب میں اپنے لشکر سمیت 1914ء کو سوات میں داخل ہونا چاہتا تھا، تو مجھے جنگِ عظیم اوّل کے شروع ہو جانے کی وجہ سے روک دیا گیا تھا، اور میں رک گیا تھا۔ میں نے ایک بڑی قربانی دی ہے، اس لیے انگریزوں کو بھی مجھے اس کا صلہ دینا چاہیئے اور سوات کا والی بننے میں کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کی جائے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں نے انھیں والی بننے کی اجازت نہیں دی۔

---

[1] https://swatencyclopedia.com/2021/01/3239/

میاں گل عبدالودود المعروف باچا صاحب ریاست سوات کے بانی

میاں گل عبدالودود 1881ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سیدو بابا کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی قومی خدمات کی وجہ سے انھیں آخوند آف سوات کا نام دیا گیا تھا۔ وہ 1917ء میں ریاست سوات کے والی بنے جبکہ 1926ء کی بات ہے کہ سوات انگریزوں کی حلیف ریاست بن گئی۔ یاد رہے کہ اس وقت سوات ریاست کا ایک تصور تو موجود تھا، لیکن کوئی سربراہ نہیں تھا۔ سید اکبر کے بعد ایک طرح کی بے یقینی کی کیفیت تھی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ میاں گل عبدالودود ریاست سوات کے بانی ہیں۔ میرے خیال میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کہ انھوں نے سید اکبر بادشاہ کے بعد پیدا ہونے والے خلاء کو پُر کیا۔ ایک ریاست جو ختم ہو چکی تھی، اسے دوبارہ سے بحال کیا۔

میاں گل تیس سال تک سوات کے والی رہے۔ تقسیم ہند کے بعد میاں گل عبدالودود نے 1949ء میں اقتدار اپنے بیٹے میاں گل عبدالحق جہانزیب کے سپرد کیا۔ وہ اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک حیات رہے۔ ان کی وفات 1971ء میں ہوئی۔ میاں گل جہانزیب صاحب کا انتقال 1987ء کو سیدو شریف میں ہوا۔

میاں گل عبدالودود بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ جب ان کی حکومت کو دس سال کا عرصہ ہو چکا اور ریاست کافی مستحکم بھی ہو گئی تھی، تو انھوں نے 1927ء میں ریاست سوات میں دیرپا امن کی خاطر لوگوں کو غیر مسلح کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک مشکل ترین فیصلہ تھا۔ اس کام کے لیے انھوں نے 13 دسمبر 1927ء کو شاہی ریاستوں کے لیے اُس وقت کے پولیٹیکل ایجنٹ (C.Latimer) کو ایک خط لکھا جس میں یہ کہا گیا، کہ وہ ریاست سوات کے باشندوں کو غیر مسلح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن انھیں یہ خوف بھی ہے، کہ کہیں اس پر لوگ بغاوت نہ کر دیں۔ اس لیے انھیں انگریزوں کی مدد درکار ہوگی۔ انگریز بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ اس سے ریاست کے قریبی علاقوں یعنی پشاور اور ہزارہ میں بھی امن قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس التجا کے جواب میں انگریزوں نے باوجود اس کے، کہ اس میں انگریزوں کا فائدہ بھی تھا، کسی طرح کی بھی مدد دینے سے معذوری ظاہر کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد سوات نے پاکستان سے الحاق کیا، لیکن والی کی حکمرانی جاری رہی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب 1969ء میں ریاست ختم ہو گئی اور یہ علاقہ پاکستان کا حصہ بن جاتا ہے۔ سوات کے والی، میاں گل عبدالودود نے 3 نومبر 1947ء کو اپنی ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا اور میاں گل جہاں زیب آخری والی تھے۔

میں نے بونیر اور سوات میں لوگوں سے ریاست کے متعلق سوال کیے۔ سب کا جواب یہ تھا کہ ریاست کے والی عادل ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے خیر خواہ بھی تھے۔ تعلیم اور صحت ان کی اولین ترجیح تھی۔ میں نے بونیر میں وہ کالج بھی دیکھا ہے جو والیِ سوات نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ گھوڑے پر سوار تھے اور زمین پر چونا پھینکتے جاتے تھے اور ایک بڑی جگہ کالج کے لیے لوگوں سے خریدی اور آج اس جگہ پر ایک بہترین کالج قائم ہے۔

میاں گل عبدالودود اور انگریز دوستی

ایک سوال میرے ذہن میں بار بار آتا ہے کہ انگریزوں نے عبدالجبار شاہ کی درخواست منظور نہ کی۔ لیکن اس نے پھر بھی ایک طرح کی ریاست کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی جسے کچھ ہی عرصے بعد میاں گل عبدالودود صاحب قبائلی جرگے کی مدد سے ختم کرکے خود ریاست سوات کے والی بن گئے۔ کیا اس سے پہلے ریاست سوات موجود نہیں تھی؟ کیا ان کے اس عمل کے پیچھے انگریزوں سے ان کے تعلقات بھی تھے؟ کیا یہ سب کچھ انگریزوں کی مرضی سے ہوا تھا؟

اس کے متعلق ایک طویل مضمون جس کا عنوان ہے:

Swat State during 1849-1969: A Historical Perspective

جسے فخر السلام نے لکھا، جو پاکستان سٹڈی سنٹر یونیورسٹی آف پشاور میں بطور ڈائریکٹر کام کرتے تھے[1]۔ اس مضمون کے مطابق سیدو بابا کے دو بیٹے تھے؛ میاں گل عبدالحنان اور میاں گل عبدالخالق۔ سیدو بابا کی وفات کے بعد دونوں میں چپقلش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ جس کا یہاں ذکر کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ وہ سیدو بابا کا تعلق صافی قبیلے سے کہتے ہیں۔

لوگ عبدالخالق کو عبدالحنان سے بہتر سمجھتے تھے۔ ایک طویل جرگے کے بعد لوگوں نے عبدالخالق کو سیدو بابا کے حقیقی وارث کے طور پر تسلیم کر لیا۔ یاد رہے سیدو بابا ریاست سوات کے والی نہیں تھے۔ وہ ایک نیک آدمی تھے لوگ ان کی روحانی برکات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آتے تھے۔ سیدو بابا کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ انھوں نے اسلامی قوانین کا نفاذ کیا تھا۔ اب یہ ذمہ داری عبدالخالق کے سر پر آ گئی۔ میاں عبدالخالق نے اپنی وفات تک (1892ء)

---

[1] http://www.nihcr.edu.pk/Latest_English_Journal

تک کامیابی سے معاملات کو چلایا ۔ ان کے دو بیٹے تھے؛ میاں گل عبدالودود اور میاں گل عبدالمنان ۔ میاں عبدالخالق کی وفات کے ساتھ ہی ان کا بنایا ہوا نظام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کس طرح کی ریاست تھی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ یہ ایک طرح کا قبائلی نظام تھا۔

میاں گل عبدالودود 1908ء میں حج کے لیے جاتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں کون بنے گا والی؟ یہ بحث شروع ہو جاتی ہے، اس کے متعلق پھر سے ایک کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خاندان میں بھی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نواب آف دیر بھی سوات پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس جنگ کے دوران سید عبدالجبار بھی 1914ء میں سوات پر حملہ کر دیتا ہے۔ پھر ایک موقع آتا ہے کہ میاں عبدالودود چکدرہ میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دفعہ پھر کوشش کرتے ہیں اور عبدالجبار شاہ کو شکست دے کر سوات پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیتے ہیں۔

اسی کشمکش میں جرگہ سامنے آتا ہے، جو میاں گل عبدالودود کو سوات کا حکمران قرار دے دیتا ہے۔ لوگ انھیں بادشاہ صاحب (صیب) کا خطاب دے دیتے ہیں۔ اس وقت ریاست سوات کے پاس محدود وسائل تھے۔ کوئی باقاعدہ فوج تھی نہ ہی انتظامیہ ۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہی ریاست سوات کے بانی ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد آپ نے ریاست سوات کے تمام ضروری ادارے قائم کیے اور ایک مضبوط اور خوشحال ریاست کو پروان چڑھایا۔

یہاں ہم اپنے دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ نواب آف دیر بادشاہ صاحب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انگریز نواب آف دیر کے حلیف تھے۔ اب بادشاہ صاحب کے پاس ایک ہی حل تھا کہ وہ بھی انگریزوں سے دوستی کر لیتے۔ یاد رہے، کہ اس وقت تک انگریز اس علاقے سمیت پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔

ایک بڑی طاقت سے ٹکر لینا ریاست سوات کے لیے ممکن نہ تھا۔ پھر ایک وہ دن بھی آ گیا جب 1926ء میں برطانوی حکومت نے بادشاہ صاحب کی ریاست سوات کے ساتھ دوستی کر لی۔

پولیٹیکل ایجنٹ دیر، سوات اور چترال کیپٹن ہے (Hay) نے 26 مئی 1932ء نے اس کا اعلان کچھ یوں کیا؛

The Wali's (Miangul Abdul Wadood) relations with the government are defined in one agreement, that of 3rd May 1926.

In this the Wali has undertaken to be loyal to the British government and give it open and active support when required to prevent raiding, not harbour outlaws, not to permit anti government propaganda in his territory and to accept control of government over Swat forests. In return the government has recognized him subsidy of Rs. 10.000/- Per Annum.

تو یہ تھی وہ غلامی کی رسید جس میں دس ہزار سالانہ بھی دیا جانا تھا، وفاداری بھی لازم تھی، امن بھی ضروری تھا، سب کچھ تھا، مگر آزادی نہیں تھی۔

ہندوستان بھر میں قائم کوئی ساڑھے پانچ سو کے قریب ریاستوں کے والیان کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایک بڑی طاقت سے جنگ ممکن نہ تھی۔، اس لیے انھوں نے عوام کا قتلِ عام ہونے سے بچانے کے لیے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جس سے امن قائم رہا۔

امن کی خاطر غلامی یا عزت کی موت؛ دونوں میں کسی نے غلامی کو قبول کیا اور کسی نے موت کو گلے لگایا۔۔۔

دونوں کا ہی تاریخ میں ذکر ملتا ہے۔۔۔

رانی جھانسی کا بھی، سلطان ٹیپو کا جو جان دینے کے حق میں تھے اور سوات، دیر، چترال، بہاولپور، حیدرآباد، خیرپور، قلات کا بھی اور بے شمار اور بھی جو آزادی قربان کرکے امن اور اپنی گدی بچانے کے حق میں تھے۔

ان کی اگر آپ نے تصاویر دیکھنی ہوں تو دہلی دربار جو (1911ء میں) جارج پنجم ہندوستان کے دورے کے موقع پر لگا تھا، کے موقع پر لی گئی تصاویر دیکھ لیں۔ اس دربار میں سب حاضر تھے، حکم تھا کہ ہر راجہ، مہاراجہ مکمل لباس جس میں ہر طرح کے میڈل لگے ہوں گے، تاج بھی ہو گا، گلے میں سونے کے ہار بھی ہوں، سب سلام پیش کریں گے اور کوئی بھی بادشاہ جارج پنجم کی طرف پیٹھ نہیں کرے گا۔۔۔

پھر ایسا ہی ہوا۔۔۔

سوائے ایک راجہ کے، جسے بعد میں اس جرم کی سزا بھی گئی۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ والی ریاست سوات کا باقاعدہ قیام تو 1849ء میں سیدو باباکے کہنے پر سید اکبر شاہ کی بطور حکمران تقرری کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ساٹھ سال تک کا دور بد امنی کا رہا ہے۔ پھر 1918ء میں ریاست سوات کو دوبارہ سے زندہ کیا جاتا ہے اور اس کے پہلے والی میاں گل عبدالودود بنتے ہیں۔

آخری والیِ سوات کی تاج پوشی

میاں گل عبدالودود المعروف باچا صاحب نے ایک روز فیصلہ کیا کہ اب انھیں حکمرانی سے سبک دوش ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے بتیس سال تک حکمرانی کرنے کے بعد عنانِ اقتدار اپنے بیٹے میاں گل عبدالحق جہاں زیب کو دے دی۔ اس سلسلے میں ایک تقریب 12 دسمبر 1949ء کو منعقد ہوتی ہے۔ استقریب کی تفصیل جلال الدین یوسف زئی نے لکھی ہے[1]۔

اس مضمون کے مطابق اس تقریب میں اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دیگر افسران بھی موجود تھے۔ باچا صاحب نے لنڈاکی کے مقام پر وزیرِ اعظم پاکستان اور دیگر مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیدو شریف میں لیاقت علی خان کو 21 توپوں کی سلامی پیش کی جاتی ہے اور ریاستِ سوات کے سپاہی انھیں ''گارڈ آف آنر'' پیش کرتے ہیں۔ نئے والی کو پہنانے کے لیے بنائی جانے والی پگڑی ایک سادہ کپڑے سے بنائی گئی تھی ۔ جبکہ اس طرح کے موقع پر دوسری شاہی ریاستوں کے حکمران تو سونے جواہرات اور ہیروں سے مزین تاج پہنتے تھے۔

تقریب کے آغاز ہی میں باچا صاحب تقریر کرتے ہیں، اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے بیٹے کے ساتھ بھی تعاون کریں گے۔ تقریر کے بعد وزیر اعظم پاکستان، پگڑی ولی عہد کے سر پر رکھتے ہیں اور یوں میاں گل عبدالحق جہانزیب سوات کے حکمران بن جاتے ہیں۔

اس کے بعد لیاقت علی خان تقریر کرتے ہیں اور آخر میں نئے والی میاں گل عبدالحق جہانزیب پشتو زبان میں تقریر کرتے ہیں۔

---

[1] https://swatencyclopedia.com/2020/03/1677/

میرے علم کے مطابق ہندوستان بھر میں شاید ہی اتنی آسانی سے اقتدار منتقل کیا گیا ہو۔ خاص طور کسی بھی والی یا نواب یا راجا کی زندگی میں ہی۔ یہ ایک خوبصورت مثال ہے۔

جس سے ہمارے آج کے حکمرانوں کو بھی سبق لینا چاہیے۔۔۔

لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا!

میاں گل جہانزیب سوات کے آخری والی تھے۔انھوں نے 1949ء اور 1969ءکے درمیان سوات کے والی کے طور پر کئی یادگار کام کیے۔وہ اپنے والد میاں گل عبدالودود کے بعد والی بنے تھے۔ مینگورہ میں ودودیہ ہال ان ہی کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ وہ ایک کثیر تعداد میں اسکولوں، اسپتالوں اور سڑکوں کی تعمیر کے حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں۔ وہ غیر ملکی سربراہان مملکت اور وی آئی پیز کو بھی اپنے ہاں مدعو کرتے تھے۔ ملکہ برطانیہ بھی 1961ء میں یہاں تشریف لائیں تھیں اور اسے ''مشرق کا سوئٹزرلینڈ'' کہا تھا۔

ریاست سوات میں انتخابات

میں جب سوات کے متعلق جاننے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے ایک مضمون سوات انسائیکلوپیڈیا پر پڑھنے کو ملا، جو ریاست سوات میں پہلے انتخابات کے متعلق ہے[1]۔اس مضمون کے مطابق قائدِ اعظم کی زندگی ہی میں ریاستِ سوات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا معاہدہ کر لیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاست کو اندرونی آزادی بھی حاصل رہی۔ سوات کے حکمران بہت سے اختیارات سے دستبردار بھی ہو گئے۔ پھر 1954ء میں ایک عبوری معاہدہ ہوتا ہے، جسے

"Supplementory Instrument of Accassion"

کا نام دیا جاتا ہے۔اس معاہدے میں یہ لکھا گیا تھا، کہ ریاست سوات میں پچیس افراد پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل بنائی جائے گی۔اس پر ریاست سوات میں عمل کیا گیا۔ میرے علم کے مطابق اس طرح کا کوئی بھی قدم کسی دوسری ریاست میں نہیں اٹھایا گیا۔ یہ بات میں نے اپنے سندھ کے سفر نامے میں لکھی ہے، کہ ریاست خیرپور نے تقسیم ہند سے قبل ہی اپنے ہاں انتخابات کروائے تھے۔

[1] https://swatencyclopedia.com/2021/01/3195/

ریاست سوات میں انتخابات کے لیے حلقہ بندیاں کی گئیں اور ریاست کو پندرہ حلقوں میں تقسیم کیا گیا۔ پچیس افراد پر مشتمل، مشاورتی کونسل کا بنیادی مقصد حکومت کو مشاورت مہیا کرنا تھا۔ پندرہ افراد کا انتخاب کیا جانا تھا، جبکہ والی صاحب نے دس افراد خود نامزد کرنے تھے۔ ریاست سوات میں یہ انتخابات 21،20 اور 22 دسمبر 1954ء کو منعقد ہوئے۔

اس مضمون میں فضل رازق شہابؔ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہوا ہے انتخابات میں ووٹنگ کا سلسلہ بہت دلچسپ تھا۔ اس طریقے کے مطابق ووٹ لینے کے خواہش مند افراد ایک کھلے میدان میں جمع ہو جاتے تھے اور ساتھ ہی لوگ بھی وہیں آجاتے۔ کھلے عام لوگ اپنی اپنی پسند کے اُمیدوار کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ جس کے ساتھ زیادہ لوگ ہوتے وہ جیت جاتا۔

یہ دلچسپ طریقہ نہایت ہی شفاف انتخابات کی ضمانت تھا۔ اگر آج بھی ایسا ہو جائے تو بات بن جائے۔ ویسے ہماری اسمبلی میں اب بھی صدر اور وزیر اعظم کا انتخاب اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اب کچھ ان خوبصورت مقامات کا تذکرہ جہاں سے ہمارا گزر ہوا۔

مینگورہ بازار: سر راہ دریا کے کنارے ایک تفریحی مقام

مینگورہ بازار جسے عرفِ عام میں مینگورہ ہی کہا جاتا ہے، سوات کا مرکزی کاروباری مرکز ہے۔ یہ ایک طویل بازار ہے جہاں وادی کے آس پاس کے لوگ خریداری اور دیگر کاروباری سرگرمیوں کے لیے آتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے سوات کا معاشی حب ہے۔ ہم ایک جگہ رکے بھی۔ دریا کے کنارے کافی کھانے پینے کا انتظام موجود تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک جگہ کافی تعداد میں نوجوان سفید لمبی قمیص شلوار میں ملبوس روائیتی اور علاقائی رقص بھی کر رہے تھے جو بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ یہ بازار رات دیر تک کھلا رہتا ہے۔ سچی بات ہے کہ ہم تو اسے ہی، سوات سمجھ رہے تھے، جبکہ یہ مینگورہ تھا۔

کالام: ایک ناقابلِ فراموش مقام

کالام مینگورہ سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک انتہائی سرسبز علاقہ ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ دریائے سوات اس کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔ گرمیوں میں یہاں کا موسم بہت ہی آرام دہ ہوتا ہے۔ کالام میں ہمارا قیام دریائے سوات کے کنارے واقع ایک ہوٹل میں تھا۔ ہمارے کمرے کی بالکونی سے دریا کا نظارہ بہت ہی بھلا لگتا تھا، جو اب تک ذہن میں محو ہے۔

ہم ایک دن جیپ کے ذریعے مہوڈونڈ جھیل بھی گئے۔ یہ جھیل کالام سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ راستہ کافی مشکل تھا۔ لیکن سفر تو سفر ہی ہوتا ہے۔ راستہ میں ایک جگہ رک کر ہم نے کھانا بھی کھایا۔ ایک صاحب نے دیسی مرغ ذبح کرکے ہماری تواضع کی۔ یہ کھانا ایک مدت تک بچوں کو یاد رہا۔

یہاں پر جھیل کنارے کئی رنگ برنگے ٹینٹ لگے ہوئے تھے۔ ایسا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اور عاصم الٰہی مانگٹ نے جھیل میں اتر کر نہانے کی بھی کوشش کی جس کے بعد ہماری حالت کافی غیر ہو گئی۔ اس جھیل میں ماہی گیری اور بوٹنگ کا نظام بھی موجود تھا، لوگ کہتے ہیں اس جھیل کی گہرائی کا کسی کو صحیح پتہ نہیں ہے۔

ملم جبہ: جس کا نام کافی مختلف لگا

ملم جبہ (جسے مالم جبہ بھی لکھا جاتا ہے) قراقرم پہاڑی سلسلے میں واقع ایک پہاڑی مقام ہے یہ سیدو شریف سے چالیس کلومیٹر دور ہے۔ ملم جبہ میں سکیٹنگ (برف پر چلنے والا کھیل) کا بہترین انتظام بھی ہے۔ یہ سطح سمندر سے آٹھ ہزار کے قریب بلندی پر واقع ہے۔ اس پر جانے کے لیے جیپ کی مدد لی جاتی ہے۔ اس تک پہنچنا ایک خطرناک سفر کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے۔

ملم جبہ اپنے بچوں کے ساتھ جانے کا موقع تو نہیں ملا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب میں (2002ء کی بات ہے) یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (یوایم ٹی) سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر منسلک تھا، تو میں یونیورسٹی کے طلباء کے ساتھ ملم جبہ گیا تھا۔ ملم جبہ کے متعلق ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ یہ مضمون سوات انسائیکلوپیڈیا پر موجود ہے۔ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا ہوا[1]۔ اس کا عنوان ہے؛

ملم جبہ، قدیم اُدھیانہ کا مذہبی و تجارتی راستہ

اس مضمون کے مطابق ملم جبہ میں، قدیم دور کے کھنڈرات اور آثار کا پایا جانا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ کوئی دو ہزار سال سے زائد عرصہ قبل بھی یہاں لوگ آباد تھے اور آج بھی ہیں۔ اس کے ثبوت کے طور پر، یہاں پر موجود بدھ مت بلکہ اس سے بھی قبل کی تعمیرات پیش کی جاسکتی ہیں۔ ملم جبہ کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی بے حد اہم سمجھی جاتی تھی۔ وہ تھا اس کا ایک ایسے راستے پر واقع ہونا، جو دریائے سندھ کے کنارے واقع کوہستان اور سوات کو

[1] https://swatencyclopedia.com/2020/09/2811/

ملاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسی راستے سے لوگ گزر کر وسطی ایشیاء سے جنوبی ایشیاء کی طرف جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ اسی راستے سے وسطی ایشیاء سے بدھ مت کے زائرین قدیم ادھیانہ آتے تھے۔

یہ بات بھی تاریخ میں درج ہے، کہ ملم جبہ کے راستے ہی یوسف زئیوں سے شکست کھا کر سواتی لوگ کوہستان کی طرف آئے تھے۔ حال ہی میں جب سوات میں طالبان کے خلاف پاک فوج نے آپریشن شروع کیا تو بہت سے لوگوں نے ملم جبہ ہی کا قدیم راستہ استعمال کرتے ہوئے، شانگلہ اور بونیر کے راستے نقل مکانی کی تھی۔

یہ بھی تاریخ میں لکھا ہوا کہ یہاں ایک بڑی تعداد میں اسٹوپے موجود تھے۔ جن کے ساتھ گھنٹیاں لگی ہوتی تھی، جنہیں جرس بھی کہا جاتا تھا۔ رات کے وقت ہوا چلنے سے ان سے ایک دل فریب موسیقی پیدا ہوتی تھی، جو دلوں کو مسحور کرتی تھی۔ اس کی انھی خوبصورت باتوں کی وجہ سے یہ علاقے ہندوستان بھر میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔

ملم جبہ میں بہت کچھ اور بھی ہے جسے دیکھنے کے لیے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچنا بے حد ضروری ہے۔

سوات میوزیم

سوات میوزیم مینگورہ اور سیدو کے درمیان آدھے راستے پر سڑک کے مشرق کی طرف ہے۔ جاپانی امداد نے اس کی سات گیلریوں کو ایک نئی شکل دی ہے ،جس میں اب گندھارا کے مجسموں کا ایک بہترین مجموعہ ہے، جو سوات میں بدھ مت کے کچھ مقامات سے لیے گئے ہیں، جنہیں دوبارہ ترتیب دیا گیا ہے اور بدھ کی زندگی کی کہانی کو بیان کرنے کے لیے لیبل لگائے گئے ہیں۔ ٹیراکوٹا کے مجسمے اور برتن، موتیوں کی مالا، قیمتی پتھر، سکے، ہتھیار اور مختلف دھاتی اشیاء جو گندھارا تہذیب کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں، بھی یہاں موجود تھیں۔ ایتھنوگرافک سیکشن مقامی کڑھائی، کھدی ہوئی لکڑی اور قبائلی زیورات کی بہترین مثالیں دکھاتا ہے۔ مجھے اب تک افسوس ہے کہ میں اس میوزیم کو کیوں نہ دیکھ سکا۔ زندگی رہی تو پھر سہی۔ ایک صاحب نے ایک خوشخبری بھی سنائی کہ مستقبل میں جھل کھنڈ سے نیلم وادی میں شاردا تک ایک سڑک کی تعمیر زیرِ غور ہے۔ اس سے بھی اس علاقے کی اہمیت میں بے حد اضافہ ہوگا۔

سوات میوزیم کے متعلق ایک مضمون سوات انسائیکلو پیڈیا پر موجود ہے[1] ۔ اس مضمون کے مطابق سوات میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کا کام، سر اورل سٹین کی سربراہی میں 1927ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کئی دہائیوں تک اس پر کوئی کام نہیں ہوا۔ پھر 1955ء میں برٹش میوزیم کے دو اہل کار E Barger اور P Wright نے اس پر نئے سرے سے کام شروع کیا۔ اس کام کے لئے جہانزیب کالج کا ایک کمرہ بطور میوزیم استعمال کیا جانے لگا۔ یہ وہی کالج ہے، جہاں قاضی حسین احمد کی پشاور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد جہانزیب کالج سیدو شریف میں بحیثیت لیکچرار تعیناتی ہوئی تھی اور وہ یہاں تین برس تک پڑھاتے رہے۔ جب سوات سے ملنے والے نوادرات کی تعداد بڑھ گئی تو والئی سوات نے ایک علیحدہ عمارت تعمیر کروائی۔ یہ سب جان کر کہا جاسکتا ہے، کہ سوات میوزیم کا سہرا ریاست سوات کے بانی میاں گل عبدالودود کے سر ہے۔

میں ریاست سوات کی بات ختم کرنے سے پہلے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس بات کے متعلق لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ کوئی بات حتمی کہنا بے حد مشکل ہوتی ہے جو میں نے سمجھا، وہ ضرور پیش کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ درست نہ ہو۔ یہ ایک تاریخی بات ہے جس میں شک کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔

کیا سیدو بابا گجر برادری سے تعلق رکھتے تھے؟

سیدو بابا کے متعلق کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ افغان نہیں، بلکہ گجر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ معلوم نہیں۔

اس کے متعلق ایک مضمون میں نے پڑھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ اپر سوات میں ایک دور دراز گاؤں میں آباد کھٹانہ گجر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے[2]۔ فخر اسلام کا کہنا ہے کہ سیدو بابا صافی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیا بات درست ہے، معلوم نہیں۔ کے پی کے کے کسی بھی بڑے آدمی کے متعلق اس طرح کی بات سننے کو نہیں ملتی۔ اگر ایسی بات کی گئی ہے تو یقیناً اس میں کوئی صداقت ہو سکتی ہے۔ نامی گرامی پختونوں کے متعلق تو سب تفصیلات لوگوں کو پتہ ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق ایسا کیوں نہیں؟ جو میں جان سکا وہ پیشِ خدمت ہے۔ میری بات درست ہو، ایسا کوئی دعویٰ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ جو جانا وہ پیش ہے۔

---

[1] https://swatencyclopedia.com/2020/10/2866/

[2] https://prabook.com/web/akhund.swat/2552399

آپ کے دو بیٹے میاں گل عبدالحنان اور میاں گل عبدالخالق تھے۔ میں نے ہندوستان کی جتنی بھی تاریخ پڑھی ہے اس میں، میں نے یہ دیکھا ہے کہ میاں کا لفظ پنجاب میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم لاہور میں آرائیں برادری سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور ملز مالکان کو میاں کہتے ہیں۔ جب کہ گجرات میں لفظ میاں گجر برادری کے علاوہ کسی کے لیے نہیں بولا جاتا۔ یہ ایک لقب ہے جو احترام کی وجہ سے بولا جاتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے سابق صدر عبدالشکور صاحب کا تعلق بھی گجرات کی گجر برادری سے ہے، اس لیے انھیں میاں صاحب ہی کہتے ہیں۔ گجرات سے تعلق رکھنے والے الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے ایک اہم فرد اور حافظ ادریس صاحب کے بھانجے وقاص وحید اپنے نام کے ساتھ میاں لکھتے ہیں، ان کا تعلق بھی گجر برادری سے ہی ہے۔ جبکہ خیبر پختونخوا میں بسنے والے پختون لوگ خان، نواب، ملک یا اسی طرح کا کوئی اور لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے مجھے یہ شک ہے کہ سیدو بابا کا تعلق افغان خاندان کی بجائے، گجر برادری سے ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات بھی سامنے رہنی چاہیے، کہ گجرات میں گجر ایک بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ جس دور میں سیدو بابا کی اولاد ریاست سوات پر حکمرانی کرتی تھی، اسی دور میں گجرات میں ایک بااثر اور جاگیر دار گجر خاندان آباد تھا، جسے پگانوالا خاندان کہتے تھے۔ اس خاندان نے گجرات میں تعلیمی ادارے بنائے، جس میں سب سے مشہور گجرات کا زمیندارہ کالج ہے، جو اب ایک یونیورسٹی بن گیا ہے۔ جبکہ خیبر پختونخوامیں جتنی بھی ریاستیں آباد تھیں، ان میں سب کے حاکم پختون تھے۔ جس قدر علم دوستی کا ثبوت ریاست سوات کے حکمرانوں نے دیا ہے، کسی اور نے نہیں دیا۔ اس سے میرے خیال کو تقویت ملتی ہے کہ سیدو بابا گجر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ گجر تعلیمی ادارے کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہ میرا خیال ہے ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔

سوات کے ایک سہانے سفر کے بعد پھر وہی شدت کی گرمی اور حبس جو لاہور میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

بونیر: جہاں مغل، سکھ اور انگریز کبھی قدم نہ جما سکے

میرا بونیر سے پہلا تعارف برادرم عبدالسلام کے ذریعے ہوا، جو ہمارے ساتھ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں کام کرتے تھے۔ مجھے کوئی ایسا بہانہ نہ ملا کہ میں بونیر جا سکوں۔ 28 فروری 2023ء کو الخدمت فاؤنڈیشن سوات کے والنٹیئرز کنونشن میں جانے کا موقع ملا۔ میرے ساتھ میرا نواسہ احمد تھا اور ڈرائیور محمد عباس۔ وہاں پر بونیر سے آئے چند دوستوں سے ملاقات ہوئی، جن میں الخدمت کے صدر سید باچا صاحب اور ان کے ساتھ جناب تاجوار خان صاحب بھی تھے۔ان سے یہ معلوم ہوا کہ ہم براستہ بونیر بھی لاہور جا سکتے ہیں۔ یہ جان کر میں نے ان سے حامی بھر لی اور یہ طے ہوا کہ ہم بونیر سے ہوتے ہوئے لاہور جائیں گے۔ اس طرح ہمیں بونیر میں واقع الخدمت اسپتال اور اس کے ساتھ ساتھ زیرِ تعمیر آغوش بھی دیکھنے کا موقع ملے گا۔ خالد وقاص صاحب صدر الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا نے بھی کہا، آپ بونیر ضرور جائیں۔ اس طرح سے پہلی بار مجھے بونیر جانے کا موقع ملا۔

گوگل سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ کوئی تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ اس وقت تک میرے ذہن میں یہی تھا، کہ بونیر ایک شہر ہے، جس میں ہمیں جانا ہے اور وہیں پر اسپتال اور آغوش بھی دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہم صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب مینگورہ سے نکلے اور بونیر کی طرف چل پڑے۔ ہم مین روڈ سے بریکے کے مقام سے بائیں طرف مڑے، تو ہم نے دیکھا کہ ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا پہاڑ تھا اور ہماری سڑک اس کی طرف ہی جا رہی تھی۔ بہت ہی خوبصورت علاقہ نظر آ رہا تھا، چلتے چلتے ہم اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ میرے خیال میں اس کی اونچائی کوئی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ ہو گی۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر برف باری بھی ہوتی ہیں۔ چوٹی پر لکھا ہوا تھا کہ ہم آپ کو بونیر میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم چوٹی سے تھوڑا سا آگے نکلے، تو ہم نے ایک بڑی وادی کو دیکھا۔ وادی کو دیکھنے پر معلوم ہوا، کہ نیچے وادی میں ایک بہت ہی خوبصورت گاؤں واقع ہے۔ یہ منظر ہمیں بہت ہی خوب لگا۔ ہم نے وہاں پر رک کر تصاویر بھی بنوائیں، وہیں پر ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی اور ٹھنڈ میں اضافہ بھی ہو گیا۔ ہم لاہور میں موسم گرما کی آمد کے عادی ہو گئے تھے۔ یہاں پر کافی سردی تھی

اس لیے ہم نے گرم کپڑے بھی نکال لیے۔ وہیں ہاشمی ریسٹورنٹ کے نام سے ایک چھوٹا سا ڈھابہ بھی تھا، وہاں پر دو افراد موجود تھے۔ ہم نے ناشتہ کی بات کی جو وہ سمجھ گئے لیکن یہ میرے لئے حیرانی کی بات تھی، کہ وہ دونوں اردو بولنا نہیں جانتے تھے اور ہم پشتو بولنا نہیں جانتے تھے، شکر ہے کہ پراٹھا، آملیٹ اور چائے جیسے الفاظ کو وہ بھی سمجھتے تھے اور ہم بھی۔

ہم نے اردو میں آملیٹ اور پراٹھا کہا، انھوں نے پشتو میں ''خوا'' کہا جس کا مطلب تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ ہم ایک شیڈ کے نیچے بیٹھ گئے۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ ہمارے چاروں طرف پہاڑ تھے اور نیچے وادی میں آبادی تھی۔ اس دوران جب بارش زیادہ ہونے لگی، تو ہم ان کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ وہاں ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ بہت ہی مزے کے پراٹھے آملیٹ اور چائے ہمیں مہیا کی گئی۔ ہم نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا، کہ ہمیں اس ویرانے میں اتنا بہترین ناشتہ مل گیا ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر ہم وادی میں آ گئے۔ پہاڑی سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب چاروں طرف میدان تھا۔ ہر طرف فصلیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لوگوں نے جانوروں کے لئے چارہ بھی بویا ہوا تھا۔ ہم چلتے گئے اور گوگل ہمیں یہ بتا رہا تھا کہ بونیر ابھی کافی دور ہے۔ وہاں پر ہمارے موبائل کے سگنل بھی ختم ہو گئے، جس کی وجہ سے ہم تاجوار صاحب سے رابطہ نہ کر سکے۔ ہم نے ایک جگہ رک کر ایک صاحب سے پوچھا کہ بونیر کہاں ہے؟ تو اس کا جواب سن کر ہمیں حیرانی ہوئی، اس نے کہا یہ سب بونیر ہی ہے۔

میرے خیال میں تو یہ تھا، کہ بونیر کسی خاص جگہ کا نام ہے۔ پتہ چلا کہ یہ تو اس علاقے کا نام ہے۔ اس کا صدر مقام ڈاگر ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے، جیسے سوات ایک علاقے کا نام ہے اور اس کا صدر مقام مینگورہ ہے۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا تو ہمیں پریشانی ہوئی۔ اللہ کا شکر ہوا، کہ اس وقت ہمارے موبائل کے سگنل آنے شروع ہو گئے۔ ہم نے تاجوار صاحب سے رابطہ قائم کیا، تو انھوں نے بتایا کہ آپ چند کلومیٹر آگے جا چکے ہیں۔ اس پر ہم نے ایک مقامی فرد سے ان کی بات کروائی، جس سے ہمیں رہنمائی ملی اور اس طرح تاجوار صاحب سے ہمارا رابطہ ہوا اور ان کے ساتھ چل کر ایک پہاڑوں کے دامن میں واقع الخدمت آغوش کی زیرِ تعمیر عمارت تک چلے گئے۔

یہ زمین کا ٹکڑا جو پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے، ڈاکٹر عبدالمالک صاحب کی ملکیت ہے۔ انھوں نے بارہ کنال جگہ آغوش کے لیے دی ہے۔ ان کے ایک کزن نے آغوش کے

لیے راستہ لے کر دیا۔ دو سال سے آغوش کی تعمیر جاری ہے۔پہلی منزل بن چکی ہے جبکہ دوسری منزل کا گرے سٹرکچر مکمل ہو گیا ہے۔ پہلی منزل میں ساٹھ بچے قیام پذیر ہوں گے۔ مقامی دوستوں کا خیال ہے، کہ داخلے کا آغاز اپریل 2023ء میں کر دیا جائے گا۔ یہ عمارت بہت ہی اچھے طریقے سے بنائی گئی ہے۔اسی دوران بونیر الخدمت کے صدر سید باچا صاحب بھی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ پاکستان ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے ایک ریٹائر آفیسر ہیں اور قریب ہی ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ان کے ساتھ کچھ دیر رُک کر ہم سواڑی کی طرف چل پڑے، جہاں الخدمت فاؤنڈیشن بونیر کا اسپتال واقع ہے۔اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کا مرکز بھی موجود ہے۔

دوستوں کا اصرار تھا کہ آپ کھانا کھائیں، لیکن ابھی ہمیں ناشتہ کیے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، اس لیے ہم نے کھانے سے معذرت کی، جو انھیں بہت اچھی نہ لگی لیکن یہ ہماری مجبوری تھی۔ ہم نے کہا کہ چائے پی لیتے ہیں۔ راستے میں رک کر ہم نے چائے پی اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے قصبات سے گزر کر ہم سواڑی پہنچے۔ ہم کچھ دیر یہاں رکے۔ دو بج رہے تھے اور ہمیں لاہور پہنچنا تھا۔ اس طرح ہم دو بجے کے قریب وہاں سے چل پڑے۔

باچا صاحب اور تاجوار صاحب نے کہا کہ ہم آپ کو آگے تک چھوڑ کر آئیں گے۔ وہ کوئی بیس کلومیٹر تک ہمارے ساتھ آئے اور بونیر کی سرحد پر انھوں نے ہمیں چھوڑا، یہ ان کی مہمان نوازی کا ایک خوبصورت انداز تھا۔

بہت ہی خوبصورت بل کھاتی ہوئی سڑک تھی ، بے حد خوبصورت مناظر تھے۔ ہم وادی سے ایک دفعہ پھر پہاڑی کے اوپر آ گئے۔ پہاڑی کے سرے پر جا کر ہم نے نیچے وادی کو دیکھا، ہمیں ایک بہت ہی خوبصورت منظر دیکھنے کو ملا۔ بونیر کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، اس طرح یہ ایک وسیع و عریض وادی کی طرح ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے مردان کا ضلع شروع ہوتا ہے۔ یہ مقام امبیلا پاس کہلاتا ہے۔ اس کا تاریخ میں ایک اہم مقام ہے۔ اس کا ذکر آگلے صفحات میں کیا جائے گا۔

باچا صاحب اور تاجور صاحب کو ہم نے خدا حافظ کہا اور اپنے سفر کا دوبارہ سے آغاز کیا۔

کچھ ہی فاصلے پر ہمیں ایک جگہ پر بہت سے لوگ بیٹھے کھانا کھاتے نظر آئے۔ قریب ہی ایک مسجد بھی تھی۔ ہم نے وہاں پر چائے وغیرہ پی اور نماز پڑھی۔ تازہ دم ہو کر دوبارہ سے

اپنے سفر کا آغاز کیا، اب ہم مردان ضلع میں تھے۔ یہ سفر بھی بہت خوشگوار تھا، بہت ہی دلفریب منظر بھی ہمیں دیکھنے کو مل رہے تھے۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے قصبے بھی آئے اور ہم ان سے گزرتے ہوئے کرنل شیر خان انٹر چینج پر آ گئے اور سوات موٹروے سے گزر کر، ایم ون موٹروے پر سفر شروع کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس سفر میں، میں نے جو دیکھا جو تاریخ سے پڑھا اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا، کہ بونیر کتنا بڑا تاریخی علاقہ ہے اور یہاں پر تاریخ میں کتنے بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔

اس تحریر کے لیے میں https://pakistanalmanac.com نامی ویب سائٹ اور slideshare پر موجود ایک مضمون جسے عمران علی صاحب نے لکھا ہے، جس میں بونیر کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہوئی ہے[1]، سے مدد لی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور جگہوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بونیر ایک سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "جنگل" کیونکہ یہ علاقہ جنگلات سے بھرپور تھا۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بونیر اور اس کے ارد گرد کے وہ علاقے، جن میں چارسدہ، مردان، سوات اور مردان شامل ہیں، سے سکندر اعظم بھی گزرا ہے۔ اس نے یہ علاقے اپنے ایک گورنر کے حوالے کیے اور خود پنجاب کی طرف چلا گیا تھا۔

میرا خیال ہے، کہ جس طرح سوات اور چارسدہ کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ ان علاقوں میں چودہ سو سال قبل مسیح میں بھی لوگ آباد تھے، اسی طرح بونیر جو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک علاقہ ہے اور بہت ہی خوبصورت وادیاں بھی ہیں جہاں پر بے شمار چشمے ہیں، زمین بھی ہموار ہے اور کاشتکاری کے لیے بے حد مفید بھی ہے، میں بھی اُس وقت لوگ ضرور آباد ہوں گے۔ چندر گپت موریا، جو ایک ہندوستانی حکمران تھا، کبھی یہ علاقہ اس کے زیر اثر بھی رہا ہے۔ موریا خاندان کے بعد بدھ مت کو عروج ملا اور بدھ مت کی کئی نشانیاں، جیسے ان کے سٹوپا وغیرہ بھی اس علاقے میں ملتے ہیں۔

---

https://www.slideshare.net/sadkhan1/buner-and-history-of-buner?from_search=0[1]

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، کہ یہاں پندرہویں صدی تک پٹھانوں کی کوئی آبادی نہیں تھی، بلکہ مقامی ہندوستانی لوگ جن میں گجر قابلِ ذکر ہیں وہی اس جگہ پر رہتے تھے، وہ خود ہی اپنے علاقے کے حکمران تھے۔ ان کا زیادہ تر گزارہ کھیتی باڑی اور مویشیوں پر تھا۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب پختون، جن میں یوسف زئی قبیلہ سب سے اہم تھا، پندرہویں صدی کے نصف میں قندھار سے ہندوستان کی طرف آ گیا۔اس وقت پشاور کے علاقے میں سواتی اور دیگر قبائل آباد تھے۔

شروع میں یوسف زئی اور مقامی لوگوں کے درمیان اچھی دوستی رہی، جو بعد میں لڑائیوں کی صورت میں بدل گئی۔ یوسف زئی طاقتور لوگ تھے،انھوں نے سوات کے لوگوں کو یہاں نکال دیا اور وہ خود سوات اور بونیر کے علاقوں پر قابض ہوگئے۔ سواتی لوگ وہاں سے ہجرت کرکے شانگلہ کی طرف چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ انھی یوسف زئی قبائل کی وجہ سے اس علاقے میں اسلام کو عروج ملا۔ یہ وہی دور ہے جب بابر ہندوستان پر حملہ کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اس خوبصورت علاقے کو فتح کرتا ہے۔ اس نے ملک شاہ منصور (یوسف زئی قبیلوں کے سربراہ) کی بیٹی کے ساتھ شادی بھی کی، اور طاقت کا استعمال بھی کیا اور یوں باجوڑ (سوائے جندول)، وادی پنجکوڑہ اور تمام علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی اور مغل مقامی پختونوں پر غالب آ گئے۔ لیکن یہ قبضہ کچھ زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔

بابر کے بیٹے، مغل شہنشاہ ہمایوں کے دور میں مقامی لوگوں نے ایک بار پھر خودمختاری کا اعلان کر دیا، مگر ناکام ہوئے، لیکن یہ سلسلہ رکا نہیں ۔ پھر ایک وقت آیا، جب 1587ء میں، شہنشاہ اکبر نے اپنی فوج ایک انتہائی اہم جرنیل، بیربل کی قیادت میں یہاں بھیجی۔ اس فوج نے کراکر، تورورسک اور ڈگر وغیرہ پر حملہ کیا اور بالآخر مالندرائی میں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی اور اس جنگ میں اکبر کی تمام فوج ماری گئی، جس میں اس کا جرنیل بیربل بھی تھا۔ اس کی موت بھی یہیں ہوئی۔ یوں ایک دفعہ پھر بونیر نے اپنی آزادی و خودمختاری کو محفوظ بنایا۔

پھر ایک وقت آتا ہے، جب سکھوں نے اس وقت کے شمال مغربی سرحدی علاقے جو موجودہ خیبر پختونخوا کے اکثر علاقوں پر مشتمل تھا، پر حکومت کی۔ یہ واقعہ 1818ء سے لے کر 1849ء تک کا ہے۔ اس دور میں بھی سکھ بونیر کے علاقے میں داخل نہیں ہوسکے۔ اس کی وجہ یہاں کے غیور عوام کا سکھوں کے آگے ڈٹ جانا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ بھی ہے، کہ بونیر سیّد احمد بریلوی اور ان کے ساتھیوں کے لیے ایک پناہ گاہ بھی تھا۔

اب وہ وقت آیا، جب سوات اور بونیر کے لوگوں نے مل کر سیتانا کے آزادی پسند سید اکبر شاہ کی قیادت میں سوات ریاست کی بنیاد رکھی، جس میں سوات اور بونیر دونوں شامل تھے۔ انھوں نے 1849-1857ء تک ان علاقوں پر حکومت کی۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ 1857ء میں ان کی موت کے بعد یہاں کے لوگ کسی کو بھی اپنا حاکم یا راجا بنانے پر راضی نہ ہوئے، اور یوں ایک آزاد منش قوم کی طرح رہنے لگے۔ قبیلے کا سربراہ ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ اسی دور میں امبیلا کا واقعہ ہوتا ہے۔

سکھوں کی طاقت کو انگریزوں نے ختم کیا اور 1849ء میں خیبر پختونخوا اور پنجاب کے بیشتر علاقے، انگریزوں کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ انگریز بھی اس علاقے پر قبضہ کرنے کی خاطر 1863ء بریگیڈیئر جنرل نیول باؤلز چیمبرلین کی قیادت میں پشاور سے بونیر کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ انگریزوں نے امبیلا پاس کے راستے وادی میں داخل ہونے کا منصوبہ بنایا، اسی لئے اسے امبیلا مہم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوسری طرف بونیر کے مجاہد بھی تیار تھے۔ انھوں نے برطانوی فوجیوں پر وادی کی جانب سے غیر متوقع حملہ کیا، جس کا انگریزوں کو کوئی اندازہ بھی نہیں تھا۔ یہ جنگ کوئی ایک ماہ تک جاری رہی۔ اس عرصے میں برطانوی فوج کو پشاور سے کمک بھی ملتی رہی اور دوسری طرف مجاہدین بھی ڈٹے رہے۔ انجام کار انگریزوں نے مجبور ہو کر اپنی عزت بچانے کی خاطر، مقامی لوگوں سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کے مطابق انگریزوں کا یہ اصرار کہ سوات ان سے الحاق کرے، نہ مانا گیا اور اس کے بدلے مقامی لوگوں کو اس بات کا پابند کیا گیا، کہ برطانوی علاقے میں چھاپے مارنے سے باز رہیں گے۔

بونیر کی ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مالاکنڈ کی جنگوں میں جو 1897ء میں ہوئیں، سعد اللہ خان کی قیادت میں اہلِ بونیر نے مالاکنڈ میں انگریزوں کو شکست دی۔ یاد رہے کہ اس وقت ایک بڑی تعداد میں سکھ فوجی انگریزوں کی فوج میں شامل تھے۔ اس جنگ کے نتیجے میں کئی انگریز اور سکھ فوجی مارے گئے یا پکڑے گئے اور بڑی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود ضبط کر لیا گیا۔ سعد اللہ خان بھی اپنے 19 مجاہدین سمیت شہید ہو گئے۔ ان کا مقبرہ مالاکنڈ میں واقع ہے۔ اب بھی لوگ انھیں بڑے اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔

انگریز اپنی شکست نہیں بھولتے۔۔۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے!

اس لیے ایک دفعہ پھر انگریزوں نے 1897ء میں سر بندن بلڈ کی کمان میں بونیر پر تین اطراف سے حملہ کیا: امبیلا پاس، پیر سائی پاس اور تنگی پاس کی سمتوں سے۔ اس جنگ میں انگریزوں کو جزوی کامیابی تو ضرور ہوئی لیکن پھر بھی انگریز اس علاقے میں برطانوی حکومت کی رٹ قائم کرنے میں ناکام رہے۔ یاد رہے کہ اس دور میں ریاست کا کوئی باقاعدہ سربراہ نہیں تھا۔

بعد میں جب 1878ء میں سوات کے آخوند سیدو بابا کی وفات ہوتی ہے، تو اس کے بعد 1915ء تک ریاست کا وجود نہیں ملتا۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب سید عبدالجبار شاہ اس کے سربراہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر 1917ء میں میاں گل عبدلودود باقاعدہ پہلے والی بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ ریاست برطانوی ہندوستان کی ایک حلیف ریاست بھی بن گئی اور یوں ان ساڑھے پانچ سو کے قریب ریاستوں میں شامل ہو گئی جو انگریزوں کی وفادار ریاستیں تھیں۔ اس کا قدرے تفصیل سے ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔

کچھ لوگ آزادی کی خاطر جان سے گئے اور کچھ لوگ اپنی ذات کی خاطر عزت و احترام سے گئے۔۔۔

انگریزوں سے دوستی مجبوری تھی یا اپنی ذات کے لیے لالچ۔۔۔ اس کا فیصلہ تاریخ ہی کر سکتی ہے۔ ہندوستان میں کئی ایسی ریاستیں تھیں جنھوں نے کمزور ہونے کے باوجود انگریزوں کا مقابلہ کیا، جان بھی دی، ریاست سے بھی ہاتھ دھوئے۔۔ لیکن غلامی قبول نہیں کی۔۔۔ مثال کے طور پر ریاست میسور اور رانی جھانسی کی ریاست۔۔۔

یہ اپنے اپنے ظرف کے فیصلے تھے۔۔۔ جنگ یا تخت۔۔۔

پھر وہ برا وقت بھی آیا جب کچھ لوگوں نے سوات سمیت بونیر پر قبضہ کر لیا۔ یہ 2007ء کی بات ہے۔ ایک تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔ اس کی تفصیل بھی بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ فوج اور قابض طالبان کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔۔۔ سب سے زیادہ نقصان اہلِ سوات اور بونیر کا ہوا۔۔۔

بونیر کے چند خوبصورت ترین مقامات میں سے کراکر، ڈگر، ماہی گیری کا ریزورٹ، امبیلا پاس، ایلم گھر پہاڑ، پیر بابا گاؤں کا مزار، پیر یانو ڈھنڈ مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کئی خوبصورت مقامات ہیں جو آپ کے منتظر ہیں۔

پشاور سے طورخم

مجھے پہلی مرتبہ 2008ء میں کابل جانے کا موقع ملا۔ کابل جانے کے لیے آپ کو طورخم بارڈر سے گزرنا پڑتا ہے۔ طورخم، افغانستان اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی شہر ہے، اس مقام تک پہنچنے کے لیے حیات آباد، جمرود، باب خیبر اور لنڈی کوتل سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ پشاور سے طورخم تک کا فاصلہ ستر کلومیٹر ہے۔ پشاور سے طورخم تک کے سفر کی ایک مختصر رُوداد پیش خدمت ہے (میں یہ تحریر افغانستان کے سفر میں بھی شامل کر چکا ہوں۔ یہاں اس لیے شامل کی ہے کہ یہ علاقے خیبر پختونخوا میں شامل ہیں)۔

حیات آباد کارخانو مارکیٹ

حیات آباد پشاور کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا نام حیات محمد خان شیر پاؤ کے نام پر رکھا گیا، جو صوبہ سرحد موجودہ خیبر پختونخوا کے گورنر بھی تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں وزیر داخلہ کے منصب پر بھی فائز رہے۔ وہ سوشلسٹ نظریات کے حامی تھے۔ بائیں بازو کے نظریات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دنیا بھر میں جانے جاتے تھے۔ حیات محمد خان شیر پاؤ، 1975ء میں ایک بم دھماکے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ لاہور میں واقع گلبرگ اور کینٹ کے درمیان ریلوے پل کا نام شیر پاؤ بھی انھی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

حیات آباد ایک پوش ایریا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا انڈسٹریل ایریا بھی موجود ہے۔ افغانستان جہاد کے دوران جو بہت بڑے بڑے لوگ جہاد میں حصہ لینے کے لیے پاکستان آئے تھے، ان کی اکثریت حیات آباد میں ہی رہتی تھی۔ میں بھی جب افغان جہاد میں حصہ لینے کے لیے پشاور آیا تھا، تو اس وقت حیات آباد میں ہی کسی گھر میں ٹھہرا تھا، جہاں ہمارے علاوہ کئی اور مجاہد بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

حیات آباد کے ساتھ ہی کارخانو بازار ہے، یہ اپنی نوعیت کی ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہاں پر بے شمار پلازے ہیں اور پوری دنیا سے سامان، خاص طور پر گھریلو سامان یہاں لا کر بیچا جاتا ہے۔ ایک دور میں لاہور سے جو بھی شخص پشاور آتا، تو اس سے یہی فرمائش کی جاتی تھی،

کہ باڑہ مارکیٹ یا کارخانوں بازار سے گھریلو سامان ضرور خرید کر لائیں۔ میں نے ذاتی طور پر بھی کئی مرتبہ باڑہ مارکیٹ اور کارخانو بازار سے سامان خریدا ہے۔

آپ کے لیے یہ بات باعث حیرت ہوگی، کہ لوگ جہیز کا پورا سامان یہاں سے خرید کر لے جاتے تھے۔ مال دکان میں ہو تو کسٹم والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا، لیکن جیسے ہی آپ سامان لے کر سڑک پر آتے ہیں تو کسٹم کا محکمہ آپ سے مختلف سوال وجواب شروع کر دیتا تھا۔ اس سب کے باوجود یہ کام بہت تسلسل سے ہو رہا ہے۔ حال ہی میں، میں پشاور گیا تو اس مارکیٹ کو دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ اس بار مجھے محسوس ہوا، کہ اب یہ مارکیٹ اتنی بارونق نہیں، لیکن پھر بھی بے شمار دکانیں موجود تھی اور گاہک بھی بڑی تعداد میں تھے۔ حیات آباد سے گزرتے ہوئے، مجھے روس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے بے شمار مجاہد یاد آئے، اُن پر قاتلانہ حملے بھی اسی علاقے میں ہوتے تھے۔

جمرود: پاکستان کا آخری سرحدی شہر

حیات آباد کے فوراً بعد جمرود کا علاقہ آتا ہے۔ جمرود پاکستان کا آخری سرحدی شہر ہے، اس کے بعد خیبر ایجنسی کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جمرود کے بازار میں بے حد رونق تھی۔ روہیلہ صاحب نے بتایا کہ ان میں سے اکثریت ان افغانیوں کی ہے، جو افغانستان پر امریکی حملہ کی وجہ سے اس علاقہ میں آئے ہوئے ہیں۔ افغانستان سے آنے والے لوگوں کی وضع قطع پشاور کے رہائشیوں سے مختلف ہوتی ہے۔ روہیلہ صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کی پشتو اور ہماری پشتو میں بھی بہت فرق ہے، جس سے انھیں پہچاننے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

جب ہم جمرود کے بازار سے گزر رہے تھے، تو میں نے تصوّر کیا کہ سکھ اس علاقہ میں قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ پہلے پنجابی تھے جنھوں نے پنجاب سے جمرود جا کر درانی قبائل اور انگریزوں کے ساتھ لڑائیاں لڑیں اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس سے پہلے جے پالا (جسے جے پال بھی لکھتے ہیں) نے 964 سے 1001 عیسوی تک ہندو شاہی خاندان کے حکمران کی حیثیت سے مغرب میں لغمان، مشرق میں کشمیر اور سرہند سے ملتان تک کے علاقوں پر راج کیا تھا۔ اس کا تعلق پنجاب سے تھا اور وہ ایک جاٹ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے غزنی پر بھی حملہ کیا تھا اس وقت غزنی پر سبکتگین کی حکومت تھی۔ اس جنگ کے نتیجے میں جے پالا کو امن معاہدہ کرنا پڑا اور اس نے ایک بھاری تاوان بھی ادا کیا۔ اس نے اپنے کچھ قلعے بھی سبکتگین کو دینے کا وعدہ کیا۔ پشاور پہنچ کر اس نے معاہدوں کی پاسداری سے انکار

کر دیا۔ یہی وہ وجہ تھی جس کی بناء پر محمود نے تخت پر بیٹھتے ہی پشاور پر حملہ کیا۔ اس سے پہلے کاشان، موریہ کے علاوہ بھی کئی ہندوستانی لوگوں نے پشاور اور کابل پر حکمرانی کی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو، اس لیے میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔ جو میں سمجھتا ہوں وہ میں نے بیان کر دیا ہے۔

جمرود سے گزرتے ہوئے، میرے ذہن میں بے شمار تاریخی واقعات تازہ ہونے لگے۔ جن میں سب سے اہم سکھوں کی اس علاقہ میں آمد تھی۔ ماضی قریب میں سکھ اور انگریز، دونوں نے افغانوں کو شکست دی۔ ابھی بھی صرف کابل میں ایک ہزار کے قریب سکھ خاندان بستے ہیں۔ یہ سکھ اٹھارویں صدی کے وسط میں کابل میں داخل ہوئے تھے۔

جمرود، حالیہ روس افغان جنگ کے دنوں میں بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ نہ صرف خیبر ایجنسی کا دروازہ کہلاتا ہے، بلکہ سلسلہ کوہ ہندوکش کا ایک حصہ بھی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ بھی ہے، کہ یہ علاقہ بذریعہ ٹرین پشاور سے بھی منسلک ہے۔ یہ وسطی اور جنوبی ایشیاء کے درمیان ایک معروف گزرگاہ بھی ہے۔ یہ وہ صدیوں پرانا راستہ ہے، جہاں سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ہر جنگجو کا گزر ہوا ہے۔

سطح سمندر سے پندرہ سو فٹ بلند یہ خطہ پشاور سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں پر سکھوں اور درانی حکمرانوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی، جس میں سکھوں کو فتح حاصل ہوئی۔

جمرود قلعہ 1836ء میں رنجیت سنگھ کے ایک جرنیل ہری سنگھ نلوا نے تعمیر کروایا تھا۔ انگریزوں نے بھی جمرود قلعہ کو اپنی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا۔ قلعہ جمرود دس فٹ چوڑی فصیلوں اور کئی عمارتوں پر مشتمل ہے۔ یہ قلعہ انگریزوں کا بیس کیمپ بھی تھا جہاں سے وہ مختلف علاقوں میں اپنی فوجوں کو بھیجتے تھے۔ وادی تیرہ میں پختونوں کے ساتھ ہونے والی مختلف لڑائیوں کے دوران یہ قلعہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ آپ اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں، کہ انگریزوں نے خیبر رائفل کا ہیڈ کوارٹر بھی جمرود میں بنایا تھا۔ قلعہ کی عمارت اب بھی باقی ہے اور اس پر اس وقت پاکستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اب پاکستانی سیکورٹی فورسز اس جگہ کو استعمال میں لا رہی ہیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا ہے، لیکن دور سے۔

اس قلعہ کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ مشہور ہے، کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے بیٹے کی شادی کی تقریب لاہور میں منعقد ہونا تھی جس میں ہری سنگھ نلوا نے اپنی نمائندگی کے طور پر

ساری فوج کو شادی میں شرکت کے لیے لاہور بھیج دیا۔ یہ بات کسی طرح انگریزوں اور حریت پسند افغانوں کو پتہ چل گئی۔ فوج کے پنجاب پہنچتے ہی انگریزوں اور افغانوں نے مل کر حملہ کر دیا اور ہری سنگھ نلوا کو ذلت آمیز شکست ہوئی وہ اپنے وزراء سمیت مارا گیا۔

مارچ 2023ء میں ایک دفعہ پھر یہاں سے گزر ہوا۔ ابھی تک اس کی شان باقی ہے۔ دور سے ہی دیکھنے کا موقع ملا۔ اندر سے بھی دیکھنے کی خواہش موجود ہے۔ اگر خالد وقاص صاحب نے کوئی بندوبست کر دیا۔

جمرود قلعہ: افغانستان اور برطانوی ہندوستان کی دوستی کا نقطۂ آغاز

رنجیت سنگھ کی موت پر، اس کی کئی بیویاں اپنی خواتین ملازماؤں کے ساتھ ستی ہو گئی تھیں (خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل جانے کو ستی کہتے ہیں)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ ستی کی رسم جہاں ہندوؤں میں عام تھی، اسی طرح یہ رسم سکھوں میں بھی تھی۔ ستی کے وقت رنجیت سنگھ کے بیٹے، دلیپ کی والدہ، مائی جنداں کو اس کے والد نے ستی ہونے سے روک دیا۔ دلیپ کمار اس وقت ایک بچہ تھا۔ اس لیے ریاست کے تمام تر معاملات مائی جنداں ہی دیکھتی تھی۔ کسی وجہ سے سکھ فوج مائی جنداں سے ناراض تھی۔ ایسی صورت حال میں، مائی جنداں نے انگریزوں کو مدد کے لیے بلوایا۔ اب ایک طرف سکھ دربار تھا، جسے انگریزوں کی حمایت حاصل تھی اور دوسری طرف سکھ فوج تھی جسے، سکھ خالصہ یا خالصہ دل بھی کہتے تھے۔

اس واقعے کے بعد انگریزوں نے سکھ خالصہ کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ سکھ خالصہ کو کسی بھی طرح کی حکومتی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اس لیے کچھ ہی عرصے میں، انگریزوں نے سکھوں کی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ پنجاب کے ساتھ ساتھ پختون علاقے بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مائی جنداں کو پنجاب بدر کر دیا اور اس کے بیٹے کو برطانیہ بھجوا دیا۔

یہ سب کچھ بتانے کا مقصد یہ ہے، کہ یہ وہی دور ہے جب انگریزوں نے پشاور سے بھی سکھوں کا صفایا کیا۔ اس میں افغان حکمرانوں کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ سب جان کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کی اس علاقے میں آمد کے ذمہ دار خود پختون ہیں، جن کی سربراہی اس وقت کے افغان حکمران کر رہے تھے۔

میں مدت سے اس بات کی تلاش میں تھا، کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا کہ انگریزوں نے اتنی آسانی سے پشاور پر کیسے قبضہ کر لیا؟ اس بارے مجھے ملٹری ہسٹری نام کی ایک ویب سے

کافی معلومات ملیں۔ جس سے مجھے اس معاملے کو سمجھنے میں بے حد آسانی ہوئی[1]۔ اب میں اصل کہانی کی طرف آتا ہوں، جس میں جمرود قلعے کا ایک اہم کردار ہے۔

یہ واقعہ 1837ء میں پیش آیا، جب پنجاب سے آکر سکھ اس علاقے میں واقع جمرود پر قابض تھے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ سکھ پشاور کیوں آئے؟ اس کا جواب بھی اسی مضمون میں موجود ہے۔ اس کے مطابق سکھوں کا پشاور پر حملہ یہاں کے ایک افغان سردار، شیر شاہ کے دور میں اس علاقے کے لوگوں پر بے پناہ مظالم کا نتیجہ تھی۔

کیا اس وجہ سے مقامی لوگوں نے سکھوں کو پشاور آنے کی دعوت دی تھی یا سکھوں نے اسے موقع غنیمت جانا تھا؟ میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔ یاد رہے کہ سکھ اس سے پہلے نوشہرہ تک اپنی ریاست قائم کر چکے تھے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ رنجیت سنگھ کے دربار میں مسلمان وزیر بھی تھے اور اس کی فوج میں یورپین جرنیلوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلمان کمانڈر اور سپاہی بھی شامل تھے۔ پنجاب کے لوگ بھی شیر شاہ کے دور میں ہونے والے اپنے پر ڈھائے گئے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ میرا خیال ہے کہ کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ اس کی میرے پاس ایک ہی دلیل ہے، کہ سکھوں کو پشاور پر قبضے کرنے کے دوران مزاحمت صرف افغانیوں کی طرف سے تھی۔ اس لیے وہ آسانی سے پشاور کے بعد جمرود تک آگئے۔ اس کے بعد افغانستان کی طرف ان کی پیش قدمی رک گئی۔ اس کی وجہ صرف افغان تھے۔

یہاں تاریخ میں ہونے والے اہم واقعات کا آغاز ہوتا ہے، جو رنجیت سنگھ کے بیٹے کی شادی سے شروع ہوتا ہے۔

ہوتا کچھ یوں ہے کہ 1837ء کے شروع میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے سکھ فوج کا ایک بڑا حصہ لاہور چلا جاتا ہے۔ اسی دوران مسٹر فاسٹ، جو کبھی برٹش حکومت کے ساتھ کام کرتا تھا، کابل جاتے یہاں سے گزر ہوتا ہے اور اس کی ملاقات دوست محمد خان کے بیٹے، محمد اکبر خان سے ہوتی ہے۔ یہ خبر اکبر خان تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا، کہ جمرود کے قلعہ میں بہت کم لوگ ہیں، تو اس نے قلعہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ قلعہ پر قبضہ کی جنگ افغانوں اور سکھوں کے درمیان 30 اپریل 1837ء کو لڑی گئی۔ دونوں اطراف سے بھاری جانی اور مالی نقصان تو ضرور ہوا، لیکن افغان قلعہ پر قبضہ نہ کر سکے۔

---

https://military-history.fandom.com/wiki/Jamrud_Fort[1]

اس طرح جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہری سنگھ نلوا، جو اس وقت یہاں کا کمانڈر تھا، نے مہاراجا رنجیت سنگھ سے مدد کی اپیل کی، لیکن کسی وجہ سے لاہور سے کوئی مدد نہ ملی۔ پھر ایک دن جنگ کے دوران ہری سنگھ نلوا سمیت بے شمار سکھ مارے گئے۔

اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا، کہ افغان پشاور پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کرتے۔ یاد رہے کہ اس وقت تک پشاور پر سکھوں کا ہی قبضہ تھا۔ اب افغانوں نے سکھوں سے خود لڑنے کی بجائے، ہندوستان میں نئے برطانوی گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ سے سکھوں کے خلاف مدد طلب کی۔ اس طرح دوست محمد ہی وہ شخص ہے جس نے سکھوں کے خوف سے، افغانستان میں برطانوی افواج کو آنے کی دعوت دی۔

یہ تھا وہ وقت جب انگریزوں کو افغان حکمرانوں نے بلاوا بھیجا، دعوت دینے والا، دوست محمد والیِ افغانستان تھا۔

اس کے بعد جب شاہ شجاع، جو دوست محمد سے پہلے کابل کا حاکم تھا، نے کابل کی گدی دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر خود ہندوستان کا سفر کیا۔ اس وقت پنجاب پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ اس سے 1813ء میں رنجیت سنگھ کو کوہ نور ہیرا پیش کرکے اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہا۔ رنجیت سنگھ بھی تیار تھا لیکن وہ اس کے لیے مطلوبہ فوج اکٹھی نہ کر سکا۔ البتہ اسنے پشاور کا رخ ضرور کر لیا اور جمرود تک آن پہنچا۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے سید محمد لطیف کی کتاب پنجاب بے حد مفید ہے۔

اس کے برعکس، سکھ انسائیکلوپیڈیا، ایک مختلف بات بیان کرتا ہے[1]۔ اس کے مطابق ایک سہ فریقی معاہدہ (26 جون، 1838) سکھوں، انگریزوں اور افغانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی انگریز پہلی اینگلو افغان وار کا آغاز کرتے ہیں۔ اس معاہدے کا ایک مختصر ذکر آپ کے لیے باعثِ دلچسپی ہو گا، کہ کس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لیے شاہ شجاع نے، انگریزوں کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔

یہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کی بات ہے، جب انگریزوں کو پتہ چلا، کہ روس، ایران اور افغانستان میں دراندازی کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان پر بھی حملہ کرنے کا ارادہ

---

https://www.thesikhencyclopedia.com/historical-events-in-sikh-history/the-british-and-sikhs-1849-1947/tripartite-treaty/[1]

رکھتا ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کے کسی روسی منصوبے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ یہ انگریزوں کا پشاور اور کابل پر حملہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ روس کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ روس اور ہندوستان کے درمیان ایک طویل فاصلہ بھی تھا اور ہندوستان، افغانستان یا ایران کی طرح، ایک چھوٹا ملک نہیں تھا۔ میں اسی بنیاد پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں، کہ جب روس نے 1979ء کو افغانستان پر حملہ کیا، تو پھر اسی ڈر سے کہ وہ گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا ہے، پاکستان کو مجبور کیا گیا کہ وہ اسے افغانستان میں ہی روکے۔ پھر ایسا ہی کیا گیا۔ اُس دور میں، انگریز یہ کام دوست محمد سے لینا چاہتے تھے، جواب کی بار انھوں نے جنرل ضیاء سے لیا۔ دوست محمد نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا، جب کہ جنرل ضیاء نے سرِ تسلیم خم کیا۔ دوست محمد کو انکار کی سزا بھی دی گئی۔ اسے نکال کر شاہ شجاع کو کابل تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کے لیے انگریزوں کو کئی ہزار افراد پر مشتمل فوج کا خاتمہ بھی کروانا پڑا۔ یہ ایک الگ سے داستان ہے، جس کا میں نے تفصیل سے ذکر اپنے افغانستان کے سفر نامے میں کیا ہے۔

اب ہم سہ فریقی معاہدے کی طرف دوبارہ آتے ہیں۔

روسی خطرے کو بھانپتے ہوئے، ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے کیپٹن الیگزینڈر برنس کو کابل بھیجا، تاکہ وہ اس وقت کے افغانستان کے امیر دوست محمد کو اس بات پر قائل کرے کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دے، تاکہ اگر روس ہندوستان پر حملہ کرے تو اسے افغانستان میں ہی روکا جاسکے۔

دوست محمد نے اس تعاون کے بدلے، اپنا کھویا ہوا پشاور واپس لینے کی شرط عائد کی۔ اس وقت پشاور پر سکھ قابض تھے۔ ایسا صرف اسی وقت ممکن تھا، جب انگریز، سکھوں سے جنگ کرتے اور پشاور پر قبضہ کرتے۔ اب انگریزوں کے سامنے دو ہی راستے تھے، دوست محمد سے دوستی یا مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ساتھ۔ انگریز اس سے پہلے ہی رنجیت سنگھ کے ساتھ کئی معاہدے کر چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں نے مہاراجہ کا انتخاب کیا۔ اس کی ایک وجہ رنجیت سنگھ کی طاقت ور فوج کے ساتھ ساتھ رنجیت سنگھ کی ذات بھی تھی۔ اس پر انھوں نے دوست محمد کو کابل سے بھگانے کے لیے افغانستان کے سابق امیر، شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بٹھانے میں اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرے خیال میں یہ حملہ، یہ شاہ شجاع کی مدد کے لیے نہیں تھا، بلکہ امیر دوست محمد، جس کا رجحان، روس کی طرف تھا، کی حکومت کو ختم کرنا تھا۔ اس کام کے لیے انھیں شاہ شجاع بھی

مل گیا، جس نے اپنی فوج کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی اور یوں ایک دن وہ کابل کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

پہلی اینگلو افغان جنگ سے پہلے، طویل مذاکرات ہوئے۔ اس کے بعد، 26 جون 1838ء کو رنجیت سنگھ، شاہ شجاع اور انگریزوں کے درمیان سہ فریقی معاہدے پر دستخط کیے جاتے ہیں۔

اس معاہدے کی چند اہم شرائط تھیں۔

پہلی یہ کہ، شاہ شجاع کو دوبارہ تخت پر بٹھایا جائے گا، دوسری یہ کہ، سکھ فوجیں شاہ شجاع کو فوج فراہم کریں گی، تیسری یہ کہ، شاہ شجاع خارجہ پالیسی کا تعین انگریزوں کے مشورے سے کریں گے، چوتھی یہ کہ، سندھ کے دائیں کنارے پر رنجیت سنگھ کے دعوے کو شاہ شجاع نے تسلیم کیا، یعنی ایک بڑا علاقہ رنجیت سنگھ کو دے دیا۔ پانچویں شرط یہ تھی کہ شاہ شجاع سندھ پر اپنے حق سے دستبردار ہوں گے۔

اس معاہدے کے نتیجے میں کشمیر، اٹک، ہزارہ، پشاور، خیبر، بنوں، ٹانک، کالا باغ، دیگر وزیری اضلاع، ڈیرہ جات اور ملتان کے امیر اور زرخیز صوبے اور سابقہ افغان املاک، پر سکھ سلطنت کے کنٹرول میں آ گئے۔ یہ سب کچھ بغیر کسی جنگ کے ہوا۔ (یہ ایک الگ داستان ہے کہ سکھوں کو ملتان پر قبضے کے لیے ایک سخت جنگ لڑنا پڑی) اس کے لیے رنجیت سنگھ کو صرف شاہ شجاع کو فوج مہیا کرنا تھی۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ایک طرح سے شاہ شجاع سندھ کے حوالے سے اپنے تمام دعووں سے دستبردار ہو گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ افغانستان کے خارجہ تعلقات متعلق مشترکہ اینگلو سکھ اتھارٹی ہی فیصلہ کرے گی۔ اس سب کے بدلے رنجیت سنگھ، شاہ شجاع کو دو لاکھ روپے کی سالانہ ادائیگی کرنے کا پابند ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ، شاہ کی امداد کے لیے کم از کم پانچ ہزار جوانوں کی ایک فوج بھی مہیا کرے گا۔

اس معاہدے کے بعد انگریز شاہ شجاع کی مدد کی خاطر 1839ء میں کابل تک گئے۔ اسے پہلی افغان جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد شاہ شجاع کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کا ذکر میں نے اپنے افغانستان کے سفر نامے میں تفصیل سے کیا ہے۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دوست محمد اور شاہ شجاع دونوں ہی اس بات کے ذمہ دار ہیں جس کے نتیجے میں انگریزوں کو افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع ملا۔

اس کے بعد گریٹ گیم کا دور شروع ہوتا ہے۔ انگریز کابل گئے لیکن براستہ پنجاب نہیں کیونکہ پنجاب پر سکھ حاکم تھے۔ بلکہ براستہ سندھ اور بلوچستان جہاں ابھی تک مقامی لوگوں کی حکومت تھی۔ انھوں نے ہی انگریز فوج کو ایک محفوظ راستہ بھی دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ شاہ شجاع کا قندھار میں ابھی اثر و رسوخ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کابل پر حملے کے لیے قندھار سے ایک بڑی تعداد میں اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر کابل پر حملہ کرے گا۔

درۂ خیبر اور بابِ خیبر

پاکستان کے مختلف صوبوں کی نمائندگی ظاہر کرنے کے لیے، اکثر اوقات کسی عمارت کی تصویر کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس طرح پنجاب کو ظاہر کرنے کے لیے مینارِ پاکستان، اسی طرح موجودہ خیبر پختونخوا کو ظاہر کرنے کے لیے باب خیبر کی تصویر لگائی جاتی ہے۔ باب خیبر، جمرود میں واقع ہے، اس کے قریب ہی قلعہ جمرود بھی ہے۔ مجھے اسے دیکھنے کا سب سے زیادہ شوق تھا اور اس دن پہلی مرتبہ اس میں سے گزر کر آگے جانے کا موقع مل رہا تھا۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی۔

میں نے اس کا اظہار روہیلہ صاحب سے کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ واقعی ایک تاریخی مقام ہے۔ یہ 1964ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ اتنا خوبصورت ہے کہ اس کی تصویر کو خیبر پختونخوا کے لوگوں نے اپنی نشانی کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ بہت سے نوٹوں پر بھی اس کی تصویر بھی چھپی ہوئی ہے۔ اتنی مشہور جگہ کے پاس جائیں تو یقیناً آپ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔

باب خیبر، درہ خیبر کے دہانے پر واقع ہے یہ وہ راستہ ہے جو افغانستان سے آنے کے لیے موضوع ترین سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے افغانستان کی طرف سے آنے والے تمام لوگ، خواہ وہ جنگ کے لیے آئے، یا علم کی روشنی پھیلانے کے لیے، ہندوستان میں آئے، سب اسی راہ سے گزرے۔ اس راستہ کی اہمیت کی وجہ سے یہاں پر بے شمار لڑائیاں بھی ہوئیں۔

رنجیت سنگھ کے جرنیل ہری سنگھ نلوا نے 1834ء میں اس علاقہ کو فتح کیا تھا، بعد میں 1837ء میں وزیر اکبر خان نے اس علاقے پر اپنا قبضہ کرلیا۔ درہ خیبر کے شمال میں ملا گوری قبیلہ رہتا ہے۔ اس کے جنوب میں وادی تیرا ہے، جس میں زیادہ تر آفریدی آباد ہیں۔ خیبر پاس میں بھی بڑی تعداد میں آفریدی لوگوں کی آبادی ہے۔ اس علاقہ کی معاشی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ ہی شنواری اور آفریدی قبائل میں لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ علاقہ افغانستان میں امریکہ کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے لوگوں کی آماجگاہ ہے۔

تاریخی واقعات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہاں امن ناپید ہے۔ کبھی سکندر آیا، کبھی مغل آئے، کبھی غزنوی آئے، کبھی غوری آئے تو کبھی سوری یہاں سے گزرے۔ جانے کون کون آیا اور جو بھی آیا، وہ تباہی پھیلا کر ہی گیا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب قدرے امن تھا اور ہم بخیر وعافیت اس طویل درہ سے گزر گئےاور ہم اپنی اگلی منزل یعنی طورخم پہنچ گئے۔ جہاں سے ہمیں افغانستان میں داخل ہونا تھا۔ اب ہم افغانستان میں داخل ہو رہے تھے، جہاں امن نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ بہر حال جانا تو تھااس لیے دل میں خوف اور دعا کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میرے گھر میں کسی کو پتہ بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں۔

ایسے پُر خطر سفر، تو پھر ایسے ہی کیے جاتے ہیں!

حال ہی میں مجھے ایک بار پھر باب خیبر دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں دیوار پر اس علاقے کی تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں ایک دلچسپ فقرہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "یہاں کے لوگ جنگ وجدل کے بے حد دلدادہ تھے۔ پھر کوئی نیک بخت آیا اور اس نے آکر لوگوں کو انسانی جان کی اہمیت سے آگاہ کیا۔"

لنڈی کوتل

جب ہم جمرود سے گزر رہے تھے، تو اس وقت دن کے کوئی گیارہ بج رہے تھے۔ میرا اس علاقے میں یہ دوسرا دورہ تھا۔ میں پہلی مرتبہ میں اپنے دوست ارشاد احمد گوندل کے ساتھ اس علاقہ میں اس وقت آیا تھا، جب مجاہدین نے روس کو شکست دی تھی۔ ہم نے علاقہ کی گہما گہمی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ علاقہ معاشی طور پر بہت اہم ہے۔ یاد رہے کہ جمرود کے بعد طورخم تک کا علاقہ فاٹا کا علاقہ کہلاتا تھا۔ یہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان واقع وہ علاقہ ہے جو ڈیورنڈ لائن کی وجہ سے بنا ہے۔ یہ ایک طرح سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک بفر زون کی حیثیت رکھتا ہے۔حال ہی میں فاٹا کے ان تمام علاقوں کو باقاعدہ خیبر پختونخوا میں ضم کر دیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ یہاں پر الیکشن ہوئے ہیں جس میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب کیے گئے ہیں۔

جمرود سے لنڈی کوتل تک کوئی اہم شہر نہیں ہے۔ لنڈی کوتل پشاور سے 45 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ سڑک کے ساتھ کہیں کہیں، انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی ریل کی پٹڑی نظر آرہی تھی، جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ ماضی میں پشاور سے لنڈی کوتل تک ایک ٹرین

چلتی تھی، جس میں ملکی اور غیر ملکی سیاح آتے تھے۔ اس ریل کی پٹڑی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ کس طرح آج سے ایک سو سال قبل یہ پٹڑی ان پہاڑوں پر بچھائی گئی اور یہاں ایک چھوٹے گیج کی ٹرین چلائی گئی تھی۔ اس پٹڑی کو بنانا یقیناً بہت مشکل کام تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ مشکل اسے چلانا تھا، جو ہم چلا نہ سکے۔ ایک سیلاب میں اس پٹری کو بہت نقصان پہنچا جس کی وجہ سے ٹرین کو اس پر چلانا ممکن نہ رہا اور کوئی اسی سال تک یہ سلسلہ چلتے رہنے کے بعد بند کر دیا گیا ہے۔

لنڈی کوتل کا اسٹیشن اپنی نوعیت کا ایک بہت ہی خوبصورت ریلوے اسٹیشن ہے۔ لنڈی کوتل شہر تھوڑا فاصلے پر ہے۔ ایک سڑک اس کے قریب سے گزرتی ہے۔ یہ شہر افغانستان کی سرحد سے تقریباً پانچ کلومیٹر پہلے ہے۔ لنڈی کوتل سطح سمندر سے تین ہزار فٹ سے زائد بلندی پر واقع ہے۔ اس علاقہ میں آفریدی قبائل اور انگریزوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں، کبھی انگریز جیتے تو کبھی آفریدی۔ انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں یہ علاقہ میدانِ جنگ بنا رہا۔ بالآخر فتح انگریزوں کی ہوئی۔ اس خطہ میں خیبر رائفلز نے اہم کردار ادا کیا جس میں اکثریت اسی علاقہ کے پختونوں کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی فوج میں سکھوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔

وادی تیراہ میں ایک بہت اہم معرکہ ہوا جس میں صرف اکیس سکھوں پر مقامی لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں حملہ کیا۔ سکھوں نے بھی ہتھیار پھینکنے کی بجائے مقابلے کا فیصلہ کیا۔ انگریز ان سکھوں کی مدد کو نہ پہنچ سکے اور تمام سکھ مارے گئے۔ اس واقعہ پر تین مختلف فلمیں بنائی گئیں اور انگریزوں نے بھی ان سکھوں کو اعلیٰ فوجی اعزازات سے نوازا، ہندوستان کے علاقہ، مشرقی پنجاب میں اب بھی ان سکھوں کے نام پر کئی گردوارے ہیں۔

جمرود سے لنڈی کوتل تک کا علاقہ بہت زیادہ سرسبز نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ ہر گاؤں کے باہر بڑی تعداد میں لوگ فارغ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے رؤف روہیلہ صاحب سے پوچھا، یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ امن وامان کی خراب صورت حال کی وجہ سے معاشی سرگرمیاں بند ہیں اور لوگوں کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے۔ یہ اس علاقہ کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی۔

یاد رہے لنڈی کوتل، انگریزوں کی آخری چوکی تھا، اس کے بعد ان کی حکومت نہیں تھی۔ افغانستان کے لوگ اپنے علاقے میں خود مختار تھے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کی طرح غلام

نہیں تھے۔ افغانستان کے لوگوں نے انگریزوں کو اس سے آگے نہیں آنے دیا اور اگر وہ کبھی آئے تو پھر انھیں جانے نہیں دیا۔ یہ ایک تاریخ ہے، جسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

طورخم: پاکستان اور افغانستان کے درمیان حدِ فاصل

ہم لنڈی کوتل سے ہوتے ہوئے طورخم بارڈر پہنچ گئے۔ جب ہم طورخم پہنچے تو اس وقت دن ایک بجے کا وقت تھا، سامان سے لدے ہوئے بے شمار ٹرک کھڑے تھے، جو افغانستان میں داخلے کے منتظر تھے۔ روہیلہ صاحب کے پاس کسٹم کے محکمہ میں کام کرنے والے کسی افسر کا کوئی ریفرنس تھا، ہم ان کے پاس چلے گئے۔ وہ بہت مصروف تھے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ وہاں پر ایک بڑے منصب پر فائز ہیں اور کسٹم کے تمام معاملات وہی طے کرتے ہیں۔ انھوں نے ہماری خوب خاطر مدارت کی اور ہمیں چائے وغیرہ پلائی۔ مجھے بے حد حیرانی ہوئی جب انھوں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو بلوایا جو افغانی تھا، اور اسے کہا کہ وہ ہمیں کابل لے جائے، ٹیکسی کا کرایہ بھی انھوں نے ادا کیا، جو ایک بڑی رقم تھی۔ جب تک میرے دوست ان کے دفتر میں بیٹھے رہے، میں نے باہر نکل کر اِدھر اور اُدھر جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ایک انتہائی دلچسپ بات جو میں نے دیکھی، وہ یہ تھی کہ سرحد پر ایک پھاٹک لگا ہوا تھا، لوگ ایک طرف سے دوسری طرف جا رہے تھے۔ کئی لوگ اپنا پاسپورٹ دکھا کر جاتے تھے، لیکن بہت سے لوگ ویسے ہی آ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے خاندان کے لوگ بھی تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرہ ہے؟ کچھ لوگ پاسپورٹ دکھا کر جاتے ہیں اور کچھ لوگ بغیر پاسپورٹ کے آ جا رہے ہیں؟ تو انھوں نے مجھے بتایا کہ اس بارڈر لائن پر بہت سے لوگ رہ رہے ہیں، جن کے گھر پاکستان اور افغانستان دونوں جگہ ہیں یا ان کے رشتہ دار دونوں ممالک میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ مقامی لوگ ہیں اور حکومت نے انھیں سہولت دے رکھی ہے کہ وہ بغیر کسی پاسپورٹ کے آ جا سکتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات بہت حیران کن تھی لیکن وہاں پر یہ روز کے معمول کا کام تھا۔ (ابھی حال ہی میں جب افغانستان گیا تو میں نے دیکھا کہ اب ایسا نہیں ہے۔ اب کافی سختی ہے)

طورخم کے مقام پر پاکستان کی حدود میں ایک کسٹم چوکی واقع ہے۔ اس جگہ ایک بڑا گیٹ بنایا گیا ہے، جس کا نام باب پاکستان ہے۔ یہ اتنا خوبصورت نہیں جتنا باب خیبر ہے، لیکن یہ ایک بڑا گیٹ ہے، جس سے تمام لوگ آتے جاتے ہیں۔ میں پاکستان کسٹم آفس سے افغانستان میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ چند لمحوں بعد میں افغانستان میں ہوں گا اور میرے ارد گرد وہ افغانی لوگ ہوں گے، جنھوں نے دو سپر پاورز، یعنی انگریزوں اور روس کو شکست دی

ہے اور اب ان کا مقابلہ تیسری سپر پاور امریکہ سے جاری ہیں۔ یاد رہے کہ اب 2023ء ہے اگست 2022ء میں امریکہ بیس سال افغانستان میں گزار کر ایک لاحاصل جنگ کر کے واپس چلا گیا ہے۔

اب جب میں جون 2023ء، میں کابل گیا تھا تو میں طور خم کے راستے سے ہی گیا تھا۔ اب یہاں پر کئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ لیکن رش پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں ایک ترتیب کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے اس کے لیے کافی کوشش کرنا پڑے گی۔

اس کے بعد ہم افغانستان میں داخل ہو گئے۔ میں نے الگ سے افغانستان کے پانچ اسفار کی رُوداد لکھی ہے۔ اس کتاب میں افغانستان میں گزرے وقت کی تفصیل دی گئی ہے۔ افغانستان کا پہلا سفر 1989ء میں کیا جو جہاد میں حصہ لینے کی غرض سے تھا، دوسرا سفر 1999ء میں کیا جو قندھار میں واقع ایک ٹیکسٹائل مل دیکھنے کے لیے تھا، تیسرا سفر کرزئی کے دور میں 2008ء میں کیا، چوتھا سفر اپریل 2022ء میں کیا اور پانچواں سفر جون 2023ء میں کیا۔ میں نے ان اسفار میں کابل، مزار شریف، ہیراتان، بلخ، غزنی، بامیان، قندھار، ہرات، ہلمند، سپن بولدک، میدان شہر، جلال آباد کے ساتھ ساتھ کئی اور علاقے بھی دیکھے۔ ان سب کی رُوداد لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے آپ کو میری کتاب ''پھر چلا مسافر: افغانستان کے پانچ سفر'' پڑھنی پڑے گی۔

چترال کے چار سفر

پاکستان میں سیر و سیاحت کے حوالے سے بہت سے خوبصورت اور دیدہ زیب مقامات موجود ہیں۔ جن میں سے کچھ کو مجھے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور کچھ کو میں ابھی تک نہیں دیکھ سکا۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں ان خوبصورت مقامات کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ایسا ہی ایک موقع مجھے کالاش اور چترال کو دیکھنے کا ملا، جو ہمارا ایک تاریخی ورثہ بھی ہے۔ وہاں جا کر میں نے جو چیزیں دیکھیں اور انھیں دیکھ کر میرے جو احساسات اور خیالات تھے، آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔امید ہے، کہ یہ تحریر آپ کے علم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ آپ کو سیاحت پر بھی جانے کے لیے مجبور کرے گی۔

کالاش اور چترال دو ایسے مقامات ہیں جو اپنے اندر ایک رومانوی کشش رکھتے ہیں۔ وادی کالاش کا ذکر کافرستان کے ساتھ اتنی بار سنا کہ دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کب وہ دن آئے گا جب میں کالاش دیکھنے جاؤں گا۔ کالاش وادی کا نام تین طرح سے لکھا جاتا ہے؛ کالاش، کیلاش اور کیلاش۔ میرے خیال میں کالاش سب سے بہتر ہے، میں نے ایسا ہی لکھا ہے۔ جہاں تک چترال کا تعلق ہے اِس کا ذکر ہمیشہ چترالی ٹوپی، چترالی دھسہ (کمبل نما گرم چادر) کے ساتھ سنا۔اسے بھی دیکھنے کی خواہش ہمیشہ سے ہی موجود رہی۔

مجھے چار مرتبہ چترال جانے کا موقعہ ملا ہے۔ پہلی مرتبہ 2014ء میں ایک ٹور گروپ کے ساتھ ۔دوسرا سفر 2018ء میں جس میں جناب خالد وقاص صاحب، عدنان راز اور سعد مرتضیٰ ساتھ تھے۔ تیسری بار 2019ء میں اپنی اہلیہ اور نواسے سجاول کے ساتھ گیا۔ اس بار ہم نے اسلام آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز سفر کیا۔ واپسی پر پرواز کینسل ہونے کی وجہ سے بذریعہ سڑک واپسی ہوئی۔ چوتھی مرتبہ 2021ء میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے پروگرام میں شرکت کی خاطر اپنے دو نواسوں؛ احمد عمر اور داؤد سرور کے ساتھ ۔

ان چاروں اسفار میں کالاش، آیون، نگر فورٹ، بونی، گرم چشمہ، برموغ لشٹ، گولین ڈیم، ترچ میر (جسے صرف دور سے دیکھنے کا موقع ملا)، چترال عجائب گھر، شاہی مسجد، شاہی

قلعہ، پامیر ہوٹل، شہرِ شام، مارخور چراگاہ، نیشنل پارک کے علاوہ بھی کئی خوبصورت مقامات کو دیکھنے کا موقع ملا۔

پہلے ان اسفار کا ایک مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، پھر اس کے بعد چترال کی دلچسپ اور خوبصورت تاریخ، جس کی جڑیں چین، ہندوستان، ایران اور افغانستان تک پھیلی ہوئی ہیں، بیان کروں گا۔

پہلا سفر بطرف چترال

اپریل 2014ء میں نے اپنے بیٹے، آصف الٰہی مانگٹ سے سے کہا کہ میں کسی ٹورسٹ گروپ کے ساتھ چترال کی سیر کو جانا چاہتا ہوں۔ میرے کہنے پر اس نے مجھے بتایا کہ ایڈونچر ٹریول پاکستان (اے ٹی پی) ایک ٹورسٹ گروپ لے کر مئی 2014ء میں کالاش اور چترال جا رہے ہیں، مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ یہ میرا کسی بھی گروپ کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ میں نے اِس کے لیے ہاں کر دی اور یوں یہ سفر میں نے اِس گروپ کے ساتھ کیا۔ اِس دورے کے تاثرات، اِس تحریر میں درج کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اِس سفر نامہ کو مفید پائیں گے۔

اسلام آباد سے روانگی

قاسم خاں، جو کہ اے ٹی پی کے روح رواں ہیں، نے بتایا کہ ہم صبح پانچ بجے کے قریب اسلام آباد سے روانہ ہوں گے۔ میں رات کو بذریعہ بس چار بجے اسلام آباد میں اے ٹی پی کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ گیا۔ جب میں بتائے ہوئے مقام پر پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ وہاں دو عدد کوسٹرز کھڑی ہیں اور ارد گرد کوئی بھی فرد نہیں ہے۔ نماز فجر کا وقت تھا۔ میں نے نماز قریبی مسجد میں ادا کی۔ اِس دوران ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ پانچ بجے کے قریب باقی لوگ بھی آ گئے۔ سب لوگ ایک دوسرے سے تعارف میں مشغول ہو گئے۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب تیاری مکمل ہو گئی اور سفر شروع ہو گیا۔ اس سفر میں کوئی چالیس لوگ شامل تھے، جس میں نصف سے کچھ کم خواتین تھیں، باقی مرد حضرات تھے۔

اِس سفر کا سب سے بڑا حاصل، جناب فاروق مان صاحب اور ڈاکٹر اسمٰعیل قریشی صاحب کی دوستی ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری بس میں بیس لوگ تھے، باقی لوگ دوسری بس میں تھے۔ اسلام آباد سے نکل کر ہم موٹر وے سے ہوتے ہوئے مردان انٹر چینج پر اترے اور مالا کنڈ میں داخل ہوئے۔

میں اسی کتاب میں اٹک سے لے کر پشاور تک کے سفر کے تذکرے میں، اس سڑک پر آنے والے اہم مقامات کا تعارف کروا چکا ہوں۔ اس لیے نوشہرہ اور رسالپور سے آگے کے مقامات کا تعارف اور اس علاقے میں سفر کی رُوداد پیش کر رہا ہوں۔

مردان: سوات اور دیر کا دروازہ

موٹروے، مردان کے جنوب مغرب میں سے گزرتی ہے۔ ہمیں اسلام آباد سے نکلے دو گھنٹے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا، سب لوگوں کو ناشتے کی طلب ہو رہی تھی اور ہماری بس میں بیٹھے اے ٹی پی کے منیجر نے بتایا کہ ہم موٹروے سے اتر کر مردان کے بعد ناشتے کے لیے رکیں گے۔ اسلام آباد سے مردان تک میری فاروق مان صاحب اور ڈاکٹر اسمٰعیل قریشی کے ساتھ اچھی خاصی گپ شپ ہو گئی تھی۔ مردان سے گزر کر ہم ایک جگہ ناشتے کے لیے رک گئے۔ اس وقت ابھی سوات موٹروے نہیں بنی تھی۔

مردان، خیبر پختونخوا کا ایک ایسا شہر جہاں سے چھ سڑکیں مختلف علاقوں کی طرف نکلتی ہیں۔ مردان کے ارد گرد ایک مکمل رنگ روڈ ہے، جو تمام سڑکوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ مردان خیبر پختونخوا کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام بھی مردان ہی ہے۔ مردان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ تخت بھائی، جمال گڑھی، اور ساول ڈیڑھ میں واقع قدیم تہذیبوں کے آثار سے کیا جاتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے، کہ سکندر اعظم نے اِس علاقہ کو 326 قبل مسیح میں فتح کیا۔ سکندر کی موت کے بعد چندر گپت موریہ نے 321 قبل مسیح سے لے کر 297 قبل مسیح تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔ کچھ عرصے تک یہ علاقہ بدھ مت کے زیرِ اثر بھی رہا۔

مردان میں بدھ مت کے ماننے والوں نے، کوئی تین سو کے قریب تعلیمی ادارے بھی قائم کر رکھے تھے۔ وومن یونیورسٹی نے اس بات کا تفصیلی ذکر کیا ہے[1]۔ ویمن یونیورسٹی کے مطابق، مردان، گندھارا کی بدھ تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر یہ تخت بھائی، شہباز گڑھی، جمال گڑھی اور سحری بہلول جیسے مقامات کی مثال دی جا سکتی ہے۔

مختار احمد صاحب نے، پاکستان میں موجود علاقوں کی قدیم تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب سے میں نے مدد لے کر مردان اور اس کے ارد گرد کے علاقے

---

[1] https://www.wumardan.edu.pk/history_of_mardan.php

میں پائے جانے والے آثارِ قدیمہ متعلق کچھ معلومات اکٹھی کی ہیں[1]۔ یہ معلومات، ہمیں ہمارا ماضی جاننے میں بے حد مددگار ثابت ہوں گی۔

مردان میں پائے جانے والے آثار قدیمہ کی کھدائی کاکام 1962ء میں شروع ہوا۔ اس دوران کئی غار بھی دریافت ہوئے۔ ان سے یہ اندازہ لگایا، کہ کوئی تیس ہزار سال قبل، پتھر کے دور میں بھی یہاں لوگ بستے تھے۔ اس میں سب سے قدیم اشیاء جمال گڑھی کے آس پاس کے علاقے سے ملے ہیں۔ ان میں غاروں کے ساتھ ساتھ کئی قسم کے نوادرات بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اشوک کے دور کے پتھر پر کنندہ فرمودات بھی مردان کے قریب پائے گئے ہیں، جنہیں اب محفوظ کر لیا گیا ہے۔

مردان کے آس پاس کے علاقے میں 1800 قبل مسیح کے دور کے گندھارا ثقافت کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اسی علاقے سے تیسری صدی قبل مسیح کے دور کا ایک بدھا کا بت بھی ملا تھا، جو اَب سان فرانسسکو کے ایشین آرٹ میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، کہ پہلی مرتبہ صفر کے استعمال کا ایک ثبوت بھی اسی علاقے سے ملا ہے۔

مردان میں انگریزوں کی ایک بڑی فوج موجود تھی۔ اسی فوج کے کچھ لوگوں نے 1879ء میں جب کابل میں برطانوی ریزیڈنسی کا مقامی لوگوں نے محاصرہ کیا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا تھا۔ ان فوجیوں کی یاد میں گائیڈز میموریل 1892ء میں قائم کی گئی ہے۔ مردان میں پہلا اسپتال برائے خواتین 1906ء میں قائم کیا گیا تھا۔

جب سکندرِ اعظم کی قیادت میں یونانی یہاں آئے، تو اس وقت پشکلاوتی (چارسدہ) گندھارا کا دارالحکومت تھا جو مردان سے صرف پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بعد گندھارا کا آخری دارالحکومت، ضلع صوابی میں واقع ہنڈ بھی کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ اسی دور میں مردان بھی ایک اہم مرکز بن گیا اور دور و نزدیک سے طالبعلم یہاں آتے تھے۔ اس وقت یہاں بدھ دور کے کئی سو تعلیمی ادارے موجود تھے، جو غزنوی کی قیادت میں آنے والے افغانوں نے تباہ کر دیے۔ (اس بات پر اعتبار کرنا مشکل ہے، لیکن یہ بات ان سے کوئی بعید بھی نہیں) کئی لوگوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ چند ایک کی باقیات تو اب بھی موجود ہیں۔

[1] https://www.amazon.com/Ancient-Pakistan-Archaeological-History-Stone/dp/1495490475?asin=1495490475&revisionId=&format=4&depth=1

بدھ مت کی سرپرستی اشوکا نے کی اور ساتویں صدی تک کئی حکمرانوں نے اس علاقے پر حکمرانی کی، گیارہویں صدی میں افغانوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے اس علاقہ پر حکمرانی کی اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد اس علاقے کو اپنا بیس کیمپ بنایا۔ بعد میں بابر، ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔ بابر کے بعد آنے والے تمام مغل بادشاہوں نے اس علاقے کو اپنی عملداری میں رکھا۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے، کہ اس علاقے پر مغل حکمران کبھی بھی آسانی کے ساتھ حکومت نہ کرسکے۔ انھیں ہر وقت ہی مقامی آبادی سے خوف لگا رہتا تھا اور ہمیشہ جنگی کیفیت رہتی تھی۔ نادر شاہ نے 1738ء میں اس علاقے کو فتح کیا اور اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ رنجیت سنگھ نے 1814ء میں اٹک کو فتح کیا اور 1822ء میں اس نے پشاور کو بھی فتح کرلیا۔ (یہ ایک عارضی فتح تھی)۔ اِس طرح یہ علاقہ سکھوں کے ماتحت ہو گیا۔ بعد میں اسے میں انگریزوں نے اس علاقے کو فتح کرلیا اور میجر لارنس کو اس علاقے کا نگران مقرر کردیا اور یہ علاقہ انتظامی طور پر پنجاب کا حصہ بن گیا۔ 1901ء میں جب موجودہ خیبر پختونخوا کو الگ سے صوبہ کا درجہ دیا گیا، تو مردان کو ضلع پشاور کا حصہ بنایا گیا۔ صوبہ سرحد کا باقاعدہ افتتاح 26اپریل1902ء کو ہوا تھا۔

یاد رہے کہ مردان سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ بلند ہے۔اب مردان ایک انتہائی بارونق شہر ہے اور خیبر پختونخوا کی معیشت میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مردان کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ہم نے ناشتہ کیا۔ یہ ایک مناسب جگہ تھی اتفاق سے ان کے ٹوائلٹ بھی ٹھیک تھے۔ اب سب لوگ تازہ دم ہو گئے تھے۔ میں نے اور فاروق مان صاحب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا اور تفصیلی گفتگو بھی کی اور آنے والے دنوں میں ایک مضبوط تعلق کی بنیاد بھی رکھی۔

یہاں پر پہلی پبلک سیکٹر یونیورسٹی، عبدالولی خان یونیورسٹی مردان 2009ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں پر ویمن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور مردان کیمپس کو مکمل یونیورسٹی میں اپ گریڈ کرکے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی مردان کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں ایک باچا خان میڈیکل کالج بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر زرعی یونیورسٹی امیر محمد خان کیمپس بھی کام کر رہا ہے۔

مردان سے کئی نامی گرامی لوگوں کا تعلق ہے۔ ان میں رحیم اللہ یوسف زئی اور سرتاج عزیز بھی ہیں۔ میں ان دونوں حضرات کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

سخاکوٹ اور درگئی

مردان کے بعد اگلا قصبہ سخا کوٹ ہے۔ سخا کوٹ، مردان سے پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کی زیادہ اونچائی نہیں ہے۔ سخا کوٹ، مالا کنڈ کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ ہم سخا کوٹ کے پاس سے گزر رہے تھے اور اب گرمی بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی،اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں بھی پروان چڑھ رہی تھیں۔ سخاکوٹ اور مالاکنڈ کے درمیان پولیس کی ایک چیک پوسٹ بھی ہے۔

سخاکوٹ دو الفاظ "سخ" اور "کوٹ" سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب ہے سخاوت کا گاؤں یا آبادی۔ یہاں پر آباد شالمان رئیس قبیلے نے انگریزوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور انگریزوں کو بہت مشکل سے دوچار کیا۔ اگر اس متعلق مزید جاننا چاہیں تو آپ چرچل کی کتاب؛ جنگِ مالاکنڈ (اردو ترجمہ) پڑھنی چاہیے۔ جس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ کس طرح اس علاقے کے حریت پسند لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے آزادی کی جدوجہد کیا۔ سخاکوٹ اس وقت ہاتھ سے بنے ہتھیاروں کی صنعت کے لیے بے حد مشہور ہے۔

لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔۔۔

سخاکوٹ کے بعد ایک گاؤں آتا ہے، جس کا نام درگئی ہے۔ درگئی کے بعد مالاکنڈ کے پہاڑ شروع ہوتے ہیں (مالاکنڈ کو ملاکنڈ بھی لکھا جاتا ہے)۔ اسے مالاکنڈ پاس یا درہ مالاکنڈ کہتے ہیں۔ میں ان پہاڑوں پر پہلی مرتبہ 1987ء میں اپنے دو بھائیوں محمد لطیف اور محمد اشرف کے ساتھ آیا تھا۔اُس وقت سے اس درہ کی ایک تصویر میرے ذہن میں ہے۔ اس لیے ذاتی طور پر اس درے میں سے گزرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر اگر آپ چوٹی پر جاکر رک جائیں۔اس دفعہ لوگوں کے رکنے کا ارادہ نہیں تھا، اس لیے ہم درہ پاس کرکے آگے چلے گئے۔

درگئی کی ایک اہم بات کا ذکر کیے بغیر اس علاقے کی تاریخ نامکمل ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی بات ہے کہ انگریزوں نے نوشہرہ سے درگئی تک 1886ء میں ایک ریلوے لائن بچھائی تھی۔ درگئی اس کا آخری اسٹیشن تھا۔ یہ ٹرین نوشہرہ سے درگئی تک اور اس سے آگے بھی رہنے والے لوگوں کی بڑے پیمانے پر نقل و حمل کی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ اسے بالائی علاقوں کی لائف لائن کہا جاتا تھا۔

پھر کیا ہوا؟

معلوم نہیں لیکن چھبیس سال تک لوگوں کو سہولت مہیا کرنے والی یہ ریل گاڑی 1992ء میں بند کر دی گئی[1]۔ یاد رہے کہ اس ریل گاڑی کا سب سے زیادہ فائدہ ان تاجروں کو ہوتا تھا جو اپنا سامان پاکستان کے دیگر شہروں خاص طور پر کراچی پہچانا چاہتے تھے۔ یاد رہے، کہ درگئی کے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔اس لیے اس کے بعد ریل کی لائن بچھانا ناممکن تھا۔ درگئی، خیبر پختونخوا کے شمالی بالائی علاقوں اور میدانی علاقوں کے سنگم پر واقع ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور جانا جاتا ہے۔یہ پاکستان بھر میں لکڑی کی ایک بڑی منڈی بھی ہے۔ یہ بات بھی جاننے کے لائق ہے، کہ درگئی 1970ء تک مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ تھا۔ پھر جب مالاکنڈ ڈویژن بنایا گیا، تو چترال، دیر اور سوات کی سابقہ ریاستوں کو اس میں ضم کر دیا گیا تھا۔

---

https://www.dawn.com/news/607629[1]

مالاکنڈ کی جنگیں جب انگریزوں نے ظلم کی انتہا کی

مالاکنڈ درہ پندرہ کلومیٹر لمبا ہے۔اس کے ایک طرف درگئی اور دوسری طرف بٹ خیلہ کا علاقہ ہے۔اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ہم سوات کینال دیکھ سکتے ہیں، جو انگریزوں نے دریائے سوات سے نکالی تھی اور اس سے مردان کا میدانی علاقہ سیراب کیا جاتا ہے۔مالاکنڈ پہاڑیوں کے اوپر ایک قلعہ بھی ہے، جو کہ اس علاقے کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔

مالاکنڈ کی وجہ تسمیہ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں کچھ لوگ اسے "مالاکنڈو" کہتے ہیں جس کی وجہ ایک مذہبی ریاست اور صاف ستھرا علاقہ ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ "مالاکنڈ " ہے جس کا مطلب پھولوں کی مالا اور پانی ہے۔اب لوگ یہ سب کچھ بھول چکے ہیں اس علاقہ کو مالاکنڈ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے ان علاقوں کی بلندی معلوم کرنے کی کوشش کی، تو پتہ چلا کہ جہاں سے سڑک گزرتی ہے، اُس کی زیادہ سے زیادہ اونچائی چھبیس سو فٹ ہے۔لیکن راستہ کافی مشکل ہے، ہماری کوچ کا ڈرائیور بہت ماہر تھا، اس نے کوئی خوف پیدا کیے بغیر راستے کو عبور کر لیا۔

مالاکنڈ تاریخی طور پر بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔خاص طور پر اس علاقے میں انگریزوں اور پختونوں کے درمیان ہونے والی جنگیں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ایک بات نہایت اہم ہے، کہ اس علاقے میں ونسٹن چرچل بھی انگریزوں کے ساتھ اس جنگ میں بطورِ نامہ نگار شریک رہا۔اس علاقے پر قبضہ کے لیے اگست 1897ء کو ایک جنگ لڑی گئی، جس میں ایک طرف مقامی پٹھان تھے جن کی تعداد دس ہزار تھی اور اتنی ہی تعداد میں دوسری طرف انگریزوں کی فوج تھی، جس میں ہندوستانی لوگ خاص کر سکھ بھی شامل تھے۔یہ جنگ انگریز جیت گئے۔اس طرح سے مالاکنڈ پر انگریزوں کا مکمل طور پر قبضہ ہو گیا۔مالاکنڈ کی اہمیت اس کے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ایک طرح سے یہ جگہ سوات، چترال، اور دیر کا دروازہ ہے۔

مالاکنڈ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے وادی میں سوات کینال نظر آتی ہے۔ اسے انگریزوں نے دریائے سوات سے مردان کے آس پاس کے میدانی علاقوں تک پہچانے کے لیے پہاڑ کے نیچے سے ایک سرنگ بھی بنائی گئی تھی، جو اس زمانے میں کوئی عام سی بات نہیں تھی۔

جب ہم پہاڑ سے نیچے اتر کر بٹ خیلہ کے بازار سے گزرے، تو ہمیں اپنے دائیں طرف ایک پرانی عمارت نظر آئی جو بظاہر ایک قلعہ لگ رہی تھی۔ شہر کے درمیان میں سے ایک نہر بھی گزرتی ہے، جو دریائے سوات سے نکالی گئی ہے۔ اس نے بٹ خیلہ کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ اس سے تھوڑا آگے جائیں تو چکدرہ کا قصبہ آتا ہے، جہاں سے نہر کا پل پار کرکے لوئر دیر اور چترال جانے والی سڑک موجود ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ یہاں پر مغل شہزادہ رفیع الشان کی رہائش گاہ بھی تھی، جو شہنشاہ بہادر شاہ اوّل کے بیٹے اور شہنشاہ اورنگزیب کے پوتے تھے۔ یہاں پر موجود قلعے کے متعلق اگر آپ تفصیل سے جاننا چاہیں، تو آپ کو چرچل کی کتاب پڑھنا ہوگی، جس میں اس قلعے کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

سوات موٹروے (M-16) بن جانے سے اب پہاڑ پر سے ہو کر گزرنا نہیں پڑتا۔ اب یہاں دو ٹنل بنا دیے گیے ہیں، جس سے اس علاقے میں آنے جانے میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ نوشہرہ کے مقام سے یہ موٹر وے شروع ہو کر چکدرہ تک جاتی ہے، اسے جون 2019ء میں ٹریفک کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ درگئی اور مالاکنڈ کی اس سرزمین کے متعلق بھی چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں جہاں ہر چپے پر کسی نہ کسی حریت پسند پختون کا خون ضرور بہا ہے۔

ایک ویب سائٹ جس کا نام ہے:

https://www.nam.ac.uk

اس ویب پر بے شمار ایسے مضامین ملتے ہیں، جن کا تعلق درگئی اور مالاکنڈ میں انگریزوں اور مقامی لوگوں کے درمیان جنگوں سے ہے۔ میں ان جنگوں کے متعلق پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ درگئی کے بازار کے بعد مالاکنڈ کے قلعے کو قریب سے دیکھا، اس کے ساتھ ساتھ ایک پہاڑی کی چوٹی پر، چرچل سے منسوب ایک یادگار کو دیکھا، تو مجھے یاد آیا کہ اس وقت تک ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مکمل نہیں ہوا تھا، جب تک انھوں نے وادی تیرہ اور مالاکنڈ پر فتح حاصل نہیں کی۔ اس فتح کی خاطر انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا، یہ سب جاننا ضروری ہے۔ اس پر

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں نے اس کے لیے ایک مضمون سے مدد لی جو نیشنل آرمی میوزیم یو کے کی ویب سے ملا[1]۔ یہ ایک طویل مضمون ہے۔ اس کا خلاصہ یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ خاص طور پر اسے نئی نسل کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے چرچل کی کتاب The Story of the Malakand Field Force (جنگ مالاکنڈ، شائع کردہ جمہوری پبلیکیشنز) سے بھی مدد لی ہے۔

میں ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ انگریزوں کا افغانستان کی سرحد پر ایک بڑی تعداد میں فوج رکھنا صرف اور صرف روس کی یلغار کو روکنا مقصد تھا۔ اس مضمون سے پتہ چلا کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا، کہ پہاڑوں پر آباد قبائل کو میدانی علاقوں پر حملوں سے روکا جائے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ چھاپہ مار کارروائیوں کا خاتمہ ہو، تاکہ ان کے علاقے میں امن ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ قبائلی لوگوں کا پیچھا کرتے کرتے، مالاکنڈ کے پہاڑوں سے بھی آگے چلے گئے۔

صوبہ سرحد کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد، انگریزوں نے پہلے تیس سال (1848-1880) کے دوران 'کلوز بارڈر' پالیسی اختیار کی۔ یعنی صرف اپنی سرحد اور اپنے علاقے کی حفاظت کی جائے اور جوابی طور پر کوئی حملہ نہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا، کہ اس سے قبائلی لوگ خود ہی تنگ پڑ جائیں گے۔ اس طرح، خطرہ بخود بخود کم ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اپنے علاقے میں رہتے ہوئے انتظار کرنا۔ اگر کوئی حملہ کرے تو اپنا دفاع کرنا۔ یہ حکمتِ عملی شروع میں تو کامیاب رہی، بعد میں حالات کی وجہ سے انگریزوں نے آگے بڑھ کر حملے کرنے کا فیصلہ کیا۔

انگریزوں نے ایک نئی حکمتِ عملی اختیار کی جس کا نام "فارورڈ پالیسی" رکھا گیا۔ اس پالیسی کے مطابق اب انگریزوں نے قبائل کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمانے کا فیصلہ کیا۔ خاص طور پر ان راستوں پر اپنا کنٹرول بہتر کیا جو راستے افغانستان سے ہندوستان کی طرف آتے تھے، تاکہ روسی حملے کی صورت میں بہتر دفاع کیا جا سکے۔

فارورڈ پالیسی پر عمل درآمد 1870ء کے بعد شروع ہوا۔ اسی پالیسی کے مطابق 1878ء میں افغانستان پر ایک بڑے پیمانے پر حملہ کیا گیا (دوسری اینگلو افغان وار)۔ اس کی

---

[1] https://www.nam.ac.uk/explore/north-west-frontier-india

وجہ سے سرحد پر رہنے والے قبائل بھی انگریزوں کے دشمن ہو گئے۔ ان قبائل کا صدیوں سے سرحد پار کے قبائل سے رابطہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ آج کی سرحد کے دونوں پار رہنے والے لوگ کبھی بھی الگ نہیں رہے۔ وہ سب پختون تھے، ایک ہی طرح کی تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک افغانستان پر حملہ در حقیقت انھی پر حملہ تھا۔ انھوں نے افغانستان کی حکومت کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ نکلا کہ 1893ء میں تاریخ میں پہلی مرتبہ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد کا تعین کیا گیا۔ قبائل کے پرزور اصرار پر دونوں ممالک کے درمیان، ایک آزاد علاقہ بھی قائم کیا گیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ پنجاباور بنگال میں بھی پیش آیا، جب ہزاروں سال کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کیا گیا۔ مشرقیاور مغربی پنجاب، مشرقی اور مغربی بنگال کی بنیادرکھی گئی۔ دونوں کے درمیان ایک سرحد بنائی گئی۔ یہاں پر بھی دونوں طرف رہنے والے ایک ہی طرح کی بودوباش رکھتے تھے۔

یہ وہی دور ہے، جب انگریزوں نے سرحد کے ساتھ ساتھ نئے قلعے اور جدید گیریژن کے نظام کی تعمیر شروع کی۔ اسی دور میں پولیٹیکل ایجنٹ کا نظام بھی متعارف کروایا گیا، شہروں میں تعلیم اور صحت کے منصوبے شروع کیے۔

اس میں انگریز کہاں تک کامیاب ہوئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب جاننا بے حد ضروری ہے۔

اس مضمون کے مطابق، انگریزوں نے ایک مرتبہ پھر اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کی اور اپنی باقاعدہ فوج کو واپس بلا لیا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور اس کا متبادل کیا سوچا؟

یہ ایک انتہائی دلچسپ داستان ہے جس نے مجھے بے حد غمزدہ کر دیا۔ آپ کیا سوچیں گے، معلوم نہیں۔

میرے علم کے مطابق انگریزوں نے اپنی باقاعدہ فوج کے ساتھ آخری جنگ 1897ء میں مالاکنڈ میں لڑی جس میں اکثریت انگریز آفیسرز کی تھی۔ وہ یہ جنگ تو جیت گئے، لیکن اس سے انھوں نے ایک سبق سیکھا، کہ ان قبائل کا مقابلہ کرنا، ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اس وقت تک افغانستان کی طرف حملے کا خطرہ بھی ٹل چکا تھا۔ اب انگریزوں نے ایک نئی سکیم بنائی۔ اس سکیم کا لب لباب یہ تھا کہ پختون ہی پختون کو مارے

گا اور اسے قابو بھی رکھے گا۔ اس کام کے لیے انھوں نے پانچ طرح کی نیم فوجی مسلح فورسز بنائیں۔ جن کا ایک مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

خاصہ دار

خاصہ داروں کی ذمہ داری قبائلی علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنا تھا۔ ان کے کمانڈر انڈین آرمی یونٹس سے منسلک لوگ ہی تھے، جو انگریزی فوج کے براہِ راست ملازم تھے۔ خاصہ داروں کا انتخاب قبائل پر چھوڑ دیا گیا، تاکہ وہ خود ہی اپنے قبیلے سے قابلِ بھروسہ لوگوں کو اپنا محافظ منتخب کریں۔

خاصہ داروں کو یہ اختیار بھی دیا گیا، کہ لوگوں کو گرفتار کر سکتے ہیں، قبائلی جرگہ بلا سکتے تھے اور اگر مجرم مزاحمت کرے تو اسے سزا بھی دے سکتے تھے۔ ان کی تنخواہ انگریزوں کے ذمہ تھی جو قبیلے کے سردار کے ذریعے دی جاتی تھی۔ خاصہ داروں کی وردی، ہتھیار، تربیت، سب کا بندوبست انگریزوں کے ذمہ تھا۔

اب پیسہ انگریزوں کا، حکم مقامی سردار کا، سامنے بھی پختون۔۔۔ بندوق والا بھی پختون۔۔۔ صاحب بہادر چھاؤنی میں فروکش، سگار کا کش لیتے ہوئے اور کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، جب کہ میدانِ جنگ میں ایک ہی قوم کے دو گروہ۔۔۔

ایک تنخواہ دار وفادار، دوسرا اپنی زمین کی حفاظت کی خاطر جان نثار کرنے والا۔۔۔

یہ ایک انتہائی چالاکی سے تیار کردہ منصوبہ۔

جس کا کئی ہزار خواص و عام شکار ہوئے اور آج تک ہیں۔

وہی آج بھی حاکم ہیں۔

پہلے وہ خود یہاں تھا اب وہ تو سات سمندر پار واپس چلا گیا۔۔۔ اب حاکم اس کے نامزد کیے ہوئے لوگ، کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اصل حاکم بہتر تھا، اس کے نامزد کردہ حاکم اپنے لوگوں کے لیے بدترین۔

اس سب کا مقصد امن قائم کرنا، جو پھر بھی نہ ہوا!

اسی وجہ سے انگریزوں کو اس کے بعد بھی کئی دفعہ خود بھی میدان میں آنا پڑا۔

پٹرول (گشت)

خاصہ داروں اور ملیشیاؤں کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ قبائلی اور آباد علاقوں کے درمیان سرحد کی حفاظت کریں۔ اس لیے ہمیشہ گشت کرتے رہتے تھے۔ عام طور پر وہ صرف اطلاع دیتے تھے۔ ضرورت محسوس کرتے تو پشاور اور کوہاٹ کے علاوہ دیگر مقامات پر موجود فوج سے رابطہ کرتے تھے۔ میرے خیال میں، یہ لوگ ایک طرح سے جاسوسی اور نگرانی کا کام کرتے تھے۔

فرنٹیئر کنٹرول

انگریزوں نے اس وقت کے صوبہ سرحد پر بہتر کنٹرول کے لیے 1925ء میں خیبر پاس ریلوے کا آغاز کیا۔ یہ ٹرین جمرود سے لنڈی کوتل تک جاتی تھی۔ اس سے انگریزوں کو اپنے فوجی بھیجنے میں آسانی ہو گئی (ہم یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے عوام کے فائدے کے لیے یہ ٹرین چلائی تھی)۔

کتنے نادان تھے ہم بھی!

یہ نظام قیامِ پاکستان تک قائم رہا۔ اس عرصے میں قبائلی علاقے بڑی حد تک خود مختار رہے۔

پنجاب فرنٹیئر فورس

پنجاب فرنٹیئر فورس بھی ایک نئی فورس تھی، جو 1851ء میں بنائی گئی تھی۔ اس کا مقصد خاص طور پر موجودہ خیبر پختونخوا پر انگریزوں کے قبضے کو برقرار رکھنے میں مدد دینا تھا۔ اس کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کی بجائے پنجاب کے چیف کمشنر کے پاس تھا۔ یہ اسی طرح کی ایک فورس تھی جیسے بھٹو دور میں ایف ایس ایف بنائی گئی تھی۔ یہ فورس ایک طرح سے کسی کی بھی مدد کے لیے کم از کم وقت میں پہنچنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس فورس نے سکھوں کے خلاف جنگوں میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔

خاکی

گائیڈز کے نام سے 1846ء میں ایک فورس بنائی گئی، جس میں کئی اور یونٹس بھی شامل تھے۔ گائیڈز کی وردی خاکی رنگ کی تھی، اسی لیے اسے خاکی کہا جاتا تھا۔ اس کی وردی سوتی کپڑے سے بنی ہوتی تھی، جسے دریا کی مٹی سے رنگا جاتا تھا۔ (کپڑے رنگنے کے اس طریقے کا علم

مجھے پہلے بار ہی ہوا ہے، حالانکہ میرا تو کام ہے کپڑوں کی رنگائی کا ہے) یہ ایک ڈھیلی فٹنگ والی یونیفارم تھی۔ اس کے خاکی رنگ کی وجہ یہ تھی، کہ اس سے دشمن سے چھپنا آسان تھا۔

ایسا ہی کام، انھوں نے بلوچستان میں کیا تھا، جہاں لیوی بنائی گئی۔ گلگت میں گلگت سکاؤٹس کی بنیاد رکھی، پنجاب میں پولیس کا نظام مضبوط کیا۔ ریاستی علاقوں میں براہِ راست مداخلت کی بجائے، ریاست کے نواب یا سردار کی مالی اور فوجی مدد کی گئی۔

اب تک کی بیان کی گئی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ انگریزوں نے ہندوستان کے ساتھ ساتھ، پختون قبائل سے بھی لوگوں کو بھی بھرتی کیا، ان کی تربیت کی، وسائل دیے اور امن کو یقینی بنایا۔

اس مضمون کے مطابق انگریزوں کی پہلی ترجیح، مال و زر کے ذریعے سرداروں کو رام کرنا ہوتا تھا۔ جب اس سے کام نہ بن پاتا، تو پھر جنگ کرتے تھے، جو ان کا آخری حربہ ہوتا تھا۔ جنگ میں فصلوں، پانی کے تالابوں، قلعوں اور گھروں کو تباہ کر دیتے تھے۔ ان جنگوں میں، ہندوستان بھر سے آئے ہوئے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہندوستانی دستوں کے ساتھ ساتھ گورکھا دستے شامل تھے۔

انگریز موجودہ خیبر پختونخوا میں کوئی سو سال کے قریب رہے۔ اس دوران انھوں نے کوئی تیس کے قریب جنگیں لڑیں اور ہر جنگ جیتی بھی۔ یہ ان ظالمانہ اقدامات کے علاوہ ہیں، جہاں انگریزوں نے ظلم کی انتہا کی، جیسے قصہ خوانی بازار میں قتلِ عام۔ جنگ جیتنے کے بعد علاقے کے لوگوں کا قتلِ عام کرنا، گھروں کو جلانا، دیہات کو تباہ کرنا اور فصلوں کو اجاڑنا جیسے مظالم انگریزوں کے نزدیک، ایک عام سی بات تھی۔

اب تک جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس کے مطابق ہندوستان بھر میں انگریزوں نے سب سے زیادہ جنگیں بھی خیبر پختونخوا کے علاقے میں لڑی ہیں اور سب سے زیادہ قتل بھی یہیں کیے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سو سال کے عرصے میں کوئی ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا، جب مقامی لوگوں نے انھیں چین سے بیٹھنے دیا ہو۔ مقامی لوگوں نے جس بہادری سے اس کا مقابلہ کیا ہے، یہ سب بھی سنہری حروف سے لکھنے والی ایک خوبصورت داستان ہے، جو بدقسمتی سے ہماری درسی کتابوں میں جس قدر تفصیل سے ہونی چاہیے تھی، اُس قدر نہیں ہے۔

اس مضمون میں ان تمام جنگوں کی تفصیل دی گئی ہے، جو انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کے خلاف لڑی ہیں۔ میں آپ لوگوں کی معلومات کے لیے صرف چند جنگوں کی ایک

فہرست دے رہا ہوں، جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ انگریزوں نے اس علاقے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کتنا زور لگایا۔

اس سارے قصے میں دکھ والی بات یہ ہے کہ انگریزوں کی فوج میں آفیسرز کے علاوہ باقی سب لوگ ہندوستانی تھے۔

مارنے والے بھی ہندوستانی۔۔۔

مرنے والے بھی ہندوستانی۔۔۔

کس کی خاطر۔۔۔

غیر ملکی حکمرانوں کے لیے۔۔۔

1. March-May 1860
   i. Mahsud Reprisal
   ii. Umbeyla, 1863
2. July-October 1868
   i. Black Mountain Expedition
3. March 1872
   i. Tochi Valley Expedition
4. August-December 1877
   i. Jowaki Expedition
5. February 1878
   i. Utman Khel Reprisal
6. 1881-1878
   i. Second Afghan War
7. November-December 1883
   i. Shiranni Expedition
8. Black Mountain, 1888-91
9. October-November 1890
   i. Zhob Valley Expedition
10. January-May 1891
    i. Miranzai Expedition
11. December 1891
    i. Hunza-Nagar Expedition
12. November 1894-March 1895
    i. Waziristan Expedition
13. Chitral, 1895

14. The 1897 Rising
i. Malakand Field Force
ii. Samana
iii. Tirah Field Force
15. December 1900-March 1902
i. Mahsud Blockade
16. November-December 1902
i. Kabul Khel Expedition
17. February-March 1908
i. Bazar Valley Campaign
18. April-May 1908
i. Mohmand Campaign
19. November 1914–March 1915
i. Tochi Valley Operations
20. April-September 1915
i. Campaign against the Mohmands and Bunerwals
21. June-July 1917
i. Operations against the Mahsuds
ii. Waziristan, 1919-22
22. June 1927
i. Operations against the Mohmands
23. 1930
i. Afridi raids and Pathan Redshirt Rebellion
24. July-October 1935
i. Mohmand Campaign
25. Waziristan, 1936-39

اب پھر ہم اپنے سفر کی داستان کی طرف آتے ہیں۔ ہم درگئی سے گزر کر آگے چلے گئے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا اور ہم بھی کافی تروتازہ تھے۔ البتہ ہمارا ڈرائیور کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اگلا شہر بٹ خیلہ تھا، جس کے بازار میں سے ہم لوگ گزر رہے تھے۔

درگئی ایک انگریز شاعر کی نظر میں

مجھے درگئی کے متعلق معلومات تلاش کرتے ہوئے، یہ ایک نظم ملی جسے ایک انگریز فوجی آفیسر نے لکھا ہے۔ مجھے اچھی لگی، ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے۔ اس نظم کا موضوع ہے،

کہ جب مقامی لوگوں نے ہم پر قابو پالیا، تو پھر ہم نے بھرپور جواب دینے کا فیصلہ کیا اور ہم نے شام تک دوبارہ قبضہ کر لیا۔

The Storming of the Dargai Heights

’Twas on the 20th of November, and in the year of 1897,
That the cheers of the Gordon Highlanders ascended to heaven,
As they stormed the Dargai heights without delay,
And made the Indian rebels fly in great dismay.

“Men of the Gordon Highlanders,” Colonel Mathias said,
“Now, my brave lads, who never were afraid,
Our General says ye must take Dargai heights to-day;
So, forward, and charge them with your bayonets without dismay!”

Then with a ringing cheer, and at the word of command,
They bounded after their leaders, and made a bold stand;
And, dashing across the open ground with their officers at their head,
They drove the enemy from their position without any dread.

In that famous charge it was a most beautiful sight
To see the regimental pipers playing with all their might;
But, alas! one of them was shot through both ankles, and fell to the ground,
But still he played away while bullets fell on every side around.

Oh! it must have been a gorgeous sight that day,
To see two thousand Highlanders dressed up in grand array,
And to hear the pibroch sounding loud and clear
While the Highlanders rushed upon the foe with a loud cheer.

The Gordon Highlanders have gained a lasting fame
Which for ages to come will long remain :
The daring gallantry they displayed at the storming of Dargai,
Which will be handed down to posterity.

Methinks I see that gallant and heroic band
When brave Colonel Mathias gave them the command,
As they rushed upon the rebel horde, which was their desire,
Without the least fear through a sheet of fire.

Then the rebels fled like frightened sprites,
And the British were left masters of the Dargai heights;
But, alas! brave Captain Robinson was mortally wounded and cut down,
And for his loss many tears from his comrades fell to the ground.

Success to the Gordon Highlanders wherever they go.
May they always be enabled to conquer the foe;
And may God guard them always in the fight,
And give them always strength to put their enemies to flight.

بٹ خیلہ: ایک نہر کنارے شہر

بٹ خیلہ، خیبر پختونخوا کا ایک اہم مقام اور ضلع مالاکنڈ کا صدر مقام ہے۔ یہ ایک خوبصورت وادی میں واقع ہے۔ یہاں پر بے شمار دریا اور نالے بہتے ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں، محمود غزنوی نے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ اُس وقت اِس علاقے پر ہندوؤں کی حکومت تھی۔ علاقہ کی فتح کے بعد کچھ لوگ یہاں رہ گئے۔ ان لوگوں نے اس علاقے کے لوگوں کو مسلمان کیا، اس طرح اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد یوسف زئی قبائل نے افغانستان سے آکر اس علاقے پر قبضہ کیا، جس میں دیر، سوات اور چترال شامل تھے۔ اِس علاقے میں ہارولڈ آرتھر ڈین نے سب سے پہلے انگریزوں کی طرف سے حملہ کیا۔ پشاور میں واقع ڈین ہوٹل اسی کے نام پر ہے۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

جب ہم بٹ خیلہ کے بازار سے گزر رہے تھے، جو کہ کافی طویل تھا اور وہاں کافی رش بھی تھا، تو پتہ چلا کہ مین روڈ کسی وجہ سے بند ہے، اس لیے ہمارا ڈرائیور گلیوں میں سے گاڑی کو نکال کر لے گیا۔ آپ کے علم میں ہے، کہ چند سال پہلے اس علاقہ پر فوج نے ایک جنگ لڑی تھی اور قابض طالبان سے علاقہ خالی کرایا تھا۔ اس وجہ سے اس علاقہ میں جگہ جگہ فوج کی چوکیاں تھیں۔ ہم نے چونکہ دیر کے لیے نکلنا تھا، اس لیے ہماری بھی کافی چیکنگ کی گئی۔ ہمارے ساتھ

ایک ایم پی اے بھی تھے، جن کا تعلق ایبٹ آباد سے تھا، ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی اور کافی رش بھی تھا، ہمارا ڈرائیور گاڑی کو آگے لے گیا، کہ شاید سفارش کام آ جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہمیں دوبارہ لائن میں آ کر شناختی کارڈ چیک کروا کے ہی جانے کی اجازت ملی۔

بٹ خیلہ بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اشوک اور کنشک دور میں بٹ نامی راجا اس جگہ پر راج کرتا تھا۔ اسی کے نام کی وجہ سے اسے بٹ خیلہ کہا جانے لگا۔ اس بات کا کوئی حوالہ نہیں ملا۔ عام طور پر اسی طرح سے بات مشہور ہے۔

اسی طرح سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے (کوئی مستند حوالہ نہیں ہے) کہ محمود غزنوی کے ایک فوجی کمانڈر پیر خوشحال نے بٹ خیلہ پر حملہ کیا تھا۔ جنگ کے بعد وہ اور ان کے کئی ساتھی یہیں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں نے مقامی لوگوں کو اسلام سے روشناس کروایا، بعد میں یوسف زئی قبیلہ افغانستان سے آ کر یہاں بس گیا۔ اس کے بعد ہی یوسف زئی قبیلے نے سوات کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک طویل تاریخ ہے، جس کا ذکر اس کتاب میں کئی جگہوں پر کیا گیا ہے۔ اسے دوبارہ دہرانا مناسب نہیں۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا، جب مارچ 1895ء میں انگریزوں نے اس علاقے پر حملہ کیا (اس کی تفصیل میں پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں)۔ مقامی لوگوں نے جہاد سمجھ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں شہید بھی ہوئے۔ شکست مقامی مسلمانوں کا مقدر بن گئی۔ انگریزوں نے اس علاقے میں مالاکنڈ ایجنسی قائم کی، جس میں دیر، سوات اور چترال کے کئی علاقے شامل تھے۔ اسے ایک پروٹیکٹڈ علاقہ قرار دیا گیا۔ اس نئی مالاکنڈ ایجنسی کے پہلے سربراہ میجر ہیرالڈ آرتھر ڈین (1854–1908ء) تھے جو بعد میں صوبہ سرحد کے پہلے چیف کمشنر بھی بنے۔ اس نئی ایجنسی کی حفاظت کی خاطر مالاکنڈ لیویز کے نام سے ایک پولیس فورس تیار کی گئی۔

اس طرح ایک پختون کو دبانے کی خاطر، ایک پختون کے ہاتھ میں بندوق دے دی گئی، جس کے ٹریگر پر ہاتھ انگریز ہی کا تھا۔ البتہ کندھا ایک مقامی پختون کا تھا، جس کے بڑوں نے انگریزوں کے خلاف لڑتے جان دی تھی۔۔۔

اسے کہتے ہیں ذہنی اور قلبی انقلاب۔۔۔

اب دن کے بارہ بج رہے تھے اور ہم بٹ خیلہ کے بعد پہاڑی علاقوں میں داخل ہو چکے تھے۔اتنا سبزہ تھا کہ خالی جگہ دیکھنا بھی محال تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا اور پہاڑی علاقوں کی وجہ سے گرمی کی شدت میں بھی کمی تھی۔علاقہ میں انگریزوں کے دور میں کی گئی ترقی کے آثار، نمایاں نظر آرہے تھے۔ لوگوں نے بتایا، کہ انگریزوں نے اپنے دور میں اس علاقہ میں بٹ خیلہ سے چکدرہ کی سڑک کے علاوہ بھی بے شمار سڑکیں بنائیں ،اس کے علاوہ بے شمار نہریں اور چوکیاں بھی قائم کیں۔سب سے اہم بات اس علاقہ کا نہری نظام ہے، جو کہ ایک انگریز کمپنی نے 1912ء میں بنایا تھا،اس سے اس علاقہ میں بے حد خوشحالی آئی۔

اس علاقہ میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی چوکی ہے،اس چوکی کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ اس چوکی پر چرچل نے ایک ہفتہ گزارا تھا۔اس وقت یعنی 1895ء میں وہ مالاکنڈ فیلڈ فورس میں بطور جنگی نامہ نگار کام کرتا تھا۔ ہم یہ چوکی دیکھ تو نہ سکے، لیکن یہ چوٹی چرچل کی وجہ سے کافی مشہور ہو گئی ہے۔ میں نے چرچل کی یہ کتاب پڑھی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ ہماری نئی نسل کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ،اس کا نام ہے؛

The Story of Malakand Fiedld Force (1898) (جنگ مالاکنڈ)

چکدرہ فورٹ : مغلوں اور انگریزوں کا بنایا ہوا قلعہ

چکدرہ[1]، پشاور سے کوئی 130 کلومیٹر، مینگورہ سے 40 کلومیٹر اور تیمر گرہ سے 38 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں سے ہم دریائے سوات عبور کرکے دیر لوئر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ جگہ کئی لحاظ سے ایک تاریخی جگہ ہے۔ یہاں سے ملنے والے آثارِ قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہاں بدھ مت کے ماننے والے بھی رہتے تھے۔ یہاں پر موجود ایک اسٹوپا (اسٹوپا کی شکل ایک الٹے رکھے ہوئے پیالے کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے) جس کا قطر بیس فٹ کے قریب ہے۔اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اسے موریہ سلطنت کے دور میں یعنی تیسری صدی قبل مسیح بنایا گیا تھا۔

کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ چکدرہ ساڑھے تین ہزار سال پرانی، ایک آبادی ہے جو اب بھی آباد ہے۔ اس علاقے میں گندھارا، بدھ مت کے مقامات اور ہندو شاہی کے تعمیر

---

[1] اسے چکدرا بھی لکھا جاتا ہے۔

کردہ قلعوں کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے، کہ یہ ایک قدیم علاقہ ہے اور ہر دور میں اس کے محلِ وقوع کی وجہ سے لوگوں کی پسندیدہ جگہ رہا ہے۔

اگر آپ نقشے میں دیکھیں، تو آپ جان جائیں گے، کہ قدیم دور میں افغانستان سے ایک راستہ ناوا پاس اور کٹکالا پاس/ذوالم پل سے ہوتا ہوا بھی چکدرہ آتا تھا۔ یعنی چکدرہ، قدیم دور سے ایک شاہراہ پر واقع تھا۔ جس کی وجہ سے اسے تجارت اور جنگوں میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ قدیم دور میں شمالی افغانستان کے لوگ اسی راستے سے ہندوستان آتے تھے۔ اگر آپ نقشے کو ایک بار پھر سے دیکھیں، تو آپ چترال کے مغرب میں افغانستان کی سرزمین پر ایک قصبہ دیکھ پائیں گے جس کا نام پشاور ہے، یعنی ایک پشاور افغانستان میں بھی موجود ہے۔

چکدرہ میں پہلا دفاعی قلعہ مغلوں نے 1586ء میں تعمیر کیا تھا، یہ اکبر کی بادشاہت کا دور ہے۔ اسی قلعے پر انگریزوں نے 1895ء میں قبضہ کیا اور اس میں کئی اضافے بھی کیے۔ یہی وہ قلعہ ہے، جہاں انگریزوں کا مقامی حریت پسندوں نے محاصرہ بھی کیا تھا۔ چکدرہ فورٹ کے متعلق ایک مضمون National Army Museum, UK کی ویب پر بھی موجود ہے[1]۔

اس مضمون کے مطابق چکدرہ فورٹ کی جگہ دفاعی لحاظ سے بے حد اہم تھی۔ دریائے سوات پر واقع ہونے کی وجہ سے دیر کی طرف سے آنے والوں کی بہتر انداز سے نگرانی ہو سکتی تھی۔ لیفٹیننٹ ہیو سٹیفنسن ٹرن بل (1882-1973) اس دور کی ایک تصویری البم بھی مرتب کی تھی۔

مجھے فیس بُک واچ پر 1920اور 1922ء کی دو وڈیوز دیکھنے کو ملیں۔ ایک میں پرنس آف ویلز اور دوسری میں سوات ریاست کے والی چکدرہ فورٹ کو دورہ کر رہے ہیں۔ آپ بھی دیکھیں۔ آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ ہم آج سے سو سال پہلے کیسے رہتے تھے۔

ایک وڈیو فوٹیج 1922ء کی ہے، جس میں ایڈورڈ ہشتم (پرنس آف ویلز) کے دورہ کے موقع پر درگئی، مالاکنڈ قلعہ، گورکھا بٹالین، چکدرہ، چکدرہ قلعہ، ونسٹن چرچل چوکی، چکدرہ

[1] https://collection.nam.ac.uk/detail.php?acc=2003-02-301-1

پل اور تھانہ گاؤں کے مناظر دکھائیں گئے ہیں۔ یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح علاقے کے لوگ، بادشاہ سلامت کو بکریاں پیش کرنے کے لیے قطار میں کھڑے ہوئے ہیں[1]۔

چکدرہ کے پاس، اندان ڈھیری میں بدھ مت کے آثار قدیمہ پائے گئے ہیں۔ یہ چکدرہ سے تقریباً کوئی سات کلومیٹر شمال میں واقع ہیں۔ پروفیسر احمد حسن دانی نے یہاں 1966ء میں کھدائی کروائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہوں پر آثارِ قدیمہ پائے گئے ہیں۔ ان کی اس سے زیادہ تفصیل یہاں مناسب نہیں ہے۔

انگریزوں کے دور کا یہاں پر ایک فولادی پل بھی موجود ہے، جس کے متعلق ایک مضمون مجھے نیشنل آرمی میوزیم کی ویب سے ملا[2]۔ اس کے مطابق جب 1895ء میں انگریز چترال کی مہم سے فارغ ہو کر چکدرہ میں قیام پذیر ہوئے، تو انھوں نے دریائے سوات پر ایک فولادی پل بھی بنایا تھا۔ اس پل کی دفاعی نُقطۂ نَظر سے بے حد اہمیت تھی۔

آغوش گل آباد

چکدرہ وہی جگہ ہے جہاں سوات موٹروے ختم ہوتی ہے۔ یہیں سے سوات موٹروے کا دوسرا حصہ جو مینگورہ کی طرف جائے گا، شروع ہوگا۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں سے گزرا تھا، اس وقت چکدرہ سے کوئی آٹھ دس کلومیٹر آگے، گل آباد میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے ایک آغوش یعنی یتیم بچوں کی رہائش گاہ بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔

بعد میں مجھے کئی مرتبہ اس کی تعمیر کے دوران بھی جانے کا موقع ملا۔ اس کے افتتاح کے دن بھی میں وہاں موجود تھا۔ جب اس نے کام شروع کر دیا تب بھی بارہا مرتبہ مجھے یہاں رکنے کا موقع ملا اور بچوں سے گفتگو کی سعادت بھی ملی۔

یاد رہے کہ میں کوئی پچھلے پچیس سال سے الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے ساتھ وابستہ ہوں۔ پہلے میری ذمہ داری اپنے محلے اور شہر کی سطح کی ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے لاہور شہر میں 2008ء میں پہلی ڈونر کانفرنس منعقد کی تھی جس میں، اس وقت کے الخدمت

---

[1]BFI/ Fair - Central News & Woods-Taylor - cameraman)

[2]https://collection.nam.ac.uk/detail.php?acc=2003-02-301-4

فاؤنڈیشن پاکستان کے مرکزی صدر جناب نعمت اللہ خان صاحب بھی تشریف لائے تھے (میرے علم کے مطابق یہ لاہور پہلی میں ڈونر کانفرنس تھی)۔اس کے بعد دوہزار پندرہ میں الخدمت والنٹیرز ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ بنایا گیا اور اسی سال مجھے الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کا سیکرٹری جنرل بھی مقرر کیا گیا۔ بعد میں (2019) میں مجھے الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے نائب صدر کی ذمہ داری دی گئی، جو تاحال جاری ہے۔

جب ڈاکٹر حفیظ الرحمان صاحب دوبارہ (2022ء میں) صدر بنے تو مجھے پھر نائب صدر کی ذمہ داری دی گئی۔اس کے علاوہ کئی چھوٹے موٹے کام بھی میرے سپرد کیے گئے۔ ان میں ایک اہم ترین کام والنٹیئر مینجمنٹ ڈیپارٹمنٹ کی ذمہ داری ہے۔اس عرصے میں الخدمت کے کاموں کے سلسلے میں کئی مرتبہ دیر کی طرف آنا ہوا۔ جب بھی یہاں سے گزرے، تو آغوش میں ضرور گئے۔ اس کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان خیبر پختونخوا ریجن نے دیر لوئر میں گل آباد کے مقام پر الخدمت آغوش سنٹر کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ یہ آغوش خاص طور پر مالاکنڈ ڈویژن کے یتیم بچوں کو بڑی حد تک سہولت فراہم کرے گا۔ایک نیک دل شخص نے اس کے لیے اپنی زمین وقف کی ہے۔ یہاں پر اب ایک سو یتیم بچوں کا ایک بہترین ہاسٹل تعمیر کیا گیا ہے، جو ہر طرح کی سہولیات سے مزین ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد اس وقت کے رکن قومی اسمبلی صاحبزادہ محمد یعقوب خان نے رکھا۔

اب پھر اپنے سفر کی رُوداد کی طرف چلتے ہیں۔

چکدرہ میں تلاشی کے مراحل سے گزر کر آگے نکلے، تو سب لوگ اس بات کی خواہش کر رہے تھے کہ کہیں رکا جائے اور کھانا کھایا جائے۔ اس دوران ہم تیمر گرہ کے قریب، ایک ڈھلوان پر بنے ہوٹل پر پہنچ گئے۔اِس ہوٹل کا نام تو یاد نہیں، لیکن اس ہوٹل کے صحن میں پڑی سرخ رنگ کی کرسیاں ابھی تک یاد ہیں۔ سب لوگ کافی تھک چکے تھے اور جلدی جلدی ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ میں اور فاروق صاحب ایک ہال میں چلے گئے۔ حسبِ معمول ہوٹل میں کافی رش تھا، لوگ چبوترے پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میں اور فاروق صاحب بھی ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کھانا تازہ تھا لیکن حسبِ معمول صفائی سے کافی دشمنی تھی، بھوک کی حالت میں ان باتوں پر دھیان نہیں جاتا، پھر اوپر سے سفر بھی ہو، تو جو ملے وہی غنیمت لگتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد، میں نے ہوٹل کے مالک سے گپ شپ لگانی شروع کی، میری یہ خواہش تھی کہ علاقے کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانا جاسکے اور معلومات حاصل کی جائیں۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ یہ تمام علاقہ بڑی دیر تک میدان جنگ بنا رہا، سامنے پہاڑی پر گولے گرتے تھے، ہم نے کافی مشکل وقت دیکھا ہے، اب بالکل امن ہے اور کوئی بھی مسئلہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی اکّا دکّا واقعات ہو جاتے ہیں۔ دھوپ بھی اچھی تھی اور موسم بھی خوشگوار تھا، ہوٹل کے عقب میں ایک نالہ بہہ رہا تھا جو کہ کافی شور پیدا کر رہا تھا، سڑک بھی نئی بنی ہوئی لگتی تھی، انھی خوبصورت یادوں کے ساتھ، ہم نے دو گھنٹے آرام کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔

تیمر گرہ: دیر کا دروازہ

تیمر گرہ، لوئر دیر کا ضلعی صدر مقام ہے، یہ دریائے پنج کورہ کے کنارے پر واقع ہے۔اس کی بلندی سطح سمندر سے ستائیس سو فٹ ہے۔اس مقام کی ایک اہم بات یہ ہے، کہ اس جگہ قدیم تہذیبوں کے آثار پائے گئے ہیں۔آثار قدیمہ کی مزید تلاش کے لیے کھدائی بھی جاری ہے۔ کھدائی سے پتہ چلا ہے، کہ اس علاقے میں پانچ سو سال قبل مسیح میں بھی لوگ آباد تھے، ان میں سے اکثریت آتش پرست تھی۔ تیمر گرہ سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ پختون ہیں اور ان میں سے بھی اکثریت یوسف زئی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہم تیمر گرہ سے گزر کر آگے جا رہے تھے، سڑک کے دونوں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی، سڑک کافی بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی، دھوپ تھی لیکن گرمی نہیں تھی۔ایسے ماحول میں، میں لاہور کی گرمی بھول گیا تھا۔ شام بھی ہو رہی تھی اور لوگوں کو اپنے ٹھکانے پہنچنے کی جلدی تھی۔ لیکن ابھی تو ہمیں لواری ٹوپ سے بھی گزرنا تھا جو بذات خود ایک بڑا مرحلہ تھا۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ تیمر گرہ کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔اس سے آپ کو اس شہر کے متعلق جاننے کو ضرور کچھ نہ کچھ ملے گا، جو امید ہے کہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ریاست دیر متعلق ایک مفصل اور مفید کتاب شاہد سلیمان نے " گمنام ریاست دیر کے " نام سے لکھی ہے[1]۔ اس کتاب میں تیمر گرہ متعلق سے میں بھی کافی معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے کئی اور ویبس سے بھی مدد لی ہے[2]۔ جو میں جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

تیمر گرہ شہر دریائے پنجکوڑہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک پُر فضاء مقام کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مجھے بھی ایک رتبہ یہاں ٹھہرنے کا موقع ملا تھا۔ خالد وقاص صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہمارے ایک بہت ہی پیارے ساتھی، جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، نے ہماری تازی مچھلی سے ہماری تواضع کی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ دریا کی وجہ سے یہاں کولوگوں کو وافر مقدار میں مچھلی میسر ہے۔

تیمر گرہ میں سطح سمندر سے کوئی ستائیس سو کلومیٹر بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک معتدل موسم ہوتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ یہ شہر چار ہزار سال سے بھی پرانا ایک شہر ہے۔ یہ سب یہاں سے کھدائی سے پتہ چلا ہے۔ کھدائی کے دوران کئی قبریں بھی ملی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی مکانات اور آگ کی قربان گاہیں بھی یہاں پائی گئی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں کے قدیم باسی آتش پرست تھے۔

تیمر گرہ میں سب ہی پختون لوگ رہتے ہیں۔ یوں تو یہاں پر کئی قبائل آباد ہیں، لیکن یوسفزئی، ابراہیم خیل، اتمان خیل اور عمر خیل سے تعلق رکھنے والے اکثریت میں ہیں۔ یہاں کی اہم مذہبی شخصیات میں تور بابا (عبدالرحیم خان) بے حد مشہور ہیں۔ عبدالرحیم خان کا تعلق باجوڑ سے تھا، وہ سترہویں صدی کے آخر میں منڈل (باجوڑ ایجنسی) سے ہجرت کر کے تیمر گرہ میں آباد ہوئے، وہ ایک انتہائی متقی شخص تھے۔

تیمر گرہ شہر کے وسط میں ایک لکڑی کی مسجد ہے، جسے باباجی کی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اس کی شان و شوکت برقرار ہے۔ یہاں ایک بڑی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ

---

https://www.scribd.com/document/462318953/Gumnaam-riyasat-e-dir-by-Sulaiman-shahid-adocate-vol-2[1]
https://dbpedia.org/page/Timergarahttps://en.[2]
https://www.graana.com/blog/everything-you-need-to-know-about-timergara/
https://en.wikipedia.org/wiki/Timergara

یہ مسجد 1899ء میں یہاں رہنے والے ایک روحانی پیشوا میاں گل محی الدین نے بنوائی تھی، ان کا تعلق یوسف زئی قبیلے سے تھا۔

اس مسجد کی خوبصورت بات یہ ہے، کہ اس کے دروازے، ستون، شہتیر، فرش اور چھت، غرض پوری مسجد سب لکڑی سے بن ہوئی ہے۔ میں یہ مسجد دیکھ تو نہیں سکا، لیکن اس کی تصاویر ضرور دیکھی ہیں، جن سے اس کی خوبصورتی اور عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

مقامی لوگوں کے مطابق، مسجد کے لیے لکڑی اس وقت کے نواب دیر محمد شریف خان نے فراہم کی تھی۔ اسے بنانے کے لیے، پشاور سے عبدالقادر نامی ایک مشہور کاریگر کو لایا گیا تھا، جس نے بڑی مہارت سے ستونوں، دروازوں اور کھڑکیوں پر نقش و نگار اور نقاشی کی، جو انتہائی دیدہ زیب ہے۔

تیمر گرہ سے آگے کئی چھوٹے بڑے قصبات ہیں۔ لواری ٹاپ سے پہلے، دیر کا قصبہ آتا ہے۔ دیر اس علاقے کا ایک مشہور قصبہ ہے،اسے دیر خاص بھی کہتے ہیں۔ یہ قصبہ ریاست دیر کا صدر مقام بھی رہا ہے۔ والیان ریاست کے دور میں ہونے والی تعمیرات کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ 1996ء میں دیر کے علاقے کو لوئر دیر اور اپر دیر میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دیر ایک قدیم علاقہ ہے۔ دیر کے معنی عربی میں ایک عبادت گاہ کے ہیں۔ دیر کی تاریخ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس علاقے میں، چار ہزار سال پرانی تاریخ کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں بدھ مت، گندھارا، آریاؤں کے آثار اس بات کو ثابت کرتے ہیں، کہ یہ علاقہ ہمیشہ سے لوگوں کے لیے باعثِ کشش رہا ہے۔

ہمارے راستے میں صاحب آباد نام کا ایک قصبہ بھی آیا جس کے متعلق مجھے اتنا معلوم تھا کہ یہاں سے ایک بااثر خاندان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ ان میں سے ایک صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب بھی ہیں جو 2013 سے 2018ء تک پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کے خاندان کے لوگ اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ دیر کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس سے آپ کو اس علاقے کے متعلق جاننے کو کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا، مجھے امید ہے کہ یہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

دیر: ایک مسلمان ریاست جو دوسو سال تک قائم رہی

دیر جو کبھی ریاست دیر کا صدر مقام تھا، دریائے دیر کے شمال میں واقع ہے۔ مالاکنڈ سے اس کا فاصلہ 110 کلومیٹر ہے۔ برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مطابق اس کے ساتھ ہی کبھی اخوند خیل کی ریاست بھی تھی[1]۔ وادی دیر کو، کاشکر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ایک زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں وافر مقدار میں پھل پیدا ہوتے ہیں، البتہ پہاڑوں پر کافی بڑے رقبے پر جنگلات بھی موجود ہیں۔ دیر کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے ایک مضمون ملا، جسے فضل حق اور فضل الرحمان نے لکھا ہے[2]۔

میری آپ سے یہ گزارش ہوگی، کہ آپ دیر کی تاریخ پڑھنے سے پہلے ہم ایک نظر اس علاقے کے جغرافیہ پر بھی ڈالتے ہیں۔ دیر کے شمال میں دروش اور چترال واقع ہے، یہاں سے چترال کا فاصلہ نوے کلومیٹر ہے۔ راستے میں لواری ٹاپ ہے۔ اب یہ راستہ سرنگ بن جانے کی وجہ سے سارا سال کھلا رہتا ہے، پہلے سردیوں میں یہ راستہ بند ہو جاتا تھا۔ اس طرح دروش اور چترال کے لوگوں کا پاکستان سے رابطہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ سردیوں میں چترال اور دروش سے لوگ افغانستان سے ہوتے ہوئے پشاور پہنچ گئے تھے۔ میں پہلی مرتبہ لواری ٹاپ سے گزر کر ہی گیا تھا، اس وقت سرنگ نہیں بنی تھی۔

دیر کے شمال مشرق سے ایک سڑک نکلتی ہے، جو شیر نگل اور وادی کمراٹ کی طرف جاتی ہے اور آگے یہ سڑک کالام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے، کہ اس علاقے میں آنے کے لیے کالام کا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، یعنی سوات سے بحرین اور کالام اور وہاں سے

---

https://www.britannica.com/place/Dir-Pakistan[1]
[2]Central Asia Journal No. 75, Winter 2014
HISTORY OF DIR VALLEY PAKISTAN: FROM ARYANS UP TO THE ARRIVAL OF AFGHAN PASHTUNS
Fazlul Haq* Fazlur-Rahman**

پھر بائیں مڑ کر دیر کی طرف جانے والی سڑک کے ذریعے دیر پہنچا جاسکتا ہے۔ دیر کا کالام سے فاصلہ 120 کلومیٹر کے قریب ہے۔ دیر کے جنوب میں مالاکنڈ سے آنے والی سڑک ہے۔ دیر کا مالاکنڈ سے فاصلہ کوئی 140 کلومیٹر ہے۔دیر کے مغرب میں افغانستان کی سرحد ہے، دیر شہر سے اس کا فاصلہ کوئی 15 سے 20 کلومیٹر ہی ہوگا۔ اسی وجہ سے زمانہ قدیم سے لوگ افغانستان سے دیر آتے تھے اور دیر سے پھر وہ میدانی علاقوں کی طرف تشریف لے جاتے تھے۔

دیر کے ارد گرد ہر طرف پہاڑی علاقے ہیں جو انتہائی سرسبز ہیں۔ میں آج بھی اس بات پر حیران ہوں کہ دیر جیسے خوبصورت علاقے سیاحوں کی پسندیدہ جگہ کیوں نہیں ہیں؟اس کی کیا وجہ ہے؟ کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اور ممکن ہے درست نہ ہو، کہ دیر والوں کی مضبوط مذہبی اور سماجی روایات اور ان کی تہذیب و تمدن، سیاحوں کی آمد میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ سیاح جہاں بھی جاتے ہیں، وہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنا کلچر بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں اور یہ بات شاید دیر کے لوگوں کو پسند نہیں ہے۔

اس لئے میں نے کبھی بھی لاہور میں کسی بھی صاحب سے یہ نہیں سنا، کہ وہ دیر کی سیاحت کو جارہا ہے۔ اگر وہ دیر گیا بھی ہے، تو صرف اس لیے کہ اسے آگے کمراٹ ویلی یا چترال جانا تھا۔ میں نے اب تک پاکستان کے جتنے بھی علاقے دیکھے ہیں، ان میں دیر ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں کے رہنے والے بھی بڑے مہمان نواز بھی ہیں اور دریا دل بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ اپنے انسانی حسن کے اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں ۔ یہاں کے لوگ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ،اپنے خدوخال کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں۔

یہ ایک بہترین علاقہ ہے، یہاں کا موسم بھی بے حد خوبصورت اور معتدل ہے اور ہر طرف ہریالی بھی اس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر لاتعداد قسم کے پھل بھی پیدا ہوتے ہیں، جو انسانی صحت کے لئے بے حد مفید ہیں۔

ایک بات یہ بھی ہے، کہ اس علاقے میں انگریزوں اور مقامی لوگوں کے درمیان جتنی بھی جنگیں ہوئیں وہ یا تو مالاکنڈ کے علاقوں میں ہوئیں یا اس کے ساتھ مہمند اور باجوڑ میں ہوئیں۔ ایک آدھ جنگ چترال میں بھی ہوئی۔ چترال کے لوگوں نے جنگ کی بجائے انگریزوں سے صلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ان کی ریاست انگریزوں کی ایک حلیف ریاست بن گئی تھی۔ دیر کی ریاست کے حکمرانوں نے بھی انگریزوں سے صلح ہی میں زندگی سمجھی۔ لیکن عام آدمی نے کبھی بھی دل سے انگریزوں کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیر کے یہ علاقے

جنگ وجدل سے دور رہے ہیں۔ البتہ جب طالبان کے دور میں بہت زیادہ مسائل کھڑے ہوئے، تو دیر بھی اس سے بے حد متاثر ہوا، میرا خیال ہے کہ دیر لوئر زیادہ متاثر ہوا۔

مجھے چار مرتبہ دیر سے گزرنے کا موقع ملا۔ ہر دفعہ یہاں ٹھہرنے کا موقع بھی ملا۔ اکثر دریا کے کنارے ہمارا قیام ہوتا تھا۔ اب تک یاد رہنے والی باتوں میں سے دریا کا کنارا، ارد گرد بے شمار سبزہ اور ان کی خوشبو قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ارد گرد ایسے پرندے بھی دیکھے جنھیں پہلے کبھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب تک یہ سب کچھ یاد ہے۔

فضل حق اور فضل الرحمان نے اپنے مضمون میں، ایک بہت ہی دلچسپ بات لکھی ہے، جو میرے دل کو بھی بھلی لگی اور جس سے میری نظر میں اہل دیر کی عزت احترام میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک انگریز جس کا نام ڈیورنڈ تھا، نے دیر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ چترال سے کشمیر جانا چاہ رہا تھا۔ اس کے لئے بہت آسان راستہ یہی تھا، یعنی دیر کی وادی سے گزرے، تیمر گرہ کے پاس سے باجوڑ اور پھر وہاں سے مسلم باغ اور شبقدر سے ہوتے ہوئے پشاور۔ اس نے جب لوگوں سے مشورہ کیا تو سب نے کہا کہ دیر اور باجوڑ کے راستے واپس جانا ناممکن ہے۔ یہاں کے لوگ اسے زندہ سلامت نہیں جانے دیں گے۔ مقامی سرداروں نے اسے تحفظ کا یقین بھی دلایا۔ لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ دیر اور باجوڑ کے بہادر لوگ کسی بھی انگریز کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس انگریز نے باجوڑ کے لوگوں کے لئے "نپولینز آف باجوڑ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ تھا، انگریزوں کی نظر میں یہاں کے لوگوں کا مقام۔ دیر اور اس علاقے کی جغرافیائی صورتِ حال دیکھنے کے بعد اب میں آپ کی خدمت میں یہاں رونما ہونے والے چند اہم تاریخی واقعات کا احوال پیش کروں گا۔

اس تحریر کے لیے میں نے فضل حق اور فضل الرحمان کے مضمون سے مدد لی ہے[1]۔ یہ ایک طویل مقالہ ہے، میں اس کا خلاصہ ہی پیش کروں گا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو یہ مقالہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

دیر میں بسنے والے لوگوں کی سخت مزاجی کی وجہ سے انگریزوں نے اس علاقے میں آنے سے گریز ہی کیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ قدیم زمانے میں دیر مختلف ناموں سے پہچانا جاتا تھا، جیسے گورائی، یغستان، بلورستان اور مسگا وغیرہ۔ پہلی مرتبہ دیر کا نام بدھ دور میں

---

[1] http://journals.uop.edu.pk/papers/06%20Fazlul%20Haq%20.pdf

استعمال ہوا تھا۔ اس کا مطلب 'خانقاہ' ہے۔ اس وقت دریائے پنجکورہ کے دونوں کناروں پر بدھ مت کی کئی خانقاہیں موجود تھیں، اس لیے اسے دیر کہا جانے لگا۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان تمام علاقوں پر، ہندو ہی حکومت کرتے تھے، جیسے راجا جے پال، پشاور کا حاکم تھا۔

وادی دیر کی تاریخ ایک قدیم تاریخ ہے اس کا ایک مختصر ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔ اسے دہرانا مناسب نہیں ہے۔

اس علاقے میں کون پہلے آئے؟ غزنوی، غوری یا یوسف زئی۔ اس کے متعلق اس مضمون میں لکھا ہے کہ سولہویں صدی کے آغاز میں یوسف زئی پہلا قبیلہ تھا، جو یہاں آیا تھا۔ میں نے مالاکنڈ کے متعلق لکھتے ہوئے یہ بتایا ہے، کہ مالاکنڈ کے لوگ غزنوی کی فوج کے لوگوں کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ اس علاقے کے کچھ حصے پر غزنوی لوگ پہلے آئے ہوں اور کچھ جگہوں پر دیگر لوگ۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ مستقل طور پر ایک حاکم کی حیثیت سے یہاں رہنے والے یوسف زئی ہی تھے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ یوسف زئی یہاں کیوں آئے؟

اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے، کہ افغانستان میں اس وقت کے حکمران سلطان الغ بیگ، جو ترک بادشاہ تیمور کے پوتے اور بابر کے چچا تھے، نے یوسف زئیوں کا قتلِ عام کیا اور ان کے اہم رہنماؤں کو چن چن کر مارا۔ قبیلے کے بہت کم لوگ اس قتل عام میں بچ سکے، جن میں دو مشہور افراد یعنی ملک شاہ منصور اور ان کے بھتیجے ملک احمد بھی تھے۔

یہ لوگ اپنے قبیلے کے بچ جانے والے لوگوں کے ساتھ دیر آ گئے، انھوں نے اپنے قبیلے کی بحالی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ پھر وہ وقت آیا، جب یوسف زئی دیر سے لے کر سوات اور پشاور کے قرب و جوار تک کے علاقوں کے حاکم بن گئے۔

ملک احمد، شیخ مالی اور شاہ منصور یوسف زئی قبیلے کے بڑے کمانڈروں اور رہنماؤں نے یہاں کے دیگر قبائل خصوصاً دلازاک قبیلے کے ساتھ جنگیں لڑیں اور آخر 1523ء میں دلازاک قبیلے کے خلاف آخری جنگ جیت کر ایک وسیع علاقے پر اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔

یوسف زئی جہاں ایک اچھے جنگجو تھے، وہیں پر علمی میدان میں بھی آگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے سیاستدان، پالیسی ساز اور سماجی امور کے ہر شعبے میں ماہر بھی تھے۔ انھوں نے یہاں پر شراکت زمین کی ملکیت کا نظام متعارف کروایا۔ یوسف زئی قبیلے نے مختلف

گروہوں کے درمیان زمین اور وسائل کی تقسیم کے لیے قواعد و ضوابط بھی تیار کیے اور ان کا نفاذ بھی کیا، اسے ویش کا نام دیا گیا۔ اس سے اس علاقے میں امن بھی قائم ہوا اور خوشحالی نے بھی دروازے پر دستک دی۔ شیخ مالی کا متعارف کرایا گیا، ویش سسٹم ایک بہترین نظام تھا، جسے جاننے کی بے حد ضرورت ہے۔

یوسف زئی سیاسی معاملات میں بھی بے حد ماہر تھے۔ جب ظہیر الدین بابر باجوڑ کے قبائل سے جنگ کر رہا تھا تو اس وقت یوسف زئی نے بابر کے ساتھ سفارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ رشتہ داری بھی کر لی۔ اس کے بعد وہ ترقی کرتے کرتے مغلوں کے قریب ہوتے گئے اور اپنی ریاست میں بھی توسیع کرتے گئے۔ پھر وقت گزرتا گیا اور وہ وقت آن پہنچا جب دیر میں خان حکومت کرنے لگے۔ یہ لوگ کون تھے؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

دیر کے اس دور کی بات کرنے کی خاطر میں نے ایک مضمون جو سعید گل صاحب نے DIR IN THE PAGES OF HISTORY کے نام سے لکھا ہے[1] اور دوسری ایک تحریر جو دیر رائل فیملی کی ویب پر موجود ہے[2] سے مدد لی ہے۔ یہ دونوں مضامین کافی طویل ہیں۔ میں نے ان کی مدد سے ایک مختصر رُوداد بیان کر رہا ہوں۔

دیر کو فتح کرنے میں تین قبیلوں (یوسف زئی، ترکانزائی اور عثمان خیل) کا اہم کردار ہے۔ بعد میں پائندہ خیل کے لوگوں نے چترال اور افغانستان کے ساتھ تجارتی راستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کے ایک فرد، جن کا نام اخون الیاس خان تھا، ایک بہت بڑے عالم تھے اور ایک متاثر کن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ دیر گاؤں کے ہی رہنے والے تھے۔ وہ اخون خیل کہلاتے تھے اور انھوں نے اپنے آپ کو دیر کے خان کہلانا شروع کر دیا اور یوں دیر ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔

یہاں کچھ دیر رک، کر اخون لفظ کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ لفظ اخون ہے، جسے اخوند بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی تصدیق ہمارے ایک مہربان دوست فدا محمد خان صاحب نے کی ہے۔ اخون کی تاریخ کافی دلچسپ ہے۔ اس نام کے ایک بزرگ "اخون سید بادشاہ" سوات میں بھی ہو گزرے ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک مضمون

---

[1] https://www.academia.edu/34661230/DIR_IN_THE_PAGES_OF_HISTORY

[2] http://dirroyalfamily.blogspot.com/p/history.html

پڑھنے کو ملا، جو سوات انسائیکلوپیڈیا پر موجود ہے، جس میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے[1]۔

یہ بات مسلمان معاشرے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں، عیسائیوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اُن لوگوں کے لیے کوئی ایک خاص لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو مذہبی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ مسلمان ایسے لوگوں کے لیے مولوی، مولانا، حضرت صاحب، پیر، صاحبزادہ اور اخون جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اپنے مذہبی پیشواؤں کے لئے ہندو برہمن اور عیسائی پوپ، پادری، بشپ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اخون کی بھی تاریخ کچھ ایسی ہی ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں ایسے قابلِ احترام حضرات کے لیے مولوی یا مولانا کا لفظ بولا جاتا ہے، ترکی میں بھی ایسا ہی ہے۔ مولوی لفظ جلال الدین رومی اور ان کے پیروکاروں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ترک عام طور پر لفظ مولوی کو صوفی اسلام کے پیروکاروں سے جوڑتے ہیں۔ افغانستان کے بعض حصوں میں مولانا کے بجائے عام طور پر ملا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے جس کا مطلب استاد، معلم یا مرشد ہوتا ہے۔ اہلِ فارس ملّا کی بجائے لفظ اخون کا لفظ استعمال میں لاتے ہیں۔ افغانستان کے ایک بڑے حصے میں فارسی بولی جاتی ہے۔ اس لیے یہ دونوں لفظ ہی رائج رہے ہیں۔ جیسے ملّا عمر جو طالبان کے ایک بڑے لیڈر تھے۔

میرا خیال ہے کہ دیر اور سوات میں بسنے والے لوگ افغانستان سے ہی آئے تھے، اس لیے وہ دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے والوں کے لیے، اخون کا لقب ہی استعمال کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، کہ ہمارے گاؤں میں مسجد میں خطیب اور امامت کا فریضہ سرانجام دینے والے صاحب کو میانہ کہتے تھے۔ ان کے خاندان کا ہر فرد میانہ ہی کہلاتا تھا۔

لقب کا رواج عام ہونے سے ایک نئی روایت کی بنیاد پڑ گئی۔ اب لوگ اپنے نسب، یعنی قبیلے کی بجائے اپنے لقب سے پہچانے جانے لگے، جیسے قاضی، مفتی، صاحبزادہ، مولوی، میاں، ملا، اخونزادہ، پیران، صاحبزادگان اور شیخان وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے خاندانوں کی نسب سے پہچان ختم ہو گئی۔ ہمارے شہر ٹوبہ میں قاضی بھی آباد تھے اور مفتی بھی۔ اب لوگ انھیں برادری کی بجائے ان کے خاندان کے لقب سے جانتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک مثال جناب قاضی حسین احمد صاحب کی بھی ہے اور دیر سے تعلق رکھنے والے صاحبزادہ یعقوب

---

[1] https://swatencyclopedia.com/2020/06/2405/

صاحب کی ہے۔ حتیٰ کہ خواتین کے نام کے ساتھ بھی صاحبزادی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اب ہم پھر سے اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اخون الیاس خان، کوہان درہ کے پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ چودہ سال کی عمر میں ہی ہندوستان میں رہنے والے، ایک روحانی پیشوا شیخ میاں نور کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ وہ حضرت بنور صاحب کے مریدوں میں شامل ہوگئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے، کہ کس طرح مغل بادشاہ شاہ جہاں کے ڈر سے بنور صاحب مکہ مکرمہ چلے گئے۔ اس طرح ان کی تربیت ہوئی۔ بعد میں وہ دیر کی خان ریاست کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے دور میں دیر ایک بہت ہی چھوٹی ریاست تھی۔ خان اخون خان الیاس کا انتقال 1676ء میں ہوا، ان کا مقبرہ لوئر دیر لجبوک درہ میں واقع ہے۔

ان کے بعد خان مولانا اسماعیل خان (1676-1752) ریاست دیر کے حاکم بنتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کے قائم کردہ طریقے کو اپنائے رکھا۔ وہ خود بھی عالم دین تھے، انھوں اپنی فوج بھی قائم کی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مغل حکومت کمزور ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ ان کی قبر لوئے بابا کے نام سے مشہور ہے۔

ان کے بعد خان غلام خان (1752-1804ء) جنہیں اسلامی علم پر خاصا عبور حاصل تھا، خان بنے۔ اس دور میں ریاست دیر نے کافی ترقی کی۔ یہ وہ دور ہے، جب ابدالی کے حملوں کے بعد مغل حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریز اور سکھ طاقت پکڑ رہے تھے۔ اس خان نے یہاں پر موجود ہندوؤں کے خلاف جنگ بھی کی اور اس طرح اس علاقے سے ہندو کوچ کر گئے۔

ان کے بعد خان ظفر خان (1804-1814ء) کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ، دیر میں مدارس کا قیام ہے۔ وہ ایک جنگجو حکمران تھا۔ اسی دور میں کوہستان میں ہندو محلات کو تباہ کیا گیا اور دیر خاص میں ایک شاہی محل بھی تعمیر کیا گیا۔

کسی کے محل گرادیے گئے اور اپنے محل بنا لیے گئے۔

ان کا دورِ حکومت دس سال تک رہا۔ ان کی قبر وڑوک بابا کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے چار بیٹوں کے نام خان قاسم خان، خان نسیم خان، خان ظاہر خان اور خان بھکو خان تھے۔

اس کے بعد خان قاسم خان (1814-1822ء) کا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے صرف آٹھ سال تک حکومت کی۔ ان کے دور میں ریاست دیر اسمار، کنڑ (افغانستان) اور

سخا کوٹ مردان تک وسیع ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک عظیم لیڈر اور جنگجو سمجھتے تھے۔اس نے افغانستان اور مغل بادشاہوں سے تعلقات بھی قائم کیے۔

بڑے آدمی کے بڑے دشمن۔۔۔

ایسا ہی خان قاسم خان کے ساتھ ہوا، ان کے کئی مخالفیں پیدا ہو گئے اور پھر ایک دن یہ افسوس ناک واقعہ ہوا کہ انھیں ان کے ایک بیٹے آزاد خان نے قتل کر دیا (اس میں کتنی صداقت ہے، معلوم نہیں)۔ان کا مقبرہ (خان شہید قبرستان) کے نام سے مشہور ہے جسے شاہی خاندان کے افراد کی آخری آرام گاہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ انجام ہوا ایک عظیم جنگجو کا۔ یاد رہے کہ یہ بات اس ویب سائٹ پر لکھی ہوئی ہے۔

http://dirroyalfamily.blogspot.com/p/history.html

خان قاسم خان کے قتل کے بعد، حسبِ معمول اس کے بیٹوں میں تخت کے لیے جنگ شروع ہو جاتی ہے۔اس دور میں کئی بار ریاست دیر کا حکمران بدلتا ہے۔ یہ کشمکش تیرہ سال تک چلتی رہتی ہے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ چترال کے مہتر کے کہنے پر، اس کے داماد اور بھتیجے خان غزن خان کو دیر پر حکمرانی کے لیے چنا گیا۔ اس نے اپنے سسر کی مدد سے اپنے بھائیوں کو شکست دی۔ ایک کو قتل کر دیا اور دو فرار ہونے میں کامیاب گئے، اس طرح صرف سترہ برس کی عمر میں خان غزن خان دیر کا خان بن گیا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جنگِ آزادی کے وقت غزن خان انگریزوں کا مخالف تھا۔ یہ بات انگریزوں کو بھلا کب گوارا تھی۔ انگریزوں نے 1863ء میں غزن خان کے ساتھ جنگ کا فیصلہ کیا۔اس جنگ میں غزن خان اور یوسف زئی قبیلے نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور کامیابی حاصل کی۔

خان غزن خان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ ایک جنگجو اور اسلامی ذہن رکھنے والا شخص تھا۔ اس کا زیادہ وقت جنگوں میں گزرا۔ اسی دور میں سوات میں ایک بزرگ سیدو بابا بھی تھے جنھوں نے سوات ریاست کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یاد رہے کہ سوات کی ریاست یوسف زئی قبیلے نے قائم کی تھی۔ یہ وہی قبیلہ تھا جنھوں نے کبھی دیر کو فتح کیا تھا۔ دیر کے شاہی خاندان کی تین سو سالہ تاریخ میں خان غزن کا 46 سال کا دور سنہری دور مانا جاتا ہے۔

خان غزن خان، اپنی عمر کے آخری ایام میں جب بیمار ہوئے تو ایک مرتبہ پھر ان کے بیٹوں میں حکمرانی کے لیے جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک طویل خانہ جنگی کے نتیجے خان رحمت اللہ خان (1870-1884ء) جو ایک بڑا جنگجو تھا، ریاست دیر کا خان بنتا ہے۔

یہ دور ایک طرح کا خانہ جنگی کا دور تھا۔ پھر یہاں پر وہی داستان دہرائی جاتی ہے جو پورے ہندوستان میں کم و بیش ہر جگہ دہرائی گئی، یعنی باہمی خانہ جنگی میں ایک گروہ کسی غیر ملکی کو دعوت دیتا ہے۔

اس بار یہ کام عمارا خان، خان جندول نے کیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ خان رحمت اللہ خان کو شکست نہیں دے سکتا، تو اس نے انگریزوں کو مدد کے لیے بلوایا۔ یاد رہے اس وقت تک انگریزوں کا پنجاب، سندھ، بلوچستان سمیت خیبر پختونخوا موجودہ تمام علاقوں پر مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ چترال ریاست کے ساتھ بھی انگریزوں کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جب عمار خان نے انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا، تو انھوں نے اسے ریاست دیر کا خان تسلیم کر لیا اور اسے ہر طرح کی مدد کا یقین بھی دلایا۔ اسی دور میں ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ کھڑا ہو گیا جس پر ریاست دیر کے خان راضی نہ تھے۔ اس موقع پر انگریزوں نے عمارا خان کی مدد کی، جو رحمت اللہ خان سے جنگ کر رہا تھا۔ رحمت اللہ آخری سانس تک لڑتا رہا، حتیٰ کہ وہ 1884ء میں فوت ہو گیا۔

اس طرح سے انگریزوں کو ریاست دیر کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل گیا۔

خان محمد شریف (1884-1897ء) اپنے والد رحمت اللہ خان کی وفات کے بعد دیر کا خان بنا۔ اسے تخت پر ٹک کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ عمارا خان جو شریف خان کا بہنوئی تھا، نے اسے شکست دے دی، جس کے نتیجے میں شریف خان کو دیر سے جلاوطن ہونا پڑا۔ عمارا خان نے چترال پر بھی حملہ کر دیا۔ اس وقت تک انگریزوں اور چترال کے حکمرانوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں مہتر نے انگریزوں کو مدد کے لیے پکارا۔

اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خانِ دیر اور میاں گل عبدالحنان آف سوات نے خان آف جندول پر حملہ کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے کہ کس طرح انگریزوں نے خان محمد شریف خان کو دیر واپس دلوایا۔ انگریزوں کی مدد سے خان بننے والے شریف خان نے انگریزوں سے معاہدہ کیا کہ دیر کے حکمران خان کی بجائے نواب کا لقب استعمال کریں گے۔ اس کے بدلے دیر کے نوابوں نے انگریزوں کو اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ وہ یعنی

نواب انھیں پشاور تا چترال روڈ بنانے دیں گے اور اس علاقے میں ٹیلی گراف اور پوسٹ آفس کا نظام قائم کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ 1897ء میں ہوا۔ اسی کے نتیجے میں دیر کی حدود کا تعین کیا گیا۔ ایک بڑی ریاست کو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ایک صاحب نے باہمی تنازعات کو حل کرنے کے لیے، ایک غیر ملکی جس نے ہندوستان پر زبردستی قبضہ کر رکھا تھا، کو خود آنے کو دعوت دی تھی۔۔۔

وہ آیا اور پھر قیامِ پاکستان تک یہیں رہا!

سب نواب، راجے، مہاراجے، مہتر، والی اس کے غلام بن گئے!

یہاں سے، ریاست دیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے پہلے نواب محمد شریف خان (1895-1904) تھے۔ اسی دور میں 1895ء میں مالاکنڈ ایجنسی قائم کی گئی اور اس کا سربراہ پولیٹیکل ایجنٹ ہی دیر اور چترال ریاست کا اصل مالک تھا۔ دونوں ہی اسے جواب دہ تھے۔

یہ تھی غلامی کی بدترین شکل!

دیر کے پہلے نواب محمد شریف خان کا دور بدامنی کا دور رہا۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے، کہ اسی دور میں نواب نے برطانیہ کی مدد سے دیر میں ایک اسپتال بنایا۔ بعد میں اسے سوات اور جندول کے قبائلیوں نے تباہ کر دیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جب نواب شریف خان کو دیر، سوات اور جندول کا نواب مان لیا گیا۔ لیکن یہ سلسلہ کچھ زیادہ دیر تک چل نہ سکا۔ یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے۔

ریاست دیر کے دوسرے نواب اورنگزیب خان بنے، جن کا دور 1904ء سے لے کر 1924ء تک کا ہے۔ ان کا دور بھی بدامنی کا دور ہی مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب خان کے 20 سالہ دورِ حکومت میں 45 جنگیں لڑی گئیں۔ نواب اورنگزیب خان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ ایک صحیح اسلامی سوچ رکھنے والا نہایت متقی شخص تھا۔ اس نے اپنے بے شمار دشمنوں کو معاف کیا۔

ریاست دیر کے تیسرے نواب شراون خان (میاں گل جان خان آف منڈا جندول) تھے۔ نواب میاں گل جان خان بہادر ایک سخت گیر نواب تھا۔ یہ شخص پشاور بالاحصار قلعے میں

کیسے قید ہوا اور پھر کس طرح اس کی رہائی ہوئی، یہ سب تفصیل بے حد دلچسپ ہے۔ یہاں اس کا ذکر مناسب نہیں۔

ریاست دیر کے چوتھے نواب محمد شاہ جہاں خان 1924ء سے 1960ء کا ہے۔ محمد شاہ جہاں کا بچپن لڑائیوں ہی میں گزرا۔ اس لیے وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ گدی کی کشمکش میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شاہ جہاں نے اپنے والد کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں کے بقول اس نے اپنے والد کو زہر دیا اور تین دن تک اس کی لاش چھپائے رکھی۔

تخت کی جنگ ہوتی ہی ایسی ہے۔۔۔ کل بھی اور آج بھی۔۔۔

شاہ جہاں نے اپنے وفاداروں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کیا اور اپنے مخالفین کو سخت سزائیں دیں۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کو ٹھنڈے پانی میں تیرنے کا حکم دیا، جس سے وہ دریائے پنجکوڑہ میں غرق ہو گئے۔ لوگ آج بھی اس کے مظالم کا ذکر کر کے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔

شاہ جہاں کے دور سے پہلے بھی اور اس کے دور میں بھی، سال میں دو مرتبہ برطانوی فوج پشاور سے چترال جاتی تھی۔ اس کے لیے اسے دیر سے گزرنا ہوتا تھا۔ شاہ جہاں کو یہ بات ناپسند تھی۔ اس نے انگریزوں کو اس کام سے کیسے روکا، یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے۔ شاہجہاں بے حد چالاک آدمی تھا۔ وہ ایک طرف اپنے آپ کو انگریزوں کا وفادار ثابت کرتا تھا اور دوسری طرف قبائل کو ان کے خلاف گوریلا کاروائیاں کرنے کو کہتا تھا۔ یہ سب اس نے کیسے کیا؟

یہ ایک بے حد دلچسپ داستان ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، موقع ملے تو ضرور پڑھیے گا۔

آپ اس کی اس کامیاب پالیسی کا اندازہ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب ہندوستان بھر میں انگریزوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا، اس وقت وہ دیر سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ریاست دیر کی تاریخ میں نوابزادہ عالم زیب خان بھی ایک اہم فرد ہے۔ وہ نواب نہیں تھا، بلکہ نوابزادہ تھا۔ وہ نواب اورنگزیب خان کا بھائی تھا۔ اس کی شاہجہاں سے ایک گہری دشمنی تھی۔ پھر ایک طویل خانہ جنگی کے بعد 1940ء میں دونوں میں صلح ہو گئی۔

عالم زیب خان کمزور تھا، اس لیے گدی پر شاہجہاں ہی براجمان رہا۔ جب قیامِ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی، تو 1944ء میں عالم زیب خان نے قائدِ اعظم سے کراچی میں ملاقات کی اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ قائدِ اعظم نے انھیں مردان اور باجوڑ کا مسلم لیگ کا صدر بھی بنایا۔ اس بات کا نواب شاہجہاں نے برا منایا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ فروری 1948ء کو دیر نے پاکستان سے الحاق کر لیا۔ یہ اسی طرح ہوا جس طرح پاکستان میں موجود کوئی تیرہ دیگر ریاستوں نے کیا۔

اس پر یہ جانتے ہوئے کہ شاہجہاں کا ظلم شاہی خاندان کے نام پر بد نما داغ ہے، عالم زیب خان نے اس کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ پھر سے ایک جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کے نتیجے 1960ء میں نواب شاہ جہاں کے دور کا خاتمہ ہوا۔ اسی کے دور میں یہاں جماعت اسلامی کے ایک رہنما جن کا تعلق صاحب آباد سے تھا، پر بھی بے حد ظلم کیا گیا تھا۔

نواب شاہ جہاں خان ایک سخت گیر اور ظالم حکمران تھا۔ اس کے دور میں قلم رکھنا بھی ایک جرم تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو تعلیم سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے خلاف ایک بغاوت شروع ہو گئی۔ اس پر جنرل ایوب خان نے نواب شاہ جہاں خان کو گرفتار کرکے اسے دیر سے نکال لیا اور اکتوبر 1961ء میں اس کے بیٹے محمد شاہ خسرو کو ریاست کا نواب (حکمران) مقرر کیا۔ نواب شاہ خسرو نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ پاکستان آرمی میں بطور میجر جنرل خدمات انجام دے رہے تھے۔ انھیں یہاں کا نواب بنایا گیا، لیکن اصل اختیارات پولیٹیکل ایجنٹ (PA) کے پاس تھے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہجہاں، جسے چنگیز خان ثانی کے نام سے پکارا جاتا ہے ،کے دور میں جہاں ظلم کی انتہا تھی، وہیں دیر میں جرائم کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ مجرم کو بے حد سخت سزا دیتا تھا۔

کہتے ہیں کہ دیر میں صرف ایک ہی ظالم تھا اور وہ تھا نواب شاہ جہاں۔

پھر وہ وقت آیا جولائی 1969ء کو سوات اور چترال کی طرح دیر ریاست کو بھی خیبر پختونخوا (اس وقت کے صوبہ سرحد) میں شامل کرکے ایک ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ بعد میں انتظامی مشکلات کی وجہ سے 1996ء میں ضلع دیر جو کہ ایک بہت بڑا اور وسیع ضلع تھا کو، دیر لوئر اور اپر دیر میں تقسیم کیا گیا۔

اور یوں ایک ریاست جس کی بنیاد اخون الیاس خان نے رکھی تھی اور جو کوئی تین سو سال کے لگ بھگ قائم رہی، آخرکار ختم ہو گئی۔ بعد میں وراثت کی تقسیم پر قانونی جنگ شروع ہو گئی جو شاید اب تک بھی جاری ہے۔۔۔

یہ تھی ایک مختصر داستان اس ریاست کی جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔

مکیں چلے جاتے ہیں، مکاں باقی رہتے ہیں۔۔۔

جب میں جناب خالد وقاص صاحب کے ہمراہ چترال جا رہا تھا تو ہم دریا کے کنارے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گئے۔ یہ ہوٹل اس سڑک پر واقع ہے جو کمراٹ کو جاتی ہے۔ وہاں ایک بڑا گیٹ بھی بنا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا''کمراٹ وادی میں خوش آمدید''۔اس ہوٹل کا کھانا بے حد لذیز تھا۔ میں بعد میں باورچی سے بھی ملا۔ اس کی خدمت بھی کی اور اس کے کھانے کی تعریف بھی۔

میں نے اکثر یہی دیکھا ہے کہ ہم ٹپ وغیرہ صرف ویٹر (بیرے) کو ہی دیتے ہیں۔ میرے خیال میں لذیز کھانا تو باورچی کا کمال ہوتا ہے۔ اس لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ باورچی کی حوصلہ افزائی بھی کروں اور اس کی خدمت بھی۔۔۔

میں دیر میں واقع عجائب گھر نہ دیکھ سکا۔ زندگی رہی تو پھر سہی۔

لواری ٹاپ: ایک انوکھا تجربہ

اپنے پہلے سفر میں، ہم لواری ٹاپ جسے لواری پاس بھی کہتے ہیں، سے ہو کر گئے تھے، جو کہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا پہاڑ ہے، جس میں سے ایک راستہ بنا ہوا ہے۔ یہ راستہ بھی دس ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ البتہ پہاڑ کوئی بارہ ہزار فٹ سے بھی بلند ہے۔ اس علاقے میں یہ ایک کم اونچائی والا پہاڑ ہے، کئی پہاڑ پندرہ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ یہ پہاڑ چترال اور دیر کے درمیان واقع ہے۔

ہم دیر سے گزر کر لواری ٹاپ کی طرف جا رہے تھے، اب شام بھی ہو رہی تھی، سب لوگ تھکاوٹ سے چکنا چور تھے، میرا حال بھی زیادہ اچھا نہیں تھا، کیونکہ میں واحد تھا، جو لاہور سے آیا تھا اور مجھے سفر میں بیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ فاروق صاحب اور اسمٰعیل صاحب سے، اب دوستی بھی ہو گئی تھی۔ بس میں کچھ خواتین بھی تھیں اور بس ڈرائیور نے حسب معمول فضول گانے لگا رکھے تھے۔ شام بھی ہو رہی تھی اور سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ جب ہم لواری ٹاپ کے پاس پہنچے، تو دیکھا کہ ہر طرف برف جمی ہوئی تھی، پوچھنے پر پتہ چلا کہ ابھی سرنگ تیار نہیں ہے، اس لیے ہمیں پہاڑ کے اوپر سے ہی جانا پڑے گا۔

میں چترال کے بقیہ تین اسفار کے دوران (2019, 2019, 2021)ء میں اسی ٹنل گزرا تھا۔ اُس وقت یہ مکمل طور پر تیار نہیں تھی۔ پہلی مرتبہ تو اِس میں دھوئیں کو نکالنے کا مناسب بندوبست نہیں تھا۔ اگر آپ دیر کی طرف سے داخل ہوتے ہیں تو نو کلو میٹر طویل ٹنل جس میں ابھی تک ہوا کے اخراج کا مناسب بندوبست نہیں ہے، گزرنا پڑتا تھا۔ جو ضروری انتظامات ہونے چاہیے، وہ ابھی تک نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے دن میں دو مرتبہ ٹنل کو بند کر دیا جاتا ہے۔ دوپہر کو دو گھنٹے کے لیے ٹنل کو بند کرتے ہیں۔ اس دوران جو اندر دھواں اکٹھا ہوا ہوتا ہے، وہ نکل جاتا ہے اور ہوا صاف ہو جاتی ہے اس طرح شام میں بھی ایک یا دو گھنٹے کے لیے ٹنل کو بند کر دیتے ہیں۔ بڑی ٹنل اور چھوٹی ٹنل کے درمیان میں ایک کھلا میدان ہے وہاں لوگ انتظار کرتے ہیں۔ اس جگہ بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے۔ اب ٹنل کی صورتِ حال کافی بہتر ہے۔

صدیوں سے دیر سے چترال جانے کے لیے اس پہاڑ کو عبور کیا جاتا ہے۔ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے یہ راستہ بند ہو جاتا تھا اور چترال کا پاکستان سے زمینی راستہ کٹ جاتا تھا، اس دوران چترال کے لوگ دریائے کنڑ سے جلال آباد پہنچتے تھے اور وہاں سے پشاور۔

ہم شام کے وقت لواری ٹاپ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک سڑک بل کھاتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت ابھی سرنگ نہیں بنی تھی۔ سڑک کی اونچائی اور اس کے بل دیکھ کر خوف طاری ہو گیا۔ سڑک بھی کافی خستہ تھی اور برف ابھی تک سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ راستہ بھی تنگ تھا اور موڑ بھی کافی خطرناک تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہمارے ڈرائیور کا اس علاقے کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔

ہماری کوچ میں بلال نام کا ایک لڑکا تھا، جو مشکل راستوں پر گاڑی سے اتر کر پتھر وغیرہ ہٹاتا تھا۔ جہاں کہیں بھی برف پگھل چکی ہوتی، تو نیچے سے پتھر نکل آتے اور گاڑی کے لیے آگے جانا محال ہو جاتا۔ ایک جگہ پانی اکٹھا ہو گیا اور ہمارا ڈرائیور گھبرا گیا۔ وجیہہ اور قاسم جو اس کمپنی کے مالک تھے، کے پاس ایک بڑی جیپ تھی۔ انھوں نے باری باری ہمیں یہ جگہ عبور کرائی، اوپر سے شام بھی ہو رہی تھی اور بھوک بھی ہمیں بے انتہا لگی ہوئی تھی۔ کافی دیر کے بعد ہم اوپر ٹاپ پر پہنچے اور پھر نیچے اترائی شروع ہو گئی۔ اترائی بھی بہت سخت تھی، بہر حال اللہ اللہ کر کے ہم سب خیریت سے نیچے اتر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم نے رات میں کونگر فورٹ پہنچنا تھا جہاں ہمارا قیام تھا۔

لواری ٹنل کی کہانی بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کی تعمیر کتنے وقت میں مکمل ہوئی؟ اس دوران اس کی لاگت میں کس قدر اضافہ ہوا؟ یہ سب معلومات ہمارے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہاں اس کا ایک مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

لواری ٹنل: بیالیس سال میں مکمل ہونے والا منصوبہ

چترال، پاکستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ مشرق میں یہ گلگت سے ملتا ہے اور مغرب میں اس کی سرحد افغانستان کے علاقہ جلال آباد سے ملتی ہے۔ واخان کی پٹی، جو کہ تاجکستان اور پاکستان کے درمیان چند کلومیٹر چوڑی پٹی ہے جس پر افغانستان کا کنٹرول ہے، چترال کے شمال میں واقع ہے۔ اس جگہ جانے کی خواہش دل میں اب تک باقی ہے۔ اس کے جنوب میں دیر، کمراٹ اور سوات واقع ہے۔ کمراٹ کے علاقے سے ایک راستہ کالام تک جاتا ہے۔ اس طرح چترال سے کالام تک بذریعہ کمراٹ بھی جایا جا سکتا ہے۔ گرمیوں میں، دیر کی

طرف سے لوگ لواری پاس سے گزر کر جاتے تھے اور سردیوں میں برفباری کی وجہ سے یہ راستہ بند ہو جاتا تھا اور یوں چترال کا رابطہ پاکستان سے منقطع ہو جاتا تھا۔ یہ عرصہ تقریباً پانچ ماہ تک رہتا تھا۔ گرمیوں میں چترال اور اس کے لوگ ضرورت کی چیزوں کا ذخیرہ کر لیتے۔ سردیوں میں اگر انھیں بہت ضرور ہی پاکستان کے دوسرے شہروں میں جانا ہوتا، تو اس کے لیے پہلے افغانستان جاتے، وہاں سے جلال آباد سے ہوتے ہوئے پشاور جاتے تھے۔ یہ ایک طویل اور مشکل سفر تھا، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار بھی موجود نہ تھا۔

دیر اور چترال کے درمیان ایک بہت اونچا پہاڑ موجود ہے جس کا نام لواری ٹاپ ہے۔ ٹاپ اور پاس دونوں انگریزی الفاظ ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نام انگریزوں نے دیے تھے۔ اس سے پہلے اسے کس نام سے پکارا جاتا تھا، معلوم نہیں۔ یہ کوہ ہندوکش کی ایک چوٹی ہے۔ لواری ٹاپ اور لواری پاس دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لواری ٹاپ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے، جبکہ لواری پاس دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے بہت اونچائی پر بھی جا کر آپ پہاڑوں کے درمیان میں سے گزر کر جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے، کہ ہوائی راستہ بھی لواری ٹاپ کے پاس سے ہی ہو کر جاتا ہے۔ 1954ء میں چترال کے مہتر کا جہاز یہاں پر گر گیا تھا، جس میں ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اب بھی جہاز کو اس علاقہ سے گزر کر جانا پڑتا ہے جو کہ انتہائی خطرناک ہے۔ موسم خراب ہو تو خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

اہل علاقہ کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہاڑوں کے درمیان میں سے سرنگ بنائی جائے۔ یہ ایک انتہائی مہنگا منصوبہ تھا، جس کے لیے کافی دیر تک بات چلتی رہی۔ آخر کار ستمبر 1975ء میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یہاں پر سرنگ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس منصوبہ کا مقصد تھا، کہ اس سرنگ میں گاڑیوں کی بجائے ایک ریل کی پٹڑی بچھائی جائے گی اور اسے آنے جانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ بھٹو صاحب کی حکومت 1977ء میں ختم ہو گی، بعد میں اس پر کام رک گیا، پھر پرویز مشرف صاحب کے دور میں ستمبر 2005ء میں اس پر دوبارہ کام کا آغاز کیا گیا اور ریل کے منصوبے کی جگہ ایک سڑک کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ 2009ء میں پھر اس پر کام رک گیا اور بعد میں نواز شریف صاحب اور زرداری صاحب کے دور میں اس پر آہستہ آہستہ کام ہوتا رہا اور آخر کار جون 2017ء کو اس کا با قاعدہ آغاز ہو گیا۔

بیالیس سال کے ایک طویل سفر کے بعد اس سرنگ کا آغاز ہو گیا۔ اب اللہ کے فضل سے چترال کا رابطہ پورا سال پاکستان کے دیگر علاقوں سے رہتا ہے۔ البتہ سردیوں میں برفباری کی

وجہ سے اس علاقہ میں سفر کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور یوں چترال کے لوگ پاکستان کے دیگر علاقوں سے جڑے رہتے ہیں۔

لواری ٹنل دو حصوں پر مشتمل ہے؛ ایک پونے نو کلومیٹر طویل ہے جبکہ دوسرا دو کلومیٹر۔ تقریبا گیارہ کلومیٹر طویل ٹنل بیالیس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کا سنگ بنیاد ذوالفقار علی بھٹو نے رکھا اور افتتاح نواز شریف کے دور میں ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو چترال کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا چترال جانے کے لیے راستہ کے متعلق آپ کو کچھ بتاؤں۔

نگر فورٹ: والئ چترال کی رہائش گاہ

لواری ٹاپ سے اترنے کے بعد ہم چترال جانے والی سڑک پر آ گئے۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ تھکاوٹ اور سردی کے ساتھ خطرناک سفر کے تجربے نے بے حد تھکا دیا تھا۔ مجھے سفر میں چوبیس گھنٹے ہو رہے تھے۔ قاسم خان نے بتایا کہ یہ رات ہم نگر فورٹ ٹھہریں گے۔ نگر فورٹ جانے کے لیے ایک خاص مقام تک تو کوسٹر جا سکتی تھی اور اس کے آگے جانے کے لیے ہمیں جیپوں میں جانا تھا۔ رات ایک بجے ہم نگر پہنچ گئے۔ دور سے دیکھا، کہ ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کے لان میں دیے روشن تھے اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خیموں کی مدد سے ایک خوبصورت ڈائننگ ہال بنایا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انتظامیہ کی کارکردگی کو بے حد سراہنے کو جی چاہا۔

نگر فورٹ ایک ایسی خوبصورت جگہ ہے، جسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے، اس کے تین اطراف دریا بہتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے لکڑیوں کا پل ہے، جس پر سے صرف ایک جیپ گزر سکتی ہے۔ ہم رات کو جب یہاں پہنچے تو پرانی بلڈنگ کے ساتھ ایک نئی بلڈنگ بھی بنی ہوئی تھی، جو کہ کرائے پر دی گئی تھی اور یہاں پر آ کر سیاح ٹھہرتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد، ہم ایک کیمپ میں سونے کے لیے چلے گئے۔ ہماری عمروں کا خیال کرتے ہوئے مجھے، فاروق مان صاحب اور ڈاکٹر اسمٰعیل قریشی صاحب کو ایک کیمپ میں سونے کے لیے بھیج دیا گیا، میری زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا، اس سے پہلے میں کبھی بھی کیمپ میں نہیں سویا تھا، تھکاوٹ اور بے آرامی نے ہمیں جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اگلے دن جب دن چڑھا اور روشنی ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت مقام ہے۔ عمارت کے سامنے ایک بہت ہی پرانا باغ تھا، جس میں بے شمار پھل تھے۔ میں اور فاروق صاحب سیر کے لیے باہر نکل گئے، ساتھ ہی ایک اسکول تھا، جس پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ کچھ گھر وہاں بنے ہوئے تھے۔ اس

طرح ایک خوبصورت سیر کے بعد ہم واپس آ گئے اور سیر کے بعد میں اپنی کتاب لے کر دریا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، یہ منظر آج تک میری نظروں کے سامنے ہے۔

مجھے نگر فورٹ میں اپنے چاروں اسفار میں ٹھہرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ جگہ میری پسندیدہ جگہ ہے۔ گرمیوں میں رات میں کافی دقت ہوتی ہے۔ کمرے اس قدر ہوادار نہیں، البتہ سردیوں، موسمِ بہار اور موسمِ خزاں میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

نگر فورٹ: دریائے چترال کے کنارے ایک جنت نما محل

اس سے پہلے کہ میں آپ کو سفر کی دیگر باتوں کی طرف لے جاؤں، میں چاہوں گا، کہ آپ کو نگر فورٹ کے متعلق کچھ بتاؤں۔ میرا خیال ہے کہ آپ جب بھی چترال آئیں، تو ایک رات کے لیے آپ ضرور نگر فورٹ میں رہائش اختیار کریں۔ لیکن گرمیوں میں نہیں، کیونکہ یہاں گرمی مناسب ہوتی ہے اور کمروں میں اے سی نہیں ہیں۔ نگر فورٹ، علی گڑھ کا امتحان پاس کرنے کی خوشی میں والد کا بیٹے کے لیے ایک تحفہ جو علم دوستی کی ایک نشانی بھی ہے۔

دِیر سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر، دریائے چترال کے مشرقی کنارے پر ایک عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کا نام نگر فورٹ ہے۔ عام طور پر فورٹ کا لفظ قلعہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ قلعہ نہیں ہے۔ یہ ایک رہائشی عمارت ہے، جس کے ارد گرد ایک دیوار ہے۔ عمارت والے حصّہ کے ساتھ ایک بڑا لان ہے۔ عمارت کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک بڑا باغ ہے۔ جس کے پاس سے دریا گزرتا ہے، اس باغ میں بہت ساری اقسام کے پھلوں کے درخت ہیں۔ اسے کچھ بھی کہیں، یہ ایک ایسی جگہ ہے جس کے تین اطراف دریا کا پانی ہے، بیچ میں ایک نسبتاً بلند جگہ پر یہ عمارت قائم ہے۔

چترال کے مہتر، شجاع الملک نے اسے بیسوی صدی کے آغاز میں تعمیر کروایا تھا اور یہ ان کی سردیوں کی رہائش گاہ تھی۔ اب یہ عمارت مالکان نے سیاحوں کی رہائش کے لیے کھول دی ہے، یہاں پر چند کمرے ہیں، کھانے پینے کا بھی مناسب بندوبست ہے۔ اس کی تصاویر آپ فیس بک پر دیکھ سکتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ عمارت دریا کے مشرق میں واقع ہے، جب کہ سڑک، دریا کے مغرب میں واقع ہے۔ دریا کے اوپر ایک معلق پل لکڑیوں اور رسوں کی مدد سے بنایا گیا ہے، جس پر سے کار تو گزر سکتی ہے، لیکن اس سے بڑی سواری نہیں گزر سکتی۔ مجھے زندگی میں جو چند جگہیں پسند آئی ہیں، ان میں سے یہ ایک ہے۔ عمارت کے دونوں طرف برآمدے ہیں، اس سے آپ

سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے دونوں مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔اس سے لگتا ہے کہ معمار نے بادشاہ کے ذوق کے تسکین کا مکمل بندوبست کیا ہوا تھا۔

اب آپ بھی یہ لطف اٹھا سکتے ہیں، لیکن سفر شرط ہے۔

میں اس محل کے ڈیزائنز کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے اس میں سب سے زیادہ ذوق کی تسکین کا سامان کیا ہے، عمارت کے جنوب میں واقع ایک چھوٹا باغ، اس بات کا ثبوت ہے۔اس باغ کا ایک بڑا حصہ دریا کے ساتھ لگتا ہے۔ میں نے اس جگہ بیٹھ کر ایک کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کی ایک تصویر اب تک میرے دفتر کی دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ جو اس جگہ سے میری محبت کی نشانی ہے۔آپ کو بھی یہاں آنا چاہیے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے، کہ دیوار پر ریاست پٹیالہ کے راجا کے خطوط فریم کروا کر لٹکائے ہوئے تھے، جس سے یہ معلوم ہوا اس ریاست کا ریاست پٹیالہ جو کہ مشرقی پنجاب ہندوستان میں واقع ہے، سے گہرے تعلقات تھے۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق بھی ریاست پٹیالہ سے تھا۔ وہ لوگ اُس زمانے میں اتنی دور دراز جگہوں پر سیاحت اور شکار کے لیے آتے تھے اور یہ لوگ بھی جب پنجاب جاتے تھے، تو ان کے مہمان ہوتے تھے۔ وہ عمارت جو کبھی بادشاہوں کے رہنے کے لیے استعمال ہوتی تھی، اب میرے جیسے عام لوگ بھی اس میں رہ سکتے تھے۔

اسی کو کہتے ہیں کہ عمارتیں رہ جاتی ہیں اور مکیں چلے جاتے ہیں!

اس کے بعد بھی میں یہاں مرتبہ ٹھہرا تھا۔ ایک دفعہ خالد وقاص صاحب اور سعد مرتضٰی کے ساتھ اور دوسری مرتبہ اپنی اہلیہ اور نواسے سجاول کے ساتھ۔ میں نے اس عمارت کے ساتھ ایک باغ بھی دیکھا۔ جب ہم باغ میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا ایک بڑا باغ ہے اور اس کے مشرق میں دریا بہہ رہا ہے اور بہت پرانے درخت اس پر جھکے ہوئے ہیں۔

دریا کے کنارے، ایک چبوترا اور اس پر سایہ کیے ہوئے ایک بڑا درخت۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ اس چبوترے پر بیٹھ کر چترال کا مہتر اپنا دربار لگاتا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں، اس پر بیٹھا ہوا چترال کا مہتر اور ارد گرد خدمت کے لیے آئی ہوئی عوام جو دست بستہ حاضر تھی، دیکھ رہا تھا۔

بادشاہ تو پھر بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ چترال کا ہو یا دلّی کا!

جب میں اپنی اہلیہ اور نواسے کے ساتھ یہاں ٹھہرا تھا تو ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان گھوڑے پر سواری کر رہا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا، کہ وہ ایک پولو میچ کی تیاری کر رہا ہے۔ یاد رہے، کہ پولو اس علاقے کا قومی کھیل ہے۔ پولو بھی ایک انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اردو میں اسے شاید کسی اور نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نگر فورٹ کا اپنا ایک ویب پیج بھی ہے جہاں سے کافی معلومات مل سکتی ہیں[1]۔

نگر فورٹ سے آیون

نگر فورٹ میں دورات گزارنے کے بعد، ہم نگر فورٹ سے چترال روڈ پر چلتے ہوئے آیون پہنچ گئے۔ صبح کا وقت تھا، جیسے ہی ہم کوچ سے باہر آئے، تو دیکھا ایک سرسبز اور شاداب گاؤں تھا، جو کہ دریائے چترال کے کنارے پر واقع تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوبصورت لگا۔ آیون چترال سے بارہ کلومیٹر پہلے اور سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ پہاڑی علاقہ اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے لاہور کی نسبت زیادہ سرد تھا۔ ہمیں بتایا گیا، کہ ہم یہاں سے کالاش جائیں گے (اسے کیلاش بھی لکھتے ہیں) آیون سے کالاش تک کا سفر بذریعہ جیپ یا پھر کار پر طے کیا جاتا ہے۔ ہم سب لوگ یہاں اتر گئے اور مختلف کاروں میں بیٹھ کر کالاش کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے آج تک جتنے گاؤں دیکھے ہیں ان میں آیون ایک نہایت ہی خوبصورت گاؤں ہے اور ایک انتہائی دلفریب نظارہ دیتا ہے۔

Nagar Fort & Resorts Chitral[1]
https://www.facebook.com/NagarFortAndResortsChitral

آیون سے کالاش تک

کالاش کا ذکر جب بھی آتا ہے، تو اس کے نام کے ساتھ ایک منفرد قبیلہ اور منفرد طرزِ زندگی رکھنے والے لوگوں کا ذکر ضرور آتا ہے۔ کچھ لوگ اسے کافرستان بھی کہتے ہیں۔ میرا لاہور سے کالاش تک کا سفر، صرف اور صرف وادی کالاش دیکھنے کا تھا۔ آیون سے آگے صرف کار یا پھر جیپ جاتی ہے۔ اِس لیے ہم سب لوگ آیون اتر گئے اور ہم نے کاروں میں بیٹھ کر کالاش کی طرف سفر شروع کیا۔

کالاش کے لوگ تین مختلف وادیوں میں رہتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ تین مختلف دیہات میں رہتے ہیں۔ ان کے نام ہیں؛ بمبوریت، رُمبور اور بِریر۔ سب سے زیادہ کالاش لوگ بمبوریت میں رہتے ہیں اور یہیں پر ہی سالانہ چلم جوش میلہ ہوتا ہے، جو تین دن جاری رہتا ہے۔ اسے چلم جوشی میلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ میلہ مئی میں ہوتا ہے۔ ہماری منزل بمبوریت ہی تھی۔ آیون سے بمبوریت تک کی سڑک مٹی کی ہی بنی ہوئی ہے، نہایت ہی تنگ ہے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور بہت ہی خطرناک ہے۔ میں، فاروق صاحب اور قریشی صاحب ایک ہی کار میں تھے۔ ڈرائیور کافی ماہر تھا اور اچھی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں جلد خوف زدہ ہو جاتا ہوں اور اس طرح کے علاقے میں میرا یہ پہلا سفر تھا۔ اسی خوف کی حالت میں ہم ایک گھنٹے میں بمبوریت پہنچ گئے۔

بمبوریت، آیون سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ وادی کالاش سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ بلند ہے، اس لیے سردیوں میں کافی سردی ہوتی ہے۔ مئی میں موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ لیکن دن میں کافی گرمی ہوتی ہے، البتہ رات کو کافی ٹھنڈ ہوتی ہے۔ مغرب کے وقت ہم بمبوریت پہنچ گئے۔ بمبوریت دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ سڑک کے دونوں طرف گھر اور دکانیں ہیں۔ بازار کے آخر سے کالاش لوگوں کی آبادی شروع ہوتی ہے۔ ہم سب کو کالاش کے لوگوں کو دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔

ایک بڑے احاطے میں ہمارا کیمپ تھا جو بالکل ہی دریا کے کنارے پر تھا اور پانی کے بہنے کا شور بھی کافی تھا۔ کیمپ میں ہماری ملاقات ولی خان سے ہوئی جو کہ اس کیمپ کے مالک تھے۔ بے حد ملنسار اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ کیمپ میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ سب لوگوں کے

ٹینٹ لگے ہوئے ہیں اور ہمارا ٹینٹ دریا کے کنارے پر تھا۔ میں نے یہ ٹینٹ دیکھا تو مجھے بے حد خوف محسوس ہوا۔ میں نے قاسم خان سے کہا کہ ہمیں لکڑی سے بنا ہوا ہٹ دے دیں۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک ہٹ تھا اور وہ ہمیں الاٹ ہو گیا۔ یہ ہٹ بھی دریا کے کنارے پر تھا اور ہٹ میں تین لوگ سو سکتے تھے۔ ہٹ میں سب سے بڑی عیاشی یہ تھی، کہ اس میں اٹیچ باتھ تھا اور اس میں لائٹ کے لیے بلب بھی موجود تھے۔ اور تو اور موبائل فون چارجنگ کے لیے ایک ساکٹ بھی تھی۔ ہمارے گروپ کے اکثر لوگ ہمارے ہٹ میں ہی آ کر موبائل چارج کرتے تھے۔ اتنی بڑی عیاشی کے لیے ہم ربّ کریم کا شکر ادا کرتے ہوئے ہٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

ولی خان کا کیمپ اور دریا کا خوف

شام ڈھل چکی تھی اور سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد باہر نکلے، تو دیکھا کہ ایک طرف میس تھا جو کہ ایک ٹینٹ میں بنا ہوا تھا، اس کے ساتھ کھلی جگہ پر کھانا تیار ہو رہا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت منظر تھا، آٹھ کے قریب ٹینٹ لگے ہوئے تھے، ایک ایکڑ کے رقبے پر پھیلے ہوئے یہ ٹینٹس دلکش اور خوبصورت تھے۔

دریا کے کٹاؤ کی وجہ سے اس کا مغربی حصہ دریا برد ہو گیا تھا۔ میں نے راستے میں دیکھا تھا، کہ جن لوگوں کے گھروں کے سامنے سڑک دریا برد ہو گئی تھی، انھوں نے اپنے گھر کے کچھ حصے کو، لوگوں کو بطور سڑک استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی اور ساتھ ہی ہر گزرنے والی گاڑی سے بیس روپے ٹیکس لینا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح دریا بردگی کچھ لوگوں کے لیے آمدنی کا ذریعہ بن گئی اور عام لوگوں کے لیے سہولت۔ رات آٹھ بجے کے قریب، ہم سب لوگ کھانے کے لیے چلے گئے۔ یہ ایک خوبصورت منظر تھا۔ ٹینٹ میں بیٹھنے کے لیے بیس افراد کی جگہ تھی، یہ ایک بوفے تھا۔ ٹینٹ، بوفے اور رات کا سہانا موسم، قابل برداشت سردی، ساتھ میں بہتا ہوا دریا اور کالاش کی وادی۔ سب نے مل کر تمام تر منظر کو خوبصورت اور یادگار بنا دیا۔

رات گزارنے کے لیے ہٹ میں جانے سے پہلے کیمپ کے صحن میں آگ جلائی گئی اور سب لوگ اس کے آس پاس بیٹھ گئے۔ اس منظر کی نقشہ کشی بہت مشکل کام ہے۔ سب لوگ ارد گرد بیٹھ گئے اور اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق گانا شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھ ایک بڑی عمر کی محترمہ زہرا سپرا بھی تھیں، جو اپنی دو بھانجیوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنی مدھم آواز میں ساٹھ اور ستر کی دہائی کے مشہور گانے سنائے۔ ان کے میاں کا انتقال کئی برس پہلے ہو گیا تھا اور ان کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ ان کے گانے سب درد بھرے اور اداس کرنے والے تھے۔ یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔

میں حسب معمول سب سے پہلے سونے کے لیے چلا گیا۔ میرے بعد فاروق صاحب بھی آ گئے اور سب سے آخر میں قریشی صاحب تشریف لائے۔ جب ہم صبح اٹھے تو پتہ چلا، کہ باقی لوگوں نے اب سونے کے لیے جانا شروع کر دیا ہے۔ ہمارا ہٹ بالکل دریا کے کنارے پر تھا۔ صبح اٹھے تو خوبصورت منظر ہمارا منتظر تھا۔ ٹھنڈی ہوا، سامنے اونچے درخت، ساتھ میں بہتا ہوا دریا اور ماحول کی خاموشی، کیسے بھلائی جا سکتی ہے۔

پروگرام کے مطابق ہمیں کالاش میں دو دن اور تین راتیں رکنا تھا۔ اس طرح سارا دن ہمارے پاس تھا۔ مجھے اور فاروق صاحب کو چائے کی تلاش تھی۔ ہم کچن میں گئے اور تھوڑی سی کوشش سے، ہمیں چائے مل گئی۔ آثار یہ بتا رہے تھے کہ لوگ کافی دیر سے اٹھیں گے اور ناشتہ بھی دن چڑھے ہو گا۔ میں نے اور فاروق صاحب نے بازار کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے کیمپ کے ساتھ ہی فوج کا کیمپ تھا۔ میلے کی وجہ سے فوجیوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تھا۔ ہم نے بازار میں دیکھا کہ ایک دکان کھلی تھی اور ایک صاحب پکوڑے بنا رہے تھے۔ ہماری خوشی میں اضافہ ہوا اور ہم نے چائے اور پکوڑوں کے ساتھ اپنے دن کا آغاز کیا۔ بازار کی سیر کے بعد ہم سب واپس آ گئے۔ دیکھا کہ ناشتے کی تیاری ہو رہی ہے۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی، فضا بھی کافی خوشگوار تھی، ہم نے ٹینٹ میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔

ناشتہ کے بعد سب لوگ اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ میں بھی دریا کنارے لگے بینچ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ دوپہر کے بعد میں نے اور فاروق صاحب نے دریا میں نہانے کا پروگرام بنایا۔ سب لوگ حیران تھے کہ اتنے یخ پانی میں آپ لوگ کیسے نہائیں گے؟ ہم نے ایک صاحب سے کہا کہ ہماری نہاتے ہوئے تصاویر بنائیں۔۔۔

شاید یہ ہمارے آخری لمحات کی تصاویر ہوں۔۔۔

پانی انتہائی ٹھنڈا تھا۔ ہم دو عمر رسیدہ لوگ ایڈوینچر کے لیے نہا رہے تھے اور آخر کار ہم کامیاب ہو گئے۔

اب بھی وہ ٹھنڈا پانی اور نہانا یاد کر کے ایک جھرجھری سی آ جاتی ہے!

میں نے اپنے کیمپ سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پاور ہاؤس دیکھا، جو کہ پانی کی مدد سے بجلی بنا رہا تھا۔ میں نے اور فاروق صاحب نے اس کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ پاور ہاؤس دریا کی دوسری طرف تھا۔ ہم دونوں پل پر سے دوسری طرف چلے گئے۔ پاور ہاؤس میں موجود ایک شخص نے بتایا، کہ پلانٹ میں بیس کلوواٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ اس علاقہ میں نہ ہی کوئی اے سی ہے اور نہ ہی فریج وغیرہ استعمال کی جاتی ہے۔ صرف روشنی کے لیے بجلی درکار ہوتی ہے۔ بجلی کی قیمت بھی چار روپے فی یونٹ ہے اور کمرشل استعمال کے لیے بجلی چھ روپے فی

یونٹ ہے۔ یہ تمام تر پلانٹ چارسدہ کا بنا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ تھوڑی سی کوشش کرکے اس علاقے کے لوگوں کی زندگی میں خوشی لائی جا سکتی ہے۔

شام کے وقت ہم دریا کے دوسری طرف کرکٹ کھیلتے بچوں کی طرف چلے گئے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب، جن کے پاس ایک چھوٹا سا ڈرون تھا، انھوں نے اسے ہوا میں اڑایا جس سے سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ پھر وہی کل والی شام، ٹینٹ میں میس، بوفے اور بون فائر، آگ کے ارد گرد میلہ، اپنی اپنی آواز میں گانے، شغل میلہ اور ایک حسین منظر۔ ہمارے سامنے پہاڑوں کے بیچ میں سے نکلتا ہوا مکمل چاند، ان سب نے مل کر اس شام کو یادگار بنا دیا۔

کالاش: ایک صدیوں قدیم تہذیب

اِس سے پہلے کہ میں کالاش کے چلم جوش میلے کے متعلق بات کروں، میں چاہوں گا، کہ کچھ ذکر کالاش کا بھی ہو جائے۔

کالاش لوگوں کے آباؤاجداد کے متعلق بے شمار حکایتیں ہیں۔ کچھ لوگ، کالاش لوگوں کا تعلق افغانستان میں واقع نورستان کے علاقہ میں بسنے والے لوگوں سے جوڑتے ہیں، کچھ لوگ ان کو یونانی نسل سے منسوب کرتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ لوگ بڑی مدت سے اپنی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہر حکومت کی کوشش ہے، کہ ان کی ثقافت قائم رہے۔ ہم ان لوگوں کے محلوں میں بھی گئے اور ولی خان نے اخروٹ کے آٹے سے بنے ہوئے نان بھی کھلائے۔ کچھ لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں میں آنے کی دعوت بھی دی۔ میں نے ایک شخص کریم خان جس نے اپنے گھر سے چائے بنوا کے پلائی تھی، اس سے دوستی بھی کر لی۔ میں ایک مرتبہ اپنی اہلیہ اور نواسے کے ساتھ بھی کالاش میں ایک رات کے لئے رکا تھا۔ اس دوران ہم یہاں ایک کالاش کے گھر میں بھی گئے تھے۔

اس دوران بے شمار دلچسپ باتوں کا پتہ چلا جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

کالاش لوگ جانوروں کو گھروں سے دور رکھتے ہیں، اس جگہ کوئی بھی عورت نہیں جا سکتی ہے، اس لیے جانوروں کی دیکھ بھال کا سارا کام کاج مرد حضرات ہی کرتے ہیں۔ ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ ماہواری کے دنوں میں عورت کو گھر سے دور رکھا جاتا ہے۔ جب وہ پاک ہو جاتی ہے، تو اسے واپس گھر آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ گاؤں سے باہر ہم نے وہ گھر بھی دیکھا جہاں پر پانچ چھ عورتیں کھڑی تھیں۔ عورت صرف سیاہ چوغہ پہنتی ہے اور اُس کے اوپر زرد رنگ کی ٹوپی اور مالا وغیرہ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت کوئی دوسرا لباس نہیں پہنتی۔

ایک کالاش لڑکی نے مجھے بتایا، کہ وہ فیصل آباد میں کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ وہاں پر عام لڑکیوں کی طرح لباس پہنتی ہے، لیکن جب وہ یہاں پر آتی ہے، تو یہاں کا لباس پہنتی ہے۔ مرد حضرات جو دل کرے لباس پہن سکتے ہیں۔ کالاش لوگ اپنے مُردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ لکڑی کے ڈبے میں بند کر کے ایک مخصوص جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ شروع میں کچھ کپڑے اور ہتھیار بھی ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ لیکن اب ایسا نہیں کرتے۔ کالاش روایات کے مطابق شادی بھی ایک خاص طریقہ سے ہوتی ہے، جو کہ نہایت ہی دلچسپ ہے، جو کچھ یوں ہے۔

لڑکا اور لڑکی آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور محبت کی پینگیں پروان چڑھاتے ہیں۔ اِس بات کی خبر گھر کے کسی نہ کسی فرد کو دی جاتی ہے، لیکن عام نہیں ہوتی۔ چلم جوش کے میلے والے دن، یہ لڑکی اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ لڑکے کے گھر چلی جاتی ہے۔ لڑکے والے لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دیتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔ لڑکی کا خاندان اپنی لڑکی کو تلاش کرتا ہے اور آخر کار ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس طرح سے لڑکی اور لڑکے کی شادی ہو جاتی ہے۔ البتہ شادی کی باقی رسومات جس میں کھانا کھلانا، کپڑے وغیرہ دینا اور جانور وغیرہ دینا شامل ہیں، بعد میں ادا کی جاتی ہیں۔

لڑکے کا شادی کی رسومات پر بہت زیادہ خرچہ ہوتا ہے۔ لڑکی کو اپنی پسند کا لڑکا چننے کی مکمل آزادی ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر نہ رہنا چاہے، تو اسے زبردستی کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ لڑکے کے گھر ہی نہ جائے۔ بہت کم واقعات ہیں کہ کسی مسلمان لڑکے نے وہاں کی کسی کالاش لڑکی سے شادی کی ہو۔

جوش میلے کے موقع پر یہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ بڑی دیر تک تیاری کرتے ہیں۔ میلے کے لیے ایک میدان مخصوص ہے، جس پر اب چھت ڈال دی گئی ہے اور ایک سٹیج بھی بنا دیا گیا ہے۔ اس میلے کے دوران، کالاش لوگ کچھ دیر کے لیے آہ و بکا بھی کرتے ہیں اور سب اونچی آواز میں روتے ہیں، پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ سب لوگ اپنے آباؤ اجداد پر ہونے والے مظالم پر روتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی مسلمان بادشاہ نے زبردستی ان کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں سو کے قریب افراد نے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، نے دریا میں کود کر جان دے دی، لیکن اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا۔

کالاش کون لوگ ہیں؟ وہ کہاں سے آئے؟ ان کا مذہب کیا ہے؟ اس طرح کے بے شمار سوالات کے جوابات کی تلاش میں، میں نے کئی مضامین اور کتابوں سے مدد لی۔ اس سلسلے میں درج ذیل مضامین اور کتابوں سے مجھے کافی کچھ جاننے کو ملا۔

شاہ میر بلوچ کا مضمون جس کا عنوان ہے[1]

The last of the Kalasha

دی گارڈین میں چھپنے والے ایک مضمون[2]

---

[1] https://www.dawn.com/news/1465752

[2] https://www.theguardian.com/travel/2011/apr/17/pakistan-taliban-hindu-kush

Culture Kalash in Pakistan

زکرے سکڈ مور کا مضمون [1]

Tribe of Kalash: The Last Kafir

آؤٹ لک انڈیا میں چھپنے والا ایک مضمون [2]

Kalash: A Secret from the Hindu Kush Mountains

ڈاکٹر محمد کاشف علی کا ایک مضمون [3] Kalash Culture

قاسم ایوب اور ان کے ساتھیوں کا ایک مضمون [4]

The Kalash Genetic Isolate: Ancient Divergence, Drift, and Selection

میرے خیال میں کالاش ایک ہند آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قبیلہ صوبہ خیبر پختونخوا کے ایک دور دراز ضلع چترال میں آباد ہے۔ ان کے ہم مذہب دنیا بھر میں کہیں اور نہیں رہتے۔ یہاں یہ لوگ تین مختلف وادیوں میں آباد ہیں۔ کچھ لوگ ان کا تعلق افغانستان سے بتاتے ہیں جو کافی حد تک ایک درست بات ہے۔ افغانستان میں نورستان نامی ایک علاقے سے یہ لوگ نقل مکانی کر کے یہاں آبسے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نورستان، جسے کافرستان بھی کہا جاتا ہے، میں بسنے والے لوگوں کو کالاش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ افغانستان کے نورستانی لوگوں کی ثقافت، ان سے بہت حد تک ملتی ہے۔ یہ لوگ نورستان میں عربوں کی کابل میں آمد سے قبل صدیوں سے آباد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غزنوی اور تیموری دور میں ان لوگوں کو زبردستی اسلام قبول کرنے کا کہا گیا۔ اس ڈر سے کچھ لوگ موجودہ علاقے میں آبسے۔

کالاش لوگوں کے متعلق ڈی این اے کی مدد سے یہ جاننے کی کوشش کی گئی، کہ یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ اس کے متعلق ایک تحقیق جو قاسم ایوب اور ان کے ساتھیوں نے کی،

/https://peaceforasia.org/tribe-of-kalash-the-last-kafir[1]

[22]https://www.outlookindia.com/outlooktraveller/explore/story/70475/have-you-heard-about-the-kalash-tribe-of-pakistan

/https://www.worldhistory.org/Kalasha[3]

Am J Hum Genet. 2015 May 7; 96(5): 775–[4] 783.

بے حد مفید ہے[1]۔ ان کے مطابق ایک بڑے پیمانے پر سروے کے نتیجے میں اس بات پر اتفاق کیا گیا ہے کہ جنوبی ایشیاء، تقسیم ہند سے پہلے کا ہندوستان جہاں اب کوئی پونے دو ارب لوگ آباد ہیں، میں پہلی مرتبہ انسانوں کی آبادی پچاس ہزار سال پہلے شروع ہوئی۔ پہلی مرتبہ آباد ہونے والوں کی اکثریت افریقہ سے آئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے ہندوستان آنے کے لیے کئی راستے اختیار کیے۔ ان میں سے کچھ نے جنوبی ساحلی راستے سے سفر کیا اور کچھ افغانستان کے راستے ہندوستان آئے۔ کالاش لوگ ان قدیم شمالی یوریشین کی اولاد میں سے ہیں۔ مزید تحقیق سے ان کے متعلق بہت کچھ جانا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کالاش یونانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ سکندر اعظم کے دور میں یہاں آئے تھے۔ ان کی پہلی آبادی نورستان (افغانستان) میں تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 1895ء میں افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمٰن نے نورستان کا علاقہ فتح کیا اور یہاں کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا اور علاقے کا نام نورستان رکھا، یعنی کافرستان کے مقابلے میں نورستان۔ اسی دور میں بہت سے لوگ مذہب کی تبدیلی سے بچنے کے لیے چترال آگئے۔

زیادہ تر کا یہی موقف ہے کہ یہ لوگ جنوبی ایشیاء سے اس علاقے میں آئے تھے۔ صحیح کیا ہے؟ شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔ میں جو جان سکا اس کے مطابق ، یہ لوگ مختلف علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ یہ لوگ یونانی ہیں، آریا ہیں، یا افغانستان سے آئے ہیں، درست نہیں ۔ ممکن ہے کہ یہاں پر بسنے والے لوگ ان تینوں مقامات سے آئے ہوں۔ بعد میں یہاں رہنے کی وجہ سے ایک جیسی بود و باش اختیار کر لی ہو۔ یہ میرا قیاس ہے، ہو سکتا ہے درست نہ ہو، یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، جو میں نے سمجھا وہ بیان کر دیا ہے۔

کالاش وادی، سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ یہاں پر ارد گرد کئی اونچے پہاڑ ہیں، جن میں تنگ گھاٹیوں کے ساتھ ساتھ یہاں پر بے شمار

---

[1] The Kalash Genetic Isolate: Ancient Divergence, Drift, and Selection

Am J Hum Genet. 2015 May 7; 96(5): 775–783.

نایاب نباتات اور حیوانات بھی موجود ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم برفانی چیتے اور ہمالیائی کالے ریچھ شامل ہیں۔

اس علاقے میں کالاش باشندے تین وادیوں میں بستے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی آبادی بمبوریت میں آباد ہے۔ اس کے بعد رمبور اور بریر بھی ہیں۔ اس کی جنوب مغربی سرحد افغانستان کے علاقے کنٹر سے ملتی ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ کبھی افغانستان میں بھی آباد تھے۔ کالاش لوگ پاکستان کی سب سے چھوٹی مذہبی اور نسلی اقلیت کے طور پر پاکستان میں آباد ہیں۔ میرے علم کے مطابق، اس نسل اور اس مذہب کے ماننے والے پاکستان اور افغانستان سمیت دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں رہتے۔ یہی وجہ کہ بے شمار لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا وجود ختم نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف پاکستان میں بہت سی مذہبی تنظیمیں یہ چاہتی ہیں کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اس کام کے لیے کہیں بھی زبردستی سے کام نہیں لیا جارہا۔ البتہ چیدہ چیدہ واقعات ضرور رونما ہو رہے ہیں، جن یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کئی کالاش لڑکیاں مسلمانوں سے شادی کرکے مسلمان ہو رہی ہیں۔ میں ایک ایسی ہی لڑکی سے ملا ہوں، جو فیصل آباد میں ایک کالج میں پڑھتی تھی اور جس نے بمبوریت میں رہنے والے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی ہے۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی ایک وجہ کالاش لوگوں کے سخت رواج بھی ہیں، جو شاید نئی نسل جو پڑھ لکھ جاتی ہے، پسند نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر ہر عورت پر لازم ہے کہ ہر ماہ ماہواری کے دنوں میں گاؤں سے باہر بنائی گئی ایک عمارت میں خاندان سے الگ رہے گی۔ میں نے ایسا ہی ایک مکان بمبوریت میں دیکھا تھا جہاں چند عورتیں رہ رہی تھیں۔ ان کے مذہب کے مطابق ماہواری کے دنوں میں عورت ناپاک ہو جاتی ہے اور اس سے بیماری پھیلنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات ایک پڑھی لکھی نوجوان عورت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے جس کی وجہ سے نوجوان لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کر رہی ہیں۔ اس سے کئی لوگوں میں بے چینی بھی پھیل رہی ہے اور اسے کالاش تہذیب کے خاتمے سے تشبیہ دیتے ہیں۔

کالاش لوگوں کی زبان علاقے میں بولی جانے والی زبانوں سے ایک مختلف زبان ہے، جسے کالاشہ کہا جاتا ہے۔ یہ زبان بھی زیادہ تر بولنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ میں بمبوریت میں ایک اسکول میں بھی گیا۔ استاد بچوں سے بات اپنی زبان میں کر رہا تھا، جبکہ درس و تدریس کے لیے اردو یا انگریزی کا ہی سہارا لیا جا رہا تھا۔

میں نے کالاش میں ہر عمر کی عورت کو لمبے سیاہ ڈھیلے کپڑے پہنے ہی دیکھا ہے جس پر سرخ اور زرد رنگ سے کڑھائی کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ رنگ برنگے موتیوں اور مالا کی بھی بے حد شوقین ہیں۔ وہ عمر بھر یہی کالا قمیض پہنتی ہیں۔ کالاش مرد پاکستانی قومی لباس یعنی شلوار قمیض واسکٹ پہنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے شمالی علاقے میں پہنی جانے والی ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔

چلم جوش میلہ

چلم جوش میلہ کالاش کے لوگوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ ہمارا کیمپ اس جگہ کے بالکل قریب تھا، جہاں چلم جوش میلہ ہوتا ہے. اس لیے ہم نے بے شمار کالاش لوگوں کو پاس سے گزرتے دیکھا، ایک خاص رنگ میں ملبوس تمام عورتیں اور بچیاں دیوانہ وار جارہی تھیں۔ مرد حضرات اس دن بے تحاشا شراب نوشی کرتے ہیں۔ ایک نیم مدہوش شخص کو اس کے ساتھی سہارا دے رہے تھے۔ ارد گرد سے آئے ہوئے لوگ بھی کالاش لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

میلہ کی جگہ کافی بلندی پر واقع ہے۔اس طرف جانے والے راستے پر فوج کے جوان موجود تھے، تلاشی لازمی جزو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ موبائل فون کی بھی اجازت نہ تھی۔ یہ میلہ صبح دس بجے شروع ہوا۔ سٹیج پر سیاسی اور سرکاری لوگ براجمان تھے۔ میدان کے بیچ میں لکڑی کی ایک چھت تھی، باقی جگہ سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ بے شمار لوگ سیڑھیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے گروپ میں موجود لڑکیوں نے کالاشی عورتوں کے لباس کرائے پر لیے اور میلہ میں شامل ہو گئیں۔ ہم سب لوگوں نے خوب لطف اٹھایا اور اپنے کیمپ میں واپس آ گئے۔ ہمارے کیمپ کی انتظامیہ کا لڑکا بھی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لے آیا اور وہ اس بات پر اتراتا تھا، اس کا پورا خاندان اس بات پر بہت خوش تھا۔ میلے کی شام بھی ایک یادگار شام تھی۔ رات کافی دیر تک سب لوگ آگ کے ارد گرد بیٹھے رہے اور بعد میں وہی اپنی آواز میں گانے۔

بمبوریت سے چترال

تیسرے روز صبح ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ راستے میں بمبوریت عجائب گھر دیکھا۔ یہ عجائب گھر ایک بڑی سی عمارت میں ہے۔ اس عمارت میں کالاش کے لوگوں کے رہنے سہنے اور ان کے استعمال کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ کالاش قبیلے کے متعلق یہاں پر کافی معلومات موجود ہیں۔ اس عجائب گھر کی تیاری میں کافی محنت کی گئی ہے۔ حسب معمول اس عجائب گھر کو بھی غیر ملکی امداد پر مکمل کیا گیا ہے۔

چترال: ہماری اگلی منزل

بمبوریت سے ہم پھر کاروں میں بیٹھ کر آیون آئے، اور وہاں سے چترال آ گئے۔ مغرب سے پہلے ہم چترال میں داخل ہوئے اور دریا کنارے پامیر ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ یہ شام بھی انتہائی خوبصورت تھی۔ شہر کے چاروں طرف پہاڑ تھے۔ سورج غروب ہونے کا نظارہ بھی دیدنی تھا۔ ہمارے کمرے کے ٹیرس سے دریا، پل اور ایک قدیم باغ نظر آتا تھا۔ حسب معمول فاروق صاحب اور قریشی صاحب اور میں ایک کمرے میں تھے۔ کچھ دیر کے بعد بازار جا کر ہم نے روایتی کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ ہمارے ساتھ ایک اور صاحب بھی شامل ہو گئے جن کا تعلق کراچی سے تھا۔ بارش بھی ہو رہی تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ روایتی تندور اور چپلی کباب مل رہے تھے۔ ہم تمام تر صفائی اور صحت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اندر چلے گئے۔ روایتی روٹی اور چپلی کباب سے لطف اندوز ہوئے۔ بازار میں گھوم پھر کر یہاں کے لوگوں کی بود و باش کو جاننا چاہا۔ اور آخر کار تھک ہار کر ہوٹل واپس آ گئے۔

چترال سے لاہور

ہمارے سفر کا پانچواں دن ختم ہو گیا تھا۔ اب تھکاوٹ اور اکتاہٹ دونوں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ سب کو واپسی کی جلدی تھی۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ صبح چھ بجے تیار ہو جائیں۔ ہم تیار تھے لیکن روانگی نو بجے کے قریب ہوئی۔ اگلے دن صبح نو بجے ہم راولپنڈی پہنچے۔

دوپہر کے بعد میں لاہور پہنچ گیا، بے شمار یادوں ،اور قریشی صاحب اور فاروق صاحب کی دوستی کے ساتھ۔

رب العزّت کا شکر ہے، جس نے ہمارا یہ سفر بخیر و خوبی مکمل کروایا۔

چترال کا دوسرا سفر خالد وقاص اور سعد مرتضٰی کے ساتھ

بچپن میں جب بھی چترال کا لفظ سنتے تھے تو ایک خوبصورت وادی کا تصور سامنے آتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی بھی شخص کی خوبصورتی کو کسی چیز سے اگر تشبیہ دینا ہوتی تھی تو ہم اس کو چترالی کہتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا تعارف چترال سے تعلق رکھنے والے قاری حضرات اور علماء کرام کی وجہ سے ہے جو ملک بھر میں موجود ہیں، بالخصوص کراچی میں مساجد کی خدمت کے لیے قاری، مؤذن اور خطیب حضرات میں ایک واضح اکثریت کا تعلق چترال سے ہے۔ 2014ء میں، میں پہلی مرتبہ ایک ٹورسٹ گروپ کے ساتھ چترال آیا، تو صرف ایک رات ٹھہرا اور واپس چلا گیا۔ اب 21 اپریل 2019ء کو الخدمت فاؤنڈیشن کی ڈونرز کانفرنس کے سلسلہ میں چترال آنے کا موقع ملا۔ اس دورے میں سعد مرتضٰی، جو الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے ہیڈ آفس میں والینٹیئرز مینجمنٹ کے سربراہ ہیں اور محترم خالد وقاص صاحب، صدر الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا، کے علاوہ ایک انتہائی مخلص ساتھی اور نرم دمِ گفت گو، عدنان راز بھی، اس دورے میں میرے ساتھ تھے۔ پروگرام کے بعد ہمیں کچھ وقت سیر و تفریح کے لیے مل گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چترال کے چند مقامات کو دیکھا، اس دورے کی مختصر رُوداد آپ کے لیے حاضر ہے۔

جب میں دوسری مرتبہ اپریل 2019ء کو خالد وقاص اور سعد مرتضٰی کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا، تو اس وقت ٹنل میں سے گزرنے کی اجازت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ٹنل سے پہلے بھی اور ٹنل کے بعد بھی سڑک زیر تعمیر ہے۔ یہکوئی پچیس کلومیٹر کا فاصلہ ہے، جو زیر تعمیر ہے اور جب بارش ہوتی ہے، تو یہاں پر سڑک نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ بہت ہی مشکل راستہ ہے جب ہم وہاں سے گزرے تو اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور راستے کو دیکھ کر میرے بھی بارہ بج رہے تھے۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ گاڑیاں یہاں سے کیسے گزریں گی۔ مقامی افراد کو یہاں سے گاڑیاں گزارنے کا تجربہ تھا۔

خالد وقاص صاحب کی گاڑی نئی تھی، انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی گاڑی دیر میں کھڑی کر دیں گے اور ایک مقامی گاڑی میں سوار ہو کر آگے جائیں گے۔ ہماری گاڑی تھوڑی سی پرانی تھی اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس گاڑی کو جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، لیکن ہمیں بھی مناسب مشکل پیش آئی۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی گاڑی تبدیل کر لینی چاہیے تھی۔ اب بھی اگر آپ اپنی گاڑی پر جانا چاہیں تو آپ کو مشورہ یہی ہوگا کہ آپ دیر تک اپنی گاڑی میں جائیں اور دیر میں اپنی گاڑی پارک کریں اور وہاں سے مقامی گاڑی لیں جو ایسے راستوں کے لیے بہت مناسب ہوتی ہے اور ان کے ڈرائیور بھی اس راستے کو بخوبی جانتے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات تھی۔ اب چترال تک سڑک کافی بہتر ہے۔ اس لیے اپنی گاڑی پر جانے میں کوئی دقت نہیں ہے۔

ہم جاتے ہوئے کافی گہرے پانی سے گزرتے رہے اور مشکل سے زیر تعمیر راستے کو عبور کیا جو کہ خوفناک بھی تھا اور سنسان بھی۔ مجھے یاد ہے ایک جگہ ہمارے ڈرائیور نے گاڑی کو پانی میں ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں پر کتنا گہرا پانی ہے اور پانی کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ خالد صاحب کا ڈرائیور ہماری گاڑی کو لے کر وہاں سے گزرا اور اسے باہر لے کر آیا۔

اس موقع پر ہم دور کھڑے انتظار کر رہے تھے اور دعا کر رہے تھے، اوپر سے رات کا ایک بج رہا تھا۔ ارد گرد اونچے پہاڑ، سردی بھی، تیز پانی بھی گزر رہا تھا۔ خدانخواستہ اگر گاڑی میں کسی طرح کا نقص پیدا ہو گیا، تو ساری رات یہیں پہ کھڑے ہونا پڑے گا۔ یہ منظر اب تک میری آنکھوں میں ہے۔ جتنی دعائیں یاد تھیں وہ بھی ہم کر رہے تھے۔ جنگل سائیں سائیں کرتا ہو، ویرانہ ہی ویرانہ ہو، ناقابل برداشت سردی کا بھی سامنا ہو، دل میں خوف ہی خوف اور صبح سے مری سے چلے ہوئے براستہ ہری پور لوئر دیر میں ٹھہرتے ہوئے، ہمیں سفر کرتے ہوئے بھی کوئی بیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ ان سب کی موجودگی میں کیا کیفیت ہو گی؟ آپ اس کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ سعد مرتضٰی جسے پہلی دفعہ ایسے واقعات سے سامنا تھا، کا بھی بے حد خیال آتا تھا۔ ان سب نے مل کر اس سفر کو یادگار بنا دیا۔ اللہ کا بے حد شکر کہ ہم ان حالات سے گزرتے ہوئے رات دو بجے کے قریب نگر فورٹ پہنچ گئے۔

صرف دو سال پہلے تک، دیر سے چترال جانے کے لیے لواری ٹاپ کو عبور کرنا پڑتا تھا، جو کہ نہایت ہی ایک مشکل کام تھا۔ راستہ بھی بہت خطرناک تھا اور اکثر راستہ برفباری کی وجہ سے بند ہو جاتا تھا۔ یہ راستہ سال میں چار سے لے کر پانچ ماہ تک بند رہتا تھا، اس دوران اہل چترال کا رابطہ دیر اور سوات سے ختم ہو جاتا تھا۔ صدیوں سے، جب ابھی افغانستان اور پاکستان

کے نام سے ملک وجود میں نہیں آئے تھے، اہل چترال سردیوں میں جلال آباد کے پاس سے ہو کر پشاور آتے تھے، البتہ گرمیوں میں وہ لواری ٹاپ، اپر دیر، لوئر دیر اور مالاکنڈ سے ہو کر پشاور آتے تھے۔

جب میں نے پہلی مرتبہ 2014ء میں چترال کا سفر کیا تھا، اُس وقت ابھی یہ ٹنل مکمل نہیں ہوئی تھی، ہم لواری ٹاپ کے ذریعے ہی آگے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ سفر مشکل تو ضرور تھا لیکن اس کی خوبصورتی کا تصور اب بھی ذہن میں موجود ہے۔ اگر آپ میں ہمت ہو اور گاڑی بھی اچھی ہو اور سیر کا شوق بھی ہو تو آپ کو بھی لواری ٹاپ کی طرف سے ایک مرتبہ ضرور جانا چاہیے اور پھر میری طرح آپ بھی اسے مدت تک یاد رکھیں گے۔

لواری ٹنل سے گزر کر جیسے ہی باہر نکلتے ہیں، تو چترال کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، جو ضلع چترال کہلاتا ہے اور ساتھ ہی دریائے چترال، اسے دریائے کنڑ بھی کہا جاتا ہے۔ جیولوجیکل سروے میں اسے چترال کابل کا نام دیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے دریائے چترال ہی کہتے ہیں۔ میں بھی اسے ہی ترجیح دینا پسند کرتا ہوں۔ ایسا اہلِ چترال کی محبت کی وجہ سے ہے۔ کچھ جگہوں پر اسے دریائے کابل بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ افغانستان میں داخل ہونے بعد دریائے کابل سے مل جاتا ہے۔ ٹنل کے فوری بعد یہ دریا آپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور آپ کو چترال کی خوبصورت وادیوں میں سے گزارتا ہوا، چترال شہر میں لے جاتا ہے۔

اس دریا کی لمبائی پانچ سو کلومیٹر ہے۔ یہ دریا، جیسے چترال کے لوگ افغانستان سے ہو کر پاکستان آتے تھے اسی طرح سے یہ دریا بھی جلال آباد کے مشرق سے ہوتا ہوا کنٹر وادی سے گزرتا ہوا دریائے کابل میں گرتا ہے اور وہاں سے پھر یہ دریائے سندھ سے جاملتا ہے اور یہی پانی پاکستان کے باسی استعمال کرتے ہیں جو چترال کے پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف سے پگھل کر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے کنڑ دریا بھی کہا جاتا ہے۔

دروش: افغانستان سے جڑا ہوا ایک سرحدی شہر

ہم دیر سے چل کر رات نگر فورٹ میں گزار کر، صبح نو بجے چترال کے لیے روانہ ہوئے۔ چترال تک کا سفر دریا کے کنارے تھا۔ اکثر جگہوں پر سڑک نئی بنی ہوئی تھی، لیکن کہیں کہیں سے اس کی حالت کافی خستہ تھی۔ دیر سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر دروش قصبہ آتا ہے۔ یہ قصبہ برلب سڑک ہے۔ اس کے مشرق کی طرف دریا بہتا ہے۔ اس علاقہ میں دریاؤں کے ناموں کے معاملے میں مجھے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ اکثر دریا طویل نہیں ہیں بلکہ

وہ جلد ہی کسی دوسرے دریا سے مل جاتے ہیں اور اب تیسرے دریا کا کیا نام ہو؟ میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا۔ لیکن مقامی لوگوں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہم نے دروش میں ایک حجرے میں کچھ دیر کے لیے آرام کیا تھا۔ جس سے ہمیں دروش کو بہتر انداز سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت ہمیں ایک مسجد، جو کہ فوج کے تعاون سے تیار کی گئی ہے، بھی دیکھنے کا موقع بھی ملا۔

دروش سے صرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر، افغانستان کی سرحد ہے۔ اس طرح ہم دروش کو ایک سرحدی قصبہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں افغانستان نام کا کوئی ملک نہیں تھا۔ اس کے مختلف حصوں پر ہمسایہ ممالک قابض تھے، جیسے ایران کے پاس ہرات وغیرہ کے علاقہ تھے۔ وسطی ایشیاء کی ریاستیں موجودہ افغانستان کے مغربی حصہ پر قابض تھیں۔ افغانستان کا مشرقی حصہ ہندوستان کے حکمرانوں کے پاس تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے پہلی مرتبہ 1747ء میں مختلف سرداروں کو اکٹھا کرکے افغانستان کی بنیاد رکھی اور پھر باقاعدہ راولپنڈی معاہدہ کے تحت 1919ء میں اسے دنیا نے ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرلیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کبھی دروش شہر افغانستان کے صوبہ بدخشاں کا حصہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی اس شہر میں ایک بڑی تعداد میں پختون رہ رہے ہیں۔ جب کہ چترال کے دیگر علاقوں میں پختون نہ ہونے کے برابر ہیں۔

جب ہم دورش شہر سے گزرے تو صبح کا وقت تھا۔ بازار میں کافی رش تھا، لوگ خریدوفروخت میں مصروف تھے جو ایک عام سی بات تھی۔ لیکن خوبصورت بات یہ ہے کہ دروش شہر کے پیچھے دریا کے دوسرے طرف ایک خوبصورت پہاڑی سلسلہ ہے، یہ پہاڑی سلسلہ بہت ہی خوبصورت منظر پیش کررہا تھا۔ یہ شہر اپنے تاریخی پس منظر میں بے حد اہمیت کا حامل شہر ہے۔ آپ کو یہاں پختون کلچر بھی نمایاں نظر آتا ہے، جو کہ چترال میں کافی کم ہے۔

آپ بھی اگر اس شہر سے گزریں تو کچھ دیر کے لیے فوج کی تعمیر کی گئی مسجد میں ضرور جائیں، دروش کی یہ واحد قابل دید جگہ ہے اور اگر آپ کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہے، یعنی ہائیکنگ کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو یہاں ضرور رُکنا چاہیے۔ ہائیکنگ کے لیے یہ ایک بہترین علاقہ ہے۔

چترال: جو دل سے آپ کا استقبال کرتا ہے!

چترال شہر، دریائے چترال کے دونوں کناروں پر بسا ایک شہر ہے، جو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ہم تقریباً دس بجے کے قریب دروش کے قصبہ سے گزر کر چترال پہنچ گئے۔ ہمارا قیام پامیر ہوٹل میں تھا، جو دریائے چترال کے کنارے پر واقع ہے۔

اس ہوٹل کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ایک بڑا ہال جس میں سو سے زائد افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے، دوسرا حصہ ایک ڈائننگ ہال پر مشتمل ہے۔ یہ دریا کے متوازی ایک منزلہ عمارت ہے۔ اس کے بعد ایک خالی جگہ ہے اور پھر ایک کمروں کی قطار ہے، جن کے دروازے مشرق کی جانب لان میں کھلتے ہیں اور مغرب کی جانب دریا کی طرف کھتے ہیں، یہ ایک طرح سے فیملیز کے لیے کمرے ہیں۔ انھیں آپ فیملی سوئیٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کمروں میں لان کی طرف داخل ہوں، تو ایک بیٹھنے کی جگہ ہے۔ پھر ایک چھوٹا کمرہ اس کے ساتھ ایک بڑا کمرہ، دوسری طرف یعنی دریا کی طرف ایک برآمدہ، جس میں اس کا دروازہ کھلتا ہے۔ سامنے لان اور اس کے بعد ایک منڈیر اور منڈیر کے نیچے دریا کے کنارے بیٹھنے کی جگہ، پھر دریا، دریا سے دوسری طرف پہاڑوں کی ڈھلوان اور اس پر بنے ہوئے بے شمار مکانات۔ اس منظر کو بیان کرنا بے حد مشکل ہے، دیکھنے سے ہی گزارہ ہو گا۔ اس لیے رختِ سفر باندھ لیجیے اور ان مناظر سے لطف اندوز ہو جائیے۔

میں اور خالد وقاص صاحب پچھلی مرتبہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے، اب بھی ہمارا قیام یہیں پر تھا۔ ہوٹل کے اندر ہی الخدمت کی ڈونر کانفرنس تھی، جس میں شریک ہونے کے لیے ہم نے چترال کا سفر کیا تھا۔ کانفرنس کوئی بارہ بجے کے قریب شروع ہوئی۔ چترال سے تعلق رکھنے والے قاری صاحب جو کہ منصورہ کی جامع مسجد میں امام بھی ہیں، چترال میں موجود تھے اور وہ بھی اس کانفرنس میں آئے ہوئے تھے۔ ان کی تلاوت سننے کا موقع ملا۔ کانفرنس میں شہر کے معززین ایک بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور سب نے الخدمت کے کاموں کے لیے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔ نوید بیگ صاحب جن کا تعلق چترال کے شاہی خاندان سے ہے، الخدمت کے صدر ہیں اور بے حد متحرک ہیں۔ اُن کی ٹیم میں بھی کئی اور بھی قابلِ قدر شخصیات ہیں۔ سب مل کر ضرورت مند لوگوں کی خدمت میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنی مصروفیات کے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا، کہ آپ کو چترال کا تعارف کروا

دوں، جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ چترال ایک اہم شہر ہے، جو ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔

چترال کا حدود اربعہ

چترال کے ضلع کی مغربی سرحد افغانستان سے ملتی ہے، چترال کے شمال میں ترچ میر کی بلند چوٹی ہے اور بونی کا علاقہ پایا جاتا ہے۔ اس کے مشرق میں کمراٹ کی وادی واقع ہے اور جنوب میں دیر کا علاقہ موجود ہے۔ چترال جانے کے تین راستے ہیں، سب سے آسان راستہ دیر سے جاتا ہے۔ جو لواری سرنگ گزرتا ہے اور دورش سے ہو کر چترال جاتا ہے۔ اگر آپ باہمت ہیں اور سفر کا شوق بھی ہے تو پھر گلگت سے گاہکوچ، پھنڈر وادی، شندور نیشنل پارک سے ہوتے ہوئے بونی سے گزر کر آپ چترال آ سکتے ہیں۔ یہ دوسرا راستہ ہے، یہ سفر تقریباً بارہ گھنٹے کا ہے۔ میں پھنڈر وادی تک تو آیا ہوں، اس سے آگے نہیں آیا۔ یہ ایک قابل دید علاقہ ہے۔ ساری سڑک دریا کے کنارے کنارے چلتی ہے۔

تیسرا راستہ جو یہاں کے لوگ صدیوں سے موسمِ سرما میں استعمال کرتے ہیں وہ ہے، چترال سے دورش اور پھر آرندو سے آپ افغانستان میں داخل ہو جائیں اور وہاں سے اسد آباد اور پھر جلال آباد کے راستے لنڈی کوتل سے پاکستان میں داخل ہو جائیں یا پھر باجوڑ کے علاقے نوا پاس (جو کہ ایک پہاڑی درہ ہے) کے راستے پاکستان میں داخل ہو جائیں۔ یہ راستہ لواری ٹاپ بننے سے پہلے کوئی سال کے پانچ ماہ تک مقامی لوگوں کے زیرِ استعمال رہتا تھا۔ اب لواری سرنگ بننے سے یہ راستہ کم ہی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چترال اور افغانستان کے درمیان بروغل اور درہ پاس بھی موجود ہیں، جو اُس وقت استعمال ہوتے تھے، جب چترال کا علاقہ افغانستان کا حصہ تھا۔ یاد رہے کہ قدیم زمانے میں ایران کے حکمران اس علاقے تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں کی زبان میں فارسی کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو کہ اس سے ملحقہ علاقہ کابل میں بولی جاتی ہے۔

چترال شہر سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے ارد گرد چالیس بڑی پہاڑی چوٹیاں ہیں، جن میں سب سے بلند کوہ ہندوکش کی ترچ میر ہے جو کہ پچیس ہزار فٹ سے زائد بلند ہے۔ یہ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں 33 ویں نمبر پر ہے۔ چترال شہر سے اس کا منظر بے حد سہانا لگتا ہے۔ اگر آپ کو پہاڑوں کو سر کرنے کا شوق ہو تو چترال ایک بہترین جگہ ہے۔

اس تحریر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ چترال کا حدود اربعہ کیسا ہے۔ میں جب بھی چترال گیا تو میرے لیے سب سے خوبصورت منظر صبح کے وقت دریا کے کنارے بیٹھ کر ترچ میر پہاڑ کو دیکھنا ہوتا تھا۔ اس کی چوٹی اکثر سرخ رنگ کی ہوتی ہے اور مجھے یہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ لگتی ہے۔ چاروں طرف پہاڑ، درمیان میں دریائے چترال بھی کہتے ہیں، جس کا پانی اکثر گدلا ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس علاقہ میں پہاڑ زیادہ تر مٹی کے ہیں اور ایک ایسا شہر یعنی چترال جس پر کبھی ایرانی، کبھی افغانی، کبھی چینی اور کبھی انگریزوں نے راج کیا۔

یقیناً آپ اس کی محبت میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

1972ء میں بھٹو کے دور میں ریاست کو مکمل طور پر پاکستان میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح کٹور خاندان کا 272 سالہ اقتدار ختم ہو گیا۔ اس خاندان کے شہزادہ محی الدین سیاست میں کافی متحرک رہے۔ وہ 1972ء میں پیپلز پارٹی کی طرف سے سیاست میں وارد ہوئے، چار مرتبہ ایم این اے رہے، وفاقی وزیر بھی رہے اور ضلع کونسل کے چیئرمین کا عہدہ بھی ان کے پاس رہا۔ اب ان کے بیٹے سیاست میں متحرک ہیں۔ جب پرویز مشرف نے الیکشن لڑا، تو پورے پاکستان میں ان کی پارٹی کا ایک ہی ایم این اے منتخب ہوا، وہ شہزادہ محی الدین کا بیٹا شہزادہ افتخار تھا۔ اس کی وجہ پرویز مشرف کا لواری سرنگ کا مکمل کرنا ہے۔

اب بھی چترال شہر میں دریائے چترال کے پاس ایک بڑی عمارت موجود ہے جس میں چترال کے سابقہ شاہی خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ اس کے ارد گرد ایک چوڑی دیوار ہے، جو اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ کسی وقت بھی گر سکتی ہے، میں جب بھی اس کے پاس سے گزرا، تو مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ گر ہی نہ جائے۔

ہر بار میرا قیام پامیر ہوٹل چترال میں ہوتا تھا۔ اس ہوٹل تک پہنچنے کے لیے اس قلعہ نما عمارت کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا ہے، اس لیے اس عمارت کو کافی دفعہ دیکھا ہے۔ جیسے ہی ریاست ختم ہو گئی، اسی طرح ریاست کی نشانیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس عمارت کو عوام الناس کے لیے کھول دیا جائے، تو شاید اس کی مرمت کا سامان بھی پیدا ہو سکے اور یہ تادیر قائم بھی رہ سکے۔

دیر کی طرف سے جاتے ہوئے آپ کو شہر میں داخل ہوتے وقت ایک پل پار کرنا پڑتا ہے، یہاں پر فوج کی چھاؤنی ہے۔ یہ ایک صاف ستھرا علاقہ ہے، اس کے بعد شہر شروع ہوتا ہے۔ شہر کا بیشتر حصہ دریا کے دونوں طرف ہے اور آبادی کے پیچھے پہاڑ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں،

کہ آبادی کا بیشتر حصہ ڈھلوان پر واقع ہے۔ پامیر ہوٹل بالکل دریا کے کنارے پر واقع ہے، کئی اور ہوٹل بھی دریا کے کنارے واقع ہیں، لیکن سب سے خوبصورت منظر پامیر ہوٹل کا ہے۔

بازاروں میں خواتین تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شہر کے وسط میں الخدمت فاؤنڈیشن چترال کی طرف سے بنائی ایک میڈیکل لیبارٹری بھی ہے۔ لیبارٹری پر بھی جانا ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ کافی لوگ اس لیب سے فائدہ اٹھارہے تھے۔ یہ لیب علاقہ کے لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

چترال میں شہرِ شام

جب خالد وقاص صاحب واپس پشاور آ گئے تو ہم نے چترال شہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ نوید بیگ صاحب سے رہنمائی لی، ان کے مشورے کی روشنی میں شام کے وقت، شہرِ شام کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔

شہرِ شام جس کا نام ہی بڑا دلچسپ تھا، محسوس ہوا کہ مقام بھی دلچسپ ہوگا۔ لوگوں سے راستہ پوچھا اور کچھ مدد گوگل سے بھی لی اور سعد مرتضٰی اور محمد عثمان جو کہ گاڑی چلاتے ہیں، کے ساتھ ہم تینوں شہرِ شام کی طرف چل پڑے۔ وہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ جاننے کے لیے کچھ دیر انتظار کریں۔ راستہ بتانے والوں نے بتایا کہ آپ گرم چشمہ کی طرف جائیں تو آپ کو شہرِ شام ملے گا۔ ہم نے پوچھا کہ کیا یہ کسی جگہ کا نام ہے، انھوں نے بتایا کہ آپ جائیں، آپ کو وہاں بے شمار لوگ سڑک کے کنارے کھڑے مل جائیں گے۔ ایک طویل سڑک کا نام ہی شہرِ شام ہے۔

شہرِ شام جانے کے لیے ہم نے دریا کا پل عبور کیا اور دوسری طرف ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم شہر سے نکلے نہیں تھے، ہمیں اپنے اور دریا کے درمیان ایک لمبی سڑک کی پٹی نظر آئی۔ تھوڑی سی حیرانی ہوئی لیکن جلد ہی دور ہو گئی کیونکہ وہاں پر ائیر پورٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا اور یہ ائیر پورٹ کا رن وے تھا۔ یہاں سے ایک سڑک ائیر پورٹ کی طرف دوسری گرم چشمہ کی طرف جاتی تھی۔ یہ وہ علاقہ ہے جو ہم اپنے ہوٹل میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف دیکھتے تھے۔

راستہ میں کئی ہوٹل بھی آئے، ایک جگہ ایک معروف اسکول کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ ہم دور تک لوٹکوہ دریا کے کنارے جاتے رہے، بے حد خوبصورت موسم تھا، شام کا وقت بھی سہانا لگ رہا تھا۔ شہرِ شام کو، شام کے وقت دیکھنے کا اشتیاق بھی عروج پر تھا، سب سے بڑھ کر

ہمارے پاس وقت بھی تھا اور ہماری شام کے وقت کوئی مصروفیت بھی نہ تھی، اس لیے ذہنی فراغت بھی میسر تھی۔ یہ سب کچھ ہو تو سیر کا مزہ دو بالا ہو جاتا ہے۔

کچھ راستہ، ہم نے دریا سے ہٹ کر طے کیا۔ آگے چل کر دریا پھر ہمارے دائیں طرف آ گیا۔ ایک دو جگہ سے ہم نے پوچھا کہ شہرِ شام کیا ہے؟ سب نے صرف اتنا کہا کہ آگے ہے۔ تقریباً پون گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم نے دیکھا کہ دریا کے کنارے کافی لوگ کھڑے ہیں اور دوربین کی مدد سے دریا کے دوسری طرف پہاڑ کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ اس جگہ شام کے وقت پہاڑ کے دوسری طرف جو نیشنل پارک ہے، اس میں رہنے والے مارخور پانی پینے کے لئے دریا کے کنارے آ جاتے ہیں۔ وہ اکثر ایک قطار بنا کر پانی پیتے ہیں۔ یہ بڑا خوبصورت منظر ہوتا ہے۔ یہاں شکار کی اجازت نہیں ہے۔ محکمہ جنگلی حیات کے اہلکار ان مارخوروں کی حفاظت کے لئے وہاں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دوربین ہوتی ہے، جس سے آپ مارخور دیکھ سکتے ہیں۔ اس جگہ کو شہر شام کہتے ہیں۔

اس سے پہلے میں 2014ء میں سوست بارڈر سے خنجراب جاتے ہوئے مارخور دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس دفعہ دوربین کی مدد سے نظارہ ہی مختلف تھا۔ سب سے خوبصورت منظر وہ لگا جب ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر، جو کہ ایک سیدھی لکیر کی مانند تھی، پر ایک مارخور کو چلتے دیکھا۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ ہمارے موبائل کے کیمرے سے اس کی تصویر لینا ناممکن تھی، سعد کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ہم نے کافی دیر تک مارخوروں کا نظارہ کیا، پھر پتہ چلا کہ اس علاقہ کو شہرِ شام اس لیے کہتے ہیں، کہ یہاں شام کے وقت مارخور، جو کہ پاکستان کا قومی جانور ہے، آتے ہیں، تا کہ لوگ ان کی زیارت کر سکیں۔ شام کا وقت، دو پہاڑوں کے درمیان ایک دریا جو بڑی روانی سے چل رہا ہو، ہر طرف ایک خاموشی، موسم خوشگوار۔

ایسے منظر ناقابل فراموش ہوتے ہیں!

ہم نے دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھ کر کچھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا اور یہ ہمارا سب سے خوبصورت وقت تھا۔

باہمی مشورے سے آگے جانے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن ایک جگہ سڑک پر پانی کی وجہ سے واپسی کا فیصلہ کیا، لیکن یہاں پر بھی قدرت نے ہمارے لیے ایک بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ دریا کے ساتھ سڑک اور اس کے ساتھ ایک اونچی جگہ پر ایک جنرل سٹور تھا۔ ہم اس سٹور پر چلے

گئے۔ ایک نہایت ہی خوبصورت شکل و صورت کے صاحب، جن کی عمر چالیس سال کے قریب ہو گی، اس سٹور کو چلاتے تھے۔ جنرل سٹور کے سامنے ایک بنچ تھا، ہم اس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک گاؤں تھا،اس کے درمیان ایک سفید رنگ کی بڑی عمارت جو کہ اسماعیلی لوگوں کا عبادت خانہ تھا، جسے اسماعیلی لوگ جماعت خانہ کہتے ہیں۔ گاؤں مکمل طور پر سبزے سے ڈھکا ہوا تھا۔ گاؤں کے پیچھے پہاڑ، گاؤں کے آگے دریا، شام کا منظر، جنرل سٹور، ایک تنہا بنچ اور سب سے بڑھ کر ذہنی طور پر سیر کے لیے نکلے ہوئے تین لوگ، ہم وہاں پر اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک شام کے سائے سے ڈر لگنا شروع نہیں ہوا۔

پہاڑوں کی شام جتنی خوبصورت ہوتی ہے، رات اتنی ہی ڈراؤنی ہوتی ہے۔

رات کے سائے سے ڈر کر ہم جلد اپنے ہوٹل آ گئے اور مارخور اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو واپس چلے اور شہرِ شام، شہرِ رات میں ڈھل گیا، اور ہماری یادوں میں ایک حسین یاد کا اضافہ ہو گیا۔

چترال کے قیام کے دوران اکیس اپریل کو سعد نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ سالگرہ منانے کے قائل ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا، اس نے کہا کہ بائیس اپریل میری سالگرہ کا دن ہے، میرا خیال ہے کہ میں اسے آج ہی منا لیتا ہوں۔ اس طرح یہ ایک یادگار سالگرہ ہو گی۔ اس کے لیے ہم نے بازار سے کیک خریدا، ہوٹل میں کام کرنے والے چھ افراد سے بات کی، انھوں نے اس سالگرہ میں شریک ہونے کی ہامی بھر لی۔

ہوٹل میں تمام لوگ سو گئے تھے، ڈائننگ ہال بند ہو چکا تھا، نو افراد نے مل کر سعد کی سالگرہ دریائے چترال کے کنارے، ایک خوبصورت ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں منائی، جس کی کھڑکی سے دریا کا پانی اور اس میں چاند کا عکس نظر آتا تھا اور دریا کے دوسری طرف وہ علاقہ تھا، جو شہرِ شام کہلاتا تھا، جہاں ہم نے شام گزاری تھی، یہ ایک حسین امتزاج تھا، ایسے میں ہم نے سعد کی ایک یادگار سالگرہ منائی۔ ہوٹل کے سٹاف نے جو سب نوجوانوں پر مشتمل تھا، نے سعد کے لیے پھولوں کا تحفہ تیار کیا اور بے حد خوش ہوئے۔ اس طرح سعد کی خوشی کے ساتھ ہمیں بھی ایک یادگار سالگرہ منانے کا موقع ملا۔

اللہ تعالیٰ سعد کو اس طرح کی بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔

ہم نے چترال کے قیام کے دوران، دو اسکولوں کا بھی دورہ کیا اور ایک سکول میں قائم کمپیوٹر لیب کا افتتاح بھی کیا۔ اس لیب کے قیام کی سعادت اللہ رب العزت نے مجھے عطا فرمائی

تھی۔ اللہ اسے قبول کرے۔ اس سے اگلے روز ہماری واپسی تھی۔ واپسی کا سفر بھی کسی مہم سے کم نہ تھا۔ اس کی تفصیل کسی اور سفر نامہ میں بیان کی جائے گی۔

آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ چترال کا سفر نامہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ طوالت سے خوف بھی آتا ہے۔ چترال ہے ہی ایسا، کیا کیا جائے۔ ابھی تو بہت کچھ میں نے چھوڑا ہے۔ چترال کو بہتر انداز سے جاننے اور دیکھنے کے لیے آپ کو خود چترال جانا ہو گا۔۔۔ ہمت کریں اور شہر شام پر مارخور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔

چترال کا تیسرا سفر: اپنی اہلیہ اور نواسے سجاول کے ساتھ

تیسری مرتبہ اپنی اہلیہ کے اور اپنے نواسے سجاول کے ساتھ چترال آیا تھا اور چترال میں چار دن گزارے۔ اس دوران ایک بھی رات ہم نے چترال شہر میں نہیں گزاری، بلکہ ارد گرد چار مختلف مقامات پر رات بسر کی۔ اس سفر کی ایک مختصر رُوداد پیش خدمت ہے۔

ہم اگست 2019 ء کو لاہور سے اسلام آباد بذریعہ بس گئے اور وہاں سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ چترال پہنچے۔ یہ ایک دلچسپ سفر تھا جس کا احوال جاننا ضروری ہے۔ میں پہلی مرتبہ اسلام آباد ائیر پورٹ سے کسی بھی ہوائی سفر پر جا رہا تھا۔ اسلام آباد ائیر پورٹ پاکستان کا ایک بڑا ائیر پورٹ ہے جو کئی سال کی تاخیر سے بن پایا۔ اسلام آباد انٹر نیشنل ایئر پورٹ، اسلام آباد شہر سے پچیس کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ ہوائی اڈہ 2018ء میں مکمل ہوا تھا۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے اور سالانہ ایک کروڑ مسافروں کے لیے کافی ہے۔ تاہم مصروفیت کے اعتبار سے اب بھی یہ جناح انٹر نیشنل ایئر پورٹ کراچی سے پیچھے ہے۔

ہم جب اس ایئر پورٹ پر گئے، تو اس کی وسعت اور طرزِ تعمیر نے بے حد متاثر کیا، یقیناً یہ ایک خوبصورت ایئر پورٹ ہے۔ سہولیات کے اعتبار سے بھی یہ کسی بھی انٹر نیشنل ایئر پورٹ سے کم نہیں ہے۔ ہم صبح کے وقت ایئر پورٹ پر پہنچے تھے۔ ابھی فلائیٹ میں کافی وقت تھا، اس لیے تمام کاؤنٹر خالی پڑے تھے۔ سجاول، ہمارے نواسے کا یہ پہلا ہوائی سفر تھا۔ اس لیے وہ بہت ہی خوش نظر آ رہا تھا۔ چترال کے متعلق، میں تفصیل سے پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں۔ ہم اس دورے میں گرم چشمہ، بونی، نگر فورٹ اور بر موغ لشٹ بھی گئے۔ ان چاروں مقامات کا ایک مختصر تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

ہمیں ہمارے دوستوں نے ائیر پورٹ سے لیا اور ہمارے لیے ایک گاڑی کا بندوبست بھی کیا۔ نوید بیگ صاحب، جو الخدمت فاؤنڈیشن چترال کے صدر ہیں، نے ہمارے لیے بر موغ لشٹ میں واقع ایک ریسٹ ہاؤس میں ایک رات ٹھہرنے کا انتظام بھی کیا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس، چترال کے مشرق میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر نیشنل پارک میں واقع ہے۔ اس جگہ کوئی

آبادی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے دوستوں نے ہمیں ایک مناسب مقدار میں راشن خرید کر دیا اور کہا کہ ریسٹ ہاؤس میں کھانا پکانے کا مکمل بندوبست موجود ہے۔

برموغ لشٹ : ایک پہاڑی پر واقع گیسٹ ہاؤس

برموغ لشٹ، چترال سے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، لیکن راستہ ایک سخت چڑھائی والا راستہ ہے۔ جیسے ہی ہم تھوڑی سی چڑھائی کے بعد رکے تو نیچے چترال کا شہر مکمل طور پر نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک بہت ہی حسین منظر تھا۔ ہم اپنی جیپ میں چترال سے مشرق کی جانب واقع پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے ایک اونچے مقام پر واقع خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ وہاں سے شہر کا نظارہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف، ایک بہت وسیع و عریض جنگل تھا۔ یہ جنگل چترال گول نیشنل پارک کا حصہ ہے۔

ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست نثار احمد جن کا تعلق چترال سے ہے۔ ان کے والد محترم اسی محکمے میں کام کرتے ہیں، جس کی ذمہ داری نیشنل پارک کی حفاظت کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک وقت تھا، جب جنگل میں مارخور کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اب یہاں پر کافی سختی کی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے اب مارخور کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

انھوں نے ایک دلچسپ بات یہ بھی بتائی کہ جنگل میں بے شمار جنگلی کتے بھی ہیں جو مارخور کے بچوں کو کھا جاتے ہیں۔ اس لئے اس محکمے کے لوگ بندوقوں کی مدد سے ان کتوں کو مارتے ہیں۔ اس سے مارخور کے بچوں کو بچانے میں مدد ملتی ہے۔

ہم جب وہاں پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ ہم گیسٹ ہاؤس کے لان میں بیٹھ گئے۔ ہمارے ڈرائیور اور وہاں پر موجود باورچی نے ملکر مل کر بہت ہی مزیدار کھانا بنایا۔ اس وقت دو اور لوگ بھی وہاں رہ رہے تھے۔ اگلی صبح اٹھ کر میں نے اور سجاول نے سیر کا پروگرام بنایا اور ہم اپنے ڈرائیور کے ساتھ کچھ دور تک جنگل میں بھی گئے بھی۔ راستہ انتہائی خطرناک تھا، اس لیے زیادہ دور تک نہ جا سکے۔

یہ جگہ سطح سمندر سے کوئی آٹھ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلندی پر واقع تھی جس کی وجہ سے سردی بھی اچھی خاصی تھی۔ میرے خیال میں چترال کے سفر میں سب سے دلچسپ سفر یہی تھا اور جہاں گزاری ہوئی رات بھی اب تک یاد ہے۔ اگلی صبح ہم نے واپسی کی راہ لی۔ راستے میں ایک ویران سی عمارت نظر آئی، اس کے ساتھ ایک گھر بھی تھا۔ ہم نے ان سے گپ شپ بھی کی۔ انھوں نے ہمیں چائے بھی پلائی۔ ہم نے یہاں موجود پھل دار درختوں سے تازہ

پھل بھی کھائے۔ اس طرح سے ہمارا پہلا دن اس ویران جنگل میں گزرا۔ اس کے بعد ہم وہاں سے آ کر بونی کی طرف چل پڑے۔

یہ بات بھی آپ کی دلچسپی کے لیے ہو گی، کہ چترال گول نیشنل پارک ایک وسیع جنگل ہے، جہاں ہر طرح کی کھیتی باڑی اور آمد و رفت منع ہے۔ یہ سب جنگلی جانوروں کی حفاظت کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ ریاستی دور تک چترال گول نیشنل پارک چترال کے سابق مہتر کی نجی ملکیت سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے یہ ایک تنازعہ کا شکار ہے۔ حکومت اور سابق مہتر کے وارثان کے درمیان اب تک قانونی جنگ جاری ہے۔

جس جگہ ہم تھے وہیں پر مہتر کا سمر فورٹ بھی تھا، جہاں مہتر اور اس کا خاندان گرمیوں میں آ کر رہا کرتے تھے۔ اب یہ قلعہ ایک ویران عمارت کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ قلعہ 1910ء میں شجاع الملک کی ہدایت پر بنایا گیا تھا۔ چترال گول نیشنل پارک میں برفانی چیتے، مارخور، آئی بیکس، کالے ریچھ، سرخ لومڑی، اوٹر، سنہری عقاب، کرین، فالکن، برف تیتر اور جنگلی حیات کی بہت سی دوسری اقسام پائی جاتی ہیں۔

بونی: ایک خوبصورت دور دراز وادی

چترال تک تو کئی بار جانا ہوا، لیکن بونی نہ جا سکے، جو اپر چترال کا صدر مقام ہے۔ اس بار جاوید صاحب نے جو بونی میں جماعت اسلامی کے امیر اور وہ متحرک ساتھی ہیں، نے ہمیں بونی آنے کی دعوت دی اور یوں ہمیں بونی میں ایک رات کے لیے ٹھہرنے کا موقعہ ملا۔

بونی، چترال کے بالائی ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس کی سرحد مشرق میں گلگت بلتستان، شمال اور مغرب میں افغانستان کے صوبہ بدخشاں کے ساتھ اور جنوب میں اپر دیر اور سوات کے اضلاع کے ساتھ ملتی ہے۔ واخان کوریڈور کی ایک تنگ پٹی شمال میں چترال کو تاجکستان سے الگ کرتی ہے۔ بونی سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ سے زائد بلند ہے۔ اس لیے گرمیوں میں یہاں کا موسم مری جیسا ہوتا ہے۔ یہاں کی مقامی زبان کھوار ہے، جو زیادہ تر بولنے میں استعمال ہوتی ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لیے اردو زبان ہی سے مدد لی جاتی ہے۔ بونی ایک بلند مقام پر ہونے کی وجہ سے سردیوں میں اچھا خاصا سرد ہو جاتا ہے۔

بونی کو وادئ چترال کا تاج بھی کہتے ہیں۔ اس قصبہ کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے ایک طرف اونچے پہاڑ ہیں، جہاں سارا سال برف سے ڈھکی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ یہ چوٹیاں ایک کمان کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ گرمیوں میں بونی کا موسم کافی گرم ہوتا ہے، جبکہ سردیوں

میں یہاں کافی سردی ہوتی ہے۔ جب ہم جاوید صاحب کے گھر جارہے تھے، تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف مختلف سبزیوں کے کھیت ، پھلوں سے لدے درخت اور بے شمار دیگر فصلیں نظر آرہی تھیں۔ چترال شہر سے ترچ میر پہاڑ بھی نظر آتا ہے، جس کی چوٹی بہت ہی خوبصورت لگتی ہے۔ ترچ میر ہمالیہ کی چوٹیوں کے بعد ایک نئے سلسلے کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اس کی بلندی 7,708 میٹر ہے۔

بونی کے رہنے والے ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاوید صاحب نے اپنے گھر میں لگا اپنا شجرہ نسب بھی دکھایا، جس کے مطابق ان کا تعلق وسطی ایشیاء کے ایک مشہور خاندان سے ملتا ہے۔

ہم رات جاوید صاحب کے گھر رکے۔ گھر کیا تھا ایک خوبصورت باغ تھا، جس میں ہر طرح کے پھل دار درخت تھے۔ خوبانی تو اتنی عام تھی جس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے بڑھ کر ان کی مہمان نوازی، جس کی کوئی حد نہ تھی۔ مجھے بونی کی تاریخ کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اس بات کا ضرور پتہ چلا کہ واخان کی پٹی اور گلگت جانے کے لیے بونی سے ہی ہو کر جایا جاتا ہے۔ شندور میلہ، جہاں پولو کے میچ کھیلے جاتے ہیں، جانے کے لیے بھی بونی سے ہی گزر کر ہی جایا جاتا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جب ڈیورنڈ لائن کا فیصلہ کیا گیا، تو اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ ہندوستان کی سرحد کہیں سے بھی اس وقت روس کی حلیف ریاستوں کے ساتھ نہ ملے، اسی لیے چترال کے علاقے میں ایک جگہ، جہاں تاجکستان کے سرحد چترال سے ملتی تھی وہاں پر بھی دونوں کے درمیان ایک تنگ علاقے کو افغانستان کا حصہ بنایا گیا، جسے واخان کاریڈور کہتے ہیں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ روس اس طرف سے ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوسکے۔

یہ میرا قیاس ہے، ہو سکتا ہے درست نہ ہو، یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، جو میں نے سمجھا، وہ بیان کر دیا ہے۔

شندور پاس بھی ایک اہم مقام ہے، جو چترال اور گلگت کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہاں پر پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (PTDC) کا ایک موٹل بھی ہے۔ یہ جگہ مختلف سبزیوں، پھلوں اور فصلوں کی افزائش کے لیے بھی مشہور ہے۔

میری ہمیشہ سے ہی یہ خواہش رہی ہے، کہ رات کسی دور دراز گاؤں میں گزاری جائے۔ جاوید صاحب کی وجہ سے میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ ہم ان کے گھر ٹھہرے، جو شہر

سے مناسب فاصلے پر واقع تھا۔ میں اس کے بعد جب اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ چترال گیا تھا، اس بار بھی ہم ایک رات بونی میں ٹھہرے تھے۔ یہ سب اب تک یاد ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں، کہ بونی میں علم دوست افراد بھی ایک کثیر تعداد میں آباد ہیں۔

گرم چشمہ: ایک منفرد مقام

میں اپنے دوسرے دورے میں سعد مرتضٰی کے ساتھ صرف گرم چشمہ جانے والی سڑک پر شہرِ شام تک گیا تھا۔ اس مرتبہ ہم نے گرم چشمہ ایک رات رکنے کا پروگرام بنایا اور نوید بیگ صاحب نے ایک ہوٹل میں ہماری بکنگ بھی کروادی۔ ہم شہر شام سے ہوتے ہوئے گرم چشمہ پہنچ گئے۔ یہ ایک ایسا خوبصورت مقام ہے جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

گرم چشمہ درحقیقت ایک وادی کا نام ہے، جہاں ایک گرم چشمہ بھی ہے۔ یہ سطح سمندر سے ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ جگہ اپنے گرم چشمے کے لیے مشہور ہے۔ گرم پانی کی وجہ زمین میں سلفر کا ہونا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلفر ملا ہوا پانی کئی جلدی بیماریوں کا بھی ایک علاج ہوتا ہے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں پر ایک تالاب بھی تھا جس میں گرم پانی تھا۔ ہم میں تو اس میں نہانے کی ہمت نہیں تھی، البتہ کمرے میں گرم پانی سے نہانے کا لطف ضرور اٹھایا۔

اس علاقے میں ٹراؤٹ مچھلی بھی کافی تعداد میں پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ماہی گیری کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم گرم چشمہ کے بازار میں تھے تو میں نے دیکھا کہ ارد گرد اونچے پہاڑ ہیں، جس سے یہ لگتا تھا کہ ہم ایک بند وادی میں آ گئے ہیں۔ اس لیے یہاں پر برف سے ڈھکی چوٹیاں، خوشگوار موسم اور قدرتی چشمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یہ بھی پتہ چلا کہ اس علاقے میں پانی سے بجلی پیدا کرنے کا بجلی گھر بنایا جا رہا ہے۔ گرم چشمہ چترال کے شمال مغرب میں کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس علاقے کی سرحد افغانستان کے صوبے بدخشاں سے ملتی ہے۔ میں اگلے دن گرم پانی کے چشمے دیکھنے کے لیے پہاڑ کے اوپر بھی گیا۔ وہاں پر ایک مدرسہ بھی تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، لیکن اپنے محلِ وقوع کی وجہ سے انتہائی منفرد ہے۔

چترال عجائب گھر

ہم گرم چشمہ سے شام کے وقت واپس آئے اور چترال عجائب گھر دیکھنے چلے گئے۔ چترال عجائب گھر کا آغاز جولائی 2010ء کو ہوا تھا۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ جس علاقے کا موسم معتدل اور آرام دہ ہوتا ہے، ایسے علاقے میں سب سے قدیم تہذیب کے اثرات ملتے ہیں۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سخت موسم والے علاقے ،انسانی زندگی کے لیے کوئی زیادہ کشش نہیں رکھتے۔ اسی طرح چترال میں، جہاں کا موسم ایک بہترین موسم مانا جاتا ہے، قدیم دور کے آثار ملتے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں قدیم دور سے ہی بستیاں آباد تھیں۔ یہ باتیں چترال میوزیم دیکھنے کے بعد زیادہ واضح ہو کر سامنے آئیں۔ یہ سب دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں، کہ چترال کا خطہ ایک بھرپور ثقافتی ورثے کا حامل ہے۔

چترال عجائب گھر،چترال کے شاندار ثقافتی ورثے کو تحفظ دینے کی ایک بہترین کوشش ہے۔چترال عجائب گھر میں دو طرح کی قدیم اشیاء رکھی گئی ہیں؛ ایتھنولوجیکل گیلری اور آثار قدیمہ اور کالاش گیلری۔ایک جگہ پر ہمیں وادی چترال کی ثقافت اور طرزِ زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جن میں کڑھائی والے کپڑے، زیورات، ہتھیار، سرامکس، موسیقی کے آلات، شکار کے اوزار، فرنیچر اور گھریلواستعمال کی اشیاء شامل تھیں۔ یہ ایک طویل فہرست ہے، جس میں عام آدمی کے استعمال کی ہر طرح کی اشیاء دیکھنے کو ملیں۔

دوسری گیلری سے آثار قدیمہ اور کالاش وادی سے ملنے والی قدیم دور کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں پر اس دور میں گھریلو اشیاء، کپڑے، زیورات، کالاش دیوی کے مجسمے، اور لکڑی سے بنی ہوئی اشیاء موجود تھیں۔ دلچسپ بات یہ کہ ان میں سے اکثر اشیاء چترال کے ارد گرد کے علاقوں سے ہی کھدائی کے دوران حاصل کی گئی ہیں۔

شاہی مسجد چترال

شہر کے وسط میں شاہی مسجد واقع ہے۔ مسجد کی عمارت کے ارد گرد ایک کھلا میدان بھی ہے۔ ایک دفعہ مجھے بھی یہاں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ یہ مسجد مہتر شجاع الملک نے بنائی تھی جو 1895ء میں چترال کے مہتر بنے تھے۔

شجاع الملک چترال میں انگریزوں کے دوست تھے ۔ وہ چترال میں انگریزوں کے بنائے گئے چترال سکاؤٹس کے اعزازی کمانڈنٹ بھی مقرر ہوئے تھے، ان کا دورِ حکومت 1895-1936ء تک کا ہے۔ مجھے شہر کے ایک محلے، جس کا نام جنگ بازار ہے، کی مسجد میں

نماز جمعہ پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا قبرستان بھی ہے، جہاں شاہی خاندان کے لوگوں کی قبریں ہیں، جن میں شجاع الملک کی قبر بھی ہے۔

شاہی مسجد چترال کو 1914ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مسجد کی تزئین وآرائش کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مسجد رقبے کے لحاظ سے کوئی بڑی مسجد نہیں ہے۔ لیکن اپنی خوبصورتی میں اس علاقے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اگر کبھی چترال جانے کا موقع ملے، تو اس مسجد میں جانا نہ بھولیں۔ شاہی مسجد کے جنوب مشرق میں ایک قلعہ بھی واقع ہے۔

شاہی قلعہ چترال جو کسی وقت بھی گرا چاہتا ہے

پامیر ہوٹل کے مغرب کی طرف دریائے بہتا ہے اور اس کے مشرق میں شاہی قلعہ موجود ہے۔ ہوٹل تک پہنچنے کے لئے بازار سے ایک سڑک شاہی قلعہ کی طرف آتی ہے اور قلعہ کے دروازے سے دائیں مڑ کر ہم اس کی پچھلی طرف موجود ہوٹل پہنچتے تھے۔ یہ ایک عام راستہ تھا۔ میں جب بھی اس قلعہ کے پاس سے گزرتا تو مجھے لگتا ہے کہ اس کی بلند و بالا دیوار جو میرے اندازے کے مطابق بیس فٹ سے زائد بلند ہوگی، جس میں خم بھی آچکا ہے، وہ کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ مجھے قلعے کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا۔ مقامی دوستوں نے بتایا کہ آج کل یہاں مہتر خاندان کا ایک فرد رہائش پذیر ہے۔

اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے شجاع الملک کے پوتے شہزادہ محی الدین سیاست میں کافی متحرک رہے۔ وہ 1990ء کی دہائی میں پاکستان کے وزیر مملکت برائے سیاحت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اس کے علاوہ وہ دو بار ضلع کونسل چترال کے چیئرمین، ایک بار ضلع ناظم اور چار بار ممبر قومی اسمبلی پاکستان (MNA) کے طور پر بھی منتخب ہوئے۔ اب اس علاقے سے مولانا عبدلاکبر چترالی قومی اسمبلی کے ممبر ہیں جن کا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے۔ مہتر خاندان کے اکثر لوگ چترال سے چلے گئے ہیں۔ اب اِکا دُکا لوگ ہی یہاں پر رہ رہے ہیں۔ ابھی بھی عام لوگوں کا ان کے پاس آنا جانا ہے۔

شاہی قلعہ چترال بھی اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ یہاں کبھی انگریز فوجیوں کا محاصرہ بھی کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر آگے کے صفحات میں کیا جائے گا۔ ابھی صرف قلعہ کی بات ہی کی جارہی ہے۔ یہ قلعہ مٹی کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور اس کے دروازے دیودار کی لکڑی سے بنے ہوئے ہیں، جو کہ ایک بہت ہی بہترین قسم کی لکڑی ہے۔ جسے ہمارے ہاں عام طور پر دیار کہتے ہیں۔ اس قلعہ کے تین بڑے حصے ہیں۔ جن میں سے ایک حصے میں یہاں کی فوج کے لوگ رہتے تھے۔

دوسرا حصہ مہتر خاندان کی رہائش کے لئے تھا، اور تیسرا حصہ دریا کی جانب باغات پر مشتمل تھا۔ یہ اس کا سب سے خوبصورت حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پر کبھی پولیس کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔

یہاں پر ایک ایسی جگہ بھی ہے، جہاں چترال کا مہتر دربار لگاتا تھا۔ میں نے اس قلعے کی تصاویر دیکھی ہیں، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تزئین و آرائش پر بہت زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ یہ قلعہ سیاحوں کے لئے بند ہوتا ہے۔ اگر آپ شاہی خاندان میں سے کسی کو جانتے ہیں، تو آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ اگر اس قلعے کو سیاحوں کے لیے کھول دیا جائے، تو اس سے ہونے والی آمدن سے قلعے کی حفاظت کی جا سکتی ہے اور اسے تباہ ہونے سے بچایا بھی جا سکتا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ 1774ء میں اس وقت کے حکمران شاہ کٹور دوئم نے تعمیر کروایا تھا۔ بعد میں شجاع الملک نے اس میں مزید اضافہ بھی کیا تھا۔ جب ریاست ختم ہوئی، تو یہ قلعہ مہتر خاندان کی ذاتی ملکیت قرار دے دیا گیا۔

مجھے اگر کبھی موقع ملا تو میں اس قلعے کو دیکھنے ضرور جاؤں گا، اس کے لیے شاہی خاندان کے ساتھ کوئی رابطہ ڈھونڈنا پڑے گا۔

نثار احمد کے گھر ایک یادگار دعوت

جس شام ہماری واپسی تھی، اسی دن نثار احمد جو ہمارے ساتھ الخدمت فاؤنڈیشن میں کام کرتے ہیں، کے والد صاحب اور ان کے چچا نے جو جماعت اسلامی چترال کے امیر بھی تھے، ہمیں اپنے گھر دعوت پر بلوایا۔ ان کا گھر چترال شہر کے مشرق کی جانب ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ پہلے تو سڑک کے ذریعے ہی ہم اونچائی پر گئے۔ بعد میں سڑک سے ہم ان کے گھر تک بھی گئے۔ ان کا گھر ایک اونچائی پر واقع ہے اور اونچائی بھی ایسی کہ میرے جیسے بھاری بھر کم جسامت والے آدمی کے لیے چڑھنا کافی مشکل تھا۔ اہلیہ کے لیے تو اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ البتہ سجاول کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جب ہم اوپر پہنچے تو ہمارا سانس پھول چکا تھا لیکن نثار صاحب اور ان کے خاندان کے لوگوں کے لیے، تو یہ ایک معمول کی بات تھی۔

یہ ایک بہت ہی پر تکلف دعوت تھی، جس میں محبت کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کے مشہور پکوان بھی شامل تھے۔ ہم کافی دیر تک ان کے گھر میں بیٹھے رہے۔ میرا ایسی مجلس میں یہی موضوع ہوتا ہے کہ یہاں پر لوگوں کی معاشرت کیسی ہے؟ یہ لوگ کہاں سے آئے سے ہیں اور کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟

اس بارے ان سے کافی معلومات ملیں۔ ہم یہیں پر بیٹھے تھے، کہ نوید بیگ صاحب نے پتہ کیا، تو پتہ چلا کہ آج شام اسلام آباد سے آنے والی پرواز کینسل ہو گئی ہے اور اگلی پرواز تین دن بعد آئے گی۔ یہ خبر کوئی اتنی اچھی خبر نہیں تھی، لیکن یہ خبر حقیقت پر مبنی تھی۔ اب ہمارے پاس دو ہی راستے تھے، کہ مزید تین دن یہاں رہیں اور اس کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعے واپس جائیں یا پھر یہاں سے بذریعہ سڑک لاہور جایا جائے۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ لاہور تک بغیر رکے، سفر سولہ گھنٹے کا ہے اور یہ سفر جہاں طویل ہے وہاں مشکل بھی ہے۔ اتنا طویل سفر کرنا بہت زیادہ آسان نہیں ہے، لیکن ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ہم نے اپنی جیپ کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں تیمر گرہ تک چھوڑ آئے۔ اس کی گاڑی نان کسٹم پیڈ تھی، اس وجہ سے وہ اس سے آگے اپنی گاڑی لے کر نہیں جا سکتا تھا۔

مرتے کیا نہ کرتے۔۔۔

ہم اس سے پچھلی رات نگر فورٹ میں تھے اور صبح ہی چترال آئے تھے۔ اس کے بعد دعوت میں شرکت کی اور اب شام کے چار بج رہے تھے۔ ہم نے دوستوں سے اجازت لی اور واپسی کے لیے چل پڑے۔ چترال سے چل کر ہم کوئی رات گئے تیمر گرہ پہنچے۔ وہاں سے پھر ایک ٹیکسی لی اور اس طرح سے اگلے دن صبح سات بجے کے قریب ہم لاہور پہنچے۔

یوں ہمارا یہ سفر مکمل ہوا، جس کی یاد اب تک ہمارے دلوں میں ہے اور جب کبھی مدھم ہونے لگتی ہے، ہم اپنی تصاویر دیکھ کر اس سفر کی یاد کو تازہ کر لیتے ہیں۔ ہمیشہ یہی دعا نکلتی ہے کہ اہلِ چترال آپ کی محبتوں کا بے حد شکریہ۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے چترال جانے کا موقع ملا جب 2021ء الخدمت فاؤنڈیشن چترال کے دوست اجتماعی شادیوں کا ایک پروگرام کر رہے تھے۔ اس پروگرام میں محترم سراج الحق صاحب امیر جماعتِ اسلامی پاکستان بھی مدعو تھے۔ مجھے بھی اس پروگرام میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں نے اپنے دو نواسوں؛ احمد عمر اور داؤد سرور کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس طرح ہم لوگ اس پروگرام میں شریک ہونے کے لیے چترال گئے۔ ہم نے رات دیر میں گزاری اور وہاں سے چترال گئے۔ اس سفر میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی سب جگہیں تھیں جن کا میں پچھلے صفحات میں ذکر کر آیا ہوں۔ اس لیے میں اپنے اس چوتھے سفر کی رُوداد بیان نہیں کر رہا۔ البتہ میں نے چترال کی تاریخ کے متعلق جو کچھ جانا، وہ ضرور پیش کر رہا ہوں۔

چترال : صدیوں سے آباد علاقہ

اگر آپ چترال کو نقشہ پر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے شمال میں تاجکستان اور چین واقع ہیں۔ تاجکستان اور چترال کے درمیان صرف واخان کی پٹی ہے، جو کہیں کہیں سے پندرہ کلومیٹر سے بھی کم چوڑائی کی ہے۔ یہ پٹی افغانستان کی ملکیت ہےاور صوبہ بدخشان کا حصہ ہے۔ کبھی کبھار جب آپ تاجکستان سے بجلی درآمد کرنے کی بات سنتے ہیں تو اس کے لیے یہی راستہ چنا جائے گا۔ یہ علاقہ انتہائی دشوار گزار ہے، حکومت پاکستان کی کوشش ہے کہ اسے قابلِ استعمال بنایا جائے، اگر اس علاقے میں یہ سڑک بن گئی، تو پاکستان سے تاجکستان جانے کا فاصلہ بے حد آسان ہو جائے گا۔

چترال کے مغرب میں کابل موجود ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے، کہ جب ایران ایک سپر پاور تھا، تو اس کا اثر و رسوخ وسطی ایشیاء تک تھا اور اُس کے اس وقت کے اثرات اب بھی چترال میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے جو مطالعہ کیا ہے،اس سے میں یہ بات اخذ کر سکتا ہوں کہ چین، جس کے اثرات گلگت تک پائے جاتے ہیں، وہ بھی اس علاقہ تک کبھی نہ کبھی ضرور آیا ہو گا۔

چترال کی سرحد، مشرق میں گلگت بلتستان سے ملتی ہیں۔ جبکہ شمال میں یہ سوات سے ملتی ہےاور شمال مغرب میں اس کی سرحدیں افغانستان کے علاوہ کنڑ، بدخشاں اور نورستان سے ملتی ہیں۔ واخان کی پٹی اسے تاجکستان سے علیحدہ کرتی ہے۔ پرانے وقتوں میں اس علاقے کو پریستان بھی کہتے تھے، جو کہ شاید اس علاقے میں موجود پریوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ چترال کا پاکستان سے رابطہ براستہ لواری ٹاپ اور دیر کی طرف سے ہے اور دوسرا راستہ شندور کی طرف سے ہے، جو گلگت کی طرف نکلتا ہے۔ اگر یہ دونوں راستے بند ہوں، تو یہاں کے لوگ براستہ افغانستان پشاور آتے ہیں۔ افغانستان کے راستے، سفر پرانے وقتوں میں ہوتا تھا، جب لواری ٹنل نہیں بنی تھی۔ لواری ٹنل بننے کے بعد راستوں کی بندش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب افغانستان کے راستے سفر کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔

ایران سے آنے والے مذہبی رہنما جو بنیادی طور پر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اس علاقہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بے حد کام کئے۔ یہی وجہ ہے کہ چترال، گلگت، ہنزہ اور سکردو وغیرہ کے علاقہ میں اہلِ تشیع کافی تعداد میں آباد ہیں۔ کالاش قبیلہ کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ یونانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب سکندر نے ایران فتح کیا اور پھر وہ ہندوستان کی طرف آیا تو بعد میں اس کے ساتھ آنے والے لوگ اس علاقہ میں بس گئے۔ کہتے ہیں کہ کالاش لوگ ان ہی کی اولاد ہیں۔

یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں، حتمی بات کہنا مشکل ہے، لیکن اہلِ تشیع کا یہاں ہونا، کالاش قبیلہ کا وجود، سکردو میں بدھ مت کے آثار اور ہنزہ میں چینی لوگوں کی قبریں، یہ سب بتانے کے لیے کافی ہیں، کہ یہ علاقے مختلف زمانوں میں ایک بڑی تعداد میں لوگوں کے لیے باعث کشش رہے ہیں۔ آخر میں انگریزوں کا اس علاقہ تک پہنچ کر اس ریاست کو اپنے ساتھ ملانا، اس علاقہ کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

چترال سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ ارد گرد پہاڑ ہونے کی وجہ سے بھی اس علاقے میں کافی سردی پڑتی ہے۔ البتہ گرمیوں میں موسم بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ چترال لاہور سے دور ضرور ہے لیکن ہے ایک ایسی جگہ جہاں ضرور جانا چاہئے۔

چترال خیبر پختونخوا کا سب سے بڑا ضلع ہے، (چترال اب دو حصوں میں تقسیم ہے، اپر چترال اور لوئر چترال) اس کا ضلعی صدر مقام چترال ہے۔ ایک اور لحاظ سے چترال ضلع کے تین حصے گنے جا سکتے ہیں، ایک زیریں چترال جس میں کالاش واقع ہے، دوسرا مرکزی چترال جو کہ اس وقت ایک بڑا شہر ہے اور تیسرا چترال بالا جو کہ اب ایک ضلع بن چکا ہے اور جس کا صدر مقام بونی ہے۔

پشاور سے چترال کا فاصلہ ساڑھے تین سو کلومیٹر ہے، اسلام آباد سے چترال چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ لاہور سے اس کا فاصلہ ساڑھے سات سو کلومیٹر ہے۔ چکدرہ تک تو موٹر وے نے سفر کو کافی حد تک آسان بنا دیا ہے۔ اس سے آگے بھی سڑک کی حالت کافی بہتر ہے۔ سنا کہ مالاکنڈ سے چترال تک ایک نئی سڑک بھی تعمیر کی جا رہی ہے۔

مغلوں کے دور میں اس علاقے کی سرکاری زبان فارسی تھی، البتہ مقامی لوگوں لوگ اپنی مقامی زبان میں بات کرتے تھے۔ یہ لوگ پختونوں سے الگ ہیں اور اپنی شناخت پر کسی قسم

کا کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ میں نے ایک شخص سے کہا کہ آپ پختون ہیں، تو اس نے میری بات کا برا منایا۔ اس نے کہا کہ ہم چترالی ہیں اور ہماری الگ ثقافت ہے۔

اس علاقے کو انگریزوں نے اپنے مفادات کے لیے فتح کیا اور سادہ سے اصول پر عمل کرتے ہوئے ریاست کو اپنے ساتھ ملایا، نہ کہ ریاست پر قبضہ کیا۔ اس طرح انگریزوں کو کم وقت میں ان جیسی کئی اور ریاستوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ یاد رہے کہ پرویز مشرف کی پارٹی کا ایک ہی ایم این اے تھا اور وہ اسی علاقے سے تھا۔ میں نے مقامی لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، تو انھوں نے بتایا کہ لواری ٹنل بنانے کی وجہ سے ہم نے پرویز مشرف کا ساتھ دیا۔

چترال لفظ کا کیا مطلب ہے، معلوم نہ کر سکا۔ یہ ایک قدیم لفظ ہے۔ اس کے کیا معنی میں مجھے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ لفظ چترال اصل میں چھترار کی بگڑی شکل ہے۔ مقامی لوگ آج بھی لفظ چھترار استعمال کرتے ہیں۔ یہ ریاست کب بنی اور کب تک قائم رہی؟ اس کے علاوہ اس سے پہلے یہاں کیا تھا؟ ان سوالات کی تلاش میں مجھے کئی مضامین پڑھنے کو ملے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

Algernon Durand کا مضمون[1] A Month in Chitral (1899)

Britishbattles.com کی ویب پر ایک مضمون[2]

Siege and Relief of Chitral

جناب احمد حسن دانی اور ان کے ساتھیوں کی کتاب[3]

History of Civilizations of Central Asia: Development in contrast : from the sixteenth to the mid-nineteenth century

---

[1] http://www.anusha.com/durand.htm

[2] https://www.britishbattles.com/north-west-frontier-of-/india/siege-and-relief-of-chitral

[3] History of Civilizations of Central Asia: Development in contrast : from the sixteenth to the mid-nineteenth century
Ahmad Hasan Dani, Vadim Mikhaĭlovich Masson, Unesco

ممتاز حسین کا مضمون [1] History of Chitral-an Outline

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا [2]

چترال ٹوڈے کی ویب [3] https://www.iranicaonline.org

پر ایک مضمون [4]

.CHITRAL (Čitrāl), river valley in the upper Indus system

ان سب سے جو جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

چترال میں آباد قدیم قبیلے

چترال میں لوگ کب سے آباد ہیں؟ اس بارے میں کوشش کے باوجود بھی کچھ زیادہ نہ جان سکا۔ ممتاز حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چترال میں دو قبائل آباد تھے یا دو نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ چترال اور اس سے اوپر والے حصے میں جس میں بونی بھی شامل ہے، کھوار لوگ آباد تھے۔ جبکہ اس کی دیر کی سمت واقع وادیوں میں، کالاش لوگ آباد تھے۔ دونوں کی تہذیب و تمدن میں کچھ چیزیں مشترک بھی تھیں، لیکن بہت ساری چیزیں مختلف بھی۔ کیا ان کے حاکم بھی ایک تھے؟ اس متعلق کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاقے میں آبادی بہت کم تھی، جس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قبائل میں لوگ بس رہے تھے، کوئی مرکزی ریاست نہیں تھی۔ ہر قبیلے کا سردار ہی علاقے کا حاکم سمجھا جاتا تھا۔ پھر تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ سولہویں صدی کے وسط میں کاشغر کے بسنے والے چغتائی خاندان کے لوگوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا اور اسے کاشغر کی ریاست میں شامل کر لیا۔ یاد رہے کہ اِس وقت کاشغر چین کا ایک جنوبی حصہ ہے۔

---

[1] http://www.mahraka.com/chitral_history.html

[2] https://www.britannica.com/place/Pakistan

[3] https://chitraltoday.net-چترال/chitral/about-chitral/

[4] https://www.iranicaonline.org/articles/chitral-citral-river-valley-in-the-upper-indus-system

کاشغر کے لوگ کب تک یہاں رہے اس بارے کچھ کہنا ممکن نہیں، لیکن تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کاشغر کی وجہ سے یہاں چترال کے جنوب میں بسنے والے لوگوں کو قاشکار کہا جاتا تھا۔

چترال کے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ دیکھنے کا موقع ملا۔ جس کا عنوان ہے :

Chitral: A Study in Statecraft (1320–1969)

جسے رحمت خان بیگ نے مرتب کیا ہے اور

International Union for the Conservation of Nature 2004
.and Natural Resources, Pakistan

نے شائع کیا ہے[1]۔

جسے چترال کے متعلق جاننے کی ضرورت ہو، اس کے لیے یہ رپورٹ بے حد مفید ہے۔ یہ رپورٹ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ میں نے بھی اسے غور سے پڑھا۔ اس رپورٹ کی چیدہ چیدہ باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

چترال میں بدھ مت اور چینی حکمران

ماضی بعید میں چترال کی سرحد کبھی بھی مستقل نہیں رہی۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ کبھی یہ شمال مشرق میں گلگت تک پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی اس میں افغانستان کا مغربی شمال حصہ بھی شامل ہوتا تھا، کبھی چترال خود بھی افغانستان کا حصہ ہوتا تھا۔ یہاں آبادی کب ہوئی؟ اس بارے یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ تیسری صدی عیسوی میں کشان سلطنت کا بدھ حکمران کنشک وہ پہلا حکمران تھا، جس نے نے چترال پر قبضہ کیا۔ یہاں ایک طویل عرصے تک حکومت کرنا بے حد مشکل تھا۔ اس کی وجہ اس کا جغرافیہ اور اس کے ساتھ گلگت اور کشمیر کے قبائل کے ساتھ ساتھ پڑوسی ملک افغانستان سے آنے والے جنگجوؤں کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی جنگوں کا سلسلہ تھا۔

[1] https://www.iucn.org/sites/default/files/import/downloads/chitral_a_study_in_statecraft.pdf

پھر وہ وقت بھی آیا، جب چوتھی صدی عیسوی میں، چین سے لوگ وادی چترال میں آئے۔ انھوں نے یہاں پر ایک جابرانہ نظام قائم کیا۔ اسی دور میں جبری مشقت کا آغاز ہوا۔ لوک داستانوں میں یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ یہاں سے قیدی لے جائے جاتے، جب وہ کمزور ہو جاتے تو پھر انھیں چھوڑ کر نئے قیدی لے جائے جاتے۔

اگلی تین صدیاں یعنی ساتویں صدی عیسوی تک یہاں کے مقامی حکمران اپنے ارد گرد اس وقت کی سپر پاورز، جن میں فارس کے شاہ، کشان راجے، چین میں تانگ خاندان شامل تھے، جنھیں خراج پیش کرکے مقامی لوگ اپنی ریاست کی حفاظت کرتے تھے۔ بیسویں صدی میں بھی، ریاست چترال، انگریزوں کو خراج پیش کرکے اپنے آپ کو بچانے میں لگی رہی۔

نظام وہی رہا، خراج لینے والے بدلتے رہے۔۔۔

کئی صدیوں تک چترال چینی حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔۔۔

پھر وہی ہوا، یعنی۔۔۔۔

ہر کمالے، راہِ زوال

اسی موضوع پر حنیف کیفیؔ کی ایک نظم بھی ہے۔

ہر اک کمال کو دیکھا جو ہم نے رو بہ زوال
سسک کے رہ گئی سینے میں آرزوئے کمال
ہم اپنی ڈوبتی قدروں کے ساتھ ڈوب گئے
ملے گی اب تو کتابوں میں بس ہماری مثال
ہوئے انا کے دکھاوے سے لوگ سرافراز
انا نے سر کو اٹھا کر کیا ہمیں پامال
ذرا سی عمر میں کس کس کا حل تلاش کریں
کھڑے ہیں راستہ روکے ہوئے ہزار سوال
مرے خلوص کا یاروں نے آسرا لے کر
کیا ہے خوب مری دوستی کا استحصال

بجھا بجھا سا یہی دل ہے اس شباب کی راکھ

رگوں میں دوڑ رہی تھی جو آتش سیال

ملے وہ لمحہ جسے اپنا کہہ سکیں کیفیؔ

گزر رہے ہیں اسی جستجو میں ماہ و سال

ایک وقت وہ بھی آیا، جب آٹھویں صدی کے آغاز میں چین کی گرفت کمزور ہونے لگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی سرداروں نے ایک طرح سے کھلی بغاوت کا اعلان کر دیا اور اپنی حکمرانی کا اعلان بھی کر دیا۔ ایسا کرنے والوں میں کالاش قبائل بھی شامل تھے جنھوں نے زیریں چترال میں اپنی ریاست قائم کر لی، جو دسویں صدی تک قائم رہی۔ اسی دور میں بالائی چترال میں بہمن کوہستانی نے اپنی ریاست کا اعلان کر دیا۔ بہمن کوہستانی کی ریاست ایک مستحکم اور خوشحال ریاست تھی۔ اس دور کو چترال کا ایک سنہری دور مانا جاتا ہے۔

چترال میں عربوں کی آمد اور بہمن کوہستانی

رحمت خان بیگ مزید لکھتے ہیں، کہ دسویں صدی کے آخر میں وسطی ایشیاء کے وسیع علاقوں کو زیر کرنے کے بعد عرب مسلمان چترال پہنچے۔ یہ پہلے مسلمان تھے، جو اس علاقے میں آئے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ زیادہ دیر تک یہاں نہیں رہے، جلد ہی واپس خراسان چلے گئے۔ (مجھے خراسان جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے تین بڑے شہروں؛ مزار شریف، حیراتان اور بلخ جانے کا بھی موقع ملا ہے) البتہ انھوں نے بہمن کوہستانی کو اپنا گورنر مقرر کیا۔ یہی وہ دور ہے، جب یہاں اسلام کی تعلیمات کو ایک بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچایا گیا۔ یہ بات بھی اہم ہے، کہ چودھویں صدی کے شروع تک چترال کی زیریں وادیوں میں کالاش ہی حاکم رہے۔

سمالیک دورِ حکومت

پھر دسویں صدی کے شروع میں چرخ سے تعلق رکھنے والے سمالیک نام کے ایک شخص نے چترال پر حملہ کیا۔ میرے خیال میں ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ چرخ تو چترال سے بہت دور افغانستان کے جنوب مشرق میں واقع صوبہ ننگرہار کے پاس واقع ہے، اتنی دور سے آ کر یہاں حملہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ مگر رپورٹ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

سمالیک خاندان کی بالائی چترال کے ساتھ ساتھ چلاس، غذر، گلگت، ہنزہ اور سکردو پر بھی حکمرانی قائم تھی۔ ان کے دورِ حکومت میں چترال نے ایک ترقی یافتہ ریاست کی شکل اختیار

کر لی تھی۔ یہ خاندان چودھویں صدی کے اوائل تک چترال کا حاکم رہا، ان کی حکمرانی کا خاتمہ رئیس خاندان نے کیا۔

شاہ نادر، کالاش اور رئیس دور کا آغاز

شاہ نادر رئیس (1320-1341) وہ پہلا حکمران ہے جس نے کالاش قبائل اور چترال کے سمالیکی حکمرانوں پر فتح حاصل کی اور پہلی مرتبہ ایک بڑی متحد ریاست قائم کی۔ شاہ نادر جس نے رئیس خاندان کی بنیاد رکھی تھی، مشرقی ترکستان سے یہاں آیا تھا۔ اسی دور کا واقعہ ہے، کہ ایک سمالیکی راجا یا بادشاہ یاری بیگ کو ایک 'دوستانہ' پولو میچ کے دوران قتل کر دیا گیا تھا۔ یاری بیگ کی موت وجہ سے شاہ نادر کے لیے اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ چترال میں قدیم دور سے ہی پولو کا کھیل ایک مشہور کھیل ہے۔

ایک اور بات نے بھی شاہ نادر کی مدد کی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں، میں یہ لکھ چکا ہوں کہ یہاں کے لوگ ایک بڑی تعداد میں مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں نے بھی شاہ نادر کی حمایت کی، خاص طور پر کالاش کے خلاف۔ اسی دور میں شاہ نادر نے زیریں چترال کے کالاش حکمران، بلاسنگ کو ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے چلم جوش میلہ میں دیکھا ہے کہ میلے کے دوران کالاش لوگ مل کر روتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کسی نے بتایا کہ یہ لوگ مسلمان بادشاہ (شاید شاہ نادر) کے دور میں ان پر کیے گئے مظالم کو یاد کرکے روتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ان کے بڑوں کو مسلمان ہونے کے لیے کہا، جس پر کئی سو لوگوں نے دریا میں کود کر اپنی جان دے دی، لیکن اپنا دھرم نہیں بدلا۔

رئیس کی حکومت میں اسلام کی دعوت دُور دُور تک پھیل گئی۔ شاہ نادر کی وجہ سے ہی کالاش کی تقریباً دو تہائی آبادی نے اسلام قبول کیا۔ جنھوں نے انکار کیا، وہ مزید جنوب میں کالاش کی وادیوں کی طرف چلے گئے، جیسے بیریر، بمبوریت اور رمبور۔ چترال پر رئیس کی حکمرانی جو 1320ء میں شروع ہوئی تھی، 1590ء میں ختم ہوئی۔ اس دوران نو رئیس لوگ تخت نشین ہوئے۔ ہر کسی نے توسیع پسندانہ پالیسی ہی اپنائی۔

اس خاندان نے موجودہ شہر چھترار (جسے اب چترال کہا جاتا ہے) کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس خاندان میں حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ان میں سے صرف چند ہی لوگوں کا جیسے شاہ ناصر، شاہ محمود اور شاہ عبدالقادر کا ہی تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق بدخشاں سے تھا۔ بدخشاں اس وقت افغانستان کا ایک

صوبہ ہے۔ اگر آپ نقشے میں اسے دیکھیں، تو آپ یہ جان سکیں گے، کہ یہ علاقہ چترال سے قریب ہے۔ مجھے بدخشاں سے بھی آگے مزار شریف جانے کا موقع بھی ملا۔

رئیس دور میں چترال میں کئی قبائل آباد تھے، جو ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے۔ شاہ نادر رئیس نے قبائلی سرداروں کی ایک تنظیم بنالی اور مل جل کر چترال کے معاملات چلانے لگے۔ چترال میں پہلی مرتبہ ٹیکس کا نظام بنایا گیا، جو کئی سو سال تک چلتا رہا۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے، کہ رئیس حاکموں نے اپنے دورِ حکومت میں علاقے میں اسلامی فقہ کو رائج کیا۔ اسی دور میں اسلامی عدالتیں بھی قائم کی گئیں اور اسلامی وراثت کے قانون، زمین کی آمدنی کا نظام، اور دکانوں، پیشوں اور گلہ بانی پر ٹیکسوں جیسی اصلاحات کا نظام متعارف کرایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کالاش قبائل پر مذہبی ظلم و ستم کا بھی خاتمہ ہوا۔

رئیس خاندان کوئی تین صدیوں تک اپنی ریاست قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا آرہا ہے۔ یعنی حکمران خاندان کے اندر جانشینی کے مسئلے پر اختلاف جس کی وجہ سے ایک دن وہ بھی آیا جب رئیس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور کٹور خاندان برسرِ اقتدار آگیا۔

کٹور خاندان کا دورِ حکومت جو کئی سو سال تک قائم رہا

پھر تاریخ نے پلٹا کھایا اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ایک مقامی خاندان نے رئیس خاندان کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس خاندان کے پہلے سربراہ کا نام محترم شاہ (کٹور اوّل) تھا۔ یہ حکمران اپنے آپ کو مہتر کہلواتے تھے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک صوفی بزرگ اس علاقہ میں آئے اور انھوں نے یہاں کے رئیس خاندان میں شادی کی اور پھر ان کے پوتے نے چترال ریاست کی بنیاد رکھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رئیس خاندان کا تعلق سکندرِ اعظم سے ملتا تھا۔ اس خاندان کے دو لڑکے تھے، ایک کا نام محمد بیگ تھا اور دوسرے کا نام محمد رئیس تھا۔ محمد بیگ نے ریاست پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ ریاست کی حکمرانی کے لیے ایک طویل جنگ ہوتی رہی، جس کی تفصیل بیان کرنا یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

یہ سن 1520ء کی بات ہے کہ بابا ایوب کے بیٹے اور پوتے نے رئیس حکمرانوں پر حملہ کردیا۔ ان لڑائیوں میں کٹور خاندان کو فتح حاصل ہوئی، اس طرح ستر سالہ جنگ کے بعد وہ 1590ء میں چترال پر قابض ہو گئے۔

کٹور نام ایک قدیم نام ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے چترال میں کٹوروں کے آباؤاجداد کے (1520ء میں) آباد ہونے سے بہت پہلے یہ لفظ مقامی لوگ استعمال کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے، کہ کٹور ایک کشان بادشاہ کا لقب تھا۔ کٹور خاندان کی شاہی تاریخ کے مطابق، ان کے جد امجد مرزا ایوب بابا جو 1520ء میں چترال آئے تھے، سلطان حسین بایقرہ کے پوتے تھے۔ سلطان حسین بایقرہ مرزا 1469 سے 1506ء تک ہرات کے تیموری حکمران تھے۔ اس طرح سے ایک خاندان جس کا تعلق وسطی ایشیاء سے تھا، جس کا بانی تیمور تھا، کی اولاد نے چترال ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ سب جان کر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ چترال میں بسنے والے اکثر لوگوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی حوالے سے وسطی ایشیاء سے ملتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جاوید صاحب نے بونی میں ہمیں اپنے گھر میں لگا اپنا خاندانی شجرہ بھی دکھایا تھا۔ جس کے مطابق ان کے آباؤاجداد وسطی ایشیاء سے چترال آئے تھے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے، کہ چترالی زبان، چترال کے علاوہ پاکستان، افغانستان، ایران، وسطی ایشیاء غرض کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے، کہ چترالی زبان میں پشتو کی نسبت فارسی کے الفاظ زیادہ ملتے ہیں۔ ابھی تک اہلِ چترال اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کی حفاظت میں کامیاب ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی قابلِ تعریف بات ہے۔ اللہ کرے کہ وہ اس میں کامیاب رہیں۔

1590ء میں، بابا ایوب کے پوتے محرم شاہ (1590-1630)، جو بعد میں کٹور اوّل کے نام سے مشہور تھے، گدی پر براجمان ہوگئے۔ اس طویل جنگ میں محرم شاہ کے ساتھ اس کے بھائی خوش احمد، خوش بخت، محمد بیگ اور محمد رضا کی کوششوں کا بھی بے حد اہم کردار ہے۔ فتح حاصل کرنے کے بعد محرم شاہ نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ریاست کو اپنے بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اس کا نتیجہ بھی کوئی خوشگوار نہ نکلا۔ اگلے کئی سالوں تک چترال کے تخت کی جنگ جاری رہی۔ کبھی ایک جیتا تو کبھی دوسرا۔ ان کی قائم کردہ ریاست قیامِ پاکستان کے بعد تک قائم رہی۔

ایک وقت ایسا بھی تھا، جب چترال کی ریاست ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ریاست ایک طرف گلگت بلتستان تک پھیلی ہوئی تھی اور دوسری طرف موجودہ افغانستان کے کئی علاقے بھی اس میں شامل تھے۔ رئیس خاندان کے بعد، کٹور خاندان کو یہ ریاست ایک طرح سے ورثے میں ملی تھی۔ بعد میں ان کی اولاد میں جانشینی کے مسئلے پر چپقلش شروع ہو گئی۔ اس طرح چترال دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ لڑائی چلتی رہی اور پھر ایک وقت آیا جب انیسویں

صدی میں امان الملک اس کا مہتر بنا، تو اس نے اسے ایک جگہ کر دیا اور اس طرح ریاست چترال کی سرحد گلگت کی وادی سے لے کر دیر کی سرحد تک اور دوسری طرف افغانستان کی سرحد تک پھیل گئی۔

ماضی قریب میں، یعنی 1857ء میں امان الملک حکمران بنا جو 1892ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس دوران اس کی سکھوں سے ایک لڑائی کشمیر میں ہوئی۔ امان الملک نے کئی اور بھی لڑائیاں لڑیں، وہ ایک بہادر حکمران کے طور پر مشہور ہوا۔ اس کے بعد جانشینی کے لیے بھی بے شمار لڑائیاں لڑی گئیں۔

ممتاز حسین مزید لکھتے ہیں امان الملک کی قیادت میں ریاست نے کافی ترقی کی، لیکن اس دوران اسے کافی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس میں سب سے بڑی مشکل مہاراجا رنجیت سنگھ کا کشمیر کی طرف سے ریاست چترال پر حملہ تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، کہ اس وقت کشمیر کی ریاست مہاراجا رنجیت سنگھ کی ریاست میں شامل تھی۔ جب کشمیر پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اس کے نتیجے میں چترال پر بھی انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ یہ 1892ء کی بات ہے، جب امان الملک کی وفات ہوئی تو اس کے پانچ بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ شروع ہوئی۔ اس میں اور بھی بہت سارے لوگ شریک ہوئے ہیں جن میں جندول کا حاکم بھی شامل تھا۔

مہتر امان الملک: ایک انگریز کی نظر میں اور شاہی مسجد چترال

الگرنن ڈیورنڈ اس بات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ یاسین (ایک وادی کا نام) پر کشوکت خاندان کی حکومت تھی۔ اس کے حکمران پہلوان بہادر کا تعلق بھی چترال کے شاہی خاندان سے تھا، وہ شاہ کٹور کے بھائی شاہ کشوکت کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے ایک حاکم نے پنیال پر حملہ کرکے ڈوگروں کو گلگت سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی تائید مہتر نے بھی کی اور اسے ہر طرح کی مدد فراہم کی۔ لیکن یہاں ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ جب پہلوان بہادر اپنی مہم جوئی کے لیے تیاری کر رہا تھا، اس وقت ریاست چترال کے مہتر امان الملک، جس نے خفیہ طور پر اپنی فوجیں جمع کی تھیں، یاسین پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح بدقسمت پہلوان اپنی ہی ریاست سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

مہتر امان الملک ایک سخت گیر حاکم بھی تھا۔ اس نے اپنے تین بھائیوں میں سے دو کو قتل کروایا تھا۔ تیسرا ڈر کے مارے کابل میں جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ یہ بدقسمتی کی بات

ہے، کہ اس طرح کی ریاستوں میں تخت کا فیصلہ تلوار کے زور پر ہی ہوتا تھا، ایسا ہی یہاں بھی ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔

اس نے ایک جابر کی طرح حکومت کی۔ کسی کو اس کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔اس نے اپنے دورِ حکومت میں پشاور کے تاجروں کے ساتھ لکڑی کا کاروبار کیا۔ اسی نے پہلی مرتبہ تجارت میں مداخلت کی، اور اپنے ملک سے گزرنے والی تجارتی اشیاء پر ٹیکس بھی عائد کیا۔ یہ ظلم بھی اس کے دور میں ہوا کہ اس نے اپنی رعایا کو غلام بنا کر بیچ دیا اور لڑکے اور لڑکیوں کے تحفے امیر اور پڑوسی سرداروں کو بھیجے۔ یہ سب اسی مضمون میں لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون کے لکھنے والے اس کے عینی گواہ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک باکردار شخص بھی تھا۔ وہ ایک مہربان اور خوش مزاج باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی اخلاقی برائیوں سے پاک تھا۔ البتہ اس کے حرم میں کئی عورتیں تھیں۔ ان میں بیویوں کے ساتھ ساتھ درجنوں لونڈیاں بھی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے اسّی بچے تھے، جو ریاست چترال میں کئی مقامات پر رہائش پذیر تھے۔

الگرنن ڈیورنڈ یہ بھی لکھتا ہے، کہ اپنی ریاست کے متعلق مہتر امان الملک کے خیالات بے حد دلچسپ تھے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس کی ریاست اس قدر دور دراز علاقے میں واقع ہے، جہاں پہنچنا ایک مشکل کام ہے، اسی وجہ سے یہ بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ بھی ہے۔ اس کے باوجود وہ کبھی کبھار قریبی قبائل پر حملہ بھی کرتا تھا۔ جس کے نتیجے میں اسے کچھ غلام مل جاتے تھے۔ اس نے ایک بڑی تعداد میں پختونوں کو قتل بھی کیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، کہ اس کا کہنا تھا، کہ انگریزوں کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے کاغذ پر نہیں بلکہ ایک تانبے کی چادر پر کندہ کیے جائیں۔ اس کا یہ خیال تھا کہ کاغذ پر لکھے گئے معاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، انھیں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

بات تو درست ہے۔۔۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

چترال کے وسط میں دریائے چترال کے کنارے اور چترال کے شاہی محل کے ساتھ ایک شاہی مسجد ہے۔ یہ مسجد شجاع الملک نے 1924ء میں تعمیر کی تھی، مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مسجد میں داخل ہوں تو ایک دیوار پر اس کی پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ اس

مسجد کے تین بڑے گنبد اور دو بڑے مینار ہیں۔ حجم کے لحاظ سے یہ مسجد بڑی نہیں ہے، لیکن اسے چترال کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز اسے حاصل ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب ڈیورنڈ لائن کا معاملہ طے ہوا اور افغانستان اور پاکستان کی موجودہ سرحدوں کے درمیان علاقہ جات کا فیصلہ ہوا، اس وقت چترال کا علاقہ افغانستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ 1911ء میں انگریزوں نے چترال کو ایک معاہدہ کے ذریعے اپنے ساتھ ملا لیا۔ شجاع الملک اس وقت حکمران تھا، اس کا دور چترال کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ چترال کے حکمرانوں نے افغانستان پر انگریزوں کے حملے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک معاہدے کے مطابق تھا، جس کے نتیجہ میں انگریزوں نے چترال کے حکمرانوں کی مدد کی۔

اسے کیا کہا جائے گا؟ حب الوطنی یا کچھ اور۔۔۔

ایسا ہندوستان بھر میں صرف ایک جگہ نہیں ہوا۔۔۔

سینکڑوں ریاستوں نے ایسا ہی کیا۔۔۔

یہ ہی انگریزوں کی پالیسی تھی۔۔۔

1947ء میں جب گلگت اور سکردو کے لوگوں نے سکھوں کے خلاف بغاوت کی، اس وقت چترال کے مہتر مظفر الملک نے بھی گلگت کے لوگوں کا ساتھ دیا تھا۔ مظفر الملک 1954ء میں لواری ٹاپ پر گزرتے ہوئے ہوائی جہاز کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 1969ء میں یحییٰ خان نے ریاست کو پاکستان کا حصہ بنا لیا، لیکن ریاست کے والیوں کے اعزازت برقرار رکھے۔

چترال میں انگریزوں کی آمد

چترال میں انگریز کب آئے اور کیوں آئے؟ ان سے یہاں کیسا سلوک کیا گیا؟ ان سوالات کے جوابات کئی کتابوں میں موجود ہیں۔ رحمت خان بیگ کی رپورٹ کے مطابق چترال میں برطانوی مداخلت 1885ء میں شروع ہوئی۔ اس کا آغاز لاک ہارٹ مشن اور چترال کے مہتر امان الملک کے درمیان ''دوستی کے معاہدے'' سے ہوا۔

انگریزوں کی اس علاقے میں دلچسپی کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ وہ افغانستان اور اس کے ہندوستان سے ملحق سرحدی علاقوں میں، اپنے ہم خیال اور حلیف لوگوں

کی حکمرانی چاہتے تھے تاکہ روس کی طرف سے کسی بھی یلغار کو آسانی سے روکا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ ریاست چترال میں موجود مادی وسائل، یہاں کی آبادی، راستوں اور گزرگاہوں سمیت ہر طرح کی معلومات ان کے پاس ہونی چاہیے، تاکہ جنگ کی صورت میں وہ ایک بہتر منصوبہ بندی کر سکیں۔

یہی وہ دور ہے جب پہلی دفعہ یہاں پر انگریز آئے۔ یہ ایک الگ سے داستان ہے، کہ وہ چترال قلعے میں محصور ہوئے، اور انھیں چھڑانے کے لیے باہر سے انگریز فوجیں آئیں (اس کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے)۔ اور پھر 1947ء تک وہ یہاں کے بالواسطہ حاکم رہے۔

امان الملک: انگریزوں کا وظیفہ خوار، کیا یہ سچ ہے؟

رحمت خان بیگ کی رپورٹ کے مطابق معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد انگریزوں نے چترال میں اپنا ایک ایجنٹ مقرر کردیا۔

ہندوستان بھر کی تاریخ میں یہ بات تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے، کہ انگریزوں نے کسی بھی علاقے پر قبضہ کرنے سے پہلے وہاں کے راجا یا نواب کے دربار میں اپنا ایک ایجنٹ ضرور مقرر کیا۔ اس کا مقصد حالات کا جائزہ لینا اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کرنا بھی ہوتا تھا۔

ایسا ہی ریاست چترال میں ہوا۔ اسے ریاست چترال کو اپنا حلیف اور ماتحت بنانے کا آغاز سمجھا جاسکتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا، بلکہ انگریزوں نے 1889ء میں مہتر کو چند رائفلوں کے تحفے کے ساتھ ساتھ چھ ہزار روپے سالانہ وظیفہ بھی دینا شروع کردیا۔ اسے کہا گیا کہ یہ دراصل ریاست چترال کی مدد ہے، مہتر کے ذاتی استعمال کے لیے نہیں ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ رقم حاکم کی جیب ہی میں جاتی تھی۔ عوام صرف اس کا بوجھ برداشت کرتے تھے۔

ایسا ہی آج بھی پاکستان کے علاوہ کئی اور ترقی پذیر ممالک میں ہو رہا ہے!

مہتر کی وفاداری دیکھ کر انگریزوں نے سالانہ وظیفہ کی رقم بارہ ہزار کردی۔ پھر یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔ جب 1892ء میں امان الملک کی وفات ہوئی، تو اس کے بعد چترال میں ایک افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ اسکی تفصیل بے حد افسوس ناک ہے۔ مختصر یہ کہ امان الملک کی وفات کے بعد ان کے بیٹے افضل الملک مہتر بنے۔ چند ماہ بعد ہی ان کے بھائی شیر افضل 1892ء میں نے انھیں قتل کردیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب جنوری 1895ء کو نظام الملک کو

بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد امیر الملک چترال کا مہتر بن گیا۔ اسی دور میں افغانستان میں واقع جندول کے ایک جنگجو عمرا خان نے چترال پر حملہ کیا۔ یہ سلسلہ بڑی دیر تک چلتا رہا۔ اسی دور میں انگریزوں کا اثر ورسوخ بھی بڑھتا گیا۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب نظام الملک قتل ہوا، تو ایک گروہ نے اپنی مدد کے لیے انگریزوں کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ پھر وہی ہوا جو ہندوستان بھر میں ہوا۔ کمزور گروہ نے طاقتور گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کو دعوت دی۔۔۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا!

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کی فوج نے افغانوں کے خلاف جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دور میں انگریزوں کو شبہ ہونے لگا کہ امیر الملک کی وفاداریاں عمرا خان کے ساتھ ہیں۔ اس پر انگریزوں نے مہتر کو بے دخل کرکے جیل میں ڈال دیا اور اس کی جگہ شجاع الملک کو مہتر بنا دیا۔

انگریز فوجی قلعہ میں محصور

یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ جب 4 مارچ 1895ء کو برطانوی فوجی، چترال کے قلعے اور اس کے نئے مہتر کا دفاع کر رہے تھے، تو عمرا خان کی افواج نے قلعے کو گھیرے میں لے لیا اور یوں چار سو کی تعداد میں فوجی محصور ہو گئے۔ میجر جارج رابرٹسن انگریزی فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی حکومت سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر نوشہرہ اور گلگت سے فوج مدد کو آ گئی۔ اس مدد کے پہنچنے میں 46 دن لگے۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ ایک پیشہ ور فوج کے سامنے عمرا خان کی فوجیں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ یوں انگریز کا عمل دخل ریاست چترال میں بڑھ گیا۔ اب مہتر ایک طرح سے انگریزوں کا ماتحت بن گیا۔ ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں۔

پھر وہ دن بھی آیا جب چترال کے حوالے سے حتمی فیصلے کا اعلان 1896ء میں کیا گیا۔ اس فیصلے کی رو سے ریاست چترال میں ایک بڑی تعداد میں انگریزی فوج کی تعیناتی کر دی گئی۔

اب حالت یہ تھی۔۔۔

بادشاہت مہتر کی، اور حکم انگریز کا۔۔۔

جو بات دوستی کے معاہدے سے شروع ہوئی وہ ایک بالواسطہ حکمرانی تک پہنچ گئی۔۔۔

اب کی بار انگریزوں نے 1919ء کی اینگلو افغان جنگ کے بعد شجاع الملک کو ان کی وفاداری کے اعتراف میں ایک بڑی تعداد میں رائفلیں اور گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مہتر کو 1927ء میں ریاستی باڈی گارڈ فورس ایک ہزار رائفلوں کا تحفہ اور پھر 1929ء میں دو توپیں بھی دی گئیں۔۔۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انگریز اپنے وفاداروں کی قدر بھی کرتے تھے۔۔۔ لیکن وہ اپنے وفادار بدلتے بھی رہتے تھے۔ جس سے مفاد وابستہ ہوتا اسی کی وفاداری قبول کرتے تھے۔۔۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔۔۔

چترال کا سخت جان جوان اور انگریزی فوج

یہاں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انگریزوں نے جب چترال کے لوگوں کو قریب سے دیکھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مقامی لوگ سرد پہاڑی علاقے میں لڑی جانے والی جنگ کے لیے بے حد مفید ہیں۔ لاک ہارٹ، جس نے چترال کا دورہ کیا تھا، نے لکھا کہ "چترالی، سردی یا تھکاوٹ سے بے نیاز لگتے ہیں۔" یہ بھی لکھا کہ وہ بہترین گھڑ سوار ہیں اور پہاڑی علاقوں میں بہترین پیادہ سپاہی ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ سب جان کر انگریزوں نے چترال کے جنگجوؤں کی مہارت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں سے دس ہزار سپاہی بھرتی کیے جا سکتے ہیں۔ پھر انھوں نے ایسا ہی کیا۔

پھر یہی چترالی، سپاہی کا کردار ادا کر رہے تھے، اسلحہ انگریز کا، افسر ایک برطانوی، سامنے افغانستان کا ایک قبائلی، واقعہ 1919ء کا جب افغان جنگ لڑی جا رہی تھی۔۔۔

اس میں کارنامے دکھانے والے چترالی سپاہی جس نے بہادری کا وہ مظاہرہ کیا جسے دیکھ کر انگریز دنگ رہ گئے۔ چترالیوں نے خود کو مکمل طور پر قابل اعتماد ثابت کیا۔ انگریزوں کے بقول وہ شاندار پہاڑی آدمی ہیں، ان کا طرزِ زندگی سادہ، مزاج سخت جان اور کم خرچ، گوریلا جنگ کے ماہر۔۔۔

انگریزوں کو اور کیا چاہیے تھا؟

چترال سکاؤٹس: انگریزوں کی وفادار فوج جو چترال میں تعینات تھی

اب انگریز مزید آگے بڑھے، اور 1903ء میں چترال میں تعینات برطانوی بٹالین کی مدد کے لیے اور اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے ایک مقامی فورس تشکیل دی۔ شروع میں دوسرے علاقوں کی طرح اسے لیوی کہا گیا۔ بعد میں اسے چترال سکاؤٹس کے نام سے جانا جانے لگا۔ اسی طرح کی ایک فورس گلگت سکاؤٹس کے نام سے بھی بنائی گئی۔ آغاز میں ایک ہزار مقامی لوگ اس میں بھرتی کیے گئے۔ بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب یہ فوج براہِ راست انگریزوں کے ماتحت تھی۔ بظاہر مہتر، چترال کا حاکم تھا، لیکن بندوق انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ چترال میں اصل حاکم کون تھا۔

چترال میں اسماعیلی فرقہ کی ابتداء

رحمت خان بیگ نے چترال میں اسماعیلی لوگوں کے متعلق بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، کہ جب بالائی چترال پر سماکی خاندان کی حکومت تھی، اسی وقت سے یعنی دسویں صدی ہی سے اس علاقے کے لوگ اسلام سے متعارف ہوئے تھے۔ جب 1320ء میں شاہ نادر نے چترال پر اپنا راج قائم کیا تو کئی طرح کے مبلغین اس علاقے میں آئے جن میں ایک اہم فرد تاج مغل بھی تھے۔ تاج مغل خراسان سے آئے تھے۔ یاد رہے کہ وسط ایشیاء کے قریب ہونے کی وجہ سے خراسان، شیعہ اسماعیلیوں کا مرکز تھا۔ تاج مغل کی تبلیغ کے نتیجے میں بالائی چترال کے لوگوں نے ایک بڑی تعداد میں اسماعیلی فرقہ کو قبول کیا۔ بعد میں کئی دیگر علاقے بھی جزوی طور پر اسماعیلی مذہب کے ماننے والے بن گئے۔ اسی طرح گلگت میں اسماعیلی فرقے کی ابتداء ہوئی۔ وہاں بھی وسطِ ایشیاء سے آنے والے مبلغین نے ہی اس سوچ کو پروان چڑھایا تھا۔

رئیس اور کٹور خاندان کے ساتھ ساتھ، چترال کے حاکم ہمیشہ سنی مسلمان ہی رہے ہیں۔ اسماعیلی بھی آباد تھے، لیکن ان کا اثر و رسوخ کوئی زیادہ نہیں تھا۔ پھر جب شجاع الملک کا دور آیا تو پہلی مرتبہ اسماعیلی لوگوں کے ساتھ ایک چپقلش شروع ہوتی ہے۔ اس کی ایک طویل تفصیل ہے جس کا یہاں ذکر مناسب نہیں۔ اس کا ایک مختصر ذکر آپ کی دلچسپی کا باعث ضرور ہوگا۔

سنی حکمرانوں نے ہمیشہ اسماعیلیوں کو برابری کے حقوق دیے۔ اسماعیلی سیدوں کو بہت عزت کا مقام دیا جاتا تھا، یہ سلسلہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔ سنی اور شیعہ اسماعیلی ایک

دوسرے کے ساتھ مل کر رہ رہے تھے۔ شجاع الملک کے دور میں ایک کشمکش کا آغاز ہوا۔ یہ عشر (فصلوں کی زکوٰۃ) کے خلاف اسماعیلی فرقہ کی مخالفت سے شروع ہوا۔ اس تحریک کو دبانے کے لئے تحریک کے رہنما، بلبل شاہ کو شمالی افغانستان جلاوطن کر دیا گیا۔ بلبل شاہ کی جلاوطنی کی وجہ سے اسماعیلیوں میں بڑے پیمانے پر غم و غصہ دیکھنے کو آیا۔ اس کے نتیجے میں چترال میں بدامنی کی فضاء پیدا ہوئی جس کے اثرات آج تک پائے جاتے ہیں۔

انگریز اور صلح صفائی

ان حالات میں انگریزوں کو ریاست چترال کے معاملات میں مزید دخل اندازی کا موقع ملا۔

برطانوی حکومت ہند نے میجر ہاپکنسن کی سربراہی میں ایک انکوائری کمیشن بنایا، جس نے اس معاملے کی تحقیق کی اور اپنی ایک رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ کے مطابق شجاع الملک پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اسماعیلیوں کو زبردستی سنی مسلمان بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ انگریزوں نے اسے کہا کہ وہ اسماعیلیوں پر مزید ظلم و ستم سے باز رہے۔

یہاں مہتر کے پاس اپنے آقاؤں کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس طرح وقتی طور پر یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

رحمت خان بیگ نے یہ بھی لکھا ہے، کہ اسماعیلیوں پر سنی اسلام کو لاگو کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی گئی۔ اب کی بار (1936ء) میں محمد ناصر الملک نے یہ کام کیا۔ اس بار زیادہ سختی سے کام لیا گیا۔ مہتر نے اسماعیلیوں کی جائیداد ضبط کرنے اور مراعات واپس لینے کی دھمکی بھی دی۔ یہ بھی کہا گیا کہ جو مذہب تبدیل کرے گا اسے زمین، رقم، کپڑے اور گھوڑے بطور انعام دیے جائیں گے۔ اب کی بار سلسلہ کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی تعداد میں اسماعیلیوں نے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے چترال سے نقل مکانی کو بہتر سمجھا۔ ان میں سے کئی بمبئی چلے گئے، جہاں اس وقت ان کے روحانی پیشوا، سر سلطان محمد شاہ، آغا خان سوئم رہتے تھے۔ کچھ نے مشرقی ترکستان اور افغانستان کے صوبہ بدخشاں میں پناہ لی۔ اس دوران اسماعیلیوں کا بڑے پیمانے پر سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا۔

ریاست چترال اور پاکستان

تحریک پاکستان میں بھی اس ریاست چترال کے حاکم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد میں انھیں کئی اعلیٰ عہدے بھی دیے گئے۔ تقسیم ہند کے وقت چترال کے مہتر مظفر الملک

(1901-1949) تھے۔ انھوں نے پاکستان سے الحاق کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن الحاق کی دستاویز پر دستخط نہیں کیے۔ یہ دستخط 6 اکتوبر 1947ء کو کیے گئے۔ پھر کوئی سات سال بعد 1954ء میں الحاق چترال کا عبوری آئین منظور کیا گیا جس کے تحت چترال ریاست پاکستان کی ایک وفاقی ریاست بن گئی۔ ریاست چترال کی حیثیت پر پہلی چوٹ 1954ء میں پڑی جب یہاں پر ایک پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر ہوا۔ پھر وہ دن آیا جب 1969ء میں ریاست کو ختم کرکے اسے صوبہ سرحد کا ایک ضلع بنادیا گیا۔

اب اس کے وارث مہتر کی بجائے شہزادہ کہلاتے ہیں۔

وہ ریاست چترال جس کا آغاز 1560ء میں ہوا، وہ 1969 میں 419 سال قائم رہنے کے بعد ختم ہوئی۔ البتہ اس کے وارثان اب بھی اپنے آپ کو اس کا والی ہی سمجھتے ہیں۔

ممتاز حسین کے بقول اس ریاست کے بائیس حکمران رہے ہیں۔ سب سے پہلے حکمران محترم شاہ تھے، جنھوں نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں اس کی بنیاد رکھی اور آخری سربراہ سیف الملوک تھے، جو 1954ء سے لے کر 1969ء تک حاکم رہے۔ سب سے طویل عرصہ حکمران رہنے والوں میں شجاع الملک ہیں جو چالیس سال سے زائد عرصہ تک اس ریاست کے حاکم رہے۔

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا کے مطابق یہاں کے لوگ گیارہویں صدی میں مسلمان ہوئے۔ ان لوگوں میں ایک بہت بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جو اسماعیلی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی انسائیکلوپیڈیا میں لکھی ہوئی ہے کہ چترال کبھی تجارت کے حوالے سے بھی ایک اہم مقام ہوتا تھا۔

چترال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگ بہترین گھڑسوار ہوتے ہیں۔ پولو یہاں کا ایک بہت ہی معروف کھیل ہے۔ ہر سال شندور میں ایک میلہ لگتا ہے جسے شندور پولو میلہ کہا جاتا ہے جہاں ایک بڑی تعداد میں پولو کے مقابلے ہوتے ہیں۔

الگرنن ڈیورنڈ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں[1] کہ مہتر امان الملک ایک عظیم آدمی تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک ایک بہترین انداز سے حکمرانی کی۔ وہ اپنے والد کے دور سے ہی

A Month in Chitral[1]
http://www.anusha.com/durand.htm

ریاست کے معاملات دیکھنے لگ گئے تھے۔ ایک طرح سے انھوں نے مشکل حالات میں جب قتل و غارت، غداری اور سازش کا دور دورہ تھا، متحدہ چترال پر حکومت کی۔ اس وقت ریاست چترال کشمیر کی ایک حلیف ریاست تھی۔ اسے کشمیر کے حکمرانوں کی طرف سے مالی مدد بھی ملتی تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ امان الملک کے بازو پر ہمیشہ ایک باز بیٹھا رہتا تھا۔

یہ تھی چترال کی ایک مختصر تاریخ، امید ہے کہ آپ کو اس سے کئی نئی باتوں کا پتہ چلا ہوگا۔

اب میں اپنے پانچویں سفر متعلق نوید بیگ بھائی کی دعوت کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ ہر سال سردیاں شروع ہونے سے پہلے، چشموں کے پانی سے کاشت کی گئی سفید مکئی پانی سے چلنے والی پتھر والی چکی پر پسوا کر بھجواتے ہیں۔ اس سے تیار کی گئی روٹی بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اللہ ان کا بھلا کرے، آمین۔

اب کے بار اگر جانا ہوا تو واخان بارڈر ضرور جاؤں گا۔ انشاء اللہ۔

ہری پور سے خنجراب پاس تک

میں نے پہلی مرتبہ 2014ء ایک گروپ کے ساتھ گلگت اور ہنزہ کا سفر کیا۔ ہمارے راستے میں کچھ حصہ خیبر پختونخوا کے علاقے، ہزارہ کا بھی تھا۔ ہزارہ کے متعلق، میں نے اپنے گلگت بلتستان کے سفر نامہ میں الگ سے تفصیل سے لکھا ہے۔ کیونکہ یہ علاقے کے پی کا حصہ ہیں، اس لیے میں اسے یہاں دوبارہ سے لکھ رہا ہوں۔ اگر طبیعت پر گراں گزرے تو معذرت چاہتا ہوں۔

ہماری بس رات ساڑھے نو بجے کے قریب لاہور سے روانہ ہوئی۔ راستے میں بھیرہ کے مقام پر، کچھ دیر کے لیے رُکے اور پھر وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ جب ہم ہری پور میں داخل ہوئے، اس وقت صبح کے دو بج رہے تھے۔ اُس وقت سڑکیں سنسان تھیں۔ سابق صدر پاکستان ایوب خان کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ جنرل ایوب، ہری پور سے کچھ میل کے فاصلے پر ایبٹ آباد روڈ پر واقع ریحانہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے علاوہ مشہور شاعر اور فلمی گیت نگار قتیل شفائی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ ہم ہری پور سے آگے نکل کر ریحانہ سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچے۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔ بس میں سوار تمام لوگ سو رہے تھے اور مجھے لوگوں کے خراٹوں کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی (لاہور سے ہری پور کے سفر کی داستان میں نے الگ سے پنجاب کے اسفار میں لکھی ہے)۔

ہزارہ: ایک خوبصورت وادی، جہاں قرآن سے محبت کرنے والے بستے ہیں

اس سے پہلے کہ میں آپ کو ہزارہ میں کیے گئے سفر کی کہانی بیان کروں، ہزارہ کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

ہزارہ ڈویژن، ہری پور، ایبٹ آباد سے شروع ہو کر، مانسہرہ، بالاکوٹ، کاغان، کوہستان اور ناران پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کے اکثر لوگوں کی زبان ہندکو ہے، جو بہت حد تک پنجابی سے ملتی ہے۔ پنجابی بولنے والے، اسے آسانی سے سمجھ تو سکتے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ ہزارہ ڈویژن دریائے سندھ کے مشرقی علاقے پر مشتمل ہے اور اس کے کل چھ اضلاع

(ہری پور، ایبٹ آباد، بٹگرام، مانسہرہ، اپر کوہستان اور لوئر کوہستان ہیں)۔ ہزارہ ڈویژن میں داخل ہوتے ہی پہاڑی سلسلوں کا آغاز ہو جاتا ہے، جو اس علاقے کے حُسن میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً پچیس سو سال پہلے اس علاقے پر سکندرِ اعظم اور اشوک اعظم کا غلبہ رہا ہے۔ ہزارہ کے ساتھ واقع ٹیکسلا میں بدھ مت کی باقیات بھی اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ مانسہرہ میں بدھ مت کے آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ یہ علاقہ بھی بدھ مت کے زیرِ اثر رہا ہے۔

ہزارہ کی ایک اور خصوصیت یہاں پر بسنے والے لوگ اور بولی جانے والی زبانیں ہیں۔ ہری پور سے شروع ہو کر کوہستان کے آخری شہر، داسو اور دوسری طرف ناران سے اوپر تک بے شمار قبائل آباد ہیں جو مختلف ادوار میں یہاں آئے، لوگوں کے بقول، اس علاقے میں کوئی دس سے زائد، زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تاہم زیادہ آبادی ہندکو اور پشتو بولتی ہے۔ اس کے علاوہ گجری بھی مقبول زبان ہے۔ کوہستان کے علاقے میں، تروالی اور شینا زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

محمود غزنوی بھی اس علاقے پر قابض رہا ہے۔ کابل واپسی پر اس نے اپنے ایک ترک جرنیل کو اس علاقے میں مقرر کیا، جس نے اپنی حکومت قائم کی اور گلی باغ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس علاقے کے لوگ مغلوں کی حکمرانی کو بھی تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے وہ مغل سلطنت کا حصہ بھی سمجھے جاتے تھے۔

ہزارہ ایک خوبصورت علاقہ ہونے کے ساتھ ساتھ شمال سے آنے والوں کے لیے ایک گزرگاہ بھی تھا۔ اس علاقے میں موجود پانی کی وافر مقدار اور ہرے بھرے جنگلات باہر سے آنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ہم اسی خوبصورتی میں کھوئے ہزارہ ڈویژن میں داخل ہوئے تو بالاکوٹ میں سیّد احمد شہیدؒ اور سکھوں کے درمیان ہونے والی جنگ کی یاد آ گئی۔ سکھوں کی حکومت سے پہلے افغانستان کے ابدالی حکمرانوں نے بھی ہزارہ کو اپنی حکومت کا حصہ بنایا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف میں یہاں ابدالی حکومت کرتے تھے۔ یہاں کا ایک نواب، میر نواب خاں، ابدالیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔

ابدالیوں کی کمزوری کی وجہ سے سکھوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ جمایا اور اسے سکھ حکومت کا حصہ بنا لیا۔ یہاں کے لوگوں نے سکھوں کا خوب مقابلہ کیا، جن میں محمد خان ترین اور بوستان خان کا نام سرِفہرست ہے۔ اس علاقے کی اہمیت کے پیشِ نظر، رنجیت سنگھ نے خود اس علاقے پر حملہ کرکے یہاں اپنا قبضہ جمایا اور محمد خان ترین کو اپنا قیدی بنا کر لے گیا۔ اس علاقے

کے لوگوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور سکھوں کو شکست دی اور ان کی چوکیوں پر قبضہ کرکے سکھوں کو اپنے علاقے سے چلے جانے کی اجازت بھی دے دی۔

اس علاقے پر انگریزوں نے بھی حکومت کی۔ سکھوں کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت، ایک حصے پر انگریز قابض ہوئے اور اس کی ذمہ داری میجر جیمز ایبٹ کو سونپی گئی۔ یہ وہی میجر ہے جس کے نام پر ایبٹ آباد شہر بنایا گیا۔ 1900ء تک اس علاقے کا مکمل کنٹرول انگریزوں کے پاس تھا اور 1901ء میں اسے پنجاب سے الگ کرکے اس وقت کے صوبہ سرحد، موجودہ خیبر پختونخوا کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے مغلوں سے سکھوں کے عہد تک، اس علاقے کا تعلق پنجاب ہی سے رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے، کہ اب بھی ہزارہ کے لوگ خیبر پختونخوا سے الگ ہو کر اپنا ایک علیحدہ صوبہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہزارہ کے لوگوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے لیے اپنے پندرہ سو فوجی بھیجے۔ یہ تمام فوجی امب کے نواب محمد فرید خان کے تربیت یافتہ تھے۔ ان قبائل نے مل کر کشمیر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا، جسے رکوانے کے لیے بھارت اقوام متحدہ میں گیا اور رائے شماری کا وعدہ کیا۔ اب یہ حصہ آزاد جموں و کشمیر کہلاتا ہے۔

ہری پور: ہری سنگھ نلوا کا بسایا ہوا شہر

مجھے پہلی مرتبہ 1980ء میں ہری پور جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ایک کالج فیلو زاہد مشتاق، اس شہر میں رہتے تھے۔ ان کے والد محترم، یہاں پر ٹی اینڈ ٹی کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ اس وقت یہ نہایت ہی صاف ستھرا شہر تھا اور کمپنی کی کالونی بہت ہی لاجواب تھی، مجھے اب تک اس سفر کی باتیں یاد ہیں۔ اس کے بعد کافی مرتبہ اس شہر سے گزرنے کا اتفاق ہوا، اب ایک مرتبہ پھر شہر کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ ، کیونکہ آگے جانے کے لیے پرانا راستہ جو حسن ابدال سے شروع ہو کر ہری پور سے گزر کر ایبٹ آباد اور اس سے آگے جاتا تھا۔ یہ ہزارہ موٹر وے بننے کی وجہ سے لوگوں نے ترک کر دیا ہے اور اب لوگ، ہزارہ موٹر وے کے ذریعے ،شاہ مقصود انٹر چینج پر اترتے ہیں اور آگے چلے جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے ہری پور ایک بڑا ہی تاریخی مقام ہے۔ یہ شہر مہاراجا رنجیت سنگھ کے دور میں بسایا گیا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اور اس شہر کا نام ایک سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوا، جس نے کشمیر اور ہزارہ کو سکھ حکومت کا حصہ بنایا تھا،کے نام پر رکھا گیا۔ یہ جرنیل سکھوں کی فوج کا سب سے کامیاب اور بہادر جرنیل مانا جاتا ہے۔ میں نے جو جانا، اس کے مطابق جب ہری سنگھ

نلوا کو ہزارہ میں تعینات کیا گیا تو اس نے یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروایا اور اس کا نام سکھوں کے آٹھویں گرو کے اعزاز میں ہری کشن گڑھ رکھا۔ بعد میں اس کے ارد گرد آبادی ہو گئی۔ اب یہ ایک بڑا قصبہ ہے اور ہری پور کے نام سے ہی موسوم ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ رنجیت سنگھ کے جرنیل اور آٹھویں گرو دونوں کا نام ایک ہی ہے۔ میرے خیال میں ہری پور کا نام، سکھوں کے گرو کے نام پر رکھا گیا ہوگا۔

یاد رہے افغانستان سے آنے والے تمام تر لوگ، جو ہندوستان کو فتح کرنے آتے تھے، وہ ہزارہ ڈویژن کے علاقے کو سب سے پہلے فتح کرتے اور یہاں پر اپنی حکومت قائم کرتے تھے۔ آخری حکومت، احمد شاہ ابدالی کی تھی، جس نے ہزارہ کو فتح کیا اور اس علاقے کی حکمرانی ہزارہ ہی کے لوگوں کو سپرد کر کے واپس چلا گیا۔

ہری سنگھ نلوا: سکھوں کا ہیرو

میں اس موقع پر ہری سنگھ نلوا بارے کچھ معلومات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ہری سنگھ نلوا کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اتنا شاید ہی کسی اور سکھ جرنیل متعلق لکھا گیا ہو۔ میں نے ان کے متعلق جاننے کے لیے دو مضامین سے مدد لی ہے۔ ایک مضمون ڈاکٹر انکیتا کمار نے لکھا ہے[1]۔ دوسرا مضمون sikhnet.com پر The Untold Story of Hari Singh Nalwa:The Sikh Warrior Who Defeated the Afghans کے نام سے موجود ہے[2]۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ افغانستان پر یونان (سکندر)، ایران، وسط ایشائی ریاستوں (تیمور، چنگیز خان، مغل، تغلق، غزنوی)، برطانیہ، روس اور امریکہ نے حملے کیے اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے طویل جنگیں بھی لڑیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک لمبے عرصے

---

[1] Hari Singh Nalwa Was Feared In Life and Death https://organiser.org/2022/09/11/93674/bharat/hari-singh-nalwa-was-feared-in-life-and-death/

[2] https://www.sikhnet.com/news/untold-story-hari-singh-nalwathe-sikh-warrior-who-defeated-afghans

کے لیے افغانستان پر حکومت نہ کر سکا۔ یہ تمام تر حملے افغانستان کے شمال، مشرق اور جنوب سے ہوئے۔ امریکہ بھی جنوب ہی سے آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان نے بھی اس کی مدد کی۔

دوسری طرف ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دو مرتبہ افغانستان پر مشرق سے بھی حملہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ جے پال نے غزنی پر حملہ کیا تھا اور دوسری مرتبہ سکھوں نے۔ سکھوں کا حملہ صرف جمرود تک ہی رہا۔

سکھوں کے حملے کے وقت، رنجیت سنگھ پنجاب کا حاکم تھا اور افغانیوں کے ساتھ جنگ کے لیے اس کا ایک نامی گرامی جرنیل ہری سنگھ نلوا تھا۔ ہری سنگھ نلوا نے پختونوں کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ اس لیے اس کا ایک مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

میرے علم کے مطابق، خیبر پختونخوا میں صرف دو بڑے شہر ایسے ہیں جن کے نام سکھوں کے نام پر رکھے گئے؛ ایک ہری پور اور دوسرا مانسہرہ۔ ہری سنگھ نلوا ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دادا ہرداس سنگھ بھی ایک بہادر آدمی تھے جو احمد شاہ ابدالی کے خلاف لڑتے ہوئے 1762ء میں مارے گئے تھے۔ ان کے والد، گردیال سنگھ کے علاوہ بھی ان کے خاندان کے لوگوں نے ابدالی کی فوجوں کے خلاف بہت سی مہمات میں حصہ لیا تھا۔ ہری سنگھ نلوا نے پشاور پر سکھوں کی حکومت بنانے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ ان کی سکھ لوگوں کے ہاں بے حد قدر و منزلت ہے، وہ اسے ایک بہادر اور عظیم سپہ سالار کی حیثیت دیتے ہیں۔

ہری سنگھ کے والد بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ ان کی والدہ، دھرم کور انھیں لے کر اپنے والدین کے گھر آ گئیں۔ ہری سنگھ نے پنجابی اور فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ، انھوں نے گھڑ سواری اور تلوار بازی کے فن میں بھی مہارت حاصل کی۔ جب جوان ہوئے، تو مہاراجا رنجیت سنگھ کی فوج میں بھرتی ہو گئے اور جلد ہی ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے، کہ انھوں نے ایک مرتبہ اکیلے ایک شیر کو قابو کیا تھا، جس کے بعد انھیں نلوا کا خطاب دیا گیا یعنی شیر جیسے پنجوں والا۔

ہری سنگھ نے قصور سیالکوٹ، ساہیوال اور خوشاب سمیت کئی مہمات میں حصہ لیا۔ وہ اس فوج میں بھی شامل تھا، جس نے ملتان فتح کیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ کشمیر کی جنگ میں ایک اہم کردار سمجھے جاتے تھے۔ پشاور کی فتح ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

ہری سنگھ ایک جنگجو کے ساتھ ساتھ ایک اچھے منتظم بھی تھے۔ انھیں جب کشمیر کا گورنر بنایا گیا تو انھوں نے شورش زدہ علاقوں میں نظم و نسق قائم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ

انھوں نے گردواروں کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا اور دریائے جہلم کے کنارے ایک کشادہ باغ بھی بنوایا۔ رنجیت سنگھ ان کے کام سے اتنا خوش تھا، کہ ان کے نام کا ایک سکہ بھی جاری کیا گیا، جسے ہری سنگھی روپیہ کا نام دیا گیا۔ میں نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ کسی بادشاہ یا راجا نے خوش ہو کر اپنے کسی جرنیل کے نام کا سکہ چلایا ہو۔

کشمیر میں ایک کامیاب گورنر کے طور پر کام کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے انھیں 1822ء میں اپنی سلطنت کے شمال مغرب میں ہزارہ اور اس کے ساتھ پختون علاقے میں گورنر تعینات کر دیا۔ وہ اس علاقے میں کوئی پندرہ سال تک رہے۔ اسی دور میں انھوں نے ہری پور قلعہ تعمیر کروایا۔

جب سیّد احمد شہیدؒ اس علاقے میں آئے، تو ہری سنگھ نلوا نے ہی ان کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ پشاور پر حملہ آور ہوتے ہیں اور 1834ء میں پشاور پر قبضہ کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جمرود میں قلعہ ان ہی کے دور میں بنایا گیا، جس کی حفاظت کرتے ہوئے، وہ قتل ہو جاتے ہیں۔

ابدالی کے بعد کا ہزارہ

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان سے جانے کے بعد سکھ حکومت طاقتور ہو گئی اور اس نے مہاراجا رنجیت سنگھ کی قیادت میں بے شمار علاقہ جات فتح کر لیے، جن میں ہزارہ بھی شامل تھا۔ سکھوں کے متعلق بھی یہی مشہور کیا گیا ہے، کہ ان کا زیادہ تر کام تباہی و بربادی پھیلانا ہی تھا اور شاید تعمیر ان کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ ہری پور شہر کو سکھوں نے بسایا بھی اور آباد بھی کیا، جو کہ ان کے متعلق پھیلائے گئے تاثر کو زائل کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سکھ اپنی ابتداء کے وقت سے آج تک حالت جنگ میں ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد بھی بھارت کی مرکزی حکومت ان کی سب سے بڑی دشمن ہے، گولڈن ٹیمپل پر حملہ اس کی ایک بڑی مثال ہے۔ ان کی پہلی دشمنی وسطِ ایشیاء سے آنے والے مغلوں سے ہوئی، پھر مراٹھے، آخر میں افغانی اور انگریز ان کے دشمن بنے۔ ان کی سب سے زیادہ جنگیں انگریزوں سے ہوئیں۔ وہ پنجاب پر برطانیہ کے قبضے کے خلاف آخری رکاوٹ تھے، ان کی شکست کے بعد ہی، برطانیہ کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو سکا۔

حالت جنگ میں تعمیر کرنا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں!

جب انگریزوں کا پنجاب پر مکمل قبضہ ہو گیا اور 1849ء میں چیلیاں والا (گجرات) کی لڑائی میں سکھوں کو شکست ہو گئی تو اس کے بعد انگریزوں نے ہزارہ کے علاقے سے سکھوں کی حکومت کو ختم کر دیا۔ ایبٹ آباد شہر، آباد ہونے سے پہلے ہری پور ہی اس علاقے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مسٹر ایبٹ نے ہری پور کی کچھ تصاویر بھی بنائی تھیں۔ ایک انتہائی دلچسپ بات یہ بھی ہے، کہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج میں یورپ کے لوگوں کو بھی بھرتی کیا ہوا تھا۔ ان میں ایک صاحب، جن کا نام کرنل کنارا تھا، اس کی قبر اب بھی ہری پور میں ہے، جو سکھوں کی طرف سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے تھے۔

میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ اس کے علاوہ بھی بے شمار لوگ، جن کا تعلق یورپ سے تھا، اس وقت ہندوستان میں مختلف مہاراجوں کے دربار یا ان کی فوجوں میں کام کرتے تھے۔ اس سے مجھے تھوڑی سی حیرانی بھی ہوئی، کہ کس طرح ایک آدمی یورپ سے چل کر اتنے دور دراز علاقے میں آتا تھا اور کسی کے لیے جنگ لڑتا بھی تھا۔

اس بات سے پتہ چلتا ہے، کہ اُس دور میں ہندوستان ایک ایسا ملک تھا، جہاں یورپ کے لوگ آکر ملازمت کرتے تھے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہے، کہ بعد میں ہندوستان کے لوگوں نے انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر مصر، فرانس اور برما کی جنگیں بھی لڑیں اور برطانیہ کے تاج کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں اپنی جانیں بھی قربان کیں۔ شاید انسانی فطرت میں لڑائی شامل ہے اور اس کے لیے مذہب اور علاقے کی کوئی قید نہیں ہے۔

ہری پور اسلام آباد سے ستر کلومیٹر دوری پر واقع ہے، بذریعہ ہزارہ موٹر وے یہ فاصلہ سو کلومیٹر کے قریب ہے اور سطح سمندر سے سولہ سو فٹ بلند ہے۔ ہری پور کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ یہاں کے قبائل کی سکھ فوجوں کے ساتھ لڑائی ہے۔ انھوں نے یہاں کے سکھ سرداروں کو پکڑا، انھیں پھانسی دی اور پھر ایک دن اس علاقے کو آزاد کروا کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

یوں انگریزوں نے اپنے ایک دشمن یعنی سکھوں کا خاتمہ دوسرے دشمن یعنی مسلمانوں کے ہاتھ سے کروایا۔

پھر ایک دن مسلمان کو بھی غلام بنا لیا!

ایک اور بات بھی اہم ہے، کہ اس وقت اس علاقے میں سکھوں کی آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سکھوں نے لاہور سے آکر اس علاقے کو فتح کیا جہاں پر ان کا ایک بھی مقامی حمایتی

نہیں تھا۔ وہ سب انھوں نے اپنی فوجی طاقت کے بل پر کیا، لیکن وہ بہت دیر تک اس قبضے کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس کے برعکس انگریز، جب اس علاقے میں آئے انھیں بھی مقامی حمایت حاصل نہ تھی، لیکن انھوں نے اپنی حکومت کی طاقت کے ساتھ ساتھ فلاحی کاموں کی مدد سے اپنا تسلط قائم رکھا اور پھر سو سال کے بعد وہ بھی اس علاقے سے چلے گئے۔ ہری پور شہر کو دیکھنے کے بعد سکھوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ بربادی کے ساتھ ساتھ آبادی کا کام بھی کر لیا کرتے تھے۔

میں ایک اور اہم بات بھی آپ کو بتانا چاہتا ہوں، کہ جب 1831ء میں بالاکوٹ میں سیّد احمد شہیدؒ کی فوج کو شکست ہوئی، اس وقت ہری سنگھ نلوا کشمیر کو فتح کر کے ہزارہ فتح کر رہا تھا۔ اس کا جرنیل شیر سنگھ بھی ساتھ تھا، جس نے کشمیر فتح کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ دوسری طرف سیّد احمد شہیدؒ رحمتہ اللہ علیہ پشاور کے بعد کشمیر فتح کرنے کے لیے، بالاکوٹ کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، کہ سکھوں نے ان کا راستہ روکنے کے لیے بالاکوٹ کے مقام پر ان سے جنگ کی اور بے شمار مجاہدین کو شہید کیا۔ یہ تمام تر کارروائی، ہری سنگھ نلوا کی نگرانی میں ہوئی ۔ اس کا ہیڈ کوارٹر یہی ہری پور تھا۔

ہری پور کے قریب تربیلا اور خان پور ڈیم دو اہم مقامات ہیں، جو آپ کی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہری پور کے پاس چوتھی صدی عیسوی کا ایک بدھ مت مندر بھی ہے، جس کا نام بامالا اسٹوپا ہے۔ 2017ء میں اس جگہ سے 48 فٹ طویل، کوئی دو ہزار سال پرانا سویا ہوا بدھا کا بت بھی ملا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بدھا کے متعلق یہاں سے بے شمار چیزیں ملی ہیں، جس سے اس علاقے کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شہر میں ایک سرکاری باغ بھی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر کبھی آپ کا اس علاقے میں آنا ہو تو دنیا بھر میں سب سے میٹھا شکری مالٹا کھانا اور لے جانا نہ بھولیے گا۔ اس سے مزیدار مالٹا، آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ حالانکہ اہل سرگودھا کا دعویٰ ہے، کہ ان کے مسمّی بہترین ہیں، مگر میں تو یہ بات ضرور کہوں گا کہ شکری کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس سے میرے کئی دوست ناراض بھی ہو سکتے ہیں، خاص طور پر ڈاکٹر اشتیاق گوندل اور امجد وڑائچ، یاروں کا کیا ہے، انھیں تو منایا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت تو بیان کرنی چاہیے۔

ہری پور کے متعلق بہت ہی مختصر بات کہی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریر آپ کے ہری پور دیکھنے کی خواہش میں اضافے کا باعث ہو گی۔

جنرل محمد ایوب خان اور ریحانہ

ایوب خان 1907ء میں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ترین قبیلے سے تھا۔ ترین قبیلہ اس علاقے میں ایک خاص مقام رکھتا ہے اور اس نے سکھوں کے خلاف جنگوں میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جنرل ایوب خان نے برٹش آرمی میں کئی سال گزارے اور جنگ عظیم دوم میں بھی حصہ لیا۔ 1947ء کے بعد وہ پاکستانی فوج کے افسر بنے اور 1951ء میں انھیں وزیراعظم لیاقت علی خان نے پاکستانی فوج کا سربراہ مقرر کر دیا۔ 1958ء میں سکندر مرزا نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا، جس کی جنرل ایوب نے بھرپور حمایت کی اور اس کے دو ہفتے بعد ہی وہ سکندر مرزا کو برطرف کر کے خود پاکستان کے حکمران بن گئے۔

جنرل ایوب کے دور میں، پاکستان کا مکمل جھکاؤ، امریکہ کی طرف ہو گیا، جو اَب تک جاری ہے۔ اس دور میں بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ ہوئی۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ جنرل ایوب کے دور میں بے شمار نئے منصوبے شروع اور مکمل بھی ہوئے جن میں تربیلا اور منگلا ڈیم قابل ذکر ہیں۔ جنرل ایوب کے دور کو پاکستان کی معاشی تاریخ میں ایک سنہری دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، لیکن جس طرح انھوں نے ملک میں قائم جمہوری قوتوں کو پامال کیا، ان کا یہ جرم بھی اگلی کئی صدیوں تک نا قابل معافی رہے گا۔

میں نے ایوب خان کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹر کا اردو ترجمہ پڑھا ہے۔ ان کے متعلق جاننے کے لیے ان کی اپنی لکھی ہوئی کتاب بے حد مفید ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنے تمام تر غیر جمہوری اقدامات کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کا فیصلہ تاریخ کر رہی ہے کہ کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔

ہری پور سے ایبٹ آباد

صدر ایوب کو یاد کرتے ہوئے ہم ریحانہ کے پاس سے گزرے۔ سڑک کے دونوں طرف کافی نرسریاں تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند سال قبل میں اپنے خاندان کے ساتھ اس راستے سے گزرا تھا اور ہم نے ایک ہوٹل سے تازہ مچھلی بھی کھائی تھی۔ میں بس سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ اب لوگ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھا عدیل لیاقت بھی اب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ عدیل کا قد ساڑھے چھ فٹ ہے جس کی وجہ سے اسے بس میں بیٹھنا کافی دشوار لگتا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ بازو والی سیٹ کا انتخاب کرتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ عدیل سے پوچھا کہ لمبے قد کا کوئی فائدہ بھی ہے، جس پر اس نے ہنس کر جواب دیا کہ گھر میں بلب وغیرہ لگانے میں

آسانی کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں۔ یاد رہے کہ عدیل اس گروپ کے مالک ہیں، جو گروپ ہمیں یہ ٹور کروارہا تھا۔ ان کا تعلق لاہور سے ہے۔

ہری پور سے ایبٹ آباد کا فاصلہ چالیس کلو میٹر ہے، لیکن دن کے وقت رش کی وجہ سے کافی وقت لگ جاتا ہے۔ چونکہ ہم رات کے آخری پہر میں وہاں سے گزر رہے تھے، اس لیے آدھے گھنٹے میں ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے تین بج چکے تھے اور سڑکیں سنسان تھیں۔ البتہ فوجی جوان دفاعی عمارتوں کے سامنے تندہی سے سیکورٹی کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے، کہ میں پہلی مرتبہ 1980ء میں ایبٹ آباد آیا تھا۔ ہمارا ارادہ تو بالا کوٹ جانے کا تھا، مگر ایبٹ آباد پہنچنے کے بعد ایک برساتی نالے کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا اور ہم واپس چلے آئے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کے متعلق کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ ہری پور اور ایبٹ آباد کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں، جو نہایت ہی دلچسپ ہیں۔

اے ایبٹ! تیرا شہر آباد رہے

پاکستان کے مختلف حصوں میں کئی شہر ایسے ہیں، جن کے نام انگریزوں کے نام پر رکھے گئے اور انھیں بسایا بھی انگریزوں نے ہی۔ کچھ ایسے بھی شہر ہیں، جو تھے تو پرانے لیکن ان کے نام بدل کر انگریزوں نے اپنے نام پر رکھ لیے۔ انگریزوں نے جو نئے شہر بسائے اور ان کے نام اپنے ناموں پر رکھے ان میں لائل پور، جیکب آباد اور ایبٹ آباد شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور شہر بھی ہیں۔ کچھ شہروں کے نام انگریزوں نے بدلے جنھیں بعد میں لوگوں نے ان کے اصلی نام سے ہی پکارنے کو ہی پسند کیا، جیسا کہ منٹگمری کو دوبارہ ساہیوال بنایا گیا، کیمبل پور کو اٹک۔

ایک شہر ایسا بھی ہے جسے انگریزوں نے بسایا اور اپنا نام دیا (یعنی لائلپور) بعد میں شاہ فیصل کی محبت میں گرفتار مسلمانوں نے اسے فیصل آباد بنا دیا۔ حالانکہ اسے بسانے میں شاہ فیصل یا اس کے خاندان کا کوئی کردار نہیں تھا۔ یہ کردار مسٹر لائل کا تھا، جو اس علاقے میں اس وقت سرکاری آفیسر تھا اور اس نے ایک بنجر علاقے کو آباد کیا تھا۔ نہری نظام بنایا اور بے شمار آبادی کو بسایا۔ ایبٹ آباد بھی ایک ایسا ہی شہر ہے جسے انگریزوں نے بسایا اور انھی کے نام پر یہ شہر اب تک موجود ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس میں اس شہر کے نام کو بدلنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ یہ شہر مجھے ذاتی طور پر بے حد پسند ہے اور میری یہ خواہش بھی رہی کہ کبھی مجھے اس شہر میں رہنے کا موقع ملتا۔

ایبٹ آباد جانے کے لیے تین راستے ہیں؛ ایک راستہ ہری پور حویلیاں کی طرف سے ہے، دوسرا راستہ نتھیا گلی سے آتا ہے جبکہ تیسرا راستہ مانسہرہ سے آتا ہے۔ جب بھی میں اپنے بچپن میں ایبٹ آباد کا نام سنتا تھا، تو فوری طور پر جو چیز سب سے پہلے میرے ذہن میں آتی تھی، وہ یہاں کی کاکول اکیڈمی تھی۔ میرے ذہن میں یہ تو نہیں تھا کہ میں کبھی فوجی بنوں گا، لیکن ارد گرد کے بہت سارے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ فوج میں کمیشن حاصل کرکے کاکول اکیڈمی سے اپنی ٹریننگ مکمل کریں گے اور یوں وہ ایک فوجی افسر بن جائیں گے۔ 27 نومبر 2018ء کو مجھے الخدمت آغوش (یتیم بچوں کی رہائش گاہ) کے نئے بلاک کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے مانسہرہ جانا تھا اور اس کے لیے ایبٹ آباد ہی سے گزرنا تھا، واپسی پر میرے پاس تھوڑا سا وقت تھا، تو میں نے سوچا کہ ایبٹ آباد شہر کی سیر کی جائے۔

یہ بات شاید آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ میں اکیلا سیاحت سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اس دن بھی میں اکیلا تھا اس لیے مجھے ایبٹ آباد دیکھنے کا موقع ملا۔ اکیلے سیاحت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی مرضی سے پروگرام بنا سکتے ہیں۔ کسی اور کی کوئی رائے شامل نہیں ہوتی کہ یہاں جانا ہے، وہاں جانا ہے، جلدی جانا ہے یا دیر سے جانا ہے۔ میں نے اپنی مرضی سے شہر کی سیر کی، جس کا کچھ احوال پیش خدمت ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں اس علاقے میں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس علاقے پر حملہ کیا اور کافی جانی نقصان اٹھایا اس کے دو بڑے جرنیل بھی قتل ہوئے، اس کے باوجود اس نے 1818ء میں اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ کشمیر کے بعد اس کی ایک اہم فتح تھی۔ انگریزوں نے سکھوں کو شکست دی اور ایک ایک کرکے مختلف علاقے ان سے چھین لیے جس میں کشمیر کے علاوہ موجودہ خیبر پختونخوا کے بھی بے شمار علاقہ جات شامل تھے۔ اس علاقے میں انگریزوں کی طرف سے میجر جیمز ایبٹ انچارج تھا اور علاقے پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد اسے اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا۔ اس نے یہاں پر شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔ اس شہر کی آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے شہر میں ایک چرچ بھی بنایا۔ میں نے وہ چرچ بھی دیکھا ہے جو 1864ء میں بنایا گیا تھا اور اس کے سامنے ایک لیڈی گارڈن تھا۔ اب اس کا نام کنٹونمنٹ گارڈن رکھ دیا گیا ہے۔

کام کسی کا، اور نام ہمارا۔۔۔ یہی رِیت ہے پرانی!

یہ میرے لیے ایک بڑی ہی حیران کن بات ہے، کہ ہم لوگوں کے کارناموں پر اپنے نام کی تختی کیوں لگاتے ہیں؟ ہمیں اپنا کام خود سرانجام دینا چاہیے اور پھر اس پر اپنا نام بھی لکھیں تو خوبصورت لگتا اور باعزت بھی لگتا ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ پاکستان کے تمام تر شہروں میں ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں موجود تھیں، جن میں اکثر کو ہم نے برباد کر دیا۔ ایک سکھ گردوارہ، ایبٹ آباد میں بھی تھا، جو 1943ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ یاد رہے، کہ اس وقت یہاں پر سکھ آباد تھے اور قریب ہی حسن ابدال بھی تھا، جہاں سکھوں کا ایک اہم مذہبی مقام بھی موجود ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب سکھ چلے گئے، تو ہم نے اس گردوارے کو بھی ختم کر دیا۔ اس گردوارے کا نام گرو بابا گردوارہ تھا اور اسے ایبٹ آباد میں رہنے والے سکھوں نے بنایا تھا۔ اب گردوارے کو مارکیٹ اور میونسپل کمیٹی کے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

مذہبی مقامات کے ساتھ ایسا سلوک مناسب نہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہری پور کو چھوڑ کر ایبٹ آباد کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا، اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ اس مقام سے ایک راستہ مظفرآباد کو بھی جاتا تھا۔ اس راستے کا بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، مجھے یہ بات میرے ماموں نے بتائی تھی جو فوج میں تھے اور اس راستے سے گزرے تھے۔

ایبٹ آباد سے ایک راستہ مری کی طرف بھی جاتا تھا اور پھر مری سے ہو کر راولپنڈی تک جاتا ہے۔ جہاں پر انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ ایک راستہ اوپر پہاڑوں سے ہو کر ناران کاغان سے ہوتا ہوا گلگت تک بھی جاتا تھا۔ اگر آپ ایبٹ آباد کے نقشے کو غور سے دیکھیں تو یہ آپ کو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ سیکورٹی کے نُقطۂ نَظَر سے بھی اس جگہ کو محفوظ سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے انگریزوں کے دور سے ہی یہاں پر مختلف فوجی تنصیبات موجود ہیں۔

ایبٹ آباد سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ پہاڑوں کی بلندی دیکھیں تو کافی زیادہ معلوم ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہاں کا موسم معتدل رہتا ہے۔ میرے خیال میں اسی وجہ سے یہاں پر کاکول اکیڈمی اور بے شمار اسکول اور کالجز بھی بنائے گئے ہیں۔ اب تو یہاں ماشاءاللہ بے شمار اسکول اور کالجز ہیں اور اسے تعلیمی شہر بھی کہا جاسکتا ہے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پرانے وقتوں میں لوگ ہزارہ سے براستہ مانسہرہ، گڑھی حبیب اللہ اور مظفرآباد جاتے تھے۔ دوسرا راستہ (پیدل چلنے کا تھا) فوج کی آمد ورفت کے

لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور شارٹ کٹ بھی تھا، وہ ایبٹ آباد سے رن کوٹ کی طرف سے ہوتے ہوئے پہاڑوں میں سے گزر کر مظفر آباد پہنچ جاتا۔ یہ مانسہرہ والے راستے سے کم طویل ہے۔ میرا خیال ہے کہ انگریزوں نے اس علاقے کو اس لیے بھی چنا ہوگا کہ یہاں سے وہ کشمیر کو بہتر انداز سے کنٹرول کر سکتے تھے۔

سو سالہ پرانی الیاسی مسجد

ایبٹ آباد کے قریب نواں شہر کے نام سے ایک قصبہ ہے، جہاں سو سالہ پرانی الیاسی مسجد موجود ہے، مجھے اسے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت عزیزم سعد مرتضٰی میرے ساتھ تھے۔ اس مسجد کی تعمیر بہت ہی خوبصورت طریقے سے کی گئی ہے اور بہت سارے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ وہ مسجد کینٹ کی طرف واقع ہے۔ مسجد کے سامنے پارکنگ کی جگہ ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر پکوڑوں کی کافی دکانیں ہیں، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پکوڑے یہاں کی سوغات ہوں۔ ہم پکوڑے کھائے بغیر مسجد میں نہ جا سکے، اس کی بڑی وجہ پکوڑوں کی خوشبو اور ہماری بھوک تھی۔

ہم نے معزز اساتذہ اکرام، جو بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے، سے مسجد کی تاریخ کے متعلق پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ آج سے تقریباً سو سال پہلے اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی اور جن صاحب نے اس مسجد کی تعمیر کی خاطر جگہ وقف کی، ان کا نام محمد الیاس تھا۔ اس وجہ سے اس مسجد کا نام الیاسی مسجد رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ محمد الیاس صاحب کو اس کارِ خیر کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین۔ یاد رہے ایبٹ آباد شہر کی بنیاد 1853ء میں رکھی گئی تھی اور اس کے بعد اس شہر نے بے حد ترقی کی۔ اس مسجد کی طرزِ تعمیر کو دیکھ کر آپ کو حیرانی ہوگی کہ مسجد میں پیلا رنگ کثرت سے پایا جاتا ہے جو کہ عموماً سکھ طرزِ تعمیر میں نمایاں ہوتا ہے۔ کچھ جگہوں پر اس مسجد کی تعمیر میں یورپی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس مسجد کو تعمیر کرتے وقت تینوں یعنی (اسلامی، سکھ اور یورپی) طرزِ تعمیر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے، اس کا فیصلہ دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس مسجد کی زیارت کے لیے تشریف لائیں۔

یہ مسجد پہاڑوں سے آنے والے ایک قدرتی چشمے پر بنائی گئی ہے۔ اب وہ چشمہ مسجد کے نیچے سے گزرتا ہے، اس کا مشاہدہ آپ بڑے گیٹ کے پاس سے کر سکتے ہیں۔ یہاں سے گزرنے والے پانی کے متعلق بھی بے شمار باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں شفا ہے، خاص طور پر جلد کی بیماریوں سے متعلق یہاں کا پانی کافی مفید سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اس پانی میں نہانے

کے لیے تشریف لاتے ہیں، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، جس کی وجہ سے اب تک لوگ یہاں جلدی بیماریاں دور کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ مسجد ایبٹ آباد کے ماتھے کا ایک جھومر ہے۔

ایبٹ آباد شہر خود تو اتنا بڑا تفریحی مقام نہیں ہے، خاص طور پر چاروں طرف پہاڑ ہونے کی وجہ سے۔ اس کے مرکز (یعنی شہر) میں بہت دھواں ہوتا ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرا تو گاڑی کا شیشہ کھولنا بھی کافی مشکل تھا۔ ایبٹ آباد کے ارد گرد کافی تفریحی مقامات ہیں۔ مثال کے طور پر، ایوبیہ، جو مری کے ساتھ صدر ایوب خان کے نام پر بنایا گیا اور اس کے علاوہ بھی بے شمار جگہیں ہیں جہاں لوگ تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ نتھیا گلی اور ایبٹ آباد کے درمیان میں ایک سب سے اونچی جگہ بھی ہے جس کے قریب خیبر پختونخوا کی حکومت کے گیسٹ ہاؤسز اور مختلف یونیورسٹیز کے ہاسٹلز بھی موجود ہیں۔ مجھے بھی اس جگہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ یقین جانیے کہ وہ اتنی خوبصورت جگہ ہے، جس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اگر آپ اس علاقے میں سیاحت کے لیے آئیں، تو ایبٹ آباد شہر کے ساتھ ساتھ اس کے ارد گرد پہاڑوں پر واقع مختلف تفریحی مقامات پر ضرور جائیں۔

ایبٹ آباد شہر میں ایک پرانا چرچ بھی ہے، جس کا نام سینٹ لیوک چرچ ہے۔ اس چرچ کی تعمیر کا آغاز 1854ء میں ہوا۔ اس کی تعمیر ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ 1857ء کی جنگ شروع ہو گئی اور اس کی وجہ سے اس کی تعمیر میں تاخیر ہو گئی۔ آخر کار 1864ء میں کلکتہ کے بشپ نے آ کر اس کا افتتاح کیا اور یوں چرچ کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ اس سے پہلے اس علاقے میں عیسائی آباد نہیں تھے، البتہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوتے تھے، ان کے لیے ایک چرچ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی لیے انگریز فوجیوں کے لیے یہ چرچ بنایا گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا قبرستان بھی بنایا گیا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں آنے والے انگریز اپنے مذہب کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں سب سے اہم جگہوں پر چرچ موجود ہیں۔

میرے خیال میں ایبٹ آباد کی سب سے اہم چیز یہاں پر پاکستان ملٹری اکیڈمی کا کول ہے۔ اس میں سالانہ دو ہزار سے زائد لوگ، جن کا تعلق تیس سے زائد مختلف ممالک سے ہوتا ہے، تربیت حاصل کرتے ہیں۔ یاد رہے اس جگہ پر پہلے انگریزوں کی فوج تعینات تھی اور ٹریننگ اکیڈمی نہیں تھی۔ انگریزوں کے فوجی آفیسر ڈیرہ دون میں یا اس کے علاوہ ہندوستان میں واقع

کئی اور جگہوں پر موجود اکیڈمیز سے ٹریننگ حاصل کرتے تھے۔ کاکول اکیڈمی کا آغاز 14 اگست 1947ء کو ہوا اور پہلی بٹالین 1948ء میں پاس ہوئی۔

بریگیڈیر انگال نام کا ایک انگریز، اس کا پہلا کمانڈر تھا۔ اس کے نام پر اب بھی ایک ہال کا نام ہے۔ 1947ء سے 1951ء تک یہ صاحب اس اکیڈمی کے انچارج رہے۔ اس اکیڈمی کے لیے، مسٹر انگال کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ میرا کہنا ہے کہ آپ کو ایبٹ آباد ضرور آنا چاہیے۔ اب تو ایبٹ آباد کا سفر بھی ہزارہ موٹروے کی وجہ سے آسان ہو گیا ہے۔ لاہور سے ایبٹ آباد تک تقریباً پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ ایبٹ آباد میں رہنے کی بجائے آپ قریبی پہاڑی علاقوں میں جائیں اور اس شہر کو بھی دیکھیں جو ایک انگریز کے نام پر ہے، جسے ایک انگریز نے آباد کیا اور ابھی تک ہم نے اس کا نام نہیں بدلا اور اللہ کرے ہم کبھی نہ بدلیں کیونکہ جس نے جو کام کیا ہو، اس کے کام کو یاد رکھا جانا ضروری ہے۔

مسٹر ایبٹ نے ایبٹ آباد کے متعلق ایک نظم بھی لکھی ہے، جس کا ذکر مدتوں رہے گا۔ ان کی نظم درج ذیل ہے۔

I remember the day when I first came here

And smelt the sweet Abbottabad's air

The trees and the ground covered with snow

Gave us indeed a brilliant show

To me the place seemed like a dream

And far ran a lonesome stream

The wind hissed as if welcoming us

The pine swayed creating a lot of fuss

And the tiny cuckoo sang it away

A song very melodious and gay

I adored the place from the first sight

And was happy that my coming here was right

And eight good years here passed very soon

And we leave you perhaps on a sunny noon

Oh Abbottabad we are leaving you now

To your natural beauty do I bow

Perhaps your winds sound will never reach my ear

My gift for you is few sad tears

I bid you farewell with a heavy heart

Never from my mind will your memories thwart

Source: Image of the monument at: *@pakistaninpics (9*
"Abbottabad is a poem by Major James -August 2019)
" (Tweet) – via Twitter---Abbott

مانسہرہ: جس کے نام کی کئی وجوہات ہیں

مانسہرہ، پاکستان کے شمال میں واقع ہزارہ ڈویژن کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ مانسہرہ سے ایک سڑک بالا کوٹ، ناران اور کاغان سے ہوتی ہوئی بابو سر کے پاس سے گزرتی ہوئی، شاہراہ قراقرم پر واقع چیلاس کے قریب جا نکلتی ہے۔ دوسری سڑک جو شاہراہ قراقرم کہلاتی ہے، شنکیاری، بٹگرام، بشام، ، پٹن، داسو، چیلاس، گلگت، ہنزہ، سوست اور خنجراب پاس سے گزر کر چین میں داخل ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں بابو سر پاس کھلا ہوتا ہے، اس لیے لوگ اس طرف سے گلگت اور ہنزہ جانا پسند کرتے ہیں، تاہم سردیوں میں شدید برف باری کی وجہ سے یہ راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ بشام کی طرف سے گلگت اور ہزارہ کا راستہ طویل بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس راستے سے تقریباً چھ گھنٹے سے زائد کا وقت لگتا ہے۔ چونکہ سردیوں کی وجہ سے بابوسر پاس بند ہو چکا تھا،اس لیے ہم نے بذریعہ بشام جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس سوزوکی اے پی وی تھی، جس میں آٹھ سواریوں کی گنجائش تھی اور ہم سات لوگ اس میں سوار ہو کر شاہراہ قراقرم پر ایک طویل سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔

آٹھ نومبر 2014ء کی صبح تقریباً چار بجے ہماری بس مانسہرہ بس اسٹینڈ پر رکی۔ باہر نکلے تو ہمیں کافی ٹھنڈک محسوس ہوئی، خاص طور پر مجھے سردی کا زیادہ احساس ہوا۔ بس اسٹینڈ پر ہماری ملاقات سلمان آفریدی سے ہوئی جن کا تعلق کوہاٹ سے ہے۔ ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سیر و سیاحت کے کافی شوقین ہیں۔ ان کے علاوہ نوید خلیل، جو عدیل لیاقت کے کاروباری شراکت دار بھی ہیں اور اسد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو ہماری گاڑی کے مالک اور ڈرائیور تھے۔ اسد صاحب ڈرائیور کم اور ٹور گائیڈ زیادہ لگتے تھے۔

بس اسٹینڈ بہت کشادہ تھا، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ ہمارے ہاں ٹوائلٹ کسی ترجیح میں نہیں آتے۔ وسائل کی دستیابی کی بات نہیں، بات صرف ترجیح کی ہوتی ہے۔ بس اسٹینڈ پر اندھیرے میں ایک طرف ٹوائلٹ نہایت بری حالت میں موجود تھے، جنھیں مجبوراً استعمال کرنا پڑا۔ ہم نے تقریباً پانچ بجے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ اسد سمیت ہم سات لوگ تھے اور ہماری منزل چیلاس تھی، جہاں ہمیں رات کو قیام کرنا تھا۔

شنکیاری اور بٹل: ایک دلفریب علاقہ

مانسہرہ کے بعد خوبصورت پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ خوبصورت وادیاں، گھر، پھلوں سے لدے درخت، تازہ اور خوشبودار ہوا، لاہور سے جانے والوں کے لیے یہ جگہ بہت ہی خوبصورت ہے اور اس وجہ سے اس میں ہماری دلچسپی بھی بہت زیادہ تھی۔ پہاڑوں کے اوپر بنے گھر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں اس بات سے پریشان تھا کہ یہاں کے لوگ اتنے مشکل راستوں سے ہوتے ہوئے اپنے گھروں کو کیسے جاتے ہیں اور گھر بنانے کے لیے بھی لوگوں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہوں گی۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ہم شنکیاری سے گزر رہے تھے۔ شنکیاری کے متعلق میں آپ کو چند باتیں بتاتا چلوں۔

شنکیاری، مانسہرہ سے اکیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر سڑک کی حالت بہت اچھی ہو، اور ٹریفک کا بھی کوئی مسئلہ نہ ہو تو یہ سفر تیس منٹ کا ہے۔ شنکیاری دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ "شن" اور "کیاری"۔ شن پشتو کا لفظ ہے اور اس کا مطلب سبز جبکہ کیاری کا مطلب ہے ایک قطعہ زمین۔ وہ ایک انتہائی صحت افزاء مقام ہے۔ اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1936ء میں شنکیاری سے دس کلومیٹر دور ایک پہاڑی علاقے میں ٹی بی کے مریضوں کے لیے ایک اسپتال بنایا گیا تھا جو آج بھی رقبے کے لحاظ سے ایشیاء کا سب سے بڑا اسپتال ہے۔ اس وقت ٹی بی کی دوا اتنی موثر نہیں تھی، اس لیے لوگوں کو صحت افزاء مقام پر رکھا جاتا تھا، تاکہ ان کی بیماری دور ہو سکے، لیکن بدقسمتی سے اب یہ اسپتال کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔

اس علاقے کی دوسری سب سے اہم بات پاکستان میں چائے کی کاشت کے متعلق ایک قومی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ 1986ء میں بنایا گیا، اس ادارے نے ایک وسیع رقبے پر چائے کی کاشت کی۔ یہ علاقہ پاکستان میں چائے کی پیداوار کے لیے انتہائی موزوں تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پر پیدا کی گئی چائے کی ایک ورائٹی کو عالمی مقابلے میں بھی شامل کیا گیا۔ اس علاقے میں پانچ قسم کی چائے اُگانے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔

شنکیاری سے گزرے تو اس وقت ابھی اندھیرا ہی تھا۔ شنکیاری سے بٹل تک تقریباً پچیس کلومیٹر کا راستہ ہے، راستہ صاف ہو تو تقریباً آدھا گھنٹہ لگتا ہے۔ سڑک صاف ستھری اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ صبح کے پانچ بجے کا وقت تھا، میں نے اسد سے کہا کہ کہیں نماز کے لیے رکیں۔ اسد کے خیال میں ابھی نماز کا وقت ختم ہونے میں کافی دیر تھی۔ اس نے بٹل میں نہ رکنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے چلیں، میں آپ کو بٹل کے متعلق کچھ بتانا چاہوں گا۔

خوانین بٹل

خوانین بٹل نام سے ایک ویب سائٹ پر بٹل کے متعلق کافی معلومات ہیں، جو کہ انتہائی دلچسپ ہیں۔ شنکیاری سے باہر نکلیں تو ایک چھوٹا سا علاقہ آباد ہے، جس کا نام ٹانڈہ ہے۔ اس کے بعد اچھڑیان کی آبادی آتی ہے اور بٹل سے کچھ پہلے شار کا نامی گاؤں بھی آتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ سب پہاڑی علاقہ ہے۔ ان پہاڑوں کی اُونچائی بھی مسلسل بڑھتی جاتی ہے اور یہ مزید سرسبز ہوتے جاتے ہیں۔ سڑک کافی بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ شاید ہی ایک آدھ کلومیٹر سیدھا ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے ندی نالے ہیں، لیکن کوئی بڑا دریا اس سڑک کے ساتھ نہیں ہے۔ میرے خیال میں، اگر اس علاقے میں ٹریک بنا دیئے جائیں، تو یہ سیاحت کے شوقین لوگوں کے لیے بہت خوش آئند ثابت ہوں گے۔

خوانین آف بٹل کے متعلق معلومات شاہ جہاں خاں اور ماجد خاں نے اکٹھی کر کے انھیں لکھا ہے۔ ان کے مطابق صوبہ پکتیا (جو کہ کابل کے باہر واقع ہے) سے یوسف زئی قبیلے کے لوگ محمود غزنوی اور محمد غوری کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور یوسف زئی قبیلے کے لوگوں کو سوات، مالاکنڈ، مانسہرہ، دیر اور باجوڑ کے علاقے فتح کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح یہ علاقہ یوسف زئی قبیلے کے ماتحت ہو گیا اور تقریباً پانچ سو تک اس علاقے پر یوسف زئی قبائل کی حکومت رہی۔ 1703ء کے قریب ایک مذہبی رہنما سیّد جلال بابا نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اس علاقے پر حملہ کیا اور یوسف زئی قبیلے کو شکست دے کر پاخیل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کونش میں واقع اس علاقے کی سب سے خوبصورت وادی ان کے قبضے میں آ گئی۔ اس علاقے کا رقبہ تقریباً سو مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے ایک طرف مالی ٹاپ ہے، جس کی اونچائی، پندرہ ہزار ہے اور دوسری جانب کرما ہے۔ جلال بابا نے یہاں پر مسجد بھی بنائی اور اپنا گھر بھی بنایا اور علاقے کی زمین اپنے فوجیوں میں تقسیم کر دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھی بزرگوں کی وجہ سے علاقے کے لوگوں میں مذہبی رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔

بٹل کی ایک اہم بات 1834ء میں یہاں ہونے والی سکھوں اور مسلمانوں کی جنگ ہے۔ سید عبدالوہاب سہروردی نے وادی کونش میں معرکہ بٹل کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے جو سیر حاصل معلومات فراہم کرتا ہے کہ کس طرح 1831ء میں بالا کوٹ میں فتح حاصل کرنے کے بعد سکھوں نے اس علاقے پر ظلم و ستم ڈھائے، 1846ء میں انھیں انگریزوں سے شکست ہوئی اور ان کی حکومت ختم ہوئی۔

یاد رہے کہ رنجیت سنگھ 1839ء میں فوت ہوا۔ اس کی موت کے بعد سکھوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ رنجیت سنگھ اپنی زندگی میں بہت بڑے علاقے پر قابض رہا۔ بٹل پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا جسے حاصل کرنے کے لیے مجاہدین نے خوب کوششیں کیں۔ یہ مجاہدین زیادہ تر سیّد احمد شہید کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے تھے۔

بٹل سے تھوڑا آگے آ کر ہم نے نماز کے لیے گاڑی روکی۔ میں نے عدیل کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد میں نماز ادا کی۔ مولوی صاحب کی قرات بہت خوبصورت تھی۔ مسجد میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ نماز سے پہلے کئی لوگ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ آہستہ آہستہ صبح طلوع ہو رہی تھی اور خدا کی خدائی کے نظارے واضح ہو رہے تھے۔ پہاڑوں میں سورج کا طلوع و غروب ہونا ایک انتہائی خوبصورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ میرے لیے شاید ان دو نظاروں کے علاوہ کسی چیز میں اتنی کشش نہیں ہوتی۔ تمام پہاڑ سرسبز اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے، بازار آہستہ آہستہ آباد ہو رہے تھے۔ ابھی سردی بھی اتنی زیادہ نہیں تھی، اس لیے لوگ صبح صبح اٹھ کر اپنے کام کاج کی طرف جا رہے تھے۔ ہماری گاڑی میں اکثر لوگ ابھی بھی محو خواب تھے۔ ہمارا اگلا سٹاپ بشام تھا۔

بٹل سے نکل کر حسین آباد، کوزہ بند اور چھپّر گراں سے ہوتے ہوئے، ہم بٹگرام پہنچے۔ مانسہرہ سے بٹگرام ستر کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بٹگرام کے چاروں طرف سرسبز پہاڑ ہیں۔ یہ اس علاقے کا ایک بڑا شہر ہے۔ یہ ضلع بٹگرام کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ یہ سطح سمندر سے 3406 فٹ بلند ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شہر مانسہرہ سے بہت زیادہ اُونچائی پر واقع نہیں ہے۔ اس ضلع کا رقبہ 1301 کلومیٹر اور آبادی تقریباً چار لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس علاقے میں پشتو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اور اس کے بعد ہندکو اور کوہستان کا علاقہ قریب ہونے کی وجہ سے کوہستانی اور گجری بھی بولی جاتی ہیں۔ یہاں کی پشتو دیگر علاقوں سے قدرے مختلف ہے۔ جب ہم بٹگرام کے مین بازار سے گزرے تھے تو لوگ دکانیں کھول رہے تھے۔ صبح کا

وقت تھا اور بازار نسبتاً صاف ستھرے تھے اور دکانوں سے لگ رہا تھا کہ یہ خاصا بڑا قصبہ ہے اور گرد و نواح کے لوگ یہاں اپنی ضروریات کا سامان لینے آتے ہیں۔

بٹگرام ایک حسین علاقہ

اب میں کچھ باتیں بٹگرام کے متعلق بتانا چاہوں گا۔ یہ علاقہ بھی 323 ق م میں سکندر کے ہاتھوں فتح ہوا۔ فتح کرنے کے بعد، سکندر اس کا انتظام ہندوستانی لوگوں کے حوالے کرکے آگے روانہ ہو گیا۔ بعد ازاں یہاں راجا رسالو کی حکومت رہی، جو سیالکوٹ کے حاکم کا بیٹا تھا۔ تاریخ میں راجا رسالو کو اچھے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد محمود غزنوی، سلطان سبکتگین اور مغلوں نے بھی اس علاقے پر حکومت کی۔ اس علاقے میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جس کی وجہ صوفیائے کرام بھی ہیں اور مسلمان حکمرانوں کی حکومت بھی۔ اس علاقے پر ترکوں نے بھی حکومت کی اور بعد میں ترکوں کو افغانوں نے شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس علاقے میں شہاب الدین نے پاخیل ریاست قائم کی اور گلباغ گاؤں کو اس کا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ اس علاقے کی اہمیت، کشمیر کو جانے والے راستے کی وجہ سے بہت زیادہ تھی۔ ترکوں سے سواتی لوگوں نے اس علاقے کا کنٹرول سنبھالا۔ کچھ عرصہ کے لیے احمد شاہ ابدالی بھی، اس علاقے پر قابض رہا اور آخر کار ابدالیوں کو سکھوں نے شکست دی (یا ابدالی ایک معاہدہ کے تحت اس علاقے سے چلے گئے) اور یوں یہ علاقہ سکھ حکومت کا حصہ بن گیا۔

بٹگرام سنسکرت کا لفظ ہے، جس کا مطلب براہمنوں کا گاؤں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے، کہ اس علاقے میں ہندو اکثریت میں رہتے تھے۔ جب سوات کے لوگوں نے کنٹرول حاصل کیا، تو یہ علاقہ سوات سے قریب ہونے کی وجہ سے والیان سوات کے زیر اثر آ گیا۔ چند سال قبل بٹگرام کو ضلع کا درجہ دے کر اسے ہزارہ ڈویژن کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ 2005ء کے زلزلے میں، اس علاقے میں پانچ ہزار کے قریب ہلاکتیں ہوئیں اور املاک کو بھی شدید نقصان پہنچا۔

تھاکوٹ: شاہراہ قراقرم اور دریائے سندھ کا سنگم

بٹگرام سے باہر نکلے تو پہاڑی علاقہ مزید کھل کر سامنے آ گیا۔ پہاڑوں کی اونچائی بھی زیادہ تھی اور خوبصورتی بھی۔ بٹگرام سے چل کر جارہ کلی فروز خاں اور کندار سے ہوتے ہوئے، ہم سات بجے تھاکوٹ پہنچ گئے۔ تھاکوٹ وہ مقام ہے جہاں سے شاہراہ قراقرم، دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گلگت تک جاتی ہے۔ تھاکوٹ، بٹگرام سے چوبیس کلو میٹر کے فاصلے پر

واقع ہے۔ وہ سارا سفر پہاڑوں کے ساتھ ساتھ تھا اور سڑک ناقابل یقین حد تک بل کھاتی ہوئی جاتی تھی۔ راستے میں میدانی علاقہ اور بڑی وادیاں بھی دیکھنے کو ملیں جو انتہائی سرسبز تھیں۔ تھا کوٹ سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کے قریب بلند ہے۔ یہ اونچائی بٹگرام سے زیادہ ہے، لیکن بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ تھا کوٹ ایک قبائلی طرز کا قصبہ ہے اور ضلع بٹگرام کی تحصیل ہے۔ لوگوں کی اکثریت سواتی قبائل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں پشتو زبان کثرت سے بولی جاتی ہے، البتہ ہندکو بولنے والے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تھا کوٹ کی خاص بات، تھا کوٹ ڈیم ہے۔

تھاکوٹ ڈیم

واپڈا کی ویب سائٹ کے مطابق، اس مقام پر بننے والے ڈیم کی وجہ سے چار ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ یہ پروجیکٹ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ بظاہر کوئی کام ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا، تاہم امید کی جاسکتی ہے کہ اس منصوبے کے مکمل ہونے پر علاقے میں خوشحالی بھی آئے گی اور پاکستان میں سستی بجلی بھی میسر ہوگی۔ تھا کوٹ ڈیم کی بلندی 198 میٹر ہے اور اس منصوبے کا تخمینہ تقریباً 6 ارب ڈالر ہے۔ یاد رہے کہ یہ سب باتیں 2014ء کی ہیں۔

تھا کوٹ تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس علاقے کا سلطان 1713ء میں دہلی چلا گیا، اس کی غیر حاضری میں اس کے داماد نے سوات کے بادشاہ سید جلال بابا کو حملے کی دعوت دی اور پاخیل حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ جلال بابا کے حملے کی وجہ سے، ترک اور ہزارہ سوات کی طرف چلے گئے۔

جب ہم تھا کوٹ سے نکلے، تو دریائے سندھ ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ اب دن نکل آیا تھا اور بازاروں میں رونق نظر آرہی تھی۔ ہم رات سے چلے ہوئے تھے، تھکاوٹ بھی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ قائد قافلہ عدیل صاحب سے جب ناشتے کا مطالبہ کیا گیا، تو انھوں نے کہا کہ ناشتہ بشام میں ملے گا، جو ابھی بھی ایک گھنٹے سے زائد کی مسافت پر تھا۔ حسین مناظر نے ناشتے کی طلب کو دبا لیا اور ہم اللہ کے بنائے ہوئے خوبصورت نظاروں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

شاہراہِ قراقرم: جو کبھی شاہراہِ ریشم کہلاتی تھی

میں یہاں کچھ باتیں شاہراہِ قراقرم کے متعلق بھی بتانا چاہوں گا۔ شاہراہ قراقرم ایک بے مثال منصوبہ ہے، اس کے متعلق، سب سے زیادہ معلومات محمد ممتاز خالد کی لکھی ہوئی کتاب "ہسٹری آف قراقرم ہائی وے" سے مل سکتی ہیں۔

روسیوں کے توسیع پسندانہ رویے کی وجہ سے، انیسویں صدی میں ہندوستان پر حکومت کرنے والے انگریزوں نے اس علاقے پر توجہ دینی شروع کی۔ سب سے پہلے انھوں نے گلگت، کشمیر، لداخ اور بلتستان پر مشتمل علاقوں کو متحد کیا اور اس کا نام ریاست جموں کشمیر رکھا اور اسے ڈوگرا راجا گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا۔ کچھ لوگ اسے ''ڈوگرہ'' بھی لکھتے ہیں، مگر اردو اخبارات کے علاوہ بی بی سی پر بھی اسے "ڈوگرا" ہی لکھا جاتا ہے۔ اس امر کا مقصد اس علاقے میں ایک ایسی حکومت کا قیام تھا جو انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتی ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے روس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گلگت میں اپنی افواج کو اکٹھا کیا۔ 1877ء میں گلگت ایجنسی کے قیام کے بعد اس علاقے پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا، لیکن 1881ء میں کوہستان کے لوگوں نے یہ قبضہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد 1889ء میں انگریزوں نے ایک بار پھر، اس علاقے پر اپنی گرفت کو مضبوط کر لیا۔

اُس وقت اس علاقے کا دوسرے علاقوں کے ساتھ تعلق چند دشوار گزار راستوں کے ذریعے تھا جن پر چل کر انگریزوں کو ان پر حکومت کرنا ہوتی تھی اور اس سے ان کی سپلائی لائن بہت متاثر ہوتی تھی۔ انگریزوں کے لیے اس علاقے پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے اور روس کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لیے ضروری تھا کہ گلگت تک ایک اچھی سڑک موجود ہو۔ اس کے لیے بہت غور و فکر کرنے کے بعد دو راستے تلاش کیے گئے؛ ایک راستہ بابوسر پاس کے ذریعے تھا جو سال میں صرف چار ماہ کھلا رہتا تھا اور دوسرا راستہ ہزارہ کوہستان کے ذریعے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ موجود تھا، جو سارا سال کھلا رہتا تھا۔

تمام تر وسائل کے باوجود سیکورٹی اور دیگر عوامل کی وجہ سے، انگریزوں نے سری نگر جانے والے پیدل راستے کو ہی استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ اسے تھوڑا سا بہتر کیا، تاکہ خچر سامان لے کر آ جا سکیں۔ یاد رہے کہ یہ راستہ بھی سال کے چھ ماہ برف باری کی وجہ سے بند رہتا تھا۔ 1891ء میں انگریزوں نے چیلاس اور بابوسر پاس کے راستے کو تیار کیا۔ اس راستے پر خچر سامان کے ساتھ چل سکتے تھے، لیکن وہ راستہ صرف گرمیوں میں استعمال ہو سکتا تھا۔ اس راستے کا فائدہ یہ تھا، کہ یہ کم طویل تھا اور ناران، کاغان سے ہوتا ہوا، مانسہرہ تک

جاتا تھا۔ 1947ء کے بعد سری نگر کا راستہ بند ہو گیا اور پاکستان کے لیے گلگت تک ایک سڑک کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ اس کے لیے نا مساعد حالات اور رقم کی تنگی کے باوجود، پاکستان آرمی کے انجینئرنگ ونگ نے اس راستے کو جیپ کے چلنے کے قابل بنا دیا، لیکن یہ راستہ بھی صرف گرمیوں میں استعمال ہو سکتا تھا۔

جنرل ایوب خان کے ابتدائی دور میں قراقرم ہائی وے کے نام سے موجودہ سڑک کا آغاز کیا گیا۔ اس سڑک کا آغاز ایک چھوٹے سے گاؤں کرور اسے کیا گیا اور اسے چیلاس کے پاس بابو سر پاس سے آنے والی سڑک کے ساتھ ملایا گیا، جہاں سے پھر گلگت تک جیپ کا راستہ موجود تھا۔ اس طرح گلگت تک کا زمینی راستہ سارا سال کھلا رہتا تھا۔ اس منصوبے کا نام انڈس ویلی روڈ رکھا گیا۔ 1965ء میں جنگ کی وجہ سے اس پر کام روک دیا گیا۔ 1966ء میں اس سڑک کو ہائی وے کا درجہ دے دیا گیا اور اسے چین کے بارڈر خنجراب تک لے جانے کا فیصلہ ہوا۔ اس سے قبل چین، خنجراب سے کاشغر تک سڑک بنا رہا تھا۔ اب اس سڑک کا نام قراقرم ہائی وے رکھا گیا ہے۔

اس منصوبے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں تھا کوٹ سے خنجراب تک ٹرکوں کے لیے سنگل روڈ بنانے کا منصوبہ تھا اور دوسرے مرحلے میں اسے ہائی وے کے اصولوں کے مطابق بنایا جانا تھا۔ تھا کوٹ سے مانسہرہ اور پھر جی ٹی روڈ تک سڑک بنانے کی ذمہ داری صوبہ سرحد کی حکومت کے سپرد کی گئی۔ 1971ء میں پہلا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد سڑک کو آمدورفت کے لیے کھول دیا گیا۔ 9 اگست 1971ء کو 12 ٹرکوں پر مشتمل ایک تجارتی قافلہ، چین سے تجارتی مال لے کر اس سڑک کے راستے، پہلی دفعہ پاکستان آیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے مرحلے پر کام شروع ہو گیا، لیکن 1971ء کی جنگ کی وجہ سے اس کام میں پھر رکاوٹ آ گئی۔ جنگ کے بعد سیاسی اور معاشی صورتِ حال کی وجہ سے حکومت پاکستان نے چین سے اس منصوبے میں مدد کی درخواست کی جسے چین نے قبول کر لیا اور خنجراب سے تھا کوٹ تک کے حصے پر مدد دینے پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تھا کوٹ سے حویلیاں تک کا حصہ بھی اس منصوبے میں شامل کر لیا گیا اور اسے بھی پاکستانی فوج کے سپرد کر دیا گیا۔ فوج نے یہ حصہ دو سال کے عرصے میں مکمل کر لیا۔

چین نے 1974ء میں اپنے دس ہزار افراد فراہم کیے اور ہماری فوج نے بھی اپنے بارہ ہزار افراد کو اس کام کے لیے مختص کیا۔ اس طرح بائیس ہزار افراد نے مل کر اس سڑک کی

تعمیر کا کام شروع کیا۔ ان لوگوں کی اَن تھک محنت کی بدولت یہ سڑک چار سال کے عرصے میں مکمل ہو گئی اور جون 1978ء میں جنرل ضیاء نے اس کا افتتاح کیا۔

حسن ابدال سے خنجراب تک کی سڑک کا نام N-35 رکھا گیا۔ اس سڑک کا آغاز پہلے کرورا سے، پھر تھاکوٹ سے، پھر حویلیاں سے اور آخر میں حسن ابدال سے ہوا۔ یہ تھی اس سڑک کی مختصر تاریخ، جو آپ کی دلچسپی کے لیے لکھی ہے۔ چونکہ ہم نے اس سڑک پر اگلے نو دن سفر کرنا تھا، اس لیے ضروری سمجھا کہ سڑک کے حوالے سے بھی کچھ لکھا جائے۔ علاقے کی تاریخ کا علم ہو تو سیاحت یا سفر نامہ میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہے، اسی لیے میں جب بھی کسی علاقے کی سیاحت کے لیے جاؤں، تو اس کی تاریخ ضرور پڑھ کر جاتا ہوں۔

بشام: ایک پُر فضا سیاحتی مقام

بشام، تھاکوٹ سے تقریباً 31 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ضلع شانگلہ کا ایک اہم شہر ہے۔ صبح کے آٹھ بجے کا وقت تھا، تھکاوٹ اور بھوک دونوں یکجا ہو کر ہماری ہمت کا امتحان لے رہے تھے۔ سب لوگ نیند سے بیدار ہو چکے تھے اور سالارِ قافلہ سے گزارش کر رہے تھے، کہ جناب والی کسی جگہ ناشتہ کا بندوبست کیا جائے۔ ہم میں سب سے زیادہ بھوک علی بٹ کو لگتی تھی جو ایک فطری سی بات تھی، کہا جاتا ہے کہ بٹ اور بھوک اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ سلمان آفریدی کو نیچے اتر کر تصویریں بنانے کی فکر تھی جبکہ اویس میری طرح اچھا پیروکار تھا، جو سب کی مرضی میں راضی رہتا تھا۔ البتہ نوید اور اسد کو کوئی جلدی نہیں تھی، شاید وہ اس طرح کے سفر کے عادی تھے۔

خدا خدا کر کے بشام آیا اور ہم ایک ریستوران (جس کا نام سوات ہوٹل تھا) کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس علاقے میں رہنے والے اکثر لوگ پختون ہیں اور سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان بھی پشتو ہے۔ ہمیں سلمان آفریدی نے بتایا کہ ان کے پشتو لہجے اور کوہاٹ کے پشتو لہجے میں خاصا فرق ہے۔ سچی بات یہ تھی کہ ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ گاڑی سے اتر کر سب سے پہلی حاجت ٹوائلٹ کی تھی، جس کی حالت باقی جگہوں سے مختلف نہ تھی۔ وہی گندگی اور ویسے ہی ٹوٹا ہوا دروازہ، بہر حال سیاحت کے شوق میں، ان سب مسائل کو تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

بشام میں ایک ریستوران میں ناشتہ

جب ہم ریستوران (جنہیں ہم عرف عام میں ہوٹل کہتے ہیں، ان پر نام بھی ہوٹل ہی لکھا ہوتا ہے) میں داخل ہوئے، تو وہاں روایتی کرسی، میز اور چارپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک چیز جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ ہوٹل کا عملہ بہت تیز اور اونچی آواز میں، ایک دوسرے سے بات کر رہا تھا۔ ناشتے کی اچھی بات یہ تھی کہ سب کچھ تازہ تھا، پراٹھا، چائے، چنے اور انڈے کا آملیٹ۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا اور خوب پیٹ بھر کر کیا۔ اسد نے ہمیشہ کی طرح کم کھایا، جبکہ علی بٹ نے اپنے روایتی بٹ ہونے کا ثبوت دیا۔ آفریدی بھائی نے ابھی تک نصف بازو کی شرٹ پہنی ہوئی تھی، جسے دیکھ کر مزید سردی لگنی شروع ہو جاتی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوئے اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ سوات ہوٹل کے لوگ بہت مہمان نواز تھے۔ بڑی دیر بعد ایک مکمل ڈش کے بعد سپلی (گریوی) کھانے کا موقع ملا۔ پتہ چلا کہ سالن تو صرف ایک دفعہ آتا ہے جبکہ سپلی امتحانوں کی طرح بار بار آتی ہے۔ پراٹھے بھی بہت مزیدار اور تازہ تھے۔ البتہ آملیٹ میں کیا کچھ ملا ہوا تھا، وہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں اب کچھ باتیں بشام کے متعلق آپ کے گوش گزار کرتا ہوں، جہاں ہم نے ناشتہ کیا۔

بشام کو بشام حلقہ بھی کہتے ہیں۔ یہ مانسہرہ سے 124 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ایک طویل بازار ہے، جس کے دونوں طرف اونچے اونچے سرسبز پہاڑ ہیں۔ یہاں کے اکثر لوگ کاشتکاری کرتے ہیں یا پھر بازار میں دکانیں چلاتے ہیں۔ بازار کی گہما گہمی، گلگت کو جانے والے سیاحوں اور مسافروں کی مرہون منت ہے۔ یہ بازار بہت بارونق ہے اور مختلف ریستوران آپس میں مقابلے کی فضا قائم رکھتے ہیں۔ یہاں مسافر بس تھوڑے وقت کے لیے رکتی ہے۔ اس لیے مختصر وقت میں سب کو کھانا کھلانا ایک چیلنج ہوتا ہے۔ میں نے ہوٹل کے ایک ورکر سے پوچھا کہ آپ اتنا تیز اور اونچا کیوں بولتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہمارا مقصد ہوتا ہے کہ ہم جلد از جلد مسافروں کو کھانا کھلائیں، ورنہ ڈرائیور شور مچا دیتے ہیں۔

بشام کے علاقے میں پہاڑ سرسبز اور چراگاہیں بہترین ہیں، اس لیے یہاں بہت سے لوگ بھیڑ بکریاں بھی پالتے ہیں۔ بشام سطح سمندر سے 1925 فٹ بلند ہے، بظاہر یہ اونچائی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بشام کے مشرق میں الائی وادی ہے، جو سیاحت کے لیے بہت مشہور ہے۔ بشام کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں سے شانگلہ کے ذریعے وادی سوات کو بھی راستہ جاتا ہے، جو یہاں کے لوگوں کی سوات سے گہرے رابطے کی وجہ بھی ہے۔

بشام کے پاس، ایک کتبے پر تحریر ہے کہ شاہراہ قراقرم 1284 کلومیٹر طویل اور تعمیرات ایک شاہکار ہے۔ اس سڑک کی تعمیر کے دوران اوسطاً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آدمی نے اپنی جان کی بازی ہاری ہے، یعنی تقریباً ایک ہزار لوگ ، جن میں ہمارے چینی بھائی بھی شامل تھے ۔ اس سڑک کے متعلق امریکیوں نے کہا تھا کہ اسے بنانا ناممکن ہے، لیکن پاکستان اور چین نے مل کر اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

بشام کوہستان کے جنوب میں واقع ہے۔ 1922ء میں ریاست سوات کے والی نے ان علاقوں پر اپنا قبضہ جمایا، لیکن مقامی آبادی نے اس کی سخت مزاحمت کی اور اپنی کمزوری کو بھانپتے ہوئے انھوں نے انگریزوں سے مدد طلب کی اور اس کے بدلے میں انگریزوں کو جنگل اور سڑک پر قبضے کی اجازت دے دی، لیکن انگریز حکمرانوں نے چند سیاسی وجوہات کی بناء پر اس تجویز پر عمل نہیں کیا، کیونکہ سوات کے حکمرانوں کے ساتھ بھی ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ تھی دو مسلمان گروہوں کی باہمی کشمکش اور جیت انگریز سرکار کی۔

ایک انگریز میجر نے ریاست سوات پر ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے سوات اور کوہستان کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں والی سوات کی کوہستان کے علاقے پر قبضے کی تفصیلات بھی درج ہیں (کوہستان کا تفصیلی احوال آگے چل کر آپ کی نذر کروں گا)۔ بشام سے نکلتے ہوئے تقریباً نو بج چکے تھے۔ ہم اپنی منزل کی جانب گامزن تھے اور آپس میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا اور وین کے اندر کا ماحول بھی خوشگوار تھا۔ بشام سے نکلتے وقت دریا ہمارے دائیں جانب تھا۔ دھوپ بھی اچھی خاصی تھی اور علاقہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے نوید خلیل سے کہا کہ مجھے اس علاقے کے لوگوں کے رنگ بہت صاف لگتے ہیں اور لوگ صحت مند بھی نظر آتے ہیں۔ نوید نے بھی میری بات کی تائید کی ۔ میرے خیال سے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علاقے زیادہ بلندی پر واقع نہیں ہیں، اسی لیے یہاں سردی بھی زیادہ نہیں پڑتی اور علاقے میں بارشیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور ہر طرف ہریالی بھی ہے۔ ان سب کی وجہ سے موسم بھی قدرے خوشگوار رہتا ہے۔

بشام کے بعد ، ہمارا اگلا پڑاؤ پٹن تھا۔ پٹن بشام سے 44 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بشام سے نکلنے کے فوراً بعد ہمیں خان خوار ڈیم نظر آیا۔ واپڈا کی ویب سائٹ کے مطابق، یہ ڈیم دریائے سندھ پر بنایا گیا ہے۔ اس منصوبے پر آٹھ ارب روپے لاگت آئی ہے۔ اس ڈیم کی صلاحیت 72 میگا واٹ ہے اور یہ 8 نومبر 2010ء سے کام کر رہا ہے۔

بشام اور اس کے ارد گرد کے لوگ، ایک طویل عرصے سے اس علاقے کو مفت بجلی فراہم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس مطالبے کی منظوری کے لیے شانگلہ اور خور بند کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ ہم ایک مشہور وادی الپوری کو دیکھے بغیر آگے بڑھ رہے تھے۔ اب دن کافی چڑھ چکا تھا اور سڑک بھی خاصی خراب تھی۔ اسد کی ڈرائیونگ قابل ستائش تھی۔ سب سے آخری سیٹ پر بیٹھے ہوئے اویس اور علی خاصے تنگ ہو رہے تھے۔ اور بار بار اسد کو گاڑی آہستہ چلانے کے لیے کہہ رہے تھے مگر اسد ان کی باتوں پر کوئی توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ اب چڑھائی کا سفر بھی شروع ہو رہا تھا۔

ہمارا سارا سفر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر تھا۔ میری سیٹ چونکہ بائیں طرف تھی اس لیے مجھے دریا کی خوبصورتی دیکھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ میں مسلسل پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا، جن کی بلندی آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی، محسوس ہو رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ مٹی زیادہ ہونے کی وجہ سے لینڈ سلائیڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا، کہ کسی بھی وقت ایک بڑا پتھر ہمارے اوپر آ گرے گا۔ عدیل لیاقت فرنٹ سیٹ پر اپنی ہی سوچوں میں مگن بیٹھا تھا۔ میں چائے پینے کا عادی ہوں اور اس کے لیے میں نے گزارش کی تو جواب میں کہا گیا، کہ پٹن میں چائے کے لیے رکا جائے گا۔

پٹن میں داخل ہونے سے پہلے، سڑک مزید خراب ہو جاتی ہےاور اونچائی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ پٹن شہر کے ارد گرد اونچے پہاڑ ہیں، جن کے درمیان میں یہ شہر آباد ہے۔ سڑک کافی بلندی سے شہر کے ایک طرف سے ہو کر گزر جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں پٹن شہر کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا۔ سڑک کے ساتھ بے شمار دکانیں، ورکشاپس، اور پٹرول پمپس بھی تھے۔ سڑک کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے اویس اور علی کی کمر جواب دے چکی تھی۔ اس میں اسد کی ڈرائیونگ کا بھی کمال بھی شامل تھا۔

سالارِ قافلہ کے وعدے کے مطابق، ہم ایک ریستوران پر رک گئے۔ یہاں سے نیچے پورا شہر نظر آ رہا تھا، ہر طرف ہریالی بھی قابلِ ذکر تھی، اور موسم بھی خوشگوار تھا۔ ایک بڑے سے تختے پر آٹھ دس لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی اپنا چائے کا پیالہ لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ علاقہ کوہستان کا آغاز ہے۔ شاہرہ قراقرم اور ناران کاغان کے درمیان کا سارا علاقہ کوہستان کہلاتا ہے۔ درمیانی علاقے میں آبادی بھی کم ہے۔ سڑکیں بھی نہیں ہیں۔ لوگوں کا گزر بسر زیادہ تر کھیتی باڑی اور لکڑی کی خرید و فروخت پر ہی ہوتا ہے۔ کوہستان کا شمار خیبر پختونخوا کے انتہائی پسماندہ علاقوں میں ہوتا ہے۔ اس

سے پہلے کہ ہم پٹن سے آگے کے پہاڑوں کا تذکرہ کریں، میں آپ کو کوہستان کے متعلق کچھ معلومات دینا چاہوں گا۔

کوہستان: ایک انتہائی نظر انداز شدہ علاقہ

کوہستان، فارسی کا ایک لفظ ہے، جس کا مطلب پہاڑوں کا علاقہ یا پہاڑوں کی سرزمین ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق، کوہستان کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھی اور اس کا رقبہ آٹھ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ کوہستان ایک ایسا علاقہ ہے، جس میں دنیا کے تین بڑے پہاڑی سلسلے آپس میں ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے، کہ یہاں کے لوگوں کا سلسلہ نسب عربوں سے ملتا ہے۔ غالباً یہ لوگ مسلمانوں کے خوف سے عرب سے اس علاقے میں آئے تھے۔ 1399ء سے 1703ء تک اس علاقے پر ترکوں نے حکومت کی۔ اس سے لگتا ہے کہ ترکوں نے اس علاقے کے بیشتر حصے پر سترہویں صدی کے قریب حکومت کی، جس میں ہزارہ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ سوات کے لوگوں نے ترکوں کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ ضلع کوہستان کی تین تحصیلیں ہیں۔ یہ ضلع دریائے سندھ کے مشرقی اور مغربی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مشرقی علاقے کو ہزارہ کوہستان اور مغربی علاقے کو سوات کوہستان کہا جاتا ہے۔ ضلع کوہستان کا ضلعی صدر مقام داسو ہے۔

یہ علاقہ اونچے پہاڑوں اور میدانی علاقوں پر مشتمل ہے، جہاں بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس علاقے میں فصلیں بھی اچھی ہوتی ہیں اور یہاں بے حد گھنے جنگل بھی پائے جاتے ہیں۔ کوہستان میں پشتو زبان کثرت سے بولی جاتی ہے، لیکن ساتھ ساتھ کئی دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے اس علاقے میں شرح خواندگی صرف دس فیصد ہے، جس کی بڑی وجہ ذرائع آمدورفت کا نہ ہونا ہے۔

کوہستان، پاکستان کا سب سے غریب ضلع ہے۔ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ معاش مویشی پالنا اور جنگل کی لکڑی (جو کہ بہت قیمتی ہوتی ہے) کاٹنا اور شہر لے جا کر بیچنا ہے۔ قومی اسمبلی میں اس علاقے کی نمائندگی ایک فرد کرتا ہے، جبکہ صوبائی اسمبلی میں یہاں سے تین ایم پی اے منتخب ہوتے ہیں۔ اس علاقے کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل ہے، لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر لوگ یہاں آنے سے کتراتے ہیں، جن میں سے ایک وجہ عدم تحفظ ہے۔ یہاں چوری چکاری کے واقعات آئے روز رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے بقول، یہاں سڑک پر ڈکیتی جیسے واقعات بھی عام ہیں۔ اس لیے رات کے وقت پولیس سفر کرنے سے منع کرتی ہے۔

یاد رہے، کہ کوہستان ہزارہ ڈویژن کا پانچواں ضلع ہے۔ اب کوہستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اپر کوہستان اور لوئر کوہستان۔ اس تقسیم سے علاقے کے لوگوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اس کی شدید مخالفت بھی کر رہے ہیں۔ لوئر کوہستان گرمیوں میں مناسب گرم ہوتا ہے، البتہ سردیوں میں شدید سردی پڑتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اپر کوہستان گرمیوں میں معتدل رہتا ہے۔

اسلام سے پہلے اس علاقے میں دیگر مذاہب کے لوگ رہتے تھے جن میں بدھ مت اور پارسی بھی تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل، یہاں کے ایک علاقے جس کا نام واویل ہے، میں ایک بڑا عبادت خانہ بھی تھا، جہاں عبادت کرنے کے لیے چین سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ داسو میں راجا اشوک کے دور کی بھی چند چیزیں پائی گئی ہیں، جن سے لگتا ہے کہ ٹیکسلا سے لے کر گلگت تک اشوک کے دور میں، اس علاقے میں بدھ مت ایک مقبول مذہب تھا۔

اسلام اس علاقے میں تقریباً تین صدیاں قبل آیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق، یہاں کے اکثر لوگ دیوبند مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ بظاہر یہ علاقہ شمالی علاقہ جات کا حصہ لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتظامی لحاظ سے یہ صوبہ خیبر پختونخوا کا حصہ ہے۔ اس علاقے میں بہت سے ایسے لوگوں نے بھی اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، جو اس علاقے سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے، جن میں چینی، سکھ اور انگریز قابل ذکر ہیں۔ کوہستان کے قبائل نے کسی بھی حکمران کو چین سے حکومت نہیں کرنے دی۔ اس لیے اس علاقے پر کسی بھی حکمران کا مستقل قبضہ نہیں رہا۔ کوہستان کے لوگ اپنے علاقے سے باہر جا کر حملہ کرنے میں بھی مشہور تھے۔

پٹن میں چائے پینے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور ہماری اگلی منزل داسو تھا۔ پٹن سے نکلنے کے بعد سڑک کی حالت مزید خراب ہو گئی اور پہاڑوں پر تھوڑی سی ویرانی بھی شروع ہو گئی۔ یاد رہے پٹن سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب چڑھائی بھی شروع ہو چکی تھی کیونکہ بشام کم اونچائی پر تھا۔ سڑک کی حالت اور اسد کی ڈرائیونگ نے ہمارے سفر کو مزید لمبا کر دیا۔ اس کے علاوہ پہاڑ بھی مزید قریب آ گئے تھے۔ دریا کا پاٹ بھی کافی تنگ ہو گیا تھا۔ موبائل فون کے سگنلز غائب ہو چکے تھے۔ اس جگہ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی، البتہ جانوروں کے ریوڑ ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔

ثمر نالہ: ایک ناقابل فراموش منظر

پٹن سے نکلیں تو داسو کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب دریا کی چوڑائی خطرناک حد تک کم تھی اور پہاڑ خوفناک حد تک اونچے تھے۔ پہاڑوں کو دیکھ کر شدید خوف آتا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ سڑک کی خرابی اور اسد کی ڈرائیونگ نے بھوک اور خوف میں شدید اضافہ کر دیا تھا۔ امیر سفر سے گزارش کی کہ کھانے کا کوئی بندوبست کیا جائے۔۔۔

جواب ملا، انتظار فرمائیں۔۔۔

داسو سے کچھ پہلے کومیلہ کے مقام پر، سڑک دریائے سندھ کے مغرب کی بجائے مشرق میں چلنا شروع ہو گئی۔ اب میری سیٹ دریا کی طرف تھی۔ تھوڑی دور جا کر ہم ایک جگہ رکے جہاں بہت سے ہوٹل تھے اور رش بھی کافی تھا۔ مشرق کی طرف سے ایک بڑا نالہ پہاڑوں سے ہوتا ہوا دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ یہاں پر سڑک، اندر کی طرف جاتی ہے اور یوشیپ بناتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہم ایک ریستوران میں چلے گئے۔ ہماری کرسیاں پہاڑوں سے گرتے ہوئے نالے کے کنارے پر لگائی گئیں۔ جہاں نالے کی روانی اور پانی کا شور تھا، ان سب کی موجودگی میں ہم اپنے لنچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس جگہ کا نام ثمر نالہ تھا۔ ثمر نالہ ہمارے سفر کا ایک یادگار سٹاپ تھا جو بہت خوبصورت مقام ہے۔ میں نے مقامی لوگوں کے ساتھ تصویریں بھی لیں اور پھر بجھے دل کے ساتھ ہم اس نالے سے آگے کی طرف روانہ ہوئے۔ ثمر نالہ اپنے نام کی طرح بے حد خوبصورت تھا۔

داسو: ایک سرسبز مقام

داسو پٹن سے 40 اور اسلام آباد سے 343 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ داسو کی وجہ شہرت، داسو ڈیم ہے۔ داسو کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ داسو، ضلع کوہستان کا صدر مقام ہے، جو سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم اب کافی بلندی پر تھے۔ داسو کے ارد گرد کئی دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں۔ اس علاقے میں اکثریت کی زبان کوہستانی ہے، جو پشتو سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پنجابی زبان کی بے شمار قسمیں (ماجھی، گجری، اور ہندکو) بھی بولی جاتی ہیں، البتہ یہ بات بھی اہم ہے، کہ اردو زبان عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ داسو کے قریب فلک شیر نامی ایک بڑا پہاڑ ہے، جو داسو سے 15 کلومیٹر دور ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور پہاڑ ہیں، جن میں سب سے مشہور ترچ میر ہے جو وہاں سے 127 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ پٹن اور داسو میں چھوٹے ائیر پورٹ اور ہیلی پیڈ بھی موجود ہیں، جہاں

سے کمرشل پروازیں نہیں چلتیں۔ داسو کے علاقے میں پولیس رات کو سفر کرنے سے منع کرتی ہے۔

داسو ڈیم: پاکستان کی ترقی میں ایک قابل قدر اضافہ

اس علاقے میں واقع داسو کے مقام پر، داسو ڈیم بنایا جا رہا ہے۔ اس ڈیم سے 4320 میگا واٹ بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ اس پراجیکٹ کو دو حصوں میں تعمیر کیا جائے گا۔ مارچ 2015ء میں اس کے پہلے حصے کی تعمیر کا فیصلہ ہوا، اس ڈیم کی اونچائی 794 فٹ اور لمبائی 1870 فٹ ہے۔ اس ڈیم سے تیار ہونے والی بجلی نہایت سستی ہوگی۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس ڈیم پر کام شروع نہیں ہوا۔ ایک دو جگہ ڈیم کے بورڈ تو لگے نظر آئے، لیکن کوئی کام ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یہاں سے تھوڑا آگے نکلے تو پہاڑوں کی ہیئت بدل رہی تھی۔ مٹی کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ دریا کا پاٹ چوڑا اور پانی کی رفتار قدرے کم ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں آبادی بھی نظر آتی تھی۔ دریا کے پاٹ میں بہت سی جگہوں پر آبادیاں بھی تھیں، لیکن کھیتی باڑی نہیں ہو رہی تھی، کیونکہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے کاشت کاری بھی کم ہوتی ہے، فصلوں کا زیادہ تر انحصار بارشوں پر ہوتا ہے اور اس علاقے میں بارشیں بھی کم ہی ہوتی ہیں، اسی لیے پہاڑ بھی خشک نظر آ رہے تھے۔ سڑک یہاں بھی خراب تھی اور اسد کی ڈرائیونگ میں کوئی بہتری بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تھکاوٹ سے برا حال تھا، امیر سفر نے کہہ رکھا تھا کہ اگلی منزل چیلاس ہے اور رات وہیں ٹھہریں گے۔

داسو سے چیلاس کا فاصلہ 123 کلومیٹر ہے، داسو سے چیلاس تک کوئی قابل ذکر قصبہ بھی نہیں ہے۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں بھاشا ڈیم بنایا جائے گا۔ داسو سے ذرا آگے جائیں تو بھاشا ڈیم کی جگہ ہے، یعنی وہ جگہ جہاں دیامیر بھاشا ڈیم کا پاور ہاؤس بنایا جائے گا۔ یہ ڈیم بھاشا کے مقام سے لے کر چیلاس سے ہوتے ہوئے آگے تک تعمیر کیا جائے گا۔

داسو کے پاس ایک گاؤں ہے جس کا نام سازن ہے۔ سازن ایک بالکل تنہا گاؤں ہے۔ اس میں شن لوگ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اینڈریو نے اس گاؤں کا دورہ کیا اور اس پر ایک کتاب لکھی، جس کا عنوان سازن ہے۔ داسو سے چیلاس تک کا سفر بہت طویل اور تھکاوٹ سے بھرپور تھا۔ یہاں کوئی آبادی تھی اور نہ ہی کوئی ٹریفک۔ گرمیوں میں یہ علاقہ بہت گرم ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ نومبر میں موسم نہایت خوشگوار تھا، مگر چیلاس ابھی بھی خاصا دور تھا۔ خدا خدا

کر کے شام تقریباً چار بجے چیلاس کے نشانات نظر آنے لگے اور جان میں جان آئی۔ آخر کار چیلاس کا بورڈ نظر آیا، جو کہ تین زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ انگلش، اردو اور ایک اور زبان جس کے حروف انگلش جیسے تھے۔ میں نے کئی لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ روسی یا وسطی ایشیائی زبان میں ہے، درست بات کا مجھے علم نہیں۔ چیلاس پہنچنے کے بعد ہوٹل میں قیام کا فیصلہ ہوا اور ہم نے سامان سفر کھولا اور آرام کرنے لگے۔ یاد رہے کہ چیلاس خیبر پختونخوا میں شامل نہیں ہے۔

اس کے بعد کے شہروں کی سیاحت کا ذکر میں نے گلگت بلتستان کے سفر نامہ میں کیا ہے۔

لاہور سے شمالی وزیرستان: ایک طویل سفر

الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا نے شمالی وزیرستان میں واقع میر علی اور میران شاہ میں یتیم بچوں کے لیے ایک پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔ اس پروگرام میں شرکت کے لیے 21 نومبر، 2018ء کو میں لاہور سے شمالی وزیرستان گیا۔ اس سفر میں خیبر پختونخوا کے جن شہروں سے گزرنے کا موقع ملا، ان کا ایک مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اس دوران ہم پنجاب کے جن شہروں سے گزرے، ان کا احوال میں نے اپنے پنجاب کے سفر نامے میں لکھا ہے۔

ہم نے کوئی رات ایک بجے کے قریب اپنا سفر شروع کیا۔ اس طرح ہم فجر کے وقت کالا باغ میں پہنچ گئے۔ ہم نے نمازِ فجر کالا باغ میں ادا کی اور اس کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا۔ عیسیٰ خیل، پنجاب کا آخری شہر ہے۔ جب ہم عیسیٰ خیل سے باہر نکلے تھے، تو ہم نے دیکھا کہ ایک بہت ہی کھلا علاقہ ہے۔ کچھ دیر سفر کے بعد، ہمیں ایک پولیس چوکی نظر آئی، جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اب ہم خیبر پختونخوا میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہاں پر ایک جگہ کا نام درہ تنگ ہے۔ اس سے تھوڑا سا آگے کا ایک ایسا لینڈ سکیپ ہے، جو مجھے اب تک نہیں بھولا۔ ہمارے دائیں طرف دریائے کرُم اور اس کے ارد گرد بہت ہی خالی علاقہ موجود تھا۔ ریت حد نگاہ تک چمک رہی تھی، پانی کہیں کم کہیں زیادہ تھا اور ہمارے بائیں طرف دور دور تک ایک ریگستان تھا۔

مجھے یاد آیا، کہ جب میں پچھلی مرتبہ یہاں آیا تھا، تو اس وقت میرے ساتھ رحمت اللہ بھی تھے اور ہم نے یہاں پر ایک ہوٹل جو اس صحرا میں اکیلا ہی تھا، سے اس علاقے کا ایک روایتی کھانا کھایا تھا، جسے یہ لوگ صوبت کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ روٹی کے ٹکڑے کر کے گوشت کے شوربے میں ڈالتے ہیں اور اسے ایک بڑی پلیٹ میں ڈال کر سب مل کر کھاتے ہیں۔ یہ اس علاقے کا ایک بہت ہی مشہور اور روایتی کھانا ہے۔ اس دفعہ اس کا موقع نہیں تھا۔ ناشتے کے وقت تک ہمیں سرائے نورنگ پہنچنا تھا، لیکن اس علاقے کا یہ جو لینڈ سکیپ ہے، وہ اس قدر منفرد ہے کہ اگر آپ کو وہ دیکھنے کا موقع ملے تو آپ اسے مدتوں فراموش نہیں کر سکیں گے۔

لکی مروت: پختون تہذیب سے جڑا ہوا شہر

عیسیٰ خیل سے لکی مروت، چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ تقریباً نصف راستہ دریائے کرم کے کنارے طے ہوتا ہے۔ یہ دریا عیسیٰ خیل کے پاس جا کر دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔ اس سڑک پر بہت کم سبزہ تھا، زیادہ تر علاقہ ایک صحرا کا منظر پیش کرتا ہے۔ ہم آٹھ بجے کے قریب لکی مروت پہنچ گئے۔ میرے ذہن میں جب بھی لکی مروت کا نام آتا تھا، تو ایک بہت ہی بہادر لوگوں کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ یہ علاقہ، خیبر پختونخوا صوبے کا بھی ایک دور دراز کا علاقہ ہے اور پنجاب کے نُقطۂ نَظَر سے بھی ایک دور دراز کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں زیر زمین پانی بہت گہرائی میں واقع ہے، بارشیں بھی بہت کم ہوتی ہیں، اس وجہ سے یہ علاقہ بے حد غربت کا شکار ہے۔

اس علاقہ کی اہمیت انگریزوں کی نظر میں کتنی تھی؟ آپ اس کا بھی اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں، کہ انھوں نے جب 1849ء میں پورے پنجاب کو فتح کیا تو پنجاب اور خیبر پختونخوا کو براہِ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کا حصہ بنالیا اور یہاں پر تحصیل، ضلع اور ڈویژن کا نظام لاگو کر دیا۔ انھوں نے اس علاقہ میں بنوں کو انتظامی لحاظ سے مرکز بنایا۔ میانوالی تک کا علاقہ بنوں میں شامل کیا۔ 1901ء میں جب انھوں نے صوبہ سرحد کی بنیاد رکھی، تو دریائے کرُم کو سرحد مان کر عیسیٰ خیل کو پنجاب کا حصہ بنایا اور ایک چھوٹے گیج کی ریل گاڑی ماڑی انڈس، جو کالاباغ کے پاس ہے، سے چلائی۔ یہ گاڑی ٹانک اور بنوں تک جاتی تھی۔

اور ہم نے یہ پٹڑی آج سے تیس سال پہلے اکھاڑ دی۔

آپ اسے کیا نام دیں گے؟

ترقی یا تنزلی!

کہتے ہیں کہ کسی وقت میں لکی مروت کا نام تھل دمان (یا تھل دامان) تھا۔ دریائے کرُم کے کنارے ایک جگہ پر صحابہ کرامؓ کی قبریں بھی ملتی ہیں۔ بابر نے بھی بنوچی قبائل کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات کا پتہ چلا، کہ لکی مروت کے علاقے میں پہلے نیازی قبیلہ کے لوگ رہتے تھے، بعد میں مروت نے ان کے ساتھ لڑائی کی اور نیازی قبائل عیسیٰ خیل کی طرف آ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ شمالی ہندوستان میں بھی جا بسے، مشرقی پنجاب میں ان کے کئی دیہات اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ علاقہ کسی وقتوں میں نادر شاہ کے قبضے میں بھی رہا ہے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمان کب آئے؟

کیا یہ ایک حقیقت ہے، کہ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں 644ء (سنہ 44 ہجری) میں یہ علاقے مسلمانوں کی پہنچ میں آ چکے تھے؟ کیا اس علاقے میں صحابہؓ کی قبریں اس بات کا ثبوت ہیں؟ اگر یہ بات درست ہے، تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں محمد بن قاسم سے کہیں پہلے آ چکے تھے۔ جنوبی ہندوستان کی ریاست کیرالہ میں چیرامن مسجد جس کے متعلق مقامی لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ مسجد آپ ﷺ کی زندگی میں ہی بنائی گئی تھی۔ پنجاب کے شہر سرگودھا کے پاس دھریمہ میں اصحابہؓ کی قبروں کی موجودگی اور لکی مروت کے علاقے میں صحابہ کے مزارات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمان ساتویں صدی کے نصف میں ہی ہندوستان آنا شروع ہو گئے تھے[1]۔

اب اگر بات شمالی ہندوستان کے متعلق کی جائے، تو یہ کہا جا سکتا ہے، کہ تھل دامان کے میدانی علاقوں میں دریائے کرُم کے بائیں کنارے پر اصحابؓ کی قبریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمان بہت پہلے اس علاقے میں آ گئے تھے۔ وہ تجارت کی غرض سے آئے، حملہ آور تھے یا پھر دین کی تبلیغ کے لیے؟ یا پھر یہ تینوں مقاصد ان کے پیشِ نظر تھے۔

ہندوستان کی تاریخ متعلق ایک کتاب

The History of India, as Told by Its Own Historians[2]

بے حد مفید ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ عربوں سے پہلے سے لے کر، ماضی قریب تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں کئی قرونِ وسطیٰ کے فارسی تاریخ کے تراجم بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں کے ایک سیٹ کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف ہنری میلر الیٹ 1808ء میں پیدا ہوئے، جو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے۔ ہینری ،ہارڈنگ اور جیمز براؤنز امسے اور ڈلہوزی جیسے لوگوں کے ساتھ، سیکرٹری خارجہ کے عہدے پر فائز بھی رہے۔ وہ مشرقی زبانوں، کلاسیکی اور ریاضی میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے

---

[1]Ron GeavesIslam and Britain: Muslim Mission in an Age of Empire

[2]Henry Miers Elliot*The History of India, as Told by Its Own Historians* a set of eight volumes between 1867-1877 in London--

اپنی کتاب میں احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری، جو نویں صدی عیسوی کے ایک مشہور عالم تھے، کے حوالے سے لکھا ہے کہ "سنہ 44 ہجری میں اور خلیفہ معاویہ کے زمانے میں، ابو صفرہ کے بیٹے محب نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کابل اور ملتان کے درمیان بنوں اور الہور (جسے اب لاہور کہا جاتا ہے) تک پیش قدمی کی تھی۔"

اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام، محمد بن قاسم سے کہیں قبل اصحابہؓ کے دور میں ہی آگیا تھا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے، کہ اس وقت اصحابہؓ دین کی تبلیغ کی خاطر آئے تھے، ملکوں کو فتح کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ محمد بن قاسم سے پہلے بھی مکران کے ساحل پر مسلمانوں کی آمد کے آثار ملتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا آغاز، محمد بن قاسم کے حملے، سبکتگین اور اس کی اولاد محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

جنوبی ہندوستان کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلی علاقوں پر کسی بھی مسلمان حملہ آور کی کوئی مصدقہ تاریخ نہیں ملتی۔ اس طرف سے آنے والے مسلمان زیادہ تر تاجر تھے اور وہ تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا کام بھی کرتے تھے۔

جنوبی اضلاع اور سکھ دورِ حکومت

ایک انتہائی دلچسپ بات یہ بھی ہے، جو میرے لئے بڑی حیرانی کی تھی کہ 1818ء میں رنجیت سنگھ نے اس علاقے پر اپنا قبضہ کیا، جس میں میانوالی، عیسیٰ خیل، بنوں سب شامل تھے۔ اتنے دور دراز علاقے کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں تھا۔ رنجیت سنگھ نے سالانہ چالیس ہزار روپے کے بدلے یہ علاقہ دیوان لکی مل، جو کہ ایک ہندو تھا، کو دے دیا۔ بعد میں ملک فتح خاں ٹوانہ بھی اس علاقے سے ٹیکس اکٹھا کر کے رنجیت سنگھ کو دیتا رہا۔ ٹوانہ نے ایک احسان پور نام کا قصبہ بھی آباد کیا، جو بعد میں دریائے کُرم میں سیلاب آنے کی وجہ سے ختم ہو گیا[1]۔

لکی مروت بڑا ہی دلچسپ علاقہ ہے، بہت وسیع منظر ہیں، زیادہ تر ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ اس کے چاروں طرف کئی پہاڑیوں کے سلسلے بھی ہیں، جو چار ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس علاقے کا نام دیوان لکی اور مروت قبائل کی وجہ سے لکی مروت پڑ گیا۔

---

[1]Virk, Hardev- (2014)-The Real Ranjit Singh-

کچھ لوگوں کو کہنا ہے کہ ایک جنگ میں مروت بہت بڑی تعداد میں تھے، تو کہا گیا کہ ایک لاکھ مروت ہیں۔اس طرح لاکھ بعد میں لکی بن گیا۔ بہر حال یہ دور دراز علاقے میں بسا ایک شہر ہے اور پختون لوگ اپنی تہذیب کے ساتھ بڑی سختی سے جڑے ہوئے ہیں ۔ اگر آپ کو پختون قبائل کی پرانی ثقافت دیکھنی ہو، یہ علاقے اس کے لیے بے انتہا موزوں ہیں۔

ہماری منزل قریب آرہی تھی، عثمان کی ڈرائیونگ بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ مجھ پر بھی تھکاوٹ کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے، لیکن خالد وقاص صاحب سے ملاقات کا شوق ہم سب پر حاوی تھا۔ ایک نیا علاقہ تھا، ایک طرح سے انجانا خوف بھی طاری تھا۔ انھی سوچوں میں گم، ہم نو بجے کے قریب سرائے نورنگ پہنچ گئے۔ اللہ کا بے حد شکر ادا کیا۔

سرائے نورنگ : ایک سردار کے نام پر بنا ہوا شہر

جب ہم سرائے نورنگ پہنچے، تو میرا پہلا تاثر یہ تھا، کہ یہ شہر لکی مروت شہر سے کہیں زیادہ مصروف ہے۔ یاد رہے کہ چھوٹے قصبہ جات میں لوگ صبح صبح اپنا کاروبار شروع کر دیتے ہیں، اس لئے دن کے پہلے حصے میں کافی رش ہوتا ہے۔ ہم یہاں پر مقامی جماعت اسلامی کے ذمہ داران کے گھر چلے گئے، انھوں نے بہت سارے لوگوں کے لیے ناشتے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جتنے یہ لوگ جفاکار ہیں، اتنا ہی بھاری بھر کم ان کا ناشتہ ہوتا ہے، جو ہمارے جیسے لوگوں کو کافی مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ بڑے بڑے پراٹھے، بڑی بڑی ڈبل روٹیاں اور کیک کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔ مہمان نوازی تو ایک خاص پختون روایت ہے، جس کا سامنا مجھے کئی بار کرنا پڑا ہے اور ہار بھی ماننا پڑی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔

خالد وقاص صاحب سے ملاقات ہوئی اور ہماری ساری تھکاوٹ بھی دور ہو گئی۔ ناشتے کے بعد ہمارا پروگرام شمالی وزیرستان جانے تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر کی داستان سناؤں، میں چاہوں گا سرائے نورنگ کے متعلق آپ سے کچھ باتیں کروں۔

انیسویں صدی کے وسط میں، جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضے کا پروگرام بنایا، تو یہاں اس وقت سکھوں کی حکومت تھی ۔ جب تک رنجیت سنگھ زندہ رہا، اس نے انگریزوں کے ساتھ مختلف معاہدے کیے ہوئے تھے اور ان معاہدوں کی رُو سے دریائے ستلج کے مشرق تک انگریزوں کی حکومت تھی اور مغرب میں لاہور سے لے کر بنوں، کشمیر، ہزارہ، ملتان، پشاور، کوہاٹ اور اس کے ساتھ ساتھ جمرود تک سب علاقوں پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کا کوئی بھی ایسا وارث نہیں تھا جو اس کی بنائی ہوئی حکومت کو سنبھال

سکتا۔ افراتفری کا ماحول تھا، سید محمد لطیف نے اس کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ پنجاب میں کیا ہے۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد، پنجاب پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کو سکھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مقامی امداد کی ضرورت تھی۔ سکھوں کے مظالم کی داستان بے حد مشہور ہے۔ مسلمان سکھوں سے بے حد تنگ بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ وقت، مسلمانوں پر سب سے برا وقت تھا۔ ایسے میں مقامی بااثر لوگوں نے سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور ایسے افراد ہمیں پاکستان کے ہر علاقہ ملتے ہیں۔ انگریزوں کا ساتھ دینے کے نتیجے میں انگریزوں نے انھیں بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ ایسا ہی سردار نورنگ خان گنڈاپور کے ساتھ ہوا۔

سردار نورنگ خان نے کئی مرتبہ اپنے فوجی جوانوں کے ساتھ انگریزوں کا ساتھ دیا اور سکھوں کو مختلف لڑائیوں میں شکست دینے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ملتان میں ہونے والی لڑائی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے بدلے میں انگریزوں نے ایک بڑی جاگیر سردار نورنگ خان گنڈاپور کو دی۔ پھر سرائے ایکٹ کے تحت نورنگ خان سرائے بنائی گئی، جس کے لیے تین ہزار کنال جگہ سردار نورنگ خان نے دی۔ اس طرح سے یہ شہر آباد ہوا۔

جو بات ہم سب کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ جب سردار نورنگ خان نے انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، تو مقامی علماء کے ساتھ مشاورت ہوئی۔ علمائے کرام نے فتوی دیا کہ سکھ کافر ہیں جبکہ انگریز اہل کتاب ہیں۔ اس لیے اس جنگ میں ہمیں اہل کتاب کا ساتھ دینا چاہیے اور دوسرا عام آدمی سکھوں کے ٹیکس وصول کرنے کے نظام سے بے حد تنگ تھا ۔کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے، کہ انگریزوں کے متعلق انھوں نے یہ سن رکھا تھا کہ ان کا نظامِ حکومت، سکھوں سے کہیں بہتر ہے۔ اس طرح سے اس علاقہ میں سردار نورنگ خان نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ بعد میں ان کے نام کی سرائے بنی جس کا شروع میں نام سردار نورنگ خان کی سرائے تھا، بعد سرائے نورنگ ہو گیا، یہاں میں دوسری مرتبہ آیا تھا۔ سردار نورنگ خان کی انھی خدمات کے بدلے انھیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا تھا[1]۔

[1] https://historyofpashtuns-blogspot-naura/com/2014/10/ng-khan-gandapur_30-html

شمالی وزیرستان: جو ہمیشہ ہی حالتِ جنگ میں رہا

سرائے نورنگ کی نورنگیوں سے ہم نکل کر بنوں کی طرف روانہ ہوئے، دوپہر تک ہمیں میران شاہ پہنچنا تھا۔ راستے میں کافی سرسبز علاقے تھے، کھیتی باڑی بھی خوب نظر آرہی تھی۔ دریائے کرُم ہم سے کافی فاصلے پر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم کوئی تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے بنوں پہنچے۔ بنوں سے ہمارے ساتھ کچھ اور دوست بھی شریک ہوئے، جو میران شاہ شہر کے رہنے والے تھے۔ یاد رہے، کہ میران شاہ شمالی وزیرستان کا مرکزی شہر ہے۔

میرا خیال ہے، آپ بھی اس بات سے متفق ہوں گے، کہ جیسے ہی آپ کو یہ پتہ چلے کہ آپ وزیرستان کے شہر میر علی اور میران شاہ جارہے ہیں، تو خوف ایک فطری بات ہے۔ کیونکہ پچھلی کئی دہائیوں سے یہ علاقہ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ میران شاہ بنوں سے 55 کلومیٹر اور افغانستان کے شہر خوست سے 60 کلومیٹر پہلے واقع ہے، افغان سرحد سے اس کا فاصلہ پندرہ کلومیٹر کے قریب ہے۔ جن دنوں ہم میران شاہ گئے تھے، اس وقت تک دہشت گردی کے واقعات میں کمی واقع تو ہوئی تھی، لیکن ابھی بھی اِکا دُکا واقعات ہو رہے تھے۔ میں نے مذاق میں خالد صاحب سے کہا کہ جا تو رہے ہیں، واپس آنے کے کیا امکانات ہیں؟ خالد صاحب ایک دلیر پختون ہیں، انھوں نے کہا کہ پہلے جاتے ہیں، واپسی کا پھر سوچیں گے۔

ایک بڑی سڑک، جو بنوں سے میران شاہ کی طرف جاتی ہے، ہم اس پر روانہ گئے۔ اس وقت بھی افغان مہاجرین کی کہیں کہیں آبادیاں ہمیں نظر آرہی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ آئی ڈی پیز کے کیمپ بھی موجود تھے۔ یہ کیمپ اس وقت بنے تھے، جب وزیرستان کے اندر فوج نے ایک بڑا آپریشن کیا تھا۔ اس وقت اس پورے علاقے کو خالی کروالیا گیا تھا۔ یہ ایک بڑی ہی دردناک داستان ہے۔ سیکورٹی چیک کے لیے ایک بڑی جگہ بنی ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ میران شاہ جانے سے پہلے اگر آپ اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتے، تو آپ کو اجازت لینا پڑتی ہے، جو ہمارے مقامی ساتھیوں نے لے رکھی تھی۔ وہاں پر ہمیں ایک چیک پوسٹ پر گاڑیوں سے اتارا گیا اور ہماری تلاشی ہوئی اور ہمارے نام لکھے گئے۔ اس ساری کارروائی کے بعد ہمیں دوسری طرف سے جانے کی اجازت دی گئی۔ سب لوگوں کے ساتھ اسی طرح سے ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے یہ ایک بڑا ہی کھلا میدان تھا، اس میں بیٹھنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لوگ جہاں جگہ ملتی کھڑے ہو جاتے، خاص طور پر خواتین کے لیے انتظار کرنا کافی مشکل تھا۔

ہمارا پہلا پڑاؤ میر علی میں تھا۔ میر علی ایک بڑا قصبہ ہے، جس میں ضرورت کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ الخدمت فاؤنڈیشن یتیم بچوں کی کفالت کے لیے ایک بڑا پروگرام چلا رہی

ہے۔ یہاں پر آج یتیم بچوں کے لئے الخدمت فاؤنڈیشن نے ایک پروگرام رکھا ہوا تھا اور ہمیں اس میں شریک ہونا تھا۔ پروگرام ایک کھلی جگہ پر تھا، سو سے زیادہ لوگ موجود تھے، ان میں یتیم بچے بھی شامل تھے۔ ایک انتہائی خوشی کی بات یہ ہے، کہ آپ پاکستان کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں تو آپ کو اردو میں بات چیت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ میرے ساتھ ایک مقامی صاحب تشریف فرما تھے، انھوں نے بڑی سہولت کے ساتھ اردو میں بات چیت کی۔

مجھے اب تک ان کے الفاظ یاد ہیں، انھوں نے کہا کہ میرے بھائی آج جس طرح کا یہ جلسہ ہم کر رہے ہیں، ہم اس کا پہلے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کس طرف سے ڈرون آئے گا اور ہمارا خاتمہ کر دے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ حالات پہلے سے کہیں بہتر ہیں، ڈرون حملے بھی کم ہو گئے ہیں۔

انھوں نے مزید مجھے یہ بتایا، کہ یہ علاقہ بد قسمتی سے صدیوں سے ہی میدانِ جنگ بنا رہا ہے۔ نادر شاہ یہاں آیا، تیمور نے بھی علاقے پر حملے کیے، احمد شاہ ابدالی نے بھی اسے نہیں بخشا، انگریزوں نے بھی یہاں پر بے شمار لڑائیاں لڑی، فقیر اپی نے بھی اسی علاقے سے ایک گوریلا جنگ لڑی۔ اب پچھلے چالیس سال سے پہلے روس کے ساتھ لڑائی، اب امریکہ کے ساتھ لڑائی لڑنے والے مجاہدین بھی یہیں رہتے تھے۔ پاک فوج بھی یہی رہتی ہے، ان کے ساتھ بہت سے لوگوں کے اختلافات بھی ہیں۔ لگتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس علاقے کو میدانِ جنگ کے طور پر چن لیا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا، کہ میرا نہیں خیال کہ ہم کبھی بھی چند سال امن سے رہے ہوں، ہمیشہ ہم جنگ کے حالات میں ہی رہے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ نئی نسل کے خیالات کیسے ہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ لوگوں کی آمدورفت شہروں میں زیادہ ہو گئی ہے۔ نئی نسل کے بچے اب یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی امن کی زندگی گزاریں، تعلیم حاصل کریں، زندگی کے بڑے بڑے مقاصد حاصل کریں اور جنگی ذہن کو ختم کریں۔ لیکن جب انھیں ان کے آباؤاجداد کی باتیں سنائی جاتی ہے، تو پھر ان کے اندر جنون دوبارہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب یہ بات پہلے سے کہیں کم ہے۔ میری خوش بختی تھی کہ ایک مقامی صاحب، جن کا میں نام نہیں لکھ رہا، سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ مجھے بہت ساری ایسی باتیں بھی انھوں نے بتائیں جو میں لکھ نہیں رہا۔ انھوں نے آخری بات یہ مجھے بتائی کہ چند بڑے لوگوں کی اس علاقہ پر حکمرانی ہے، باقی سب ان کے غلام

ہے۔ ایسے لوگوں کے چہرے، نام اور عہدے بدلتے رہتے ہیں، لیکن بات وہی صدیوں پرانی ہے۔

میر علی اور فقیر اپی

کوئی میر علی سے گزرے، اسے تاریخ کا شغف بھی ہو اور اسے فقیر اپی یاد نہ آئے، یہ ناممکن ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ فقیر اپی جو اس علاقے کی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے جس کی مثال ہندوستان اور افغانستان میں ملنا ممکن نہیں۔ انھیں فقیر آف اپی بھی کہا جاتا ہے۔ آف ایک انگریزی لفظ ہے، یہ کیسے ان کے نام کا حصہ بنا۔ معلوم نہیں، شروع میں وہ اپی کے فقیر کے نام سے جانے جاتے تھے۔ میں ان کے متعلق جتنا پڑھتا گیا، اتنا ہی ان کے متعلق جاننے کا شوق پیدا ہوتا گیا۔

ان کی انگریزوں سے آزادی کی ایک طویل جدوجہد، جس میں اس نے جرمنوں سے بھی مدد لی، ان کا دیا ہوا پستول بھی اپنے پاس رکھا، افغانستان میں انگریز مخالف لوگوں سے رابطہ بھی رکھا، ایک مسلم لڑکے اور ہندو لڑکی کے رومانس کی وجہ سے ہونے والے جھگڑے کو بنیاد بنا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان بھی کیا اور قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان سے اختلافات بھی کیا، یہ سب کچھ اور بہت کچھ اور بھی۔ اس شخص کا ایک مختصر ذکر جو وزیرستان کے متعلق لکھی گئی تاریخ کی ہر کتاب اور ہر مضمون میں بیان کیا گیا ہے اور بیان کیا جاتا رہے گا، جو آج بھی ایک داستان کی طرح وزیرستان کے لوگوں کو یاد ہے، آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

یہ کوئی 1936ء کی بات ہے کہ بنوں کے جھنڈی خیل علاقے میں رام کوری نام کی ایک نوجوان ہندو لڑکی اور ایک سید پختون امیر نور علی کے درمیان دوستی ہو گئی۔ دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا[1]۔ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام بدل کر اسلام بی بی رکھ لیا۔ یہ بات ہندو خاندان کو قبول نہ تھی۔ لڑکی کی والدہ نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے یہ جان کر کہ لڑکی نابالغ ہے، شادی ختم کروادی اور نور علی کو گرفتار کرکے دوسال قید کی سزا بھی سنائی۔

The Faqir of Ipi of North Waziristan[1]
Asad Munir
November 14, 2010
https://tribune.com.pk/story/77388/the-faqir-of-ipi-of-north-waziristan

میں نے کہیں یہ بھی پڑھا ہے، کہ قیامِ پاکستان سے قبل ایسا ہی ایک واقعہ کوہاٹ میں بھی پیش آیا تھا، جسے رفع دفع کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کو بھی مداخلت کرنا پڑی تھی۔ مجھے ایک دفعہ دہلی میں ایک بزرگ جن کا تعلق لکھنؤ سے تھا، ملنے کا موقع ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں بھی کئی ہندو مسلم فسادات کی وجہ بھی اسی طرح کا کوئی واقعہ ہی ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے نتیجے میں ہندو مسلم اختلافات شدت اختیار کر گئے۔

قبائل نے مسلمان لڑکی کو ہندو خاندان کے حوالے کرنے کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ یاد رہے کہ عدالت میں لڑکی کے خاندان کی طرف سے سیٹھ چھوٹو رام وکیل تھے، جو ایک نامی گرامی وکیل تھے۔ وہ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امیر آدمی بھی تھے۔ انھوں نے بنوں میں اسکول بنانے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے نام کی تختی اب بھی اسکول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عدالت کے فیصلے کے خلاف 14 اپریل 1936ء کو میر علی کے قریب ایک جرگے کا اہتمام کیا گیا، جس میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ ہوا اور ایک قبائلی لشکر تشکیل دیا گیا۔ اس لشکر کی سربراہی، اپی فقیر کو دی گئی۔ اس طرح اپی فقیر منظرِ عام پر آیا۔

اپی فقیر کا اصل نام مرزا علی خان تھا۔ اس کا تعلق طوری خیل سے تھا۔ وہ 1897ء میں (کچھ لوگوں نے 1901ء بھی لکھا ہے) شمالی وزیرستان میں میر علی کے قریب، ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ اپی گاؤں میں آباد ہوئے اور اس میں واقع ایک مسجد کے امام بن گئے۔ اس کے بعد وہ حج پر گئے اور علاقے بھر میں ایک عالم دین اور متقی انسان کے طور پر جانے جانے لگے۔ ایک عرصے تک ان کی ساری مصروفیت صرف مذہبی امور تک ہی رہی۔ اس دوران وہ سیاسی معاملات سے دور ہی رہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے اصل نام کی بجائے، اپی کے فقیر کے نام سے جاننے لگے، جو بعد میں فقیر آف اپی بن گیا۔ پھر وہ دن آیا جب علاقے کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور انھیں اس جہاد کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

کیا یہ جہاد عدالت کے فیصلے کے نتیجے میں شروع ہوا یا یہ فیصلہ ایک بہانہ تھا، لوگ پہلے سے ہی انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار تھے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب میں ڈھونڈ نہ سکا۔ میرا اندازہ ہے، کہ مقامی لوگ پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھے، عدالتی فیصلے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

اس کے بعد اپی فقیر نے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی۔ انگریز کبھی بھی نہ تو اسے پکڑ سکے اور نہ ہی مار سکے۔ اپی فقیر کون تھا اور اس نے کیا کچھ کیا؟ اس کا مختصر ذکر کچھ یوں ہے۔

جب نومبر 1936ء میں انگریزوں نے وزیرستان کے مختلف علاقوں میں آپریشن شروع کیے، تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اپی فقیر نے اپنے ساتھیوں سمیت مزاحمت کا آغاز کیا۔ اس دوران کئی بار انگریزوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اسی طرح کی ایک اہم جنگ خیسور کی جنگ ہے، جس میں اپی فقیر اور اس کے پیروکاروں نے ایک ہزار سے زائد برطانوی فوجیوں کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے ایک بڑی فوج کے ساتھ، جو پچاس ہزار افراد پر مشتمل تھی، کی مدد سے وزیرستان پر حملہ کیا۔ اپی فقیر کے کئی جانثار شہید ہوئے، لیکن وہ خود کبھی بھی پکڑا نہیں گیا۔

دوسری طرف اپی فقیر ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھا، وہ کانگرس کا حامی تھا۔ اس کے مطابق ایک الگ قومی ریاست ہندوستان میں مسلمانوں کو کمزور کر دے گی، لیکن اس کی بات نہ مانی گئی۔ تقسیم ہند بھی ہوئی اور قیامِ پاکستان کا عمل بھی مکمل ہوا۔ اپی فقیر نے 1960ء میں وفات پائی۔ انھیں گوروک، شمالی وزیرستان میں دفن کیا گیا۔ اب تک اس کی بہادری کے چرچے علاقے میں مشہور ہیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اس جنگ میں، جب تک رائل ایئر فورس کے دستے شامل نہیں ہوئے تھے، اس وقت تک اپی فقیر کے لشکر کو برتری حاصل تھی۔ جہازوں سے بمباری کے نتیجے میں اپی فقیر کی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ جس طرح سبھاش چندر بوس نے انگریزوں کے خلاف جرمنی کی مدد لی تھی، اسی طرح اپی فقیر نے بھی کابل میں واقع جرمن سفارت خانے کے ذریعے کچھ جنگی سامان جرمنی سے حاصل کیا تھا۔ اس جنگ میں جرمنی کے علاوہ اٹلی نے بھی اپی فقیر کی خفیہ طور پر مدد کی تھی۔ ان ممالک کا مقصد برطانوی ہندوستانی فوج کو اس علاقے میں مصروف رکھنا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھی، اپی فقیر نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا اور پاکستان کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔ اس دوران انھوں نے پختونستان بنانے کا اعلان کیا اور رزمک میں منعقدہ ایک قبائلی جرگہ نے انھیں پختونستان کا پہلا صدر منتخب کیا[1]۔ ان کی موت پر (20اپریل

/https://storyofpakistan.com/faqir-of-ippi[1]

1960ء) ٹائمز اخبار لکھا، کہ اپی فقیر ایک مضبوط اور معزز دشمن تھا، وہ ایک اصول پسند اور صاف ستھرا آدمی تھا[1]۔

تقسیم ہند کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا!

بنوں میں پختون رہنماؤں کا ایک بڑا جرگہ، 21 جون 1947ء کو ہوا۔ اس میں باچا خان، ان کے بھائی، وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب، خدائی خدمتگار، اراکین صوبائی اسمبلی، کے ساتھ ساتھ اپی فقیر اور دیگر قبائلی سردار بھی شریک ہوئے۔ یاد رہے کہ یہ جرگہ تقسیم ہند سے صرف سات ہفتے پہلے منعقد ہوا تھا[2]۔ جرگے میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا، کہ پختونوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کی بجائے، برطانوی ہندوستان کے تمام پختون علاقوں پر مشتمل پختونستان کی ایک آزاد ریاست کا انتخاب کریں۔

اس کا مطلب تھا کہ پختونوں کو پختونستان کے نام کی ایک آزاد ریاست کے قیام کا اختیار دیا جائے۔ یعنی جو ریفرنڈم ہو رہا ہے جس میں لوگوں سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں؟ ان سے یہ بھی پوچھا جائے کہ کیا وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں؟ تقسیم ہند کے فارمولے میں ایسے ہی طے کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ابھی تک پاکستان یہ کہہ رہا ہے کہ کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت ملنا چاہیے۔ جب اپی فقیر اور خدائی خدمتگاروں کی یہ مانگ پوری نہیں ہوئی تو انھوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے بعد اس کے حکومتِ پاکستان سے تعلقات خراب ہونا شروع ہو گئے۔

اپی فقیر کا کبھی بھی کانگریس یا مسلم لیگ سے براہِ راست رابطہ نہیں رہا۔ یہ بات درست ہے، کہ وہ کانگرس کی طرح تقسیم ہند کا مخالف تھا۔ اس کی ساری جدو جہد آزادی ہند کی خاطر تھی، لیکن وہ تقسیم ہند یعنی قیامِ پاکستان کے حق میں بھی نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے اکتوبر

---

[1] Asad MunirNovember 14, 2010
https://tribune.com.pk/story/77388/the-faqir-of-ipi-of-north-waziristan

[2] Ali Shah, Sayyid Vaqar (1993). Marwat, Fazal-ur-Rahim Khan (ed.). Afghanistan and the Frontier. University of Michigan: Emjay Books International. p. 256. Archived from the original on 19 December 2019. Retrieved 18 August 2019.

1947ء میں حکومت پاکستان کی طرف عام معافی کے اعلان کے باوجود پاکستان مخالف کاروائیاں جاری رکھیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے 12 مئی 1948ء کو ایک پوسٹر شائع کیا جس کہا گیا، کہ پاکستان انگریزوں کی تخلیق ہے اور قائداعظم ان کے ایجنٹ تھے۔ یہ وہی نظریات تھے، جو غفار خان اور ان کے ساتھیوں کے تھے۔

اپنے ان خیالات کی تکمیل کی خاطر اپی فقیر نے دریائے سندھ تک پاکستانی سرزمین پر مشتمل ایک الگ ملک (پختونستان) بنانے کے لیے بھارت سے مالی اور فوجی مدد کی درخواست بھی کی، لیکن اپی فقیر کے اس خیال کی حمایت بہت کم لوگوں نے کی۔ وزیرستان کے اکثر لوگ پاکستان کے حامی تھے۔ اس لیے اپی فقیر کی یہ تحریک بہت جلد ختم ہو گئی اور یوں ایک خواب، خواب ہی رہا۔

یہ خواب اس کے علاوہ بھی کئی لوگوں کا تھا، لیکن سب ہی ناکام ہوئے۔ مرکز مخالف تحریک کسی نہ کسی انداز میں اب بھی چل رہی ہے۔ اس تحریک کے حامی لوگوں سے مل بیٹھ کے بات چیت ہی اس مسئلے کا حل ہے۔۔۔

آج بھی اور کل بھی۔۔۔

جتنی جلدی ہو سکے، اسے حل ہونا چاہیے۔۔۔

میرا خیال ہے کہ وزیرستان میں موجودہ سیاسی ابتری کی بنیاد اپی فقیر کے دور میں ہی رکھی گئی تھی۔

یہ میرا قیاس ہے، ہو سکتا ہے درست نہ ہو، یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، جو میں نے سمجھا، وہ بیان کر دیا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام آباد میں 1/11-4 کی ایک سڑک کا نام، ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ایک طرف ان کے خلاف جنگ اور دوسری طرف پاکستان کے صدر مقام اسلام آباد کی ایک سڑک کا ان کے نام پر نام۔

یہ تھی ایک داستان اس شخص کی جو ایک امام مسجد تھا، جہاد کا سربراہ بنا، انگریزوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا، کبھی گرفتار نہ ہوا، کبھی شکست نہ کھائی، آزادئ ہند کی خاطر گیارہ سال تک گوریلا جنگ کرتا رہا۔ تقسیم ہند کی مخالفت کی، قیامِ پاکستان کو قبول نہ کیا، پھر ایک دن 1960ء

میں خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے نام پر خیبر پختونخوا میں کہیں بھی کوئی یادنہ بنائی گئی، حتیٰ کہ وزیرستان میں بھی نہیں۔ اسلام آباد میں ایک سڑک ان کے نام پر ہے، جو ان کی یاد دلانے کی کافی سمجھی گئی۔ ان کا جرم تقسیم ہند کی مخالفت تھا۔

اس کے سیاسی نظریات اس کی گوریلا جنگ میں کامیابی پر حاوی ہو گئے۔۔۔

وہ انھی نظریات کی بناء پر پاکستان مخالف ٹھہرایا گیا۔۔۔

اور بہت سے لوگوں کی طرح۔۔۔

اس فہرست میں جہاں اور بے شمار لوگ ہیں وہیں محترمہ فاطمہ جناح بھی ہیں۔۔۔۔

پیر روشان اور روشنیہ تحریک، پشتونوں کا نظرانداز باب

وزیرستان بارے لکھتے ہوئے ایک اور اہم شخصیت جناب بایزید انصاری پیر روشان کا پتا چلا۔ وہ بھی ایک عظیم شخص تھے۔ جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے جنگ جو بھی تھے۔ ان کی کہانی مغلوں سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کے ماننے والے اب بھی بے شمار لوگ ہیں۔ ان کی زندگی بارے ایک خوبصورت مضمون پڑھنے کو ملا، جسے طاؤس پیر نے لکھا ہے[1]۔ اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

طاؤس پیر کہتے ہیں کہ پختون قوم کی روایات، اقدار اور پشتو نثر اور شاعری کا ذکر بایزید انصاری المعروف پیر روشان کے بغیر ادھورا ہے۔ بایزید انصاری "پیر روشان" (1585۔ 1525ء) کو پختونوں کا سب سے پہلا صاحب سیف و قلم و کتاب مانا جاتا ہے۔ انھوں نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور (1605۔ 1556) میں روشنیہ تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسی وجہ سے ان کا لقب پیر روشان پڑ گیا۔

یوں تو پیر روشان کا تعلق جنوبی وزیرستان کے ایک انصاری قبیلے سے تھا۔ لیکن ان کی پیدائش جالندھر پنجاب میں ہوئی جہاں ان کے والد رہائش پذیر تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ 1526ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کی شکست سے پہلے پختون ایک بڑی تعداد میں ہندوستان میں رہتے تھے۔ مغل بادشاہ بابر کے ہاتھوں شکست کے بعد پختونوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور پختونوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بابر کے دور میں پختونوں کو ہندوستان میں سکون کا ٹھکانہ میسر نہ تھا۔ پھر ایک دن وہ شیر شاہ سوری کی قیادت میں اکٹھے ہوئے اور بابر کے بیٹے ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت واپس چھین لیا۔ اسی دور میں

---

[1] https://www.humsub.com.pk/442242/taus-peer-2/

ایک مرتبہ پھر پختون بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ یہی وہ دور تھا جب پیر روشان کے والد شیخ عبداللہ وزیرستان سے بغرض تجارت ہندوستان کے شہر جالندھر جایا کرتے تھے اور پیر روشان کی پیدائش بھی جالندھر میں ہوئی۔ انھوں نے بچپن ہی میں مغلوں کا پختونوں پر ظلم و ستم اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی سلوک کی وجہ سے بابر کی موت کے فوری بعد پختون، ہمایوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

پیر روشان کو خاندان کے علمی ماحول نے بے حد متاثر کیا۔ جوانی ہی میں وہ اپنے چچازاد بھائی خواجہ اسماعیل کی روحانی زندگی سے متاثر ہوئے اور ان کے حلقہ ارادت میں بیٹھنے لگے اور صوفیانہ راستہ اختیار کر لیا۔ وہ وجد میں آکے رقص بھی کرتے تھے۔ سماع اور سرود کی محفلوں کے قائل تھے۔ اس میدان میں وہ دور تک گئے۔

انھوں نے پہلی مرتبہ مرد و زن کے حقوق میں برابری کی بات کی، جو وزیرستان جیسے علاقے میں ایک منفرد بات تھی۔ ان کی شہرت کی وجہ سے دربار کابل میں ان کی شکایت بھی گئی۔ اس پر والی کابل مرزا محمد حکیم مغل، شہنشاہ جلال الدین اکبر کے سوتیلے بھائی نے ان سے بات چیت کی اور پیر روشان کو تمام الزامات سے بری قرار دیا گیا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ایک نئی جنگ شروع ہو گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ کابل کے مغل گورنر نے توئی کے مقام پر ایک قافلے کو لوٹنے کی پاداش میں پورے گاؤں کو تباہ کر دیا۔ اس میں مغل فوج نے طاقت کے نشے میں بعض بے گناہ لوگوں کو بھی قتل کر دیا۔ یہ سب دیکھ کر توئی کے لوگوں نے مرشد پیر روشان کے پاس پہنچ کر روحانی مدد کے لیے درخواست کی۔ پیر روشان نے ایک خط والی کابل کے نام لکھا اور درخواست کی کہ جو لوگ بے گناہ قید کیے گیے ہیں انھیں رہا کیا جائے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔

یہ خط دربار کابل نے شاہانہ آداب کے منافی سمجھا اور پیر روشان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ پیر روشان تصادم سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ہشت نگر سے یوسف زئی کلیانی کی طرف کوچ کر گئے۔ اسی دوران، کابل کا بھیجا ہوا صوبیدار پشاور بمعہ لشکر ان کا تعاقب کرتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

اب وہ وقت آیا جب پیر روشان نے اپنے مریدوں اور جانثاروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یا تو بھوک اور پیاس سے مر جائیں یا مغل کے لشکر سے زندہ رہنے کی بھیک مانگیں۔ یہ دونوں صورتیں ذلت آمیز ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں اپنی مردانگی اور شجاعت کا مظاہرہ اور موت کو گلے لگالیں۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ پیر روشان کے مریدوں نے صوبہ دار پشاور

اور اس کے لشکر کو جنگ میں عبرتناک شکست دی۔ اس کے بعد روشنیہ تحریک کے حوصلے بلند ہوئے اور وہ اکبر کے مقابلے میں ایک طاقت بن کر ابھرے۔

اسی دور میں پیر روشان نے تیراہ میں آزاد مملکت کی بنیاد ڈالی۔ یہ مغل حکومت کو قبول نہ تھا۔ پیر روشان کی آزاد ریاست ننگرہار تک پھیل چکی تھی۔ پھر شنواری علاقہ توراغہ میں ایک آخری معرکہ ہوتا ہے جس میں پیر روشان کو شکست ہوئی۔ پیر روشان کی بھی موت واقع ہوتی ہے۔ آپ کو ہشت نگر میں دفن کیا۔

ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے شیخ عمر نے روشنیہ تحریک کی باگ ڈور سنبھالی۔ ان کی موت بھی یوسفزئی، دلہ زاک اور کافر آباد قبائل کے ساتھ اندرونی خانہ جنگی میں واقع ہوئی جہاں وہ اپنے تین بھائیوں سمیت مارے گئے۔ ان جنگوں میں ان کے ایک بھائی جلال الدین المعروف "جلالہ" خود کو بچانے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں "جلالہ" نے تحریک کو نئی روح پھونکی۔

یہ بات بھی اس مضمون میں لکھی ہوئی کہ ہے کہ موجودہ جلال آباد افغانستان اور تحصیل جلالہ مردان کا نام انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ اس کے بعد بھی ان لوگوں کی مغلوں کے ساتھ پانچ خونریز جنگیں ہوئیں۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جنگ وجدل کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار مغل بادشاہ شاہجہان کے دور میں روشنیہ اور مغلوں کی صلح ہوئی۔

پیر روشان صاحب قلم تھے۔ وہ ایک شاعر ایک ماہر لسانیات، ایک طالب علم ایک عالم، ایک سیاستدان، ایک سپاہی، ایک جرنیل تو تھے ہی، وہ سب سے بڑھ کر ایک پیر بھی تھے۔ پیر روشان نے پہلی پشتو نثر کی کتاب خیر البیان لکھی جس کو مزید تین زبانوں، عربی، فارسی اور ہندی میں لکھا۔ دیگر تصنیفات میں حالنامہ، فخر الطالبین، مقصود المومنین، رسالہ عالم، رسالہ فرحت المجتبیٰ شامل ہیں۔ یہ تھا تذکرہ ایک ایسی شخصیت کا جس کے بارے ہر پختون کو جاننا ضروری ہے۔

میران شاہ: تیمور کی اولاد کے نام پر بسا شہر

میر علی سے فارغ ہو کر ہم میران شاہ چلے گئے۔ راستے میں دو چیزیں ہی موجود تھیں، ایک پہاڑ اور دوسرے ہر پچاس قدم کے بعد فوج کا ایک سپاہی جو لوگوں کی حفاظت کر رہا تھا اور ان کے درمیان میں رواں دواں وزیرستان کے مختلف قبائل کے لوگ، جو اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ کہیں کہیں نوجوان لڑکے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے بھی، ہمیں نظر آتے تھے۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ رواج بھی یہاں پر کافی ہے۔ نئی نسل کے لوگ شاید اتنے مذہبی نہیں ہیں، جتنے ان کے بڑے تھے۔ کوئی نہ کوئی مذہب سے دوری کی بات اس علاقے میں کر رہا ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے۔

جب ہم میران شاہ میں پہنچے تو ہم نے دیکھا، کہ شہر سے پہلے ایک بڑا میدان تھا، اس کے بائیں طرف چھوٹا سا دریا چل رہا تھا، جس کا نام ٹوچی دریا ہے۔ یہ دریا آگے چل کر دریائے کُرم سے جا ملتا ہے، جو عیسیٰ خیل کے پاس دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ دریا کے کنارے کھیل کے میدان، پھر درمیان میں سڑک اور پھر سڑک کے دوسری طرف ایک پکنک پوائنٹ اور جرگہ کے لیے ایک بڑا ہال تھا۔ ہم الخدمت فاؤنڈیشن کی طرف سے ضرورت مند لوگوں میں ضرورت کی چیزیں تقسیم کرنے کے لیے آئے تھے۔ بہت سے لوگ وہاں پر موجود تھے۔ الخدمت فاؤنڈیشن کے ساتھیوں نے کافی بسترے وغیرہ اکٹھے کیے ہوئے تھے، جو انھوں نے لوگوں میں تقسیم کیے۔ ہال کی دیواروں پر مقامی لوگوں کی بے شمار تصاویر لگی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ فوج کے لوگوں کی تصاویر بھی تھی۔ ہم کافی دیر تک اس علاقے میں رہے، بعد میں قریب ہی جماعت اسلامی کے ایک ساتھی کے گھر پر کھانا تھا، جس میں کافی لوگ شریک تھے۔ انھوں نے بڑی محبت سے کھانا پیش کیا۔ ان کا کھانا پیش کرنے کا انداز اور بار بار پوچھنا اور کیا چاہیے، یہ سب کچھ مجھے اب تک یاد ہے۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ یہ وہ گھر ہے جہاں پر ایک وقت میں پچاس پچاس مجاہدین بھی رہتے رہے ہیں۔ جو بھی مجاہد، روس کے خلاف جنگ کے لئے بنوں کی طرف سے آتا تھا، وہ یہاں

پر قیام کرتا تھا اور یہاں مقامی جماعت اسلامی کے ساتھی ان کی خدمت کرتے تھے۔ ایک بزرگ اس کام میں سب سے آگے تھے، اب ان کے بچے بھی اس مقام پر لوگوں کی مہمان نوازی کا کام کرتے ہیں۔

پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد، میں نے اپنے میزبان سے یہ کہا، کہ میں شہر کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ جس پر انھوں نے ہامی بھر لی، جس کی وجہ صرف ان کی مہمان نوازی تھی، لیکن وہ دل سے اس بات پر راضی نہ تھے، وجہ صرف جان کا خطرہ تھا۔ یہ علاقہ کسی بھی لحاظ سے محفوظ نہیں تھا، خاص طور پر میرے جیسے اجنبی فرد کے لیے۔ جب ہم شہر میں گئے، تو میں نے ان سے یہ کہا کہ شہر میں تو کوئی بھی پرانی عمارت نہیں ہے، اس طرح کے علاقوں میں تو بہت پرانے گھر ہوتے ہیں، مارکیٹیں بھی پرانی طرز کی ہوتی ہیں، لیکن یہاں تو سب کچھ نیا ہے۔ کئی منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں، اس میں شہروں کی طرز کی مارکیٹس تھیں، لیکن سب خالی پڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھے یہ بتایا، کہ ساری پرانی مارکیٹیں ختم کر دی گئی ہیں اور مقامی لوگوں کے لیے نئی مارکیٹس بنائی گئی ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ فوج اس علاقے میں لوگوں کے لیے کافی کام کر رہی ہے، لوگوں کی ضروریات بھی پوری کی جا رہی ہیں، علاقے میں تعلیم کے لئے بھی کام ہو رہا ہے۔

یہ سب کچھ موجود ہے، لیکن اس کی بہت بڑی قیمت مقامی لوگوں کو دینی پڑ رہی ہے۔ اس علاقے کے لوگ آزاد منش لوگ ہیں، آزادی ہی ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اب ان کو تلاشی دے کر اپنے علاقے میں آنا پڑتا ہے اور یہاں بھی بہت نظم و ضبط کے ساتھ رہنا پڑتا ہے، جس کی انھیں صدیوں سے عادت نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو میران شاہ سے باہر لے جاؤں، میں چند باتیں میران شاہ کے متعلق، آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

میران شاہ اور امیر تیمور

امیر تیمور کے بیٹے، جلال الدین میران شاہ کے نام پر اس شہر کو بسایا گیا تھا اور پھر تیمور کی اولاد یعنی مغلوں نے بھی، اس شہر میں اپنی آمدورفت کو جاری رکھا۔ یہ ایک بڑی طویل داستان ہے، کہ کس طریقے سے یہاں پر مختلف لوگ آپس میں جنگ و جدل کرتے رہے۔ ماضی قریب کی ایک اہم شخصیت مرزا علی خان عرف فقیر اپی کی ہے، جنھوں نے اپنے ایک ہزار ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے حکومت پاکستان سے اختلافات پیدا ہو گئے (اس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا

ہوں)۔ حکومت پاکستان نے ان کے خلاف یہاں پر جنگی کارروائیاں بھی کیں۔ میران شاہ سے ایک راستہ ہنگو اور کوہاٹ کی طرف بھی جاتا ہے۔

وکی پیڈیا کے مطابق میران شاہ کی پیدائش 1366ء میں ہوئی۔آپ تیمور کے چار بیٹوں میں سے تیسرے تھے[1]۔ اسے اس کے والد نے خراسان کی فتح سے پہلے، اس علاقے کا گورنر نامزد کیا، اس کے بعد اس نے ہرات بھی فتح کیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے، جس کا تفصیلی ذکر یہاں مناسب نہیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے، کہ منگول خاندان کا ایک فرد اس علاقے میں ایک شہر بساتا ہے اور یہ شہر آج تک اسی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے، کہ اگر اس علاقہ میں امن ہو اور ڈرون حملے کا خطرہ نہ ہو، اب تک میں نے جو مقامات دیکھے ہیں، ان میں میران شاہ ایک بہت ہی خوبصورت جگہ ہے، جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، درمیان میں دریائے ٹوچی بہتا ہے، دریا کے دونوں طرف سرسبز وادیاں ہیں، مہمان نواز لوگ ہیں موسم خوشگوار ہے، کیونکہ یہ سطح سمندر سے بہت زیادہ بلند نہیں ہے۔کاش یہاں پر اتنا امن ہو کہ لوگ اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں آئیں۔اب بھی اس شہر کے دوستوں کے ساتھ رابطہ رہتا ہے۔ دوپہر کے بعد اس دعا کے ساتھ ہم بنوں واپس آگئے کہ اے اہلِ میران شاہ اللہ آپ کو امن نصیب کرے۔آمین!

وزیرستان اور انگریز

جب انگریزوں نے پنجاب کے ساتھ ساتھ سندھ اور بلوچستان پر بھی اپنی حکمرانی قائم کر لی، تو انھوں نے وزیرستان پر اپنی حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ صدیوں سے وزیرستان کے قبائل ایک آزاد اور قبائلی معاشرہ کے عادی تھے اور باہمی تنازعات کو حل کرنے اور دوسرے گروہوں کے ساتھ تعلقات کو منظّم کرنے کے لیے جرگوں پر انحصار کرتے تھے۔ کسی مرکزی حکومت کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یہاں انگریزوں نے ایک مختلف پالیسی اختیار کی۔انھوں نے جنگ کی بجائے (1849ء سے 1914ء تک کے عرصے میں) قبائلی عمائدین کو ساتھ ملا کر اس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ اس علاقے پر انگریزوں کی حکمرانی اپنی ریاست کو وسعت دینے کی خاطر نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد روس کا افغانستان کی طرف سے ہندوستان

1.[1] *Woods, John E- (1990)- The Timurid dynasty- Indiana University, Research Institute for Inner Asian Studies- p- 18-*

پر حملے کو روکنا تھا۔ ایسا انھوں نے گلگت سے لے کر بلوچستان کے ان علاقوں میں کیا، جہاں ہندوستان کی سرحد افغانستان اور ایران سے ملتی تھی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔

اس بارے مزید جاننے کے لیے Hugh Beattie کا ایک مضمون بے حد مفید ہے۔[1]

اس کے علاوہ ایک اور کتاب The British colonial experience in Waziristan and its applicability to current operations

جسے Mr-W Matthew - Department of GG-13 Williams, Defense نے تحریر کیا ہے، بھی اس کے لیے بے حد مفید ہے[2]۔

وزیرستان میں انگریزوں کی پالیسی کے اہم نکات میں قبائل کو یکجا ہونے سے روکنا، دوستوں کو نوازنا اور مخالفین کو سزا دینا، براہِ راست مذاکرات کرنا، مقامی لوگوں کی ثقافت اور روایات کا احترام کرنا، جیسی اہم باتیں شامل تھیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ امریکہ نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو انھوں نے وزیرستان میں انگریزوں نے اپنے اہداف کی تکمیل کی خاطر، جو طریقہ کار وضع کیا تھا، کو سامنے رکھ کر اپنی پالیسی بنائی۔ لیکن اس پر وہ عمل کُرے میں کافی حد تک ناکام ہوئے۔ اس کا ذکر بڑی تفصیل سے میتھیو نے کیا ہے جس کا تذکرہ میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے۔

میتھیو کی کتاب، میرے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مصنّف نے امریکہ کو افغانستان پر حملہ کرنے اور یہاں کے لوگوں پر حکمرانی کرنے یا انھیں دوست بنانے کے لیے اسی طرز کی پالیسی بنانے کا مشورہ دیا، جس طرح کا طرزِ عمل

---

[1] Hugh Beattie (2011) Negotiations with the Tribes of Waziristan 1849–1914—The British Experience, The Journal of Imperial and Commonwealth History, 39:4, 571-587, DOI: 615597-2011-1080/03086534-10

[2] The British colonial experience in Waziristan and its applicability to current operations
Williams, GG-13 Department of - Matthew W-Mr
Defense
School of Advanced Military Studies
United States Army Command and General Staff
College Fort Leavenworth, Kansas

انگریزوں نے وزیرستان میں اپنایا تھا۔ وہ کہتا ہے ،امریکہ کو چاہیے کہ وہ افغانستان میں انٹرا ایجنسی آپریشنز کے ذریعے اپنے اہداف کو پورا کرے اور ماحول کو ہر ممکن حد سب کے لیے قابلِ قبول بنائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس طرح انگریزوں نے یہ جان لیا تھا، کہ کھلے عام فوجی آپریشن وزیرستان میں کسی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے،اسی طرح امریکہ کا کھلے عام فوجی آپریشن افغانستان میں کسی کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ مگر امریکہ نے اس سے مختلف پالیسی اپنائی، جس کا حشر ہم سب نے دیکھ لیا ہے۔

بنوں: سخت جان لوگوں کا مسکن

بنوں شہر سے تعارف میرا کوئی پرانا نہیں ہے۔ لیکن اس کے متعلق بہت کچھ سننے کو ضرور ملا۔ جب 2014ء میں آئی ڈی پیز کا مسئلہ بنا تھا، اس وقت میں پہلی مرتبہ بنوں آیا تھا۔ اب کی بار ستمبر 2018ء میں الخدمت فاؤنڈیشن کے پروگرامات کے سلسلہ میں بنوں، شمالی وزیرستان اور کوہاٹ جانے کا موقع ملا۔ اس دوران، جو دیکھا، وہ حاضرِ خدمت ہے۔

جب ہم شمالی وزیرستان سے واپس آئے، تو شام ہو گئی تھی لیکن بنوں کے بازار میں ابھی تک کافی رش تھا۔ ہم سب لوگ الخدمت اسپتال میں چلے گئے، جہاں عرصہ دراز سے ایک میڈیکل سینٹر چل رہا ہے۔ اب اس جگہ ایک مکمل اسپتال کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ یہ بڑا پروجیکٹ ہے، اللہ کرے یہ جلد پایہ تکمیل کو پہنچے۔ جب یہ سفر نامہ لکھا جا رہا ہے، تو مجھے جلال شاہ بھائی سے معلوم ہوا، کہ یہ اسپتال اب مکمل ہو چکا ہے لو اور ایک کثیر تعداد میں مریض یہاں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس سے علاقہ کے لوگوں کی بہت بڑی ضرورت پوری ہو گی۔ الخدمت فاؤنڈیشن بنوں کے صدر صاحب نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہماری ملاقات کروائی اور دفتر میں ہی کھانے کا انتظام تھا۔

یاد رہے کہ بنوں کے پاس ایک دریا بھی بہتا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ مچھلی بہت پسند کرتے ہیں، کیونکہ انھیں میٹھے پانیوں کی مچھلی مل جاتی ہے۔ ہماری بھی تواضع مچھلی کے ساتھ کی گئی، جو یقینا بہت ہی لذیذ تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اور خالد وقاص صاحب نے تھوڑی سی چہل قدمی کی۔ خالد صاحب کی ایک بہت ہی پختہ عادت ہے، کہ رات کو کھانا کھانے کے بعد لازماً سیر کرتے ہیں۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ کئی جگہوں پر سڑک کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس تعمیر کی خاص بات یہ تھی کہ قدیم بنوں کی شناخت ختم کی جا رہی تھی اور نیا بنوں تعمیر ہو رہا تھا۔

اب میں کچھ باتیں آپ کو بنوں کی تاریخ کے متعلق بھی بتانا چاہوں گا۔ یقیناً یہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

ایک روایت کے مطابق، ساتویں صدی عیسوی میں ایک چینی سیاح زوآن زنگ ہندوستان سے واپسی کے سفر میں ایک شہر میں رکا، جسے اس وقت "بنّا" کہتے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ شہر بنوں ہی تھا[1]۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہاں کے لوگ بنوچی شاہ فرید کی اولاد ہیں، جنہیں کو شتنک بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ایک پختون سردار کی بیوی کا نام تھا۔ اس کی صداقت میں عام طور پر شک کیا جاتا ہے۔ جب انگریزوں نے سکھوں کی مدد کی خاطر اس علاقے پر حملہ کیا، تو 1848ء میں اس کا نام پنجاب کے حکمران مہاراجا دلیپ سنگھ کے نام پر دلیپ نگر رکھا گیا۔ بعد میں 1869ء میں، سر ہربرٹ ایڈورڈز (ضلع میں پہلے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ) کے نام پر اس کا نام ایڈورس آباد کر دیا گیا، جو 1903ء میں دوبارہ بنوں میں تبدیل ہو گیا۔ بنوں ہی اس کا قدیم نام تھا۔

یہ نام بنوچی قبیلے کے نام پر، ایک پختون سردار کے نام پر، یا اس کی بیوی کے نام پر یا پھر ایک ہندو لڑکی کے نام پر۔

سچ کیا ہے، مجھے معلوم نہیں!

اس شہر کی نئے سرے سے بنیاد 1848ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال رجمنٹ کے لیفٹیننٹ ہربرٹ بینجمن ایڈورڈز نے رکھی تھی۔ اس نے لاہور کے مہاراجا کے اعزاز میں دلیپ گڑھ (دلیپ گڑھ) نامی قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ اس بات کی تفصیل خیبر پختونخوا کی ایک ویب سائٹ[2] پر بھی دی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق انگریزوں نے رنجیت سنگھ کی موت کے بعد، سر ہربرٹ بنجمن ایڈورڈز کی سربراہی میں مہاراجا دلیپ سنگھ کی مدد کے لیے، ایک سکھ رجمنٹ کو بنوں بھیجنے کی منظوری دی، تاکہ وہ بنوں کے لوگوں سے ٹیکس لینے میں سکھ حکومت کی مدد کرے۔ اس کام کے لیے ایڈورڈز نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور بنوں پہنچ گیا۔ اس کارروائی کے نتیجے میں بہت کم ریونیو اکٹھا ہوا۔

انگریزوں نے ایسا کیوں کیا؟

میری سمجھ کے مطابق، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے، کہ انگریزوں نے سکھ دربار (مائی جنداں) سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا، جس کے نتیجے میں انگریزوں نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ مائی جنداں یہ رقم ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی مدد کے لیے انگریزوں نے ٹیکس

---

[1]https://pmru.kp.gov.pk/districts/bann
/https://pmru.kp.gov.pk/districts/bannu[2]

وصولی کے لیے ایک دور دراز علاقے بنوں میں، سکھ فوجیوں پر مشتمل ایک فوج بھیجی اور اس کا سربراہ ایک انگریز کو بنایا گیا۔ اس کاروائی سے سکھ دربار کو ٹیکس تو نہ مل سکا، لیکن انگریزوں کو اس علاقے میں آنے کا جواز مل گیا۔

کیا یہی وجہ تھی؟ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔

اصل وجہ یہ تھی کہ انگریز اس علاقے تک رسائی چاہتے تھے، جس کے لیے انھوں نے سکھوں کی مدد بھی لی اور ایک بہانہ بھی تراشا۔

ویب پر دی گئی تفصیل کے مطابق، اس کاروائی کا مقصد اس علاقے کی مکمل جاسوسی تھا اور مستقبل میں اس علاقے پر براہِ راست یا بالواسطہ حکمرانی کا پروگرام تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی بار ایڈورڈز نے لیفٹیننٹ ٹیلر کے ساتھ مل کر جھنڈو خیل میں اپنا کیمپ لگایا، جہاں بنوچی کے بزرگ آئے اور انگریزوں کی طاقت کو دیکھتے ہوئے بغیر کسی مزاحمت کے اپنی خدمات پیش کر دیں اور ٹیکس بھی ادا کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بنوں کی وادی سے لکی مروت کے علاقے تک، ایک سڑک بھی تعمیر کی۔

یہاں بھی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ انگریزوں نے سکھ فوجیوں کو مہاراجا کے نام پر ''دلیپ گڑھ قلعہ'' نامی قلعہ کی تعمیر کا کام سونپا۔ اس طرح انگریزوں نے اپنے حلیف کے نام پر ایک قلعہ تعمیر کیا۔ میرے علم کے مطابق ہندوستان بھر میں ایسا کام صرف بنوں میں ہی ہوا ہے۔

یہ اپنے حلیف کی وفاداری کا صلہ ہے یا پھر ایک طویل المعیاد پروگرام کی منصوبہ بندی کا حصہ۔

کیا صحیح ہے، معلوم نہیں!

انجام کار ایک دن انگریز اس علاقے کے حاکم بن گئے۔

شروع میں بنوں، برطانوی سلطنت کی فوجوں کی وادی ٹوچی اور وزیرستان کے سرحدی محاصرے تک کی جانے والی مہموں کے آپریشن کے اڈے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک فوجی سڑک بنوں سے ڈیرہ اسماعیل خان تک بنائی گئی۔ یہ سڑک فوجی انجینئروں نے بنوں کے ایک انجینئر رام این مولک کی نگرانی میں بنائی تھی۔ مولک نے بنارس انجینئرنگ کالج سے

گریجویشن کی تھی۔ مشنری سوسائٹی چرچ نے 1865ء میں یہاں ایک ہائی اسکول بھی قائم کیا اور 1867ء میں بلدیہ کی تشکیل کی گئی۔

یہ میں نے ہر جگہ دیکھا ہے کہ جہاں بھی انگریز گئے ہیں، سب سے پہلے، انھوں نے اس علاقے میں تین طرح کے ادارے ضرور بنائے؛ اسکول، بلدیہ یعنی میونسپل کمیٹی اور چرچ۔

آکرا: بنوں میں صدیوں پرانا مقام

بنوں کے قریب ایک مقام، جسے آکرا کہا جاتا ہے (اسے آکرہ بھی لکھا جاتا ہے)، موجود ہے۔ اس مقام پر کھدائی سے معلوم ہوا، کہ یہاں کوئی دو سو ایکڑ پر محیط ایک بڑا میدان ہے، جس سے ملنے والی اشیاء سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک بڑی آبادی تھی۔ اس کے متعلق *Farid Khan; JR Knox; P Magee; KD Thomas* نے ایک مضمون لکھا ہے[1]۔

اس مضمون کے مطابق یہ ایک سرسبز و شاداب کھیتوں، کھجور اور چنار کے درختوں کے درمیان ایک خوبصورت دیہی علاقہ ہے۔ یہاں کھدائی کا کام 1996ء میں شروع کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک قدیم تہذیب کا مسکن تھا۔

بنوں میں آثار قدیمہ کی دریافت کے لیے بنوں آرکیالوجیکل پروجیکٹ (یا بی اے پی) جس میں پاکستان ہیریٹیج سوسائٹی، یونیورسٹی کالج لندن، برٹش میوزیم، برائن ماور کالج اور یونیورسٹی آف کیمبرج کے اسکالرز شامل ہیں، شروع کیا گیا۔ اس پراجیکٹ کے تحت بنوں کے آثار قدیمہ کے علاوہ بھی کئی جگہوں پر کھدائی کا کام کیا گیا، جس سے یہ جاننے کو ملتا ہے کہ بنوں کے ارد گرد بھی کئی جگہوں پر، صدیوں قبل آبادی کے آثار ملے ہیں۔

جان نکلسن ہاؤس: انیسویں صدی کی ایک عمارت

بنوں سے وابستہ ایک اور داستان بھی اپنے اندر دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ یہ ایک گھر کی کہانی ہے جسے 1850ء میں بنوں کے ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس میں پہلی مرتبہ رہائش رکھنے والے اس وقت کے بنوں کے ڈپٹی کمشنر میجر جان نکلسن تھے۔ یہ

---

[1] Farid Khan; JR Knox; P Magee; KD Thomas (2000). "Akra: The ancient capital of Bannu". Journal of Asian Civilization.

وہی صاحب ہیں جنھوں نے 1857ء کی بغاوت کچلنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا — اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ متضاد طبیعت کا مالک شخص تھا۔ اس کے متعلق ایک تفصیلی مضمون The News on Sunday میں شائع ہوا ہے جسے ڈاکٹر راحیل احمد صدیقی نے لکھا ہے[1]۔ اس مضمون کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

نکلسن کا تعلق آئرلینڈ سے تھا، وہ 1839ء میں صرف سترہ سال کی عمر میں بنگال کی مقامی انفنٹری میں شامل ہونے کے لیے ہندوستان آیا۔ یاد رہے اسی دور میں پہلی افغان جنگ برپا ہوئی۔ وہ اس لڑائی میں شریک ہوا اور غزنی کی لڑائی کے بعد اسے قیدی بنا لیا گیا۔ غزنی میں انگریز فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ کچھ عرصہ بعد جب انگریزی فوج نے کابل پر قبضہ کر لیا تو اسے رہائی مل گئی۔ اس کے بعد اس نے درۂ خیبر میں کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ بعد میں مرادآباد میں تعینات ہوا اور وہیں اس نے اردو میں مہارت حاصل کی اور مقامی زبان کے امتحانات پاس کر لیے۔

نکلسن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا، جو انگریزوں کے ہندوستان میں راج کے لیے اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ پھر ایک وقت آیا جب نکلسن کو بنوں میں قبائل کی سرکشی روکنے کے لیے ڈپٹی کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔ وہ 1852ء سے 1855ء تک بنوں کے ڈی سی رہے۔ اسی دوران انھوں نے یہ گھر بنایا جسے نکلسن ہاؤس کہا جاتا ہے۔ یہ گھر کینٹ میں واقع ہے۔ میں اسے نہ دیکھ سکا، کیونکہ یہ کینٹ میں واقع تھا۔ اب اس گھر کی تزئین و آرائش کی گئی ہے اور یوں ایک تاریخی عمارت کو محفوظ بنانے کی کوشش جاری ہے۔ اس کی تصاویر نیٹ پر موجود ہیں۔

نکلسن کے متعلق بنوں کے لوگ کئی عجیب و غریب کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ان میں ایک کہانی یہ بھی ہے، کہ انھوں نے ایک مظلوم کی دادرسی کے لیے جس کا چچا اس کی زمین پر ناجائز قابض تھا، اپنے آپ کو ایک درخت کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ انتہائی انصاف پسند تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجرموں کو سزا دینے میں بھی کسی سے کم نہیں تھے۔

---

[1] https://www.thenews.com.pk/tns/detail/936650-the-spirit-of-bannu

اسی طرح کی ایک اور کہانی بھی مشہور ہے۔ ڈاکٹر راحیل نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے[1]۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ بنوں میں لوگ ایک محاورہ بولتے تھے جو کچھ یوں تھا؛ تم مچن فرنگی نہیں ہو (محاورہ پشتو میں ہے۔) یہ محاورہ ایسے شخص کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو بہت سخت مزاج، تند خو اور انتہائی بد دماغ ہوتا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم کتنے بھی برے ہو لیکن مچن فرنگی نہیں ہو سکتے۔ مچن کون تھا؟ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ اس علاقے میں ایک انگریز آفیسر تعینات تھا جو بے حد سخت مزاج تھا اور لوگوں کو سزا دینے میں بے حد مشہور تھا۔ اس کا نام؛ Captain Richard Meacham تھا۔ پشتو میں اسے مچن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پشتو میں مچن اس پتھر کو کہتے ہیں، جو آٹا پیسنے کے کام آتا ہے۔ رچرڈ کا تعلق آرٹلری رجمنٹ سے تھا اور وہ جیل کا انچارج تھا۔ وہ معمولی غلطیوں پر بھی سخت سزا دیتا تھا۔ سب سے بری سزا قیدیوں کو گھنٹوں گندم پیسنے پر لگانا ہوتا تھا، اس لیے اس کا نام مچن فرنگی پڑ گیا۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ بنوں جیل میں قید ایک قیدی محب خان وزیر پر جیل کے کچن میں کام کرتے ہوئے کچھ روٹی لے جانے کا الزام لگا۔ یہ جان کر کیپٹن رچرڈ نے اسے سرِ عام برا بھلا کہا اور گالی بھی دی اور ساتھ ہی چند کوڑے بھی مارے۔ اس بات کا محب خان وزیر کو بے حد غصہ تھا۔

جب محب رہا ہوا، تو اس نے ایک دن موقع پا کر کیپٹن رچرڈ کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا اور لاش کو مسخ بھی کر دیا اور قتل کرنے کے بعد وہ قریبی پہاڑوں میں فرار ہو گیا۔ یہ بات انگریزوں کو کیسے ہضم ہو سکتی تھی؟

انھوں نے قبائلی عمائدین کو ساتھ ملایا اور ان کے ذریعے محب کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ گرفتاری دے دے تو اسے قید کی سزا ملے گی، پھانسی نہیں دی جائے گی۔ عمائدین کے یقین دلانے پر محب نے ہتھیار ڈالنے پر رضامندی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ اسے ایک چارپائی پر لے جایا جائے، ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن دوسری طرف کوئی اور ہی پلان تھا۔ محب وزیر کو گرفتار کیا گیا اور ایک مختصر مقدمہ کے بعد پھانسی دے دی گئی۔

---

[1] https://www.thenews.com.pk/tns/detail/1076373-you-are-not-michan-ferangi

کیا یہ بات عمائدین کو معلوم تھی یا وہ بھی اس جرم میں شریک تھے، کیا وہ بھی انگریزوں کی خاطر اپنے ایک ہم وطن کو پھانسی کے پھندے تک پہچانے میں برابر کے شریک تھے؟

اس کا فیصلہ ہم خود ہی کر سکتے ہیں!

تاریخ نے محب وزیر کو مرنے نہیں دیا۔ وہ ایک ہیرو کی طرح یاد کیا جاتا رہا۔ اس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے، کہ اس نے قبائلی ضابطہ غیرت کے مطابق ذاتی توہین کا بدلہ لیا تھا اور موت کا سامنا بھی بہادری سے کیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھے۔ وہ ایک مجرم نہیں تھا، بلکہ ایک ہیرو تھا۔

محب وزیر کے واقعہ پر کئی گانے بھی لکھے گئے جنھیں لوگ گاتے تھے۔ علاقے کے ایک پشتو لوک گلوکار شہباز خان نے بھی اس کے متعلق گانے گائے ہیں۔

ایس ایس تھورنبرن، جو 1869ء میں بنوں میں ڈپٹی کمشنر تھے کی کتاب

Bannu or Our Afghan Border میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے جس کے مطابق رچرڈ کو نومبر 1859ء میں بنوں سے کوہاٹ جاتے ہوئے ایک جگہ پر گھات لگا کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس کے قاتلوں کو اس علاقے کے کابل خیل وزیروں نے پناہ دی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد 1860ء میں انگریزوں نے محسود قبیلے کے خلاف ایک مہم شروع کی۔ اسی مہم کے دوران رچرڈ کا قاتل محب وزیر بھی پکڑا گیا اور اسے اسی اس جگہ پر قتل کیا گیا جہاں اس نے رچرڈ کو قتل کیا تھا۔

کہانی کچھ بھی ہو۔۔۔

بے عزتی کا بدلہ لینا ایک پرانی ریت ہے۔۔۔

جسے زندہ رہنا چاہیے۔۔۔

وہ کوئی محب وزیر کرے، عجب خان آفریدی کرے، دلا بھٹی کرے، بھگت سنگھ کرے، یا رائے احمد خان کھرل کرے!

اس کہانی کا آخری حصہ بھی دلچسپ ہے۔ ایک مدت کے بعد جس جگہ پر رچرڈ کو قتل کیا تھا، اس جگہ پر اس کے چھوٹے بھائی کیپٹن کلفورڈ ہنری میچم نے ایک یادگار بنوائی اور اس پر لکھا کہ اس جگہ کے قریب 5 نومبر 1859ء کی رات کو ایک وزیر نے کیپٹن رچرڈ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کی خاطر پولیس نے بزدلانہ رویہ کا مظاہرہ کیا اور اسے بچانے میں ناکام رہے۔

یہ تختی اب بھی لگی ہوئی ہے۔ اس کی تصویر ڈاکٹر راحیل نے اپنے مضمون میں دی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ تصویر پرانی ہے یا موجودہ دور کی ہے۔

بنوں میں تقسیم ہند سے پہلے کا ایک اسکول بھی ہے جس کا پرانا نام سناتم دھرم ہائی اسکول تھا۔ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہندوئوں نے بنایا تھا۔ اب اس کا نام ماڈل ہائی اسکول نمبر ۲ ہے۔

نام بدلنے کی ریت نہ جانے کب سے ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

جس نے بنایا تھا اسی کا نام برقرار رہنا چاہیے تھا۔

بنوں، دورِ حاضر میں

اس وقت بنوں میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی، جس کا آغاز 2005ء میں ہوا، قائم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بنوں میں ایک میڈیکل کالج بھی ہے اور یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور، کا کیمپس بھی موجود ہے۔ اس علاقہ کا سب سے قدیم اور مشہور ادارہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں ہے، جس نے 1951ء میں کام کرنا شروع کیا تھا۔

بنوں آنے کے لئے ایک راستہ ڈی آئی خان کی طرف سے آتا ہے۔ دوسرا آپ میانوالی سے بھی آ سکتے ہیں، تیسرا کوہاٹ کی طرف سے آتا ہے۔ میں پہلی مرتبہ 2014ء بنوں آیا تھا۔ اس وقت یہاں پر آئی ڈی پیز آئے ہوئے تھے کیونکہ وزیرستان میں ضرب عضب چل رہا تھا اور وہاں کے تمام لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر مختلف علاقوں میں رہ رہے تھے۔ اس وقت الخدمت نے یہاں پر اپنا ایک کیمپ بھی لگایا تھا اور ضرورت مند لوگوں کی خدمت میں دن رات کوشاں رہتے تھے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ دو حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک کو سکھ دربار کہا جاتا تھا اور دوسرے کو خالصہ دل۔ سکھ دربار رنجیت سنگھ کی اولاد کے پاس تھا، وہ اپنے آپ کو حکمران سمجھتے تھے۔ دلیپ سنگھ اس کا بیٹا تھا اور مائی جنداں اس کی بیوی تھی۔ جو سکھ فوجی تھے انھیں خالصہ دل کہا جاتا تھا۔ خالصہ دل نے دربار کی مخالفت شروع کر دی اور سکھ دربار کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ دربار نے انگریزوں سے درخواست کی کہ انھیں تحفظ فراہم کریں۔ اس طرح انگریز پہلی مرتبہ لاہور میں سکھ دربار کی حفاظت کے لیے آئے۔

انگریزوں کی ساری لڑائیاں خالصہ دل کے خلاف تھیں، خالصہ دل کوئی منظّم فوج نہیں تھی، بلکہ ایک گروہ کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس طرح سے انگریزوں نے سکھوں کی آپس کی کشیدگی سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب اور موجودہ خیبر پختونخوا کے بہت سے علاقوں کے ساتھ ساتھ، کشمیر گلگت اور ہزارہ وغیرہ کے علاقوں پر بھی قبضہ کیا۔ سیّد احمد شہیدؒ نے بھی سکھوں کے خلاف ہی جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ ان کی سکھوں کے خلاف آخری جنگ بالاکوٹ میں ہوئی تھی، جس میں وہ اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے تھے۔ اس طرح سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔

اس وقت بنوں شہر میں کافی کام ہو رہے ہیں، پچھلے ادوار میں بھی جب اکرم درانی جن کا تعلق بنوں سے ہے، وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا تھے، تو انھوں نے یہاں پر کافی کام کیے، جن میں ایک انجینئرنگ یونیورسٹی بھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کوئی پینتیس کلومیٹر طویل بائی پاس بھی بنوایا تھا۔ یہاں ایک پرانا قلعہ بھی ہے، جو اَب کنٹونمنٹ کے اندر ہے، کبھی وہاں پر ایک کافی بڑا پکنک پوائنٹ ہوتا تھا۔ یہ قلعہ اب عام لوگوں کی پہنچ سے دور ہے۔ بنوں شہر میں 1960ء کے دوران ایک بنوں وولن مل بھی بنائی گئی تھی جن کے مالکان حبیب اللہ خان اور ان کا خاندان تھا، یہ وہی لوگ ہیں جن کی کوہاٹ کے اندر بھی ٹیکسٹائل ملیں چل رہی ہے۔ باوجود کوشش کے ہم ان کی دُکان سے کوئی خریداری نہ کر سکے۔

بنوں شہر کی ایک اور سوغات یہاں کے مصالحہ جات ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ 2014ء میں جب میں یہاں آیا تھا، تو میں ایک مصالحہ جات کی مارکیٹ میں گیا۔ دکان دار نے کوئی تیس سے زائد مختلف چیزوں کو ملا کر، گرائنڈ کرکے ایک مصالحہ بنا کر دیا تھا جو کہ نہایت ہی مزیدار تھا۔ ایک اور چیز جو یہاں پر پائی جاتی ہے، وہ دودھ کا حلوہ ہے۔

اجمل صاحب امیر جماعت اسلامی ضلع بنوں ہیں، نے بتایا کہ ایک خاص آدمی سے دودھ کا حلوہ بنوانے کے لئے ایک دن پہلے آرڈر دینا پڑتا ہے، وہ تو ہم نہ دے سکے۔ لیکن آتے ہوئے خالد وقاص صاحب نے جو خیبر پختونخوا الخدمت کے صدر ہیں شوگر کے مریض، یعنی مجھے حلوہ تحفے میں دے دیا۔ اب آپ ہی بتایئے میں کھاؤں یا نہ کھاؤں یا پھر کچھ لوگوں کی طرح اس میں شوگر کی گولی رکھ کر کھالوں، دیکھتے ہیں کیا سلوک اس کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

بنوں شہر اس لحاظ سے بے حد اہم ہے، کہ اس علاقہ سے انگریزوں نے قبائل کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور کوہاٹ کے بعد یہاں پر ایک بڑی چھاؤنی بنائی۔ اب یہ چھاؤنی فوج کے کنٹرول میں ہے اور ضربِ عضب کی کارروائی میں اس چھاؤنی کا بے حد اہم کردار ہے۔

یوں تو بہت سے اہم لوگوں کا تعلق بنوں سے ہے، لیکن دو نام زیادہ اہم ہیں۔ ایک جناب غلام اسحاق خاں سابق صدر پاکستان اور دوسرے آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنماء ملک دسمساز خان۔ ملک دسمساز خان ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ وہ اُس وقت مسلم لیگ میں شامل ہوئے، جب پورا شہر تو کیا، پورا صوبہ خدائی خدمت گاروں کے زیرِ اثر تھا۔ وہ 1940ء میں بنوں میں قائدِ اعظم کا استقبال کرنے والوں میں بھی شامل تھے۔ ان کی ایک بڑی حویلی تھی، ان کے پاس اس وقت بھی ایک بڑی گاڑی تھی۔ جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یا تو قائدِ اعظم سوار ہوئے تھا یا اس قافلے میں شامل تھی جس کی قیادت قائدِ اعظم کر رہے تھے۔ میں نے اس حویلی اور گاڑی کی ویڈیو دیکھی ہے۔ اُن کی حویلی واقعی ایک متاثر کرنے والی عمارت ہے۔

بنوں کے مشہور شاعر مقبول عامر کے چند خوبصورت اشعار:

ہم اہل شب کے لیے صبح کا حوالہ ہے
دیے کی آنکھ میں آنسو نہیں اجالا ہے

دیدۂ تر نے بڑی دیر میں پہچانا اسے
روپ کھو بیٹھا ہے دو چار ہی سالوں میں کوئی

دشتِ بے آب سے پوچھو کہ وہاں کے اشجار
کن مراحل سے گزرتے ہیں نمو پانے کے لیے

میں ایسے کھیت کا دہقان ہوں جہاں عامرؔ
زمین بھوک اُگاتی ہے ہر بشر کے لیے

کبھی آپ کو خیبر پختونخوا آنے کا موقع ملے تو آپ کو ضرور یہ سفر کرنا چاہیے اور بنوں کی تاریخی اہمیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے۔ آپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

رات ہم نے ایک قریبی گاؤں میں قیام کیا، جو کہ میرے لیے بذاتِ خود ایک خوبصورت تجربہ تھا۔ ایک خالص پختون ماحول میں ہماری مہمان نوازی ہوئی، جو اب تک یاد ہے۔ ایک بڑا سا گھر تھا جو صرف مہمانوں کے لیے تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ پختون علاقوں میں گھر بھلے چھوٹا ہو، مہمان خانہ ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک گاؤں تھا، جو مجھے فطری طور پر بے حد پسند ہے، کیونکہ بالآخر میں بھی ایک پینڈو ہوں۔

ہماری اگلی منزل کوہاٹ تھی۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور ایک کم طویل، لیکن نسبتاً غیر آباد علاقہ سے گزرنے والی سڑک کو سفر کیے لیے منتخب کیا۔ اس سڑک کے ساتھ خالد وقاص صاحب کی طالبعلمی کے دور کی ایک یاد وابستہ تھی جب ان کا یہاں پر موٹر سائیکل پر ایک حادثہ ہوا تھا۔ اس کی ساری تفصیل انھوں نے ہمیں سنائی، جو بڑی ہی دلچسپ تھی۔ ہم شام سے کچھ دیر پہلے کوہاٹ پہنچ گئے۔

یہ سفر میں نے خالد صاحب کی گاڑی میں کیا اور ان کے ڈرائیور کامران کے کمالات دیکھے جو میں پہلے بھی چترال کے سفر میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس سے زیادہ دلیر ڈرائیور نہیں دیکھا اور اس نے مجھ سے زیادہ بزدل مسافر نہیں دیکھا تھا۔ لیکن کمانڈ تو اس کے پاس تھی۔ وہی ہونا تھا جو کمانڈر نے کرنا تھا۔ میں تو صرف آنکھیں ہی بند کر سکتا تھا جو میں نے مسلسل بند رکھیں۔ ایک موقع پر جب ہم کوہاٹ کے قریب پہنچے تو خالد صاحب کا صبر بھی جواب دے گیا، جب ہم بال بال بچے۔ خالد صاحب نے جو کہا وہ تو پشتو میں تھا، لیکن اندازِ بیاں سے لگتا تھا کہ کہہ رہے تھے کہ میرا خیال نہیں رکھنا، مہمان کا خیال تو رکھ۔

لیکن کلام نرم و نازک اکثر بے اثر ہی ہوتا ہے۔

نوٹ:

یہاں ایک میں افسوس ناک بات کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔ اب جب میں یہ کتاب پرنٹنگ کے لیے بھجوا رہا ہوں، کامران ایک مختصر علالت کے بعد دنیا سے چلا گیا۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعونَ۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

میں نے درج ذیل صفحات، اپنے ہندوستان کے سفر نامے حصہ دوم میں لکھے ہیں، ان کا تعلق بنوں سے ہے۔ اس لیے میں ان صفحات کو یہاں دوبارہ سے لکھ رہا ہوں۔ اگر دوبارہ پڑھتے ہوئے ناگوار گزرے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔

بنوں سے دلی، دلی سے بنوں اور پھر واپس دلی: ایک لٹے پٹے ہندو خاندان کی نقل مکانی کی داستان

جب ہماری گاڑی سورت (بھارت) سے روانہ ہوئی، اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گاڑی میں موجود خدمت پر مامور صاحب نے کچھ دیر پہلے ہی، ہم سے ہمارے کھانے سے متعلق پوچھ لیا تھا۔ سب نے اپنی پسند بتائی۔ ہم دوستوں نے احتیاط کے تحت سبزی پر ہی اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔ باقی لوگ بھی سبزی خور ہی تھے، اس لیے ہمیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ میرے ایک ہندو دوست نے مجھے بتایا کہ آپ پورے بھارت میں جو بھی گوشت کھائیں گے وہ حلال ہی ہوگا، کیونکہ گوشت کا کاروبار صرف مسلمان ہی کرتے ہیں، ہندو، سکھ اور جین نہیں کرتے اور وہ حلال طریقے سے ہی جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سفر میں ہم نے احتیاط ہی کی۔ اگر کہیں کوئی ایسا ریستوران ملا جو کسی مسلمان کی ملکیت لگتا، تو صرف وہاں گوشت کھانے کو ترجیح دیتے۔

کھانا کھاتے کھاتے تقریباً رات کے نو بج گئے تھے۔ ساتھ بیٹھے باقی لوگوں سے بھی ہماری گپ شپ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی آپ کے لیے حیران کن ہو گی کہ ان میں سے اکثر پہلی مرتبہ کسی پاکستانی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب کا چہرہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے، ان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہو گی اور وہ شکل و صورت اور وضع قطع سے ایک خوشحال آدمی لگ رہے تھے۔ ان کا نام سنیل تھا۔ مجھے ان کے لہجے سے لگا کہ یہ خالصتاً مقامی لہجہ نہیں ہے۔ ان کے لہجے سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ کبھی کبھی ہندکو کا کوئی لفظ بول رہے ہیں۔

کچھ دیر میں ان کی باتیں سنتا رہا، وہ ایک بہت بڑی کاروباری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ تعارف ہو جانے کے بعد، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے آباؤاجداد کا موجودہ پاکستان کے کس علاقے سے تعلق تھا؟ کیونکہ آپ کا لہجہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ ہندکو یا سرائیکی بولتے ہیں۔ جب میں نے یہ بات کہی تو وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے اور پھر انھوں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ان کے کسی بہت ہی حساس معاملے پر بات کی ہے۔ میں خاموش رہا۔ وہ بالکل میرے ساتھ بیٹھے تھے، اس لیے باقی لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا، کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سنیل صاحب نے بتایا کہ میرے والد بنوں سے بھارت آئے تھے۔ اس سے میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی، جس کی بنیاد پر میں نے یہ سوچا تھا کہ ان کے آباؤاجداد کا تعلق ہندکو یا سرائیکی لوگوں سے لگتا ہے۔

سنیل نے جب یہ بتایا کہ اس کے آباؤاجداد کا تعلق بنوں سے تھا تو مجھے لگا کہ میں ان سے بہت کچھ جان سکوں گا۔ میں نے ان سے گزارش کی اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے آباؤ اجداد اور ان کی نقل مکانی کے متعلق بتائیں ۔ میری بات کے جواب میں انھوں نے کہا، کہ یہ کوئی بہت خوشگوار بات نہیں ہے اور میں اسے دہرانا بھی نہیں چاہتا۔ میں نے کہا جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میں بھی ایک ایسے فرد کی اولاد ہوں، جس کا تعلق موجودہ بھارتی پنجاب سے تھا اور وہ بھی لٹ لٹا کر پاکستان گیا تھا۔ اس لیے اس طرح کے موضوع پر بات کرتے ہوئے، میں بھی کبھی خوشی محسوس نہیں کرتا، لیکن اسے بیان ضرور کرتا ہوں، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے اور آنے والی نسلوں کو بھی خبر ہو کہ وہ سب کیا تھا، کس نے کیا، دکھ کیا ہوتا ہے اور اس کا فائدہ کسے پہنچا؟

جب سنیل صاحب کو یہ پتہ لگا، کہ میں بھی ایک مہاجر کی اولاد ہوں تو انھوں نے کہا پھر آپ کو تو اس بات کا اندازہ ہوگا، کہ جن لوگوں نے یہاں سے وہاں یا وہاں سے یہاں نقل مکانی کی ان کے ساتھ کیا بیتی ؟ میں نے جواب میں کہا میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس طرح کے چند جملوں کے تبادلے کے بعد انھوں نے مجھے جو کچھ بتایا، وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں آپ کو سنیل کے خاندان کی نقل مکانی کی تفصیل بتاؤں، میں چاہوں گا کہ تقسیم ہند سے قبل بنوں میں رہنے والے ہندوؤں سے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ ایسا کرنے سے میں سنیل صاحب کی باتوں کو زیادہ اچھے طریقے سے بیان کر سکوں گا۔ مجھے Septimus Smet Thorburn کی کتاب

Bannú: Or Our Afghan Frontier دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں ایک دلچسپ بات لکھی ہوئی ہے جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ وہ لکھتے ہیں (صفحہ 4) کہ انگریزوں نے پنجاب کو بتیس اضلاع میں تقسیم کیا تھا۔ اس فہرست میں، بنوں کا نمبر دسواں تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں، کہ بنوں شہر کی بنیاد ایک انگریز نے 1848ء میں رکھی تھی۔ یاد رہے یہ وہی دور ہے، جب انگریز پشاور اور ملتان میں سکھوں کا قلع قمع کر رہے تھے۔ انھوں نے اِسی سال بنوں پر قبضہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق بنوں فتح کرنے کے لیے وہ ملتان کی طرف سے آئے اس طرح سے انھوں نے موجودہ خیبر پختونخوا کے علاقے کو دونوں اطراف سے فتح کرنا شروع کیا؛ ملتان اور راولپنڈی۔

بیسویں صدی کے آغاز کی ایک رپورٹ کے مطابق اُس وقت شہر کی آبادی پندرہ ہزار تھی۔ میں نے ابھی حال ہی میں کوہاٹ کے متعلق، میں ایک سفر نامہ لکھا ہے جس میں یہ بتایا

ہے کہ موجودہ خیبر پختونخوا کے جن علاقوں میں انگریز گئے، وہاں انھوں نے ہزارہ اور دیگر علاقوں سے ہندکو بولنے والے کئی لوگوں کو اپنے ہاں بلوایا۔ ان میں ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی شامل تھے۔ انگریزوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ وہ جس بھی علاقے میں بھی گئے، وہاں انھوں نے عیسائیت کو پروان چڑھانے کے لیے چرچ بھی بنائے۔ بنوں میں پہلا چرچ 1865ء میں بنایا گیا۔

انگریز دور میں شائع ہونے والے Gazetteer of the Bannu: District: 1883ء میں لکھا ہوا ہے کہ 1856ء میں، پہلی مرتبہ انگریزوں نے بنوں شہر میں ایک ڈسپنسری قائم کی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بنوں اور وزیرستان کے مختلف علاقوں میں تیس ہزار کے قریب ہندو اور سکھ رہتے تھے، جن کی اکثریت براہمن، کھتری اور کراڑ تھی۔ تقسیم ہند کے وقت یہ تعداد ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ ان میں سے کوئی پچاس ہزار لوگوں نے ہندوستان نقل مکانی کی۔ اب تھوڑی بہت تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی ان علاقوں میں رہتی ہے۔ ان کے آباؤاجداد ہندکو بولنے والے علاقوں سے آئے تھے، اس لیے ان میں سے اکثر اب بھی پشاور، کوہاٹ اور بنوں میں ہندکو ہی بولتے ہیں۔

ہندو، بنوں شہر کی آبادی کا ساٹھ فیصد تھے۔ بعدازاں انھوں نے مختلف دیہات میں زمینیں خرید لیں۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان جو تقسیم کے بعد موجودہ خیبر پختونخوا کے وزیراعلیٰ تھے، نے ہندو بنیے پر زمین خریدنے کی پابندی لگا دی تھی۔ ایسا ہی پنجاب میں بھی ہوا۔ پنجاب میں یہ کام سر چھوٹو رام نے کیا تھا۔

تقسیم ہند کے وقت ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں بنوں سے چلے گئے۔ بہت سے لوگوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے، کہ بنوں سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو بہت عزت سے بھارت پہنچایا گیا تھا۔ بڑی تعداد میں یہ لوگ جب بھارت پہنچے، تو انھوں نے یہاں پر بنوں برادری کے نام سے اپنی ایک تنظیم بنائی۔ یہ لوگ کاروباری تھے۔ بھارت آنے کے بعد انھوں نے بہت جلد کاروبار شروع کیے اور جلد ہی خوشحال زندگی گزارنے لگے۔ اس وقت بنوں برادری کے نام سے ایک تنظیم قائم ہے جس کی تفصیلات انٹرنیٹ پر موجود ہیں، انھوں نے کئی ٹرسٹ بھی بنائے ہوئے ہیں۔

میں نے سنیل سے پوچھا کہ آپ کے آباؤاجداد نے کیسے نقل مکانی کی۔ اب وہ کچھ حوصلے میں تھے، لیکن ان کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ ایک جذباتی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ بنوں میں ان کے والد ایک بڑے خاندان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ خاندان کے سربراہ ان کے دادا تھے۔ بنوں شہر میں ان کا بہت اچھا کاروبار تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہی وہ لوگ بنوں گئے تھے۔ بنوں شہر میں اکثر کاروبار ہندوؤں کے پاس ہی تھے۔ اس سے قبل ہم راولپنڈی کے قرب وجوار میں کہیں رہتے تھے، شاید موجودہ اٹک میں۔ انھیں اس بات کا صحیح علم نہیں۔ جب تقسیم کا وقت آیا تو میرے دادا کو اس کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم ہو گی اور بنوں پاکستان کا حصہ ہوگا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ پہلے ہی دہلی چلے جائیں، تاکہ تقسیم ہند کے وقت آپ کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ہمارا خاندان دادا کی رہنمائی میں دہلی آگیا۔ جب دہلی آئے تو دیکھا کہ انھیں مختلف کیمپس میں رکھا جا رہا تھا اور کسی طرح کی بھی کوئی سہولت میسر نہ تھی، جب کہ ہم بنوں میں ایک انتہائی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔

ہم کئی ماہ دہلی کے کیمپوں میں رہے۔ پھر ایک دن میرے دادا جان نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تو بہت کچھ چھوڑ کر آئے ہیں اور یہاں تو ہمیں کچھ بھی نہیں مل رہا تو انھوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح میرے دادا جان، اپنے خاندان کے اٹھارہ افراد کو لے کر بنوں کی طرف واپس چل پڑے۔ جب وہ لوگ بنوں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر بار کو لوٹا جا چکا ہے۔ بہت سارے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے جا چکے ہیں، ان کی جائیدادوں پر مقامی لوگ قبضہ کر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انھیں بہت دکھ ہوا۔

پہلے جب میرے دادا جان بنوں سے نکلے تھے، تو ہم بہت پُرامن طریقے سے دہلی آئے تھے۔ اس وقت مشرقی پنجاب میں ہنگامے شروع نہیں ہوئے تھے، لیکن جب میرے دادا بنوں واپس پہنچے، تو پاکستان اور بھارت میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ بنوں کے لوگوں کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ بھارتی پنجاب اور اس سے ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ مقامی لوگوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف سخت اشتعال پایا جا رہا تھا۔ جب میرے دادا جان اپنے چھوڑے ہوئے گھروں میں گئے تو انھیں سخت مایوسی ہوئی۔

پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس دہلی چلے جانا چاہیے، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ عارضی طور پر ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن کچھ لوگوں نے اس مکان پر حملہ کر دیا۔ اتفاق سے میرے والد صاحب جن کی عمر دس برس کے قریب ہو گی، وہاں نہیں تھے۔ وہ محلے میں واقع ایک مسلمان کے گھر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حملے کے نتیجے میں ہمارے خاندان کے سترہ لوگ مارے گئے جن میں میرے دادا، میری دادی،

میری والدہ اور دیگر لوگ شامل تھے۔ جب یہ خبر ان گھر والوں کو ملی، جہاں میرے والد صاحب موجود تھے، تو انھوں نے میرے والد کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیا اور کئی روز تک اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ میرے والد صاحب کو پتہ چل چکا تھا کہ ان کا سارا خاندان قتل کر دیا گیا ہے۔

مسلمان خاندان کے لیے یہ مسئلہ تھا، کہ وہ کب تک میرے والد کو اپنے پاس رکھیں گے اور اگر انھیں بھارت بھیجنا ہو تو کیسے بھیجیں گے۔ بعدازاں جب امن وامان ہو گیا تو عام لوگوں نے قتل و غارت کرنے والے لوگوں کی بہت مذمت کی۔

میرا یہ پختہ اور سوچا سمجھا موقف ہے کہ یہ قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، اغوا، عام لوگوں کا کام نہیں تھا، کچھ مخصوص قسم کے اوباش، ڈاکو، امن دشمن اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والے تھے، لوگ تھے، جو یہ کام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے، کہ اس وقت کے حاکم، راجے مہاراجے، قانون نافذ کرنے والے ادارے یعنی، پولیس اور فوج اور دیگر بھی اس جرم میں شریک تھے؛ دونوں طرف، پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی، جو یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہے تھے۔ وہ چاہتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ان میں اکثریت یہی چاہتی تھی، کہ پاکستان میں کوئی ہندو اور سکھ نہ رہے اور بھارت میں کوئی مسلمان باقی نہ بچے۔ وہ اس میں کامیاب بھی ٹھہرے۔ بھارتی پنجاب جہاں بیس فیصد سے زائد مسلمان بستے تھے، آج وہ صرف دو فیصد ہیں۔ پاکستانی پنجاب جہاں تیس فیصد سے زائد ہندو اور سکھ صدیوں سے آباد تھے، آج نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم پھر سنیل کی داستانِ غم کی طرف آتے ہیں۔ متحدہ پنجاب میں مسلمان کل آبادی کا پچپن فیصد تھے، باقی ہندو اور سکھ تھے۔ عیسائی آبادی کا دو فیصد سے بھی کم تھے۔

اس نے بتایا کہ امن امان ہونے کے بعد پتہ چلا کہ راولپنڈی سے ایک ٹرین دہلی کے لیے چلتی ہے جو ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر جاتی ہے۔ جنھوں نے میرے والد کو پناہ دی تھی، وہ انھیں لے کر راولپنڈی آ گئے۔ کئی دن ٹھہرنے کے بعد انھیں ہمارے دور پار کے کسی رشتہ دار کا پتہ چلا اور انھوں نے میرے والد صاحب کو ان کے حوالے کر دیا۔ میرے والد صاحب اس خاندان کے ساتھ دہلی آ گئے۔ کافی عرصہ کیمپوں میں رہنے کے بعد نقل مکانی کر کے آنے والوں کو حکومت نے یہاں سے جانے والے لوگوں کے گھر الاٹ کرنا شروع کر دیے۔

اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ یہ قانون بنایا گیا تھا، کہ نقل مکانی کر کے جانے والے کسی کی کوئی جائیداد کوئی بھی مقامی شخص نہ خرید سکتا ہے، نہ اس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ سنیل نے کہا مجھے پتہ لگا تھا کہ پاکستان میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے والد صاحب نے اپنی تعلیم دوبارہ سے شروع کی۔ ہمارے رشتہ داروں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ ہر روز میرے والد

اپنے خاندان کو یاد کرتے ہیں اور بنوں میں اپنے بچپن کے دوستوں سے رابطے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

سنیل نے مجھ سے پوچھا کہ بھارت سے جو لوگ نقل مکانی کرکے گئے تھے، ان کی جائیداد یا تو نقل مکانی کرکے آنے والوں کو دی گئی یا حکومت نے خود اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا خاندان ٹوبہ ٹیک سنگھ میں، جس مکان میں آکر آباد ہوا تھا، اسی مکان میں میری پیدائش بھی ہوئی تھی، وہ گھر تقسیم ہند سے دس سال قبل ایک امیر ہندو نے بنایا تھا۔

سنیل مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا آپ کبھی بنوں گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے ابھی تک جانے کا موقع نہیں ملا۔ سنیل کے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ جو گھر ہم چھوڑ کر آئے تھے، وہ کس حالت میں ہے؟ کیا ان مکانوں میں یہاں سے جانے والے بس رہے ہیں یا کوئی اور؟ میں نے کہا کہ میرے علم کے مطابق بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ موجودہ خیبر پختونخوا کے علاقوں سے جسے پہلے صوبہ سرحد کہتے تھے، بھارت نقل مکانی کر گئے تھے۔ ان میں اکثر بہت امیر اور بڑی جائیدادوں کے مالک تھے، لیکن بھارت سے ہجرت کرکے آنے والے اکثر لوگ پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی خیبر پختونخوا کے علاقوں میں آباد ہوا ہو۔ اس لیے ان کی چھوڑی ہوئی ساری جائیدادیں مقامی لوگوں کے ہی استعمال میں ہیں۔

سنیل یہ سب کچھ بڑے حوصلے سے مجھے سناتے رہے، وہ بھی اپنے خاندان کو یاد کرکے آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انھیں کہا کہ میرے والد بھی اپنی جائے پیدائش کو دوبارہ نہ دیکھ سکے اور آپ کے والد بھی اپنی جائے پیدائش کو دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ میرے والد تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں، اس لیے ان کا کوئی امکان نہیں لیکن آپ کے والد حیات ہیں تو کوشش کریں کہ کبھی انھیں بنوں لے جائیں۔ یقیناً یہ ان کی بہت بڑی خواہش ہو گی اور وہ بہت خوش ہوں گے۔

ہمیں باتیں کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا۔ سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے، ہمیں بھی سونا ہی تھا لیکن سونے سے پہلے ہم دونوں نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھا، بظاہر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہمیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں بہتے آنسو ضرور نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں اپنوں کو یاد کرکے آنکھیں نم کر رہے تھے!

آنسو صاف کرنے کے بعد میں نے سنیل سے کہا کہ کتنی بڑی نقل مکانی ہوئی، لاکھوں کی تعداد میں قتل و غارت، ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سب نے کی، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سے کس کو فائدہ پہنچا؟ کبھی تو معلوم ہو گا، ہم نہیں ہوں گے لیکن ہماری اولاد تو جان سکے گی۔

آج مجھے سفر نامہ لکھتے ہوئے سنیل کا چہرہ پھر سے یاد آیا۔ میں پچھلے چند سالوں میں کئی مرتبہ بنوں گیا ہوں۔

میں تصور ہی میں وہ سارے مناظر دیکھتا ہوں جو مجھے سنیل نے بتائے تھے۔ میں نے اس خاندان کا پتہ پوچھنے کی کوشش کی، جس نے سنیل کے والد کی حفاظت کی تھی۔ سنیل نے بتایا کہ والد کو بھی معلوم نہیں کہ وہ لوگ کون تھے۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ ہمارا سفر بھی کٹ رہا تھا۔

کیا تھا، کیا ہوا، کیوں ہوا؟

یہی سوچتے سوچتے نیند کی دیوی نے آلیا۔

تقسیم ہند کے موقع پر ایک بڑی تعداد میں قتل و غارت ہوئی۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ایک بے حد مشہور پنجابی نظم امرتا پریتم نے بھی لکھی۔ اس کے کچھ شعر یوں ہیں۔

اَج آکھاں وارث شاہ نوں کِتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھی آں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہین
اٹھ دردمنداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وچ دِتی زہر رلا
تے اوہناں پانیاں دھرتی نوں دِتّا پانی لا
ایس زرخیز زمین دے لوں لوں پھٹیا زہر
گِٹھ گِٹھ چڑھیاں لالیاں، فٹ فٹ چڑھیا قہر
ویہو ولسی وا فیر ون ون وگی جا
اوہنے ہر اک بانس دی ونجلی دتی ناگ بنا

ناگاں کیلے لوک منہ، بس فر ڈنگ ہی ڈنگ
پلو پلی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ
گلیوں ٹٹے گیت فیر ترکلیوں ٹٹی تند
تر نجنوں ٹٹیاں سہیلیاں چرخڑے کو کر بند
سنے سیج دی بیڑیاں لُڈن دِتیاں روڑ
سنے ڈالیاں پینگھ اج پپلاں دِتی توڑ
جتھے وجدی سی پھوک پیار دی اوہ ونجھلی گئی گواچ
رانجھے دے سبھ ویر اج بھل گئے اُس دی جاچ
دھرتی تے لہو وسیا قبراں پئیاں چون
پریت دیاں شاہزادیاں اج وچ مزاراں رون
اج سبھے کیدو بن گئے، حُسن عشق دے چور
اج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور
اج آکھاں وراث شاہ نوں کِتوں قبّراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

کوہاٹ: بہادر لوگوں کی سرزمین

میرا کوہاٹ سے پہلا تعارف اس وقت ہوا جب میں میٹرک کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ مجھے خود تو فوج میں بھرتی ہونے کا تو اتنا شوق نہیں تھا، جتنا میرے والد صاحب کو تھا کہ میرا بیٹا ایک فوجی افسر بنے۔ فوج میں افسر بھرتی ہونے کے لیے جو ٹیسٹ پاس کرنا ہوتا تھا، اسے آئی ایس ایس بی کا امتحان کہتے تھے اور یہ کوہاٹ میں ہوتا تھا۔ یہ تھا میرا کوہاٹ سے پہلا تعارف۔ فوج میں جانے کا شوق، شوق ہی رہا۔ میں کبھی بھی فوج کا حصہ نہ بن سکا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ میں اپنے طبعی میلان کی وجہ سے کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔

دوسری دفعہ کوہاٹ سے تعارف 1986ء میں ہوا جب میں نے اپنی پہلی کار خریدی۔ میں اور میرے دو بھائی، میرے پیارے دوست ارشد رفیق صاحب کے پاس آئے تھے۔ وہ اس وقت کوہاٹ میں ایک ٹیکسٹائل مل میں جنرل مینجر تھے۔ تیسری مرتبہ کوہاٹ آنے کا اتفاق، خلیق بٹ صاحب اور ارشاد گوندل صاحب کے ساتھ ہوا۔ پچھلے سال الخدمت نسیم اسپتال کوہاٹ کی افتتاحی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس موقع پر میرے پیارے بیٹے عاصم الٰہی مانگٹ بھی ہمراہ تھے۔ اب کی بار وزیرستان سے واپسی پر، 22 نومبر 2018ء کوہاٹ آنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد بھی ایک بار اپنے دو نواسوں کے ساتھ آنا ہوا۔ ان تمام اسفار میں جو کچھ دیکھا، جو سنا، پیش خدمت ہے۔

لاہور سے کوہاٹ براستہ پشاور

لاہور سے اسلام آباد تک موٹروے ایم ٹو ہے، جو 375 کلومیٹر طویل ہے۔ جبکہ ایم ون پشاور-اسلام آباد موٹروے کی لمبائی 155 کلومیٹر ہے۔ پشاور جانے کے لیے، آپ اسلام آباد سے کافی پہلے ایم ون پر چلے جاتے ہیں۔ لاہور اور پشاور کے درمیان فاصلہ 517 کلومیٹر ہے۔ ہم لاہور سے چل کر دو جگہ رک کر تقریباً چھ گھنٹے میں پشاور ٹول پلازہ پر پہنچ گئے اور اس کے بعد ہم نے پشاور رنگ روڈ پر جنوب مغرب کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا کے صدر جناب خالد وقاص صاحب نے ہمیں کہا کہ آپ ہمارے پاس دفتر آجائیں اور پھر ہم اکٹھے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ وقت کافی کم ہے، ہم سیدھے کوہاٹ جاتے ہیں، وہیں پر آپ سے ملاقات ہو گی۔ اس طرح ہم شہر میں داخل ہونے سے بچ گئے۔

پشاور رنگ روڈ، شہر کے چاروں طرف نہیں ہے۔ اس کا مغربی حصہ ابھی تک تعمیر نہیں ہوا۔ اس رنگ روڈ کا افتتاح 2010ء میں اس وقت کے پاکستان میں تعینات امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے کیا تھا اور ان کے ساتھ آصف علی زرداری بطور صدر پاکستان اور صوبائی گورنر اویس احمد غنی بھی موجود تھے[1]۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ پاکستان میں کسی سڑک کا افتتاح کسی امریکی سفیر نے کیا ہو۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو معلوم ہوا کہ امریکہ نے اس پروجیکٹ کے لیے دو ارب روپے سے زائد رقم دی تھی۔ یقینی طور پر امریکی پیسہ لگاتے وقت یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ امریکہ کے سفیر نے بھی افتتاح کے موقع پر یہی کہا تھا کہ اس رنگ روڈ کی وجہ سے علاقے میں آمد و رفت کی بھی سہولت ہو گی اور سیکورٹی کے معاملات بھی بہتر ہوں گے۔ یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ سڑک ان کی افغانستان میں کارروائیوں میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دو ارب روپے سے زائد کی رقم، اس سڑک کے لیے دی۔

U.S. Ambassador Anne W. Patterson, President Asif Ali Zardari and Provincial Governor Owais Ahmed Ghani unveil a plaque during the ground-breaking ceremony for the reconstruction of a section of the Peshawar Ring Road.[1]

پشاور رنگ روڈ پر چھ بیرونی سڑکیں آ کر ملتی ہیں جن میں چارسدہ روڈ، باڑہ روڈ، جمرود وارسک روڈ، کوہاٹ روڈ، ایم ون اور دالازاک روڈ شامل ہیں۔ اس نُقطۂ نَظر سے یہ ایک اہم سڑک ہے۔ جب ہم رنگ روڈ پر سفر کر رہے تھے، تو میں نے محسوس کیا کہ عام طور پر بائی پاس یا رنگ روڈ پر رش کم ہوتا ہے لیکن یہاں پر ایسا نہیں تھا۔ سڑک پر بھی خاصا رش تھا اور ارد گرد بازار بھی کافی مصروف تھے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آنے والے دنوں میں ایک اور رنگ روڈ بنانا پڑے گا جو شہر سے اور دور گزرے۔ ایک دفعہ جب مجھے انڈیا جانے کا موقع ملا، میں نے وہاں پہ دیکھا کہ دلی کے ارد گرد دو رنگ روڈ بنے ہوئے تھے، ایک کو وہ انر رنگ روڈ کہتے تھے اور دوسرے کو آوٹر رنگ روڈ کہتے تھے۔ شاید ایسا ہی پشاور میں بھی کرنا پڑے۔ تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے کے بعد ہم نے کوہاٹ روڈ پر اپنا سفر شروع کیا۔

کوہاٹ پاس روڈ: جس کی تعمیر کے لیے باقاعدہ جنگیں ہوئی

اس سے پہلے کہ میں آپ کو سفر کی دیگر مصروفیات کے متعلق بتاؤں، میں یہ چاہوں گا کہ آپ کو کوہاٹ پاس روڈ جسے کوہاٹ روڈ بھی کہتے ہیں، کی تاریخ کے متعلق معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

1848ء میں، پشاور میں سکھوں نے انگریزوں سے شکست کھائی اور ان کی آخری لڑائی انگریزوں کے خلاف 1849ء میں گجرات میں ہوئی۔ انگریزوں کی پشاور کے ارد گرد علاقے پر قبضہ کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ سکھ تھے۔ سکھوں کا خاتمہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اس علاقے میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ اس دوران انھیں مقامی قبائل سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی پختون قبائل سے ان کی کئی خونریز جنگیں بھی ہوئی، جو ایک مدت تک جاری رہیں۔

انگریزوں نے پشاور کے بعد، کوہاٹ اور بنوں پر بھی قبضہ کیا اور سکھوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ کوہاٹ اور بنوں کی طرف، اپنی آمدورفت کو بڑھانے کے لیے انھوں نے 1849ء میں کوہاٹ پاس روڈ کی تعمیر شروع کی، جو اب پشاور اور کوہاٹ کو آپس میں ملاتی ہے۔ یہ ستر کلومیٹر طویل سڑک ہے۔ اس دوران مقامی قبائل نے سڑک بنانے کی شدید ترین مخالفت کی، لیکن کسی نہ کسی طرح انگریزوں نے براستہ درۂ آدم خیل اس سڑک کی تعمیر کی۔ اس کے ساتھ ساتھ، انگریزوں نے راولپنڈی سے کوہاٹ تک براستہ خوشحال گڑھ بھی ایک سڑک تعمیر کی، لیکن اُس علاقے میں انھیں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ 1853ء میں اس روڈ

کے ارد گرد رہنے والے قبائل نے آپس میں لڑائی شروع کر دی اور یہ سڑک ایک دفعہ پھر بند ہو گئی۔ بعد میں صلح صفائی کے بعد، اس سڑک کو دوبارہ شروع کیا گیا۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سڑکیں بناتے وقت انگریزوں کو سب سے زیادہ دقت موجودہ خیبر پختونخوا کے علاقے میں ہی پیش آئی۔ کوہاٹ پاس روڈ پر واقع آفریدی قبائل، اکثر اوقات اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے سڑک بند کر دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ سڑک دو دو سال کے لیے بھی بند رہی۔ کہتے ہیں کہ انگریزوں کا سڑک سے گزرنا کبھی بھی آسان نہ تھا۔ پھر جب انھوں نے کوہاٹ میں اپنی چھاؤنی تعمیر کر لی، تو ان کی طاقت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح سے کوہاٹ اور بنوں کے درمیان سڑک بناتے وقت، انگریزوں کو وزیر قبائل کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا تھا اور یہ مخالفت بعض اوقات بڑی لڑائی کی شکل بھی اختیار کر جاتی تھی۔

آج ہم اس سڑک پر جا رہے تھے تو بظاہر کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن آج سے چند سال پہلے، اس علاقے کی سکیورٹی کی صورتِ حال کافی مخدوش تھی۔ بہت سے تشدد پسند لوگوں کا اس علاقے پر کنٹرول تھا اور یہاں سے گزرنا محال تھا۔ تین سال پہلے میں بھی اس سڑک پر تھوڑی دور تک گیا تھا۔ واپسی پر جب میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ میں کوہاٹ روڈ پر گیا تھا۔ انھوں نے میری طرف بہت حیرانی سے دیکھا اور یہ کہا کہ ہم میں ہمت نہیں ہے کہ ہم اس روڈ پر بغیر مسلح ہو کر جائیں۔ اس سڑک کا نمبر این 55 ہے۔ یہ سڑک پشاور سے شروع ہو کر ڈی آئی خان تک جاتی ہے۔

اب اللہ کا شکر ہے کہ یہ سڑک بہت محفوظ ہے۔۔۔

اللہ اسے ہمیشہ محفوظ رکھے۔۔۔آمین

بہادر کلے: رحمان بابا کی جائے پیدائش

رنگ روڈ پر مختلف مقامات کی نشاندہی بہت خوبصورت طریقے سے کی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ گوگل میپ بھی ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ رنگ روڈ پر بہادر کلے کے مقام سے، ہمیں کوہاٹ کے لیے راستہ لینا تھا۔ بہادر کلے، کتنا اہم مقام ہے اس کا اندازہ مجھے کبھی بھی نہیں تھا۔ میں اس مقام سے کوئی 34 سال بعد گزر رہا تھا۔ اُس وقت یقیناً اتنا رش نہیں تھا۔ آگے جانے سے پہلے، میں آپ کو اس مقام کی ایک تاریخی اہمیت کے متعلق آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔

پشتو ادب میں رحمان بابا کا نام، عظیم صوفی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد غزنی سے پشاور آئے تھے (مجھے دو دفعہ غزنی جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے)۔ ان کی بہادر کلے کے مقام پر 1632ء پیدائش ہوئی (سن پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے)۔ یہاں پر گڑھی قمر دین بھی واقع ہے، جن میں رہنے والے لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ یہ لوگ رحمان بابا کی نسل سے ہیں۔ رنگ روڈ پر بہادر کلے سے پہلے دائیں طرف، ہزار خوانی کے علاقے میں رحمان بابا کا مزار ہے۔ رحمان بابا، مہمند قبیلہ کی ایک شاخ گوریا خیل سے تعلق رکھتے تھے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 2009ء میں رحمان بابا کے مزار پر ایک بہت بڑا حملہ ہوا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے، جب پاکستان میں سب کچھ تھا، لیکن امن نہیں تھا۔ ہم سب نے مل کر امن حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دیں اور قربانیاں دینے والے شہروں میں پشاور سب سے اوّل نمبر پر ہے۔

اس علاقے سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا، میرے بہت اچھے دوست انور خان درانی، جو مہمند ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں، دورانِ طالبعلمی مجھے ٹیکسٹائل کالج میں رحمان بابا کے شعر سنایا کرتے تھے۔ شعر تو پشتو میں تھے، لیکن ان کا ترجمہ وہ مجھے اردو میں سناتے تھے جو بے حد فہم و فراست لیے ہوئے ہوتے تھے۔

ان کے چند شعر پشتو میں اردو ترجمہ کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں[1]۔

وآسمان تہ لاس د عقل نہ رسیږی
داخو عشق دی چہ پہ عرش کرسی قدم ږدی
آسمان تک عقل کا دست نہیں پہنچتا
یہ تو عشق ہے کہ جو عرش و کُرسی پر قدم رکھتا ہے

روشنائی مې د چشمانو ستا دیدن دی
پہ داکورکښې بل څراغ و مشال نشتہ
میری چشم کی روشنائی تمہارا دیدار ہے

[1]https://www.urduweb.org/mehfil/threads-پشتو-اشعار-مع-اردو/
/96500.ترجمہpage-4

اِس گھر میں [کوئی] دیگر چراغ و مَشعَل نہیں ہے

چہ کیمیا د قناعت ی یې په لاس کښې وزی
که ګداوی د قارون په څیر توانګر شی

جب شخص کے دست میں قناعت کی اِکسیر آ جائے

تو اگر وہ گدا بھی ہو تو قارُون کی مانند ثروَت مند و مال دار ہو جاتا ہے

راحت بې زحمته نه دی چا موندلی
غم ښادی د دې دہر خور وورور

کس شخص نے زحمت و مشقّت کے بغیر راحت نہیں پائی ہے

اِس دہر کے غم و شادمانی خواہر و برادر ہیں

مجھے افسوس ہے کہ میں بارہا پشاور گیا، لیکن کبھی ان کے مزار پر جا کر فاتحہ خوانی کا موقع نہ ملا۔ انشاء اللہ آئندہ جب بھی پشاور گیا، تو ان کے مزار پر ضرور جاؤں گا، جنھوں نے بہت سے لوگوں کے ذہنوں کو خاص طور پر پختون لوگوں کو اپنی صوفیانہ شاعری سے بے حد متاثر کیا۔ بابا کا خطاب بہت کم لوگوں کو ملتا ہے، رحمان بابا جن کا اصل نام عبدالرحمان گوریاخیل تھا۔ اب ان کے مزار پر ہر وقت لنگر جاری رہتا ہے اور بے حد رونق رہتی ہے۔

اللہ رب العزت ان نیک طینت بزرگوں کی قبروں کو جنت کا باغ بنائے اور ان کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

میرے نزدیک صوفیانہ شاعری کسی بھی زبان میں ہوں، ان سب میں مشترکہ بات محبت، رواداری، حسن سلوک، دوسروں کے لئے قربانی ہے۔

بڈھ بیر ہوائی اڈہ : امریکہ کی فوجی امداد میں پاکستان کا پہلا قدم

بہادر کلے سے جیسے ہی ہم کوہاٹ کی طرف بڑھے تو میں نے دیکھا کہ یہاں بہت ہی زیادہ رش ہے۔ اکثر دکانیں گاہکوں سے بھری ہوئی تھی۔ سڑک پر بھی بہت زیادہ آمدورفت تھی۔ کسی بھی شہر کے مصروف علاقوں میں گاڑی چلانا کافی مشکل کام ہے، لیکن میں نے محسوس

کیا، کہ یہاں پر یہ کام مشکل سے بھی آگے ہے۔ اکثر لوگ ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہیں، لیکن چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹریفک کے قوانین کا خیال نہیں رکھتے۔ اس سے نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ایسے علاقوں میں اگر آپ سے کسی کا نقصان ہو جائے، تو بہت ہی مشکل پیش آتی ہے۔ اس لیے وہ سفر جو عام طور پر مقامی لوگ پشاور سے کوہاٹ تک ڈیڑھ گھنٹے میں کرتے ہیں ہم نے احتیاط سے یہ سفر دو گھنٹے میں کیا۔ ہمارے ساتھ بچے بھی تھے، اس لئے بھی ہم زیادہ محتاط تھے۔ اجنبی شہر اپنا ایک خوف لئے ہوتا ہے۔

بہادر کلے سے تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر بڈھ بیر کا علاقہ ہے۔ میں نے شعیب ہاشمی بھائی سے کہا، کہ بڈھ بیر ایک بہت ہی اہم جگہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے علم نہیں کہ اس جگہ کی کیا اہمیت ہے؟ جب میں نے انھیں بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا تھا۔ جسے ہم نے 1958ء میں امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ آزادی کے صرف گیارہ سال بعد، تاکہ وہ روس کے خلاف اسے اپنی جنگ میں استعمال کر سکے اور تب سے یہ سلسلہ اب تک چلتا آرہا ہے۔ حال ہی میں ہم نے بلوچستان کے ہوائی اڈے امریکی فوج کے حوالے کیے، تاکہ وہ آسانی سے افغانستان پر حملے کر سکے۔

ذرا سی ترمیم کے ساتھ۔۔۔

یہ غلامی نصف صدی کا قصہ ہے

دو چار برس کی بات نہیں

جب ہم یہاں سے گزر رہے تھے، تو میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ یہاں پر امریکی آرہے ہیں اور ہمارے نوجوان ان کی حفاظت پر معمور ہیں اور ہماری سیاسی و فوجی قیادت انھیں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب ہم نے اپنا رخ ایک ہمسائے (روس) سے ہٹا کر ہزاروں میل دور بیٹھی ایک طاقت کے ساتھ جوڑا تھا، جو اب تک جڑا ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے 1958ء میں اُسی طاقت نے، جس کی غلامی میں ہم آج بھی جکڑے ہوئے ہیں، فوجی اڈے کی تعمیر میں مالی معاونت کی اور ساٹھ سال بعد بھی رنگ روڈ کی تعمیر میں اسی کا ڈالر کام آیا!

یہ دونوں منصوبے اسی کی ضرورت تھے!

وہی امریکہ، وہی پاکستان۔۔۔

ایک دے رہا ہے اور دوسرا لے رہا ہے۔۔۔

دینے والے کے اپنے مفادات ہیں اور لینے والے کی اپنی مجبوریاں یا اہلِ اقتدار کا لالچ۔۔۔

مفادات کی اس جنگ میں عوام کو تعلیم اور صحت کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں!

ابھی پاکستان کو آزاد ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے، کہ امریکہ نے اپنی روس مخالف پالیسی کی ضرورت کے تحت، پاکستان سے فوجی مدد مانگی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ایسی ہی فوجی مدد آج بھی مانگی جا رہی ہے۔ یاد رہے، کہ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں روس مخالف پالیسی کے تحت بہت سے اقدامات کئے تھے۔ انھوں نے افغانستان کے خلاف کئی جنگیں بھی لڑی تھیں جنھیں اینگلو افغان وارز کہا جاتا ہے۔ ان سب کا مقصد روس کے اثر و نفوذ کو کم کرنا تھا۔ قیامِ پاکستان کے فوری بعد امریکہ نے پاکستان میں اپنے فوجی اڈے بنانے کے لیے، حکومت پاکستان سے رابطہ کیا۔ ان کی خواہش تھی، کہ کسی ایسی جگہ اڈے بنائے جائیں، جہاں سے وہ روس کی طرف سے کی جانے والی مختلف کارروائیوں پر نظر رکھ سکیں۔ اس کام کے لیے بہت سارے مقامات کا سروے کیا گیا۔ آخر کار پشاور کے جنوب مشرق میں واقع، بڈھ بیر کو ایک انتہائی محفوظ علاقے کے طور پر چنا گیا۔ یہ علاقہ پشاور سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس پروجیکٹ کا نام سینڈ بیگ رکھا گیا[1]،[2]۔

---

[1]Badaber: Now and in the Past

by Ejaz Haider

https://www.newsweekpakistan.com/badaber-now-and-in-the-past/

[2]Elisabeth Leake

An “Eye for an Eye”: Mohammad Ayub Khan and the Collapse of Regional Relations

Published online by Cambridge University Press: 20 January 2017

اس سارے کام کی اجازت، پاکستان کے پہلے فوجی حکمران ایوب خان نے دی تھی۔ اس سے پہلے سیاسی حکومتیں امریکہ کی درخواست منظور کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ ایوب خان نے آتے ہی 1958ء میں، یہ علاقہ دس سال کے لیے امریکہ کو دے دیا اور امریکہ نے یہاں پر اپنا اڈہ بنایا اور اور اسے یو ایس اے لٹل (USA Little) کا نام دیا۔

ہم بھی کیا لوگ ہیں ؟ اپنے ہی ملک کا ایک حصہ دوسرے ملک کو دیا اور انھوں نے ایک ملک کے اندر اپنا ایک الگ ملک بنایا، اس کا نام بھی اپنے ملک پر رکھا۔ وہاں پر کسی بھی پاکستانی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک وقت میں یہاں پر 1300 سو امریکن کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہاں سے ایک امریکی جاسوس طیارے نے روس کی طرف پرواز کی، جسے روس نے مار گرایا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم براہِ راست روس کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے۔ اب یہ جگہ پاکستان ایئر فورس کے پاس ہے۔ بڈھ بیر کی ایک مختصر داستان پیشِ خدمت ہے۔ یہ اس لیے کہ ہماری موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے، کہ ہمارے بڑے کیا کرتے رہے ہیں۔

قصہ کچھ یوں ہے ۔ یہ یکم مئی 1960ء کا واقعہ ہے، کہ روس کے میزائلوں نے روسی علاقے میں نہایت ہی اونچی پرواز کرنے والے، ایک امریکی جاسوس طیارے کو مار گرایا۔ یہ خبر سب کے لیے بڑی حیران کر دینے والی تھی۔ اس میں ایک اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ طیارے کا پائلٹ فرانسس گیری پاورز کو بھی پکڑ لیا گیا ہے۔ طیارے کا نام U-2 جاسوس طیارہ تھا۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ یہ واقعہ اس اجلاس سے صرف دو ہفتے قبل پیش آیا تھا، جس میں روس اور امریکہ کے درمیان جاری سرد جنگ کو ختم کرنے کی حکمتِ عملی طے ہونا تھی۔ روس اس تلاش میں تھا، کہ یہ جاسوس طیارہ کہاں سے اڑا تھا؟

یہ جلد ہی معلوم ہو گیا، کہ اس کام کے لیے پاکستان کی سرزمین کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا منطقی انجام یہ ہوا کہ اس کے بعد روس نے پاکستان کو امریکہ کا ساتھی تصور کرنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ایک دشمن کا جیسا برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔ افغانستان میں روس نواز حکومت بھی اس میں شامل ہو گئی۔ پاکستان نے امریکہ کی مدد اس لیے کی تھی، کیونکہ وہ امریکی ڈالر کا خواہشمند تھا۔ یہ ڈالر لینے کا انجام تھا، جو اب بھی جاری ہے۔ اس واقعہ کے بعد پاکستان، روس اور امریکہ کے درمیان جاری سرد جنگ کا حصہ بن گیا، جو آج تک ہے۔ اب امریکی طیاروں اور فوجیوں کی موجودگی کی وجہ سے پشاور روس کا واضح ہدف بن گیا۔

اس واقعہ کے بعد پاکستانی حکام نے (حسبِ معمول) اس بات کی تردید کی۔ اس وقت کے صدر جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے بھی زور دے کر کہا کہ "ہمارے علم کے مطابق

کسی بھی امریکی فوجی طیارے نے پاکستان کے کسی بھی ہوائی اڈے سے اڑان نہیں بھری۔" اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر روس نے پاکستانی ایئر بیس پر کوئی حملہ کیا، تو اس کے دوست اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے، یعنی امریکہ۔

اس موقع پر اگر روس حملہ کرتا تو تیسری عالمی جنگ کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ایک طرف پاکستان انکار کر رہا تھا تو دوسری طرف امریکہ صدر آئزن ہاور کی انتظامیہ نے اس واقعہ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

اب ہمارے پلے کیا رہ گیا تھا؟ کچھ بھی نہیں!

اس کے بعد روس نے یہ کہا کہ اب کی بار ہم نے خاموشی اختیار کی ہے، اگر آئندہ ایسا واقعہ ہوا" ہم فوراً جوابی کارروائی کریں گے۔"

اس واقعہ کے بعد ایوب خان اپنے امریکی اپنے دوستوں متعلق محتاط ہو گئے۔ پاکستان نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ امریکہ کی دوستی اسے کسی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔

پاکستان نے صدر ایوب نے پاکستان کی سرزمین امریکہ کے حوالے کیوں کی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا میں نے جواب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جو جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

جنگ عظیم دوم کے بعد، جنگ کے اتحادی (روس اور امریکہ) ایک دفعہ پھر اپنی دشمنی کو یاد کرنے لگے۔ امریکہ نے روسی نشریات کی نگرانی کے لیے ایک موزوں جگہ کی تلاش شروع کی۔ جگہ کا افغانستان کے قریب ہونا ضروری تھا، تاکہ روسی نشریات کو آسانی سے سنا جاسکے۔ اس کے لیے پشاور کے قریب بڈھ بیر کا انتخاب کیا گیا۔ کیا اس جگہ پہلے سے کوئی عمارت تھی؟ اس بارے مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

جگہ کے انتخاب کے بعد اجازت کا مسئلہ تھا۔ اس وقت کے سربراہانِ مملکت نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس دوران، ایوب خان ملک کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے، انھوں نے آتے ہی امریکہ کو دس سال کی لیز پر یہ جگہ دے دی۔ اسے یہاں ہر طرح کے کام کی اجازت بھی، جس میں یہاں سے جہازوں کا پرواز بھرنا بھی شامل تھا۔ جاسوسی کے آلات کا استعمال تو یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بڈھ بیر کے ایئر بیس سے U-2 جاسوس طیاروں کو پرواز کرنے کی بھی سہولت تھی۔ یہ کام ایک عرصہ تک ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک دن، روس نے ایک طیارہ مار گرایا، جس کے بعد دنیا کو اس کی خبر ہوئی اور یہاں سے پروازوں کا سلسلہ رک گیا۔

اس واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر انور اقبال نے تفصیل سے لکھا ہے، جس سے بہت کچھ جاننے کو ملا[1]۔ اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ اس سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ پاکستان کے حکمرانوں نے کس طرح، ایک دور بیٹھے ملک کی غلامی کی خاطر، ہمسائے میں موجود ایک بڑی طاقت سے دشمنی مول لی، جو اب تک جاری ہے۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ اپنے عروج پر تھی، تو اس جنگ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فرانس میں ایک اہم سربراہ کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں فرانس کے علاوہ امریکہ،، برطانیہ اور سوویت یونین کے سربراہ بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے پر، جرمنی میں جاری صورت حال، ہتھیاروں کے کنٹرول یا ٹیسٹ پر پابندی کے ساتھ ساتھ امریکہ اور روس کے درمیان تناؤ میں کمی کرنے پر بات چیت بھی شامل تھی۔

جب کانفرنس کا سیشن شروع ہوا، تو اچانک روس کے سربراہ خروشیف شدید غصے کے عالم میں کانفرنس ہال میں داخل ہوئے اور امریکی صدر آئزن ہاور سے مخاطب ہو کر کہا، کہ تم ایک طرف ہمارے ملک میں جاسوسی کرتے ہو اور دوسری طرف مذاکرات۔ صدر آئیزن ہاور نے اس الزام کی تردید کی۔ یہ سن کر خروشیف نے کہا کہ تمہارے جاسوس طیارے کا پائلٹ ہمارے پاس ہے اور وہ اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس لیے میں اس کانفرنس کو ختم کرتا ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف جاسوسی کی جارہی ہو اور دوسری طرف مذاکرات۔ اس کے بعد خروشیف کو جب یہ پتہ چلا کہ یہ جہاز پشاور سے اڑا تھا، تو اس نے پشاور کے گرد سرخ نشان لگا دیا گیا ہے۔۔۔

جس کی سزا پشاور آج تک بھگت رہا ہے۔

اور یوں ہم روس کے نشانے پر آ گئے۔۔۔

یہ تھا امریکہ کی دوستی کا بھیانک انجام۔۔۔

امریکہ دوست تو نہ بن سکا، البتہ روس دشمن ضرور بن گیا!

بڈھ بیر کی تعمیر 1958 میں اس وقت کے صدر ایوب خان کی اجازت سے شروع ہوئی۔ یہاں سوویت یونین کے عسکری عزائم جاننے کے لیے کئی بار خفیہ جاسوسی پروازیں بھی

---

[1] https://www.humsub.com.pk/530040/anwar-iqbal-59/

سوویت یونین کی جانب روانہ کی گئیں۔ ان جہازوں میں جدید خفیہ کیمرے نصب تھے۔ ایسا ہی ایک جہاز یوٹو، جسے امریکی ہوا باز گیری پاورز اڑا رہا تھا، جاسوسی مشن پر روانہ ہوا۔ اسے سوویت یونین کی حدود سے گزر کر، ناروے کے ایک فضائی اڈے پر اترنا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ کام سرانجام دے چکا تھا۔ لیکن اس بار حالات اس کے حق میں نہیں تھے۔

گیری پاورز، جیسے ہی یکم مئی 1960ء کی صبح ساڑھے آٹھ بجے سوویت یونین کی حدود میں داخل ہوا، اسے روسی راکٹ نے اسے مار گرایا۔ راکٹ لگتے ہی طیارے میں آگ لگ گئی اور گیری پاورز نے پیراشوٹ کے ذریعے طیارے سے چھلانگ لگا دی اور شہر کے نواح میں حفاظت سے اتر گیا۔ اسے جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ یہ خبر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یوں جاسوسی کا راز نہ صرف سوویت یونین بلکہ ساری دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ جب روس اور اس کے حلیف ممالک کو پتہ چلا تو پاکستان سخت مشکل میں پھنس گیا۔

شروع، شروع میں تو صدر ایوب نے انکار کیا۔۔۔ لیکن کب تک۔

ایک طرف صدرِ پاکستان انکار کر رہا تھا، تو دوسری طرف امریکی حکام اقرار کر رہے تھے۔ اس کے بعد بھی بڈھ بیر کا ہوائی اڈہ، 1969ء تک امریکہ کے قبضے میں رہا۔

اس ہمدردی کی پاکستان کو ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے بعد سوویت یونین نے بھارت کے ساتھ دوستی میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور 1970ء میں اس سے دفاعی معاہدہ بھی کیا۔ جب 1971ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی تو سوویت یونین نے کھل کر بھارت کی امداد کی۔

جن کے لیے ہم مرے تھے، وہ وضو ہی کرتے رہے!

ہم سب ساتویں بحری بیڑے کے انتظار میں مشرقی پاکستان گنوا بیٹھے!

اس واقعے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ خروشیف نے پاکستان کو براہِ راست دھمکی ہے، ایوب خان نے اس حادثے پر شرمندگی محسوس کرنے یا ملک کی حفاظت کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھانے کی بجائے امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو اس بات پر فخر ہے، کہ براعظم ایشیا میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے، جس کی سرزمین پر امریکی فوجیں آزادی سے رہ کر اپنے دفاع کے لیے کام کر سکتی ہیں۔

پھر ہم نے وہ دن بھی دیکھا جب 2 مئی 2011 کو ایبٹ آباد سے، جہاں ہر وقت ہزاروں فوجی موجود ہوتے ہیں، جی ایچ کیو سے بھی کوئی ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر، پہاڑوں کے درمیان واقع، سرحد سے کئی سو کلومیٹر دور، ایک، دو نہیں، چار امریکی ہیلی کاپٹر اور ان میں سوار امریکن میرینز اسامہ بن لادن کو قتل کرکے اس کی لاش اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

یہ بھی المیہ ہے کہ کسی نے اس کی ذمہ داری لیتے ہوئے مستعفی ہونے جیسا کوئی کام نہیں کیا۔

یہ وہ سفر ہے جو ہم نے بڈھ بیر سے شروع کیا اور بلوچستان میں کئی فوجی اڈے حوالے کرنے تک پہنچا۔ اللہ کرے کہ اب بھی رک جائے۔۔۔

مجھے تو ڈر ہے، کہ کہیں کل کلاں کو ہمیں چین کے خلاف بھی امریکہ کو اڈے نہ دینے پڑ جائیں۔

ایک بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا جہازوں کا یہاں سے روس کی جاسوسی کے لیے پرواز کرنا صدر ایوب کی مرضی سے تھا یا پھر پاکستان کے اداروں کو اس کی خبر نہ ہوئی؟ کیا صحیح ہے یا کیا غلط۔

معلوم نہیں، دونوں صورتوں میں اس وقت کے حکمران ایوب خان ذمہ دار ہیں۔

دس سال بعد، 1969ء میں صدر ایوب نے ہی یہ معاہدہ ختم کیا[1]۔ انور اقبال کا کہنا ہے کہ اسے یحییٰ خان نے ختم کیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایوب خان نے یہ انکار ذوالفقار علی بھٹو کے مشورے پر کیا تھا۔ اس کے بعد امریکی صدر جانسن اور دیگر لوگوں نے اس معاہدے کو بحال کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ایوب خان مسلسل انکار کرتے رہے۔ بعد میں، کبھی بھی یہ جگہ امریکہ کے استعمال میں نہیں رہی۔

اس کی وجہ کیا تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کو ایسا مشورہ دیا؟

میرا خیال ہے اس کی بنیاد ایک واقعہ ہے۔۔

Ali Ashraf Khan, Pakistan Observer (Karachi[1]
Short History of U.S. Cold War Listening Post at Peshawar, Pakistan
History of PAF Badaber
October 5, 2015

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو، جو اس وقت ایوب کی حکومت میں قائم مقام وزیر خارجہ تھے، نے پشاور کے دورے کا منصوبہ بنایا اور اس دورے کے دوران بڈھ بیر بیس جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کمشنر پشاور نے امریکہ بیس کمانڈر سے رابطہ کیا۔ جو جواب ملا، وہ نہایت ہی افسوس ناک تھا اور توہین آمیز بھی[1]۔

بیس کمانڈر نے اپنی ہائی کمان سے بات کرنے کے بعد کمشنر کو بتایا، کہ ہم مسٹر بھٹو کا کیفے ٹیریا میں استقبال کریں گے اور وہاں ان کی مہمان نوازی کریں گے، لیکن وہ بیس کے اندر نہیں جا سکیں گے اور نہ ہی یہاں پر نصب آلات و تنصیبات دیکھ سکیں گے۔ یہ بات بھٹو صاحب کو بے حد بری لگی، اس پر بھٹو صاحب نے احتجاجاً اپنا پروگرام منسوخ کر دیا۔

میرے خیال میں امریکیوں کا یہ رویہ پاکستان کے حکمرانوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ یہ سمجھنے لگے، کہ امریکہ کی یہاں موجودگی ان کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس سے ان کے ہمسایہ ملک افغانستان اور روس کے ساتھ تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایوب خان نے دس سالہ معاہدے میں توسیع سے انکار کر دیا۔

اور یہ انکار ہی رہا!

کیا اس انکار کی سزا، ایوب خان کو اقتدار سے علیحدگی کی صورت میں دی گئی؟

میرا خیال ہے کہ یہ بات درست ہے۔ آپ مجھ سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

پھر ایک دن وہ وقت بھی آیا جب 2001ء میں، جناب پرویز مشرف نے بلوچستان میں ایک سے زائد ہوائی اڈے امریکہ کے حوالے کر دیے، جہاں ہر پاکستانی کا داخلہ بند تھا، ان ہوائی اڈوں سے بیس سال تک جہاز پرواز کرتے رہے اور افغانستان کے معصوم شہریوں پر آگ برساتے رہے۔

Ali Ashraf Khan, Pakistan Observer (Karachi[1]
Short History of U.S. Cold War Listening Post at Peshawar, Pakistan
History of PAF Badaber
October 5, 2015

دونوں بار یہ خدمت ہمارے فوجی آمروں نے مہیا کی تھی؛ کسی جمہوری حکمران نے نہیں۔

اسے کیا کہیے، جو حفاظت پر مامور تھے، وہی یہ کام کرتے رہے!

جب ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے، اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لٹل یوایس اے سے گزر رہے ہیں۔شاید دنیا میں کہیں بھی ایسا نہ ہو ایک ملک دوسرے ملک میں جاکر اپنا ایک ملک بنالے۔

میرے خیال میں، چین بھی آہستہ آہستہ پاکستان میں اسی طرح کے علاقے قائم کرے گا، جہاں پاکستانیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور چین کا ہی قانون کام کرے گا۔اگر ایسا ہوا، تو یہ مناسب بات نہیں ہوگی، لیکن یہ تو سچ ہے کہ جو کام ہم نے 1958ء میں کیا وہی کام ہم 2023ء میں کر رہے ہیں۔

کام نیا نہیں ہے، وہی پرانا کام ہے جو ہم دوبارہ کر رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ کیوں ہوتا رہا ہے؟اور کیوں ہونے جارہا ہے؟

سوال کا جواب میرے پاس تو نہیں ہے، آپ کے پاس ہے تو ضرور دیجئے!

بڈھ بیر کا ہوائی اڈہ اور افغان جہاد

جب میں بڈھ بیر کے پاس سے گزر رہا تھا، تو مجھے یاد آیا کہ یہ جگہ افغان جہاد کے موقع پر ایک اہم جگہ کے طور پر جانی جاتی تھی۔اس وقت یہاں ایک بڑا واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔ اس کا ایک مختصر ذکر بھی آپ کو دلچسپ لگے گا۔ اس بارے مجھے ایک مضمون ملا جو مولانا خان زیب نے لکھا ہے، اس میں کافی دلچسپ اور تاریخی معلومات دی گئی ہیں[1]۔اس مضمون سے جو میں جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

اس مضمون میں لکھا ہے، کہ جناب ولی خان کی ایک تحریر کے مطابق کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد ہی امریکہ میں پاکستان کے سفیر، ابو الحسن اصفہانی نے امریکی صدر کو مالی مدد کے لیے ایک خط لکھا، جو اَب ایک راز نہیں رہا۔اس میں یہ کہا گیا تھا، کہ اگر امریکہ ہماری مدد کرتا ہے تو اسے بوقتِ ضرورت, پاکستان اپنی سرزمین بھی استعمال کرنے کی اجازت دے گا، بلکہ منظّم

[1] https://dailyshahbaz.com/public/article/US-Pakistan-relations-and-Badaber-base

پولیس اور تربیت یافتہ مسلح فوج بھی اس کی مدد کے لیے موجود ہو گی، یہ تھی امریکہ کی ضرورت ۔اسے ہر حال میں پاکستان کی مدد کی ضرورت تھی تاکہ وہ روس کی طرف سے کسی بھی پیش قدمی کو روک سکے، پھر ایسا ہی ہوا۔ 24 جون 2023ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ہمارے وزیرِ دفاع خواجہ آصف نے کہا کہ ہم نے بلاوجہ دو جنگوں میں حصہ لیا؛ پہلی امریکہ کی روس کے خلاف دوسری امریکہ کی طالبان کے خلاف۔ ایسا ہی ایک دفعہ سابق آرمی چیف قمر جاوید باجوہ بھی کہہ چکے ہیں۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔۔۔

امریکہ کی شکست کی خوشی منانا ایک طرف، لیکن اس کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھی سوچنے کی ضرورت تھی۔ یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ارد گرد تین بڑی طاقتوں؛ چین، روس اور بھارت کی موجودگی اور امریکہ کی بلواسطہ مداخلت، کتنی بڑی پریشانی کو جنم دے سکتی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ ان عالمی طاقتوں کا میدانِ جنگ ہم ہی ہوں گے ۔ ایسا پچھلے کئی برس سے ہو رہا ہے۔ جنگ روس اور امریکہ کی بم دھماکے پاکستان کے شہروں میں ؛ جنگ سعودی عرب اور ایران کی، حملے پاکستان کی مساجد اور بارگاہوں پر، جنگ امریکہ اور طالبان کی، بچے ہمارے اسکولوں میں شہید کیے گئے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ان جنگوں میں پاکستان کے مالی نقصان کا کوئی اندازہ ہی نہیں ۔

اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو بے حد دھیان سے اپنی پالیسی بنانی چاہیے۔ کہیں ہم پھر نہ کہہ رہے ہوں کہ امریکہ اور چین کی جنگ میں، ہمیں کسی ایک طرف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ہمارا ماضی تو یہی بتاتا ہے کہ کسی بھی عالمی طاقت کی براہ راست موجودگی کی مخالفت کرنا، سیاسی قوتِ فیصلہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اسے فوجی انداز میں حل نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں جو سلسلہ گریٹ گیمز شروع ہوا اور سرد جنگ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، ان سب کی بنیاد عالمی سامراج نے اپنے مفادات پر رکھی تھی۔ اس کے لیے ہر دفعہ ایک مختلف حربہ استعمال کیا گیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں، جب سلطنتِ برطانیہ اور افغانستان کے درمیان معاہدے ہو رہے تھے، تو اس وقت کمیونزم اور سوویت یونین کا نام بھی نہیں تھا۔ پھر کمیونزم کے

خلاف جہاد کی بات کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ روس کا گرم پانیوں تک پہنچنے کے منصوبے کو سامنے لایا گیا۔ طالبان کے خلاف جنگ کو دہشت گردی کے نام پر لڑا گیا۔ ہم نے اس جنگ میں براہِ راست حصہ لیا اور طالبان کے خلاف لاجیسٹک سپورٹ کے نام پر شہباز ائیر بیس، شمشی ائیر بیس اور پاکستان کے دیگر ہوائی اڈوں سے، نیٹو جنگی جہازوں کو ہزارہا حملے کرنے کا موقع فراہم کیا، اپنی بندرگاہ اور سڑک کے استعمال کی اجازت دی۔

میں یہ سب جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نظریات سے زیادہ عالمی طاقتوں کے نزدیک، معاشی مفادات زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی وحدت اور ایک امت کا تصور کہیں کتابوں میں تو ہے، عملی طور پر اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔

بڈھ بیر کے موضوع پر، سید فخر کاکاخیل نے ایک طویل مضمون لکھا ہے[1]۔ ان کے مطابق روسی قیدیوں، جو بڈھ بیر میں قید تھے، نے 26 اپریل 1985ء کی شام کو جب جیل پر مامور لوگ نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے، موقع پا کر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ بڈھ بیر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگا۔ اس کے نتیجے میں روسی فوجیوں نے جیل پر ایک طرح سے قبضہ کر لیا۔ یہاں پر متعین مجاہدین کی سربراہی برہان الدین ربانی کر رہے تھے۔ فائرنگ کا سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ بعد میں مذاکرات کا راستہ کھولا گیا۔ روسی اور افغان قیدیوں کا مطالبہ تھا کہ روسی اور افغان سفارت خانے سے حکام کو بلا کر انھیں ان کے حوالہ کیا جائے۔

اس وقت جب یہ بات دنیا بھر میں پھیل گئی، تو پاکستان اور امریکہ دونوں عجیب مصیبت میں پھنس چکے تھے۔ پاکستان کا اپنی ایک جیل میں روسی اور افغان فوجی قیدیوں کو رکھا جانا، روس کے خلاف پاکستان کی براہ راست جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ صرف مسئلہ یہ ہی نہیں تھا۔ بڈھ بیر کے مقام پر مجاہدین کا تربیتی کیمپ بھی تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں پر تربیت کے لیے سی آئی اے کا سٹاف بھی موجود تھا، جو مجاہدین کو ٹریننگ دینے کے ساتھ ساتھ، روسی اور افغان گرفتار فوجیوں سے تفتیش بھی کر رہا تھا۔

آخر کار ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اسلحے کی ڈپو کو آگ لگ گئی، زور دار دھماکے ہوئے جس سے ایک خوف کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پورا شہر لرز اٹھا۔ اس کی خبر کسی نہ کسی طرح ایک انگریزی روزنامہ میں چھپ گئی۔ اسلحہ ڈپو میں دھماکے کی وجہ سے جیل میں

[1]https://mashriqtv.pk/latest/143690/

موجود بہت سے لوگ مارے گئے۔ اس دھماکے میں کتنے روسی، کتنے امریکی، کتنے افغان اور کتنے پاکستانی مارے گئے، اس کا آج تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

ان سب باتوں کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ انیسویں صدی میں بھی برطانیہ اور روس کی جنگ کا میدانِ جنگ ہم ہی تھے، امریکہ اور روس کی جنگ بھی یہیں لڑی گئی، ایران اور سعودی عرب کے اختلافات بھی طے ہوئے، امریکہ اور طالبان کی جنگ کے اثرات بھی ہم ہی نے بھگتے۔۔۔

اور موجودہ چین اور امریکہ کی جنگ میں ہم ہی مارے جا رہے ہیں۔۔۔

ایک کہتا ہے گوادر پورٹ کو ترقی دو۔۔۔

تو دوسرا کہتا ہے کہ کر کے تو دکھاؤ۔۔۔

اس کا واحد حل یہی ہے کہ خود انحصاری کی طرف سفر شروع کریں۔۔۔

یہی ایک عزت کا راستہ ہے، ورنہ وہ جو کہتے ہیں۔

غَرِیب کی جورُو سَب کی بھابی،

زَبَردَسْت کی جورُو سَب کی دادی

یا پھر انگریزی کہ میں کہتے ہیں۔۔۔Beggars can't be choosers

جب تک اپنے وسائل میں زندہ رہنا نہیں سیکھتے۔۔۔ ہمارے ساتھ یوں ہی ہوتا رہے گا۔ بقول احمد فرازؔ

مانگے تانگے کی قبائیں دیر تک رہتی نہیں

یار لوگوں کے لقب القاب مت دیکھا کرو

ان کی مکمل غزل کچھ یوں ہے:

عاشقی میں میرؔ جیسے خواب مت دیکھا کرو

باؤلے ہو جاؤ گے مہتاب مت دیکھا کرو

جستہ جستہ پڑھ لیا کرنا مضامین وفا

پر کتاب عشق کا ہر باب مت دیکھا کرو

اس تماشے میں الٹ جاتی ہیں اکثر کشتیاں

ڈوبنے والوں کو زیر آب مت دیکھا کرو

مے کدے میں کیا تکلف مے کشی میں کیا حجاب

بزم ساقی میں ادب آداب مت دیکھا کرو

ہم سے درویشوں کے گھر آؤ تو یاروں کی طرح

ہر جگہ خس خانہ و برفاب مت دیکھا کرو

مانگے تانگے کی قبائیں دیر تک رہتی نہیں

یار لوگوں کے لقب القاب مت دیکھا کرو

تشنگی میں لب بھگو لینا بھی کافی ہے فرازؔ

جام میں صہبا ہے یا زہراب مت دیکھا کرو

متنی: جہاں بچوں کی بس پر تحریک طالبان نے حملہ کیا تھا

رحمان بابا کی یاد کے ساتھ ہی ہم چلے آ رہے تھے۔ جب ہم متنی سے گزر رہے تھے، تو مجھے یاد آیا، کہ ایک دفعہ اس علاقے میں اسکول کے بچوں کی بس پر فائرنگ کی گئی تھی۔ یہ 2011ء کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی ذمہ داری تحریک طالبان پاکستان نے لی تھی۔ بس پر فائرنگ کے نتیجے میں بس کا ڈرائیور اور چار بچے جن میں ایک سات سالہ بچی بھی تھی، شہید ہو گئے تھے۔ یہ ایک انتہائی اندوہناک واقعہ تھا، جس کی ہر شخص نے مذمت کی۔ اس کے حق میں صرف وہی تھے جو ایسا چاہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں مقامی لوگوں نے ہتھیار اٹھانا چاہے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔

کیسے دن تھے کہ جب ہمارے بچے بھی اسکول جاتے ہوئے محفوظ نہیں تھے اور یہ کیسے ظالم تھے، جو دین کے نام پر معصوم بچوں کو شہید کرتے تھے!

متنی سے کچھ فاصلے پر آدیزئی نام کا ایک گاؤں ہے۔ اس کی کہانی بھی بہت اداس کر دینے والی ہے۔ ایک وقت آیا جب 2008ء میں اس گاؤں میں رہنے والے لوگوں پر تحریک

طالبان سے تعلق رکھنے والے افراد نے حملہ کیا اور پورے گاؤں پر ایک طرح سے قبضہ کر لیا۔ جب کوئی سرکاری امداد نہ ملی، تو ان لوگوں نے ایک امن لشکر بنایا، جس میں زیادہ تر مقامی لوگ تھے۔ بعد میں یہ جنگ تحریک طالبان اور مقامی قبائل کے درمیان، ایک کھلی جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔

مقامی قبائل کے لوگوں نے یہ سوچ لیا تھا، کہ طالبان کے ہاتھوں مرنے سے بہتر ہے، کہ ہم میدانِ جنگ میں ان کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں۔ ایک مقامی قبائلی سردار دلاور خان کی قیادت میں، تین ہزار سے زائد لوگوں کا ایک لشکر تیار کیا گیا۔ اسلحہ کی کمی نہیں تھی، ہر گھر میں اسلحہ موجود تھا۔ تا دیر یہ مقابلہ چلتا رہا اور لشکر کے بے شمار لوگ شہید ہوئے، لیکن انھوں نے اپنے علاقے سے تحریک طالبان کا خاتمہ کیا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، کہ پشاور کے بالکل نواح میں ایک واقعہ ہوا، جس میں لوگوں کو اپنی حفاظت کے لیے ایک بڑا لشکر ترتیب دینا پڑا۔ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے مال و جان اور عزت کی حفاظت کی۔ اس وقت ہمارے دفاعی ادارے کیا سوچ رہے تھے؟ میں نہیں سمجھتا، کہ ایک غیر تربیت یافتہ مقامی لوگوں کا لشکر، تربیت یافتہ فوج سے بہتر ہو سکتا ہے۔

جب حالات ایسے ہو جائے کہ ہر روز آپ پر حملے ہوں تو بندوق اٹھانا ہی آخری حل ہے!

کچھ لوگوں کو باقی لوگوں کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کرنا پڑتی ہے، ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

ایسے ہی لوگ عظیم ہوتے ہیں!

درۂ آدم خیل: آفریدی قبائل کا گڑھ

ہم لٹل یو ایس اے اور اس کے بعد مٹانی قصبہ سے ہوتے ہوئے درۂ آدم خیل میں داخل ہوئے۔ درہ اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان میں گزرنے کی جگہ ہوتی ہے، انگریزی میں اسے پاس کہتے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں اس سڑک کا نام کوہاٹ پاس تھا۔

میں جب پہلی مرتبہ 1986ء میں اس جگہ آیا تھا۔ اس وقت میرے ساتھ میرے دو چھوٹے بھائی تھے۔ اس وقت بہت امن وامان تھا، کسی طرح کا کوئی بھی خوف نہ تھا۔ درۂ آدم خیل کے بازار میں بے شمار دکانوں پر کاریگر مختلف اسلحہ بنا رہے تھے۔ ہم بھی ایک دُکان میں

چلے گئے اور اس میں ہم نے اسلحہ بنتے دیکھا۔ انھوں نے ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ ہم سے یہ پوچھا کہ ہمیں کیا چاہیے؟ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اسلحہ نہیں خریدنا، ہم یہ صرف دیکھنا چاہ رہے ہیں، کہ آپ اسلحہ کیسے بناتے ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ دکان میں ایک صاحب نے کہا، کہ نسل در نسل ہمارا یہ کام ہے اور ہم اس کام میں بہت ماہر ہیں۔ آج جب ہم دوبارہ یہاں سے گزر رہے تھے، تو میں اپنے آپ کو اتنا پُرسکون محسوس نہیں کر رہا تھا، جتنا آج سے 34 سال پہلے تھا۔ پشاور سے کوہاٹ جانے کے لیے پہلے پہاڑ کے اوپر سے جانا پڑتا تھا، بعد میں ٹنل بن گئی۔ اب آپ درۂ آدم خیل سے گزر کر ٹنل کے ذریعے کوہاٹ جا سکتے ہیں۔

درۂ آدم خیل کے مین بازار کے رش سے بچنے کے لیے ایک بائی پاس بنا ہوا ہے۔ ہم بھی بائی پاس سے گزر کر ٹنل تک چلے گئے، لیکن میرے دل میں یہ حسرت باقی رہی کہ کاش ہم درۂ آدم خیل کے اس بازار سے گزرتے جہاں سے میں 34 سال پہلے گزرا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک تو وقت کی تنگی اور دوسری بات دل میں خوف بھی تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ واپسی پر درۂ آدم خیل کے بازار کو دیکھنے کی میری خواہش پوری ہو گئی۔ واپسی پر سلمان آفریدی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ ان کا آبائی علاقہ ہے۔ انھوں نے ہمیں درۂ آدم خیل کے بازار میں واقع ایک مشہور ریسٹورنٹ سے چپلی کباب بھی کھلائے، اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو ٹنل کے متعلق، کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ درۂ آدم خیل میں آباد آفریدی قوم کے متعلق کچھ معلومات آپ کے سامنے رکھی جائیں اور یہ بھی بتایا جائے، کہ یہ لوگ پہلے مغل حکمرانوں سے لڑتے رہے ہیں۔ پھر انھوں نے سکھوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی آخری جنگیں انگریزوں کے ساتھ ہوئیں۔ میرے خیال میں انگریزوں کے ساتھ ان کی جنگ فتح یا شکست پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ جب تک انگریز یہاں پر رہے، کسی نہ کسی طرح اس علاقے لوگ انگریزوں کو تنگ ضرور کرتے رہے اور انگریز کبھی امن سے نہ رہ سکے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور اور اس کے گردونواح میں واقع علاقوں پر 1823ء میں قبضہ کر لیا اور انھیں اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ سکھوں کا یہ قبضہ 1848ء تک رہا، یعنی سکھوں کی حکومت صرف 26 سال تک برقرار رہ سکی۔ یاد رہے اس وقت تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہی حکومت تھی۔ سکھوں کا شمال مغربی ہندوستان میں ہزارہ، نوشہرہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور دیگر علاقہ جات پر قبضہ اور ایک عرصہ تک ان پر حکومت کا احوال میں نے اس کتاب میں پشاور کا ذکر کرتے ہوئے تفصیل سے کیا ہے، اسے یہاں دہرانا مناسب نہیں۔

آفریدی قبائل کی تاریخ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس میں سب سے اہم بات جو میں نے محسوس کی ہے، اس کے مطابق ان لوگوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی اور اس کام کے لیے کئی جنگیں بھی لڑیں ۔ ابھی حال ہی میں ان علاقوں کو پاکستان میں ضم کرنے کی کوشش کی مخالفت بھی کی گئی ہے۔

کوہاٹ ٹنل: پاکستان اور جاپان کا ایک مشترکہ منصوبہ

میں جب 1986ء پہلی مرتبہ کوہاٹ آیا تھا، اس وقت ہم پہاڑ کے اوپر سے گزر کر گئے تھے ۔ یہ ایک انتہائی خطرناک راستہ تھا، لیکن اب ہم ٹنل سے گزر رہے تھے۔ ٹنل کے ذریعے جانے کی وجہ سے بہت سارا وقت بھی بچ گیا اور کوئی دقت بھی نہیں ہوئی۔ ابھی بھی تیل کے ٹینکرز کو کوہاٹ ٹنل سے گزرنے کی اجازت نہیں۔ ٹنل کی تعمیر کا آغاز 1999ء میں کیا گیا تھا اور 2003 ء میں یہ مکمل ہوئی۔ جنوری 2008ء میں، طالبان نے اس ٹنل پر قبضہ کر لیا اور جو ٹرک اسلحہ لے کر وزیرستان جا رہے تھے، انھیں قبضے میں لے لیا۔ یہ بہت ہی انوکھا واقعہ تھا۔ آج بھی یہ جان کر پسینہ آتا ہے کہ وہ لوگ کس قدر طاقتور تھے، کہ ہماری اہم جگہوں پر بھی قبضہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ پاکستانی فوج نے ایک خونریز جنگ کے بعد بیس سے زائد دہشت گردوں کو مار کر ٹنل دوبارہ کنٹرول حاصل کیا۔ ٹنل کی لمبائی 1900 میٹر ہے اور حسبِ معمول اس کی تعمیر کے لئے جاپان نے فنڈ مہیا کئے تھے۔

ٹنل ہماری، اسے استعمال ہم نے کرنا ہے، رقم کوئی اور دے!

ایسا کیوں ہے؟ ایسے وقت میں ہماری ملی حمیت کہاں چلی جاتی ہے؟

کوہاٹ آمد

پروگرام کے مطابق، ہمیں راولپنڈی روڈ پر واقع ایک قصبہ بابری بانڈہ جانا تھا جہاں پر ایک نہایت ہی معزز شخص، جناب غلام علی آفریدی صاحب نے ظہرانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ آفریدی صاحب ایک انتہائی درد دل رکھنے والے صاحب ہیں ۔ انھوں نے کچھ عرصہ پہلے برلب سڑک کئی ایکڑ زمین الخدمت اسپتال کے لئے دی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تعمیر بھی مکمل کر کے دی تھی۔ حال ہی میں تعمیر ہونے والے آغوش کوہاٹ کی تعمیر میں بھی انھوں نے بے حد تعاون فرمایا تھا۔ امیر جماعت اسلامی، جناب سراج الحق صاحب نے بھی وہیں آنا تھا۔ کوہاٹ میں داخل ہونے کے بعد، ہمارا رخ بابری بانڈہ کی طرف ہی تھا۔ جیسے ہی ہم بابری بانڈہ کی طرف بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں پر کوہاٹ سیمنٹ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

بھٹو دور میں جب بہت سی انڈسٹریز کو قومی تحویل میں لیا گیا تھا، تو مختلف انڈسٹریز کو کنٹرول کرنے کے لیے کارپوریشنز بنائی گئی تھی۔ سیمنٹ انڈسٹری کو کنٹرول کرنے کے لئے سیمنٹ کارپوریشن کا وجود عمل میں آیا۔ اس کارپوریشن نے نوے کی دہائی میں کوہاٹ میں، کوہاٹ سیمنٹ کی بنیاد رکھی۔ یہ پلانٹ روزانہ ایک ہزار ٹن سیمنٹ بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بعد ازاں، جب حکومت پاکستان نے مختلف انڈسٹریز کو پرائیویٹائز کرنا شروع کیا، تو کوہاٹ سیمنٹ کو 1992ء میں لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت ہی معزز کاروباری شخص شیخ عزیز صاحب نے خرید لیا۔

شیخ صاحب نے علاقے کے اندر بے شمار فلاحی کام کیے جن کی تفصیل انھوں نے ایک پروگرام کے دوران بتائی تھی۔ الخدمت اسپتال کے لئے بھی، انھوں نے فراخ دلی سے فنڈز مہیا کیے۔ شیخ صاحب کی قیادت میں کوہاٹ سیمنٹ پلانٹ نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اب اس کی پیداواری صلاحیت سات ہزار ٹن روزانہ سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ یہاں پر ایک 22 میگا واٹ کا پاور پلانٹ بھی لگایا گیا ہے۔

کاروبار تو سب ہی کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فلاح و بہبود کا کام کرنا کم لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ شیخ صاحب کو اللہ تعالی نے یہ صفت عطا کی ہے۔ ان سے میری ملاقات اسپتال کے افتتاح کے موقع پر ہوئی تھی۔ آج ان کے پلانٹ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ پہلے سے طے نہیں تھا، ورنہ میں ان سے ملاقات کے لئے ضرور جاتا۔

بابری بانڈہ میں حاجی غلام علی آفریدی صاحب کے حجرے پر ایک پُر تکلف ظہرانہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ پچاس سے زائد لوگ شریک تھے۔ سب نے کھانے کے ساتھ انصاف کیا۔ احمد اور داؤد نے بھی خوب کھانا کھایا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ سفید گوشت دیکھا، جو انھیں بے حد اچھا لگا۔ اس کھانے میں سراج الحق صاحب کے ساتھ ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے سابق ناظم اعلیٰ شبیر احمد خان صاحب بھی موجود تھے۔ جناب محمد علی جو دیر سے جماعت کی طرف سے ایم پی اے تھے، وہ بھی وہاں پر موجود تھے۔ خالد وقاص صاحب سے بھی کافی دیر کے بعد ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر ہمیشہ ہی بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ کھانے اور نماز کے بعد، ہم لوگ آغوش کوہاٹ کی افتتاحی تقریب کی طرف چلے گئے۔ آغوش کوہاٹ ایک طرح سے نواحی علاقے میں واقع ہے۔ اس علاقے میں ایک مشہور درگاہ کھمکول شریف بھی واقع ہے۔

تقریب میں کئی سو لوگ موجود تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوت، نعت اور قومی ترانہ سے کیا گیا۔ اس تقریب کی ایک خاص بات یہ تھی، کہ اس تقریب کے مہمان خصوصی، ہمارے وہ یتیم بچے تھے جن کو الخدمت فاؤنڈیشن نے یہاں پہ داخلہ دیا ہے۔ سراج الحق سمیت سب لوگ راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے، بچوں پر پھولوں کی پتیاں گرائی گئیں۔ بچے آتے گئے اور اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھتے گئے، سب نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرے۔ یہ ایک نہایت ہی خوبصورت منظر تھا۔

جو جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں ہماری ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا تھا۔

سعید اللہ صاحب، جنھوں نے یہ جگہ دی تھی، وہ خود تو تشریف نہ لا سکے، مگر ان کے بیٹے موجود تھے۔ انھوں نے بھی خطاب فرمایا اور بات کرتے ہوئے کہا کہ میں ہمیشہ والدین کے متعلق قرآن میں بتائی گئی دعا پڑھتا ہوں۔ میرے والد کو اللہ نے بہت زیادہ مال و دولت اور دنیا دی ہے۔ میرے والد صاحب نے دعا کی تھی، کہ وہ ایسا کام کریں جو آخرت میں ان کے کام آئے۔ جب انھوں نے یہ جگہ دینے کا فیصلہ کیا، تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔

حاجی غلام علی آفریدی صاحب نے کہا، کہ میں جب بھی اللہ کے لیے کوئی رقم دیتا ہوں تو اللہ مجھے اس سے کئی گنا اسی وقت واپس کر دیتا ہے۔ تقریب سے سراج الحق صاحب نے بھی خطاب کیا اور دیگر کچھ حضرات کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بات کرنے کا موقع ملا۔ یہ تقریب مغرب کے وقت ختم ہوئی۔

چراغ حسین: میرے ایک پیارے دوست

میرے ٹیکسٹائل کالج کے ایک دوست جن کا نام چراغ حسین ہے، وہ کوہاٹ میں رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ جماعت اسلامی کے ایک مقامی ساتھی نے ان کے گھر تک رہنمائی کی اور ہم ان کے گھر چلے گئے۔ میں آج سے 34 سال پہلے ان کے گھر آیا تھا۔ کوئی بڑی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ چراغ بھائی سے مل کر 43 سالہ پرانا دور یاد آ گیا جب 1977ء میں ہم ٹیکسٹائل کالج لائلپور میں پڑھتے تھے۔ دیر تک ہم ان کے گھر بیٹھے رہے اور پر تکلف چائے سے لطف اندوز ہوئے۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ یہ بھی ایک افسوس ناک بات ہے کہ ہماری اس ملاقات کے چند ماہ بعد ہی چراغ بھائی کا انتقال ہو گیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آج سے چھ سال قبل 2014ء میں، میں ایک گروپ کے ساتھ گلگت، ہنزہ اور خنجراب کی سیر کے لیے گیا تھا۔ سلمان آفریدی، جن کا تعلق کوہاٹ سے ہے وہ بھی اس ٹور میں ہمارے ساتھ تھے۔ اس وقت سے سلمان کے ساتھ ایک گہری دوستی ہے۔ میں جب بھی کوہاٹ آتا ہوں، ان سے ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے کوہاٹ آنے سے پہلے ان سے رابطہ کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، رات کا کھانا ان کے ساتھ تھا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں سپرنگ ویلی میں چراغ بھائی کے گھر ہوں تو وہ بھی وہیں پر آ گئے۔ سلمان آفریدی نے کہا کہ کوہاٹ ایک چھوٹا سا شہر ہے، ہم سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

جیسے ہی وہ آئے، تو چراغ بھائی نے ان سے پشتو میں بات چیت شروع کی۔ پشتو لہجہ پہچانتے ہوئے چراغ بھائی نے کہا کہ آپ کا تعلق تو فلاں قبیلے سے ہے۔ سلمان نے کہا کہ آپ نے ٹھیک پہچانا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم گوجرانوالہ سے آئے ہوئے یا فیصل آباد سے کسی بھی صاحب کو پنجابی بولتے دیکھیں، تو فوراً پہچان لیتے ہیں کہ وہ کس علاقے سے ہیں۔

ہم کافی دیر تک چراغ بھائی کے گھر رہے اور پھر کوہاٹ میں واقع سب سے اونچی جگہ پر واقع ریستوران، جسے منی منال کہتے ہیں چلے گئے۔ اس کا اصل نام آفریدی اِن ہے۔ آفریدی اِن کے مالک واجد آفریدی ہیں، انھوں نے ہمارا استقبال کیا اور بڑی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس خوبصورت منظر کے متعلق کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ کوہاٹ کا پس منظر آپ کے سامنے رکھوں اور ماضی میں ہونے والے چند اہم واقعات بھی آپ کے سامنے پیش کروں۔

کوہاٹ: بدھ راجا کے نام پر بسا شہر

کوہاٹ کے متعلق کئی لوگوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ خیبر ڈاٹ او آر جی کی ویب سائٹ پر اس متعلق بہت کچھ لکھا ہوا ہے جس میں بہت ہی دلچسپ معلومات دی گئی ہیں[1]۔ اس ویب سائٹ پر لکھا ہوا ہے کہ اس تحریر کے لیے انھوں نے History of Kohat

Gazetteer of Kohat District سے مدد لی ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے۔ اس سے جو جانا، اس کا ایک مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

کوئی بات واضح نہیں ہے، لیکن عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بدھ مت کے دور میں ادھ اور کوہاٹ نامی دو راجے اس علاقے میں آباد تھے۔ راجا کوہاٹ کے نام پر کوہاٹ شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ دوسرے نے کوہاٹ کے مغرب میں چار میل دور ایک گاؤں میں ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلعے کے کھنڈرات اب بھی کسی نہ کسی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کہیں کہیں، بدھ مت کے زمانے کی کچھ باقیات بھی کوہاٹ کے قرب وجوار میں ملتی ہیں۔

یہاں پر آنے والے تمام تر پختون قبائل افغانستان سے آئے ہوئے ہیں جن میں بنگش، اورکزئی، آفریدی چند نمایاں ناموں میں سے ہیں۔ بابر نے بھی اپنی کتاب بابر نامہ میں بھی اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ بابر نے پشاور فتح کرنے کے بعد، کوہاٹ کے پختونوں کو شکست دے کر اسے فتح کیا تھا۔ یاد رہے کہ اس کے اکیس سال بعد یعنی 1526ء میں، بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی (وہ بھی ایک پختون تھا) کو شکست دی تھی، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغلوں اور پختونوں کے درمیان جنگ کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ بعد میں ان دونوں کے ورثاء (ہمایوں اور شیر شاہ سوری) کے درمیان بھی جنگ اسی پرانی دشمنی کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔ ابدالی اور مغلوں کی جنگ بھی، دراصل ایک پختون اور مغل کی جنگ ہی تھی۔

---

[1] http://khyber.org/publications/036-040/history.shtml

یہ میرا خیال ہے جو ممکن ہے درست نہ ہو!

ایک وقت وہ بھی تھا، جب نادر شاہ کی فوج اس علاقے میں آئی تھی۔ اس کی فوج نے کوہاٹ کی بجائے پشاور پر قبضہ کرنے کو بہتر جانا۔ جب درانی حاکم شجاع درانی کی حکومت 1810ء میں ختم ہوئی تو اس کے بعد کوہاٹ، کابل کے ماتحت ہو گیا۔

اب تک جو میں نے جانا، اس کے مطابق انگریزوں کی اس علاقے میں آمد سے قبل، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی سرحد نہیں تھے۔ موجودہ سرحد کے دونوں طرف کے علاقے ایک ہی ریاست کا حصہ ہوتے تھے، کبھی قندھار، کابل، غزنی وغیرہ دہلی دربار کے ماتحت ہوتے تھے اور کبھی بلوچستان کا ایک بڑا علاقہ جس میں لورالائی تک کے علاقے شامل تھے، افغانستان کے بادشاہ کے زیرِ اثر ہوتے تھے۔ ڈیورنڈ لائن ہی موجودہ پاکستان، افغانستان اور ایران کے درمیان حد بندی کی وجہ بنی۔ اس سے پہلے 1879ء میں گندمک کا معاہدہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں موجودہ خیبر پختونخوا کے کئی علاقے، برطانوی ہندوستان کا حصہ بن گئے تھے۔ اس بات کا دکھ، افغان کبھی بھی نہیں بھولے۔

اس طرح صدیوں سے اکٹھے رہنے والے لوگ تین ممالک میں بٹ گئے؛ پاکستان، ایران اور افغانستان اور اب تک بٹے ہوئے ہیں۔ پھر وقت نے یہ بھی دیکھا کہ پہلی مرتبہ پنجاب کے ایک حکمران مہاراجا رنجیت سنگھ نے 1837ء میں یہاں کے مقامی حاکم اعظم خان کو شکست دی اور کوہاٹ کو اپنی راجدھانی میں شامل کر لیا۔

پہلی مرتبہ ایسا ہوا، مشرق سے کوئی حملہ آور آیا اور اس نے کوہاٹ کے علاوہ کئی اور ملحقہ علاقے بھی قبضے میں لے لیے۔ اس سے پہلے ہمیشہ حملہ آور مغرب کی طرف سے ہی ہندوستان پر قبضہ کرنے آتے تھے۔ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ رنجیت سنگھ وہ واحد حکمران ہے، جس نے افغانستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اسی وجہ سے سکھ، اسے شیرِ پنجاب اور راجہ کی بجائے مہاراجہ کا خطاب دیتے ہیں۔

کوہاٹ پر قبضہ کرنے والے سکھ جرنیل کا نام، افطار اسنگھ سندھیلیاں والا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار جرنیل تھا۔ اس نے مقامی لوگوں کو بہت سامال و متاع دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور یوں وہ امن سے یہاں رہنے لگا۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ اور بھی پیش آیا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سکھوں کے دورِ حکومت میں یہ جگہ کتنی پُر امن تھی۔ یاد رہے یہ وہی دور ہے جب پنجاب میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگیں ہو رہی تھیں۔ یہ جنگ انگریزوں

اور سکھ خالصہ کے درمیان ہو رہی تھی جبکہ کوہاٹ پر سکھ دربار کے ایک جرنیل کا قبضہ تھا، جن کی انگریزوں سے گہری دوستی تھی۔ اسی وجہ سے کرنل لارنس نے (جس کے نام پر لاہور میں لارنس گارڈن ہے) لاہور سے فرار ہو کر کوہاٹ میں پناہ لی تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب 1849ء میں کوہاٹ پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی، پھر وہ 108 سال تک کوہاٹ پر قابض رہے۔

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں کوہاٹ کی فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں نے آزادی کی خاطر لڑنے والے فوجیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ شہر میں ہندو اور سکھ ایک بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ 1924ء میں یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی فسادات شروع ہو گئے تھے، جنھیں ختم کروانے کے لیے مہاتما گاندھی نے بھوک ہڑتال کی تھی۔

کوہاٹ کی تاریخ میں ایک بات اور نوٹ کرنے والی ہے کہ اس علاقے میں جو کہ بہت ہی غیر آباد تھا، صدیوں پہلے افغانستان سے مختلف قبائل آ کر آباد ہوتے رہے ہیں۔ یہ تمام قبائل پختون تھے اور مسلمان تھے۔ میں یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ ہندو اور سکھ لوگ اس علاقے میں کب آئے اور کیوں آئے؟

کافی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انگریز جس بھی علاقے میں جاتے تھے وہاں اپنی چھاؤنی تعمیر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک چھوٹا شہر بھی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بناتے تھے، جسے ہم ایک بڑی مارکیٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ ان لوگوں کو وہاں آنے کی دعوت دیتے تھے، جن سے وہ پہلے سے واقف ہوتے تھے۔ انگریزوں نے راولپنڈی میں چھاؤنی بنانے کے بعد جب پشاور میں چھاؤنی بنائی تو راولپنڈی سے ہندکو بولنے والے لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اسی طرح سے جب کوہاٹ میں چھاؤنی بنائی، تو بہت سارے لوگ وہاں چلے گئے، جن میں اکثریت ہندکو بولنے والوں کی تھی۔ بنوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔

آج بھی کوئٹہ میں ایک بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کا تعلق ہزارہ اور پنجاب کے دیگر علاقوں سے ہے۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں جن لوگوں نے ان علاقوں میں رہائش اختیار کی وہ یا تو ملازمت پیشہ تھے یا کاروباری لوگ تھے۔ کاروباری لوگوں کی اکثریت کا تعلق ہندو برادری سے تھا۔ جہاں تک سکھوں کا تعلق ہے، ان کے متعلق میرا یہ کہنا ہے کہ یہ لوگ اس علاقے میں فاتحین کے طور پر آئے تھے، اس لیے وہ ان علاقوں میں آباد ہوئے۔

کوہاٹ کے متعلق اس سے زیادہ لکھنا شاید مناسب نہیں ہوگا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کوہاٹ کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔

کوہاٹ، ایک دلچسپ تاریخ کا حامل شہر

کوہاٹ کی تاریخ قدیم بھی ہے اور جدید بھی ہے۔ قدیم اس طرح سے کہی جا سکتی ہے، کہ اس شہر کی بنیاد بدھ ازم کے ایک راجا کوہاٹ نے رکھی تھی۔ یقیناً یہ کوئی دو ہزار سال پرانی بات ہے۔ پھر اس کے بعد اس علاقے میں نادر شاہ درانی کے حملوں کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے، کہ اس علاقہ پر بابر نے بھی حملہ کیا، جب وہ پشاور فتح کر چکا تھا۔ صرف یہی نہیں، مہاراجا رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کرنے کے بعد 1819ء میں کوہاٹ کو بھی فتح کیا۔ 1836ء میں مقامی پختون قبائل نے سکھوں سے اپنا قبضہ چھڑوالیا۔ بالآخر 1848ء میں انگریزوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ کر لیا اور پھر انھوں نے یہاں پر 1870ء میں چھاؤنی بنائی اور پشاور، راولپنڈی، بنوں، ڈی آئی خان کی طرف جانے والے راستوں کو تعمیر کیا، کوہاٹ پاس بھی بنایا۔ یہ علاقہ فوجی نُقطۂ نَظر سے انگریزوں کے لئے نہایت ہی اہم مقام تھا۔ اپریل 1923ء میں اس علاقہ میں ایک بہت ہی اہم واقعہ پیش آیا، جب عجب خان آفریدی نے ایک انگریز خاتون کو قتل کیا اور اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

کوہاٹ جانے کے لئے، آپ پشاور سے جا سکتے ہیں، بذریعہ درۂ آدم خیل یہ فاصلہ ستر کلومیٹر ہے، راولپنڈی سے براستہ فتح جنگ جا سکتے ہیں، یہ فاصلہ سو کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے، بنوں کی طرف سے بھی آ سکتے ہیں۔ کوہاٹ سطح سمندر سے سولہ سو فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہاں گرمی بھی کافی ہوتی ہے، لیکن سردیوں میں بھی بہت زیادہ سردی نہیں پڑتی۔

شہر کے وسط میں ایک پہاڑی بھی ہے، جس پر دور سے آپ کو آبادی نظر آ سکتی ہے۔ شہر اونچی نیچی سڑکوں پر واقع ہے، اس شہر میں میرا ایک عزیز دوست سلمان آفریدی رہتا ہے، جس نے یہ بتایا کہ اس کے دادا کی چوتھی شادی سرگودھا کے ایک مقامی زمیندار کے گھر ہوئی تھی۔ سلمان بڑا ہی دلچسپ آدمی ہے اور بڑی خوشی خوشی وہ اپنے خاندان کی دلچسپ باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال جب میں کوہاٹ آیا تھا تو اس نے اپنے امرود کے باغ میں سے تازہ امرود بھی دیے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ کوہاٹ اپنے امردوں کی وجہ سے بھی بے حد مشہور ہے۔

کوہاٹ تقریباً سوسال تک انگریزوں کے ماتحت رہا۔ اس علاقہ کو انگریزوں نے 1849ء میں فتح کیا اور پہلا اسسٹنٹ کمشنر جس کا نام پولیک تھا، کو مقرر کیا۔اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے پشاور سے کوہاٹ تک سڑک کی تعمیر بھی شروع کردی۔ یاد رہے درمیان میں ایک بہت بڑا پہاڑ آتا ہے جسے کوہاٹ پاس کہتے ہیں۔ موجودہ سرنگ بننے سے پہلے، اس پہاڑ کے اوپر سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں بھی 1986ء میں پشاور سے کوہاٹ اسی پہاڑ کے اوپر سے گزر کر گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی مشکل راستہ تھا۔

انگریزوں نے جب اس علاقہ میں، پشاور سے کوہاٹ تک سڑک بنانا شروع کی تو مقامی لوگوں نے اس کی بہت شدت سے مخالفت کی،اس کے بعد انگریزوں نے کوہاٹ سے راولپنڈی تک سڑک بنانے کے لئے، خوشحال گڑھ کا راستہ اختیار کیا۔انگریزوں نے اس علاقہ میں چیرَاٹ کے مقام پر جو کہ نسبتاًاونچائی پر واقع ایک پہاڑی مقام ہے، کو ہل اسٹیشن کا درجہ دیا، جہاں پر وہ گرمیوں میں جا کر رہتے تھے، مجھے اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، جس کا مجھے افسوس ہے۔

ایک بات جو مجھے نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ علاقہ کافی خوش حال تھا، کھیتی باڑی کے لئے بھی بہت موزوں ہے۔ افغانستان سے نادر شاہ، مغلوں کی طرف سے بابر ، سکھوں کی طرف سے رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے حملے، یہ سب مل کر یہ بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ صدیوں تک میدانِ جنگ بنا رہا۔ پچھلے چند سال میں اس علاقے میں دہشت گردی کے خلاف مہم کے دوران بھی بے شمار مشکل وقت آئے۔اس علاقہ میں کئی بار خود کش حملے ہوئے، جس میں ایک بڑی تعداد میں بے گناہ لوگوں کی موت واقع ہوئی۔

ایک اہم بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ آفریدی قبائل اس گروہ کا حصہ تھے، جو کوہاٹ میں اکٹھے ہوئے اور جنھوں نے 1948ء میں کشمیر پر حملہ کیا اور موجودہ آزاد کشمیر کو آزاد کروایا تھا، یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے۔ اس میں آفریدی قبائل کے علاوہ بھی دیگر کئی قبائل نے بھی حصہ لیا تھا، لیکن کہتے ہیں کہ اس میں آفریدی سب سے زیادہ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ کو آزاد کشمیر کے بے شمار علاقوں میں پختون قبائل کے لوگ ملتے ہیں، جو آزادی کے بعد واپس نہیں آئے، بلکہ وہیں رہ گئے۔ ان میں سدوزئی قبیلے کے لوگ تعداد میں کافی زیادہ ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن میں کام کرنے والے ہمارے ایک ساتھی، احمد قدیر کا تعلق بھی سدوزئی قبیلہ سے ہے۔ ان کے بقول کافی بڑی تعداد میں سدوزئی لوگ آزاد کشمیر میں رہتے

ہیں۔ آزاد کشمیر کی آزادی میں ان لوگوں کا بے حد اہم کردار ہے، جسے کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

ایک اور اہم بات یہ ہے، کہ اس علاقہ میں بہت سارے پختون قبائل رہتے ہیں جن میں آفریدی بھی ہیں اور بنگش بھی، ان کے علاوہ بھی کئی اور۔ ان قبائل کی آپس کی دشمنیاں سالوں پر پھیلی ہوئی ہیں اور جب دشمنی بڑھ جاتی تھی، اس سڑک کو بند کردیا جاتا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1924ء میں اس علاقہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بہت بڑے مذہبی فسادات بھی ہوئے، انھیں ختم کروانے کے لئے مہاتماگاندھی نے بھی کوشش کی تھی۔

کہیں اس طرح کے فسادت ہی تو مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہندوستان کی وجہ تو نہیں بنے؟ میرا خیال ہے کہ مذہب، زبان، رنگ و نسل کی بنیاد پر باہمی اختلافات یا فسادات ہمیشہ سے ہی چلتے آئے ہیں اور ہر معاشرے میں ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح کے فسادات کا حل تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ تفہیم ہی سے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جناب الطاف حسن قریشی نے اپنے ایک مضمون میں بیسویں صدی میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی تفصیل لکھی ہے[1]۔ اس کے مطابق شدھی اور سنگھٹن تحریکوں کی مسلسل دست درازیوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات میں بے حد اضافہ ہوا۔ نامور تاریخ دان پروفیسر کے کے عزیز کی کتاب (Britain and Muslim India) میں دی گئی تفصیل کے مطابق 1923ء میں گیارہ، 1924ء میں اٹھارہ، 1925ء میں سولہ، 1926ء میں تینتیس اور 1927ء میں پینتیس ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ جس وقت لاہور میں مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس منعقد ہو رہا تھا، اس وقت کوہاٹ میں خونریز فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ جس کے متعلق مہاتماگاندھی نے اعلان کیا کہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ اَدا کرنے کے لیے اکیس روزہ برت رکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے فی الفور اتحاد کانفرنس کا انتظام کیا۔ اُس میں ایک مرکزی پنچایت قائم ہوئی، جس کا مقصد مقامی لوگوں کے باہمی جھگڑے ختم کروانا تھا۔ مگر اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

---

[1] https://www.humsub.com.pk/515195/altaf-hasan-qureshi-117/

کیا تقسیم ہند کے بعد فسادات نہیں ہوئے؟ بھارت اور پاکستان سمیت کئی شہروں میں بے شمار فسادات ہوئے ہیں، جن میں شیعہ سنی بھی ہیں، سکھ ہندو بھی، ہندو عیسائی اور مسلم عیسائی بھی۔ مذہب کی بناء پر فسادات کی ایک طویل داستان ہمیں آئر لینڈ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ فسادات کی بنیاد پر کسی بھی ملک کی تقسیم شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔

یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔ کسی بھی معاملے میں کوئی حتمی بات کہنا میرے لیے تو ممکن نہیں ہے۔آپ کیا رائے رکھتے ہیں، یہ آپ بہتر جانتے ہیں۔ اگر آپ اپنی رائے سے مجھے آگاہ کریں گے، تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

یہ بات بھی آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی کہ کوہاٹ میں دو ٹیکسٹائل ملز بھی لگی ہوئی ہیں، ایک کا نام جی ڈی ایم ٹیکسٹائل مل ہے، دوسری بابری ٹیکسٹائل مل ہے۔ یہ ملیں ایک مشہور سیاسی خاندان، جس کے سربراہ حبیب اللہ خان تھے، جو بہت دیر تک حکومت میں رہے، کی ملکیت ہیں۔ میرے ایک انتہائی عزیز دوست ارشد رفیق یہاں پر جنرل مینجر تھے۔ میں ایک دفعہ ان سے ملنے کے لئے بھی آیا تھا۔ کوہاٹ میں کوہاٹ سیمنٹ کے نام سے، ایک سیمنٹ کا پلانٹ ہے، جن کے مالکان کا تعلق لاہور سے ہے، میری بھی ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ انھوں نے حال ہی میں اپنے علاقہ میں کئی رفاہی کام شروع کیے ہوئے ہیں۔

کوہاٹ ان مقامات میں سے ایک مقام ہے، جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگ کافی سخت مزاج ہوتے ہیں۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے اس کے لیے آپ کسی دن کوہاٹ جائیں اور دیکھیں کیا ایسا ہی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ بہت نرم مزاج ہوتے ہیں، لیکن جب معاملہ لڑائی کا آ جائے، ان سے سخت مزاج کوئی نہیں ہوتا۔ اس شہر کی ایک وجہ شہرت، ہمارا ہیرو شاہد آفریدی بھی ہے۔ اس کا آبائی تعلق تو وادی تیراہ سے ہے لیکن اس کا خاندان کوہاٹ میں رہ رہا ہے۔ ایک عظیم انقلابی شاعر احمد فراز کی پیدائش بھی کوہاٹ کی ہے۔

احمد فراز کی ایک مشہور غزل:

سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں

یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے ربط ہے اُس کو خراب حالوں سے

سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے دن میں اُسے تتلیاں ستاتی ہیں

سُنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے

کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُسے بھی ہے شعر و شاعری سے شغف

سو ہم بھی معجزے اپنے ھُنر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی

سو ہم بھی اُس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے حشر ہیں اُس کی غزال سی آنکھیں

سُنا ہے اُس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کی سیاہ چشمگیں قیامت ہے

سو اُس کو سُرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے رات اُسے چاند تکتا رہتا ہے

ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں

.سُنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اُس کی

سُنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں

سو ہم بہار پر الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے شبستاں سے مُتصل ہے بہشت

مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اُس کی

جو سادہ دل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ اِمکاں میں

پلنگ زاویے اُس کی کمر کے دیکھتے ہیں

رُکے تو گردشیں اُس کا طواف کرتی ہیں

چلے تو اُس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

بس اِک نگاہ سے لُٹتا ہے قافلہ دل کا

سو راہروانِ تمنّا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

اب اُس کے شہر میں ٹھہریں یا کُوچ کر جائیں

فرازؔ آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

کوہاٹ ایک اچھا تفریحی مقام ہے۔ یہاں کئی تاریخی عمارات بھی پائی جاتی ہیں۔ اگر آپ کو موقع ملے، تو ضرور کوہاٹ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں جائیں۔ یہاں پر کھمکول شریف نام کی ایک درگاہ بھی ہے جو کافی مشہور ہے۔ اور اگر آپ کو سلمان آفریدی جیسا دوست مل جائے تو آپ کو اچھے امرود بھی مل سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کوہاٹ جانے کا ارادے تو ضرور کریں گے کیونکہ کم از کم ارادہ کا ثواب تو ضرور لے لیں۔

کوہاٹ کے امرود

آپ کوہاٹ جائیں اور آپ کو کوئی شخص امرود پیش نہ کرے، یہ ممکن نہیں۔ بلکہ میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ جب پیر فہیم صاحب جو الخدمت فاؤنڈیشن کوہاٹ کے صدر ہیں، ایک دفعہ لاہور تشریف لائے، تو اس وقت بھی وہ میرے لیے کوہاٹ سے امرود ہی لے کر آئے تھے۔ کوہاٹ میں امرودوں کی ایک خاص قسم ہے، جو باقی علاقوں میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی خوشبو اور مٹھاس بہت ہی مختلف ہے۔ ان کا ذائقہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ میں جب اس سے پہلے

کوہاٹ آیا تھا تو سلمان آفریدی نے اپنے باغات سے ہمیں تازہ امرود لا کر دیے تھے۔ اس دفعہ بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے اپنے امرود کے باغات بھی دکھائے۔ انگریزوں کے دور میں ان کے پردادا، درہ آدم خیل سے نقل مکانی کرکے کوہاٹ آ گئے تھے۔ انھوں نے یہاں بہت ساری زمینیں خریدیں، جو اب شہر کا حصہ بن گئیں ہیں۔ ان کے اپنے بے شمار باغات ہیں۔ انھوں نے جب ہماری گاڑی میں امرود رکھے، تو پوری گاڑی خوشبو سے مہک اٹھی۔ یہ صرف امرودوں کی خوشبو نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ سلمان آفریدی اور اہلِ کوہاٹ کی محبت کی خوشبو بھی تھی۔ ہم نے لاہور آ کر امرود نکال بھی لیے لیکن خوشبو پھر بھی باقی رہی۔

آپ کو جب بھی موقع ملے تو کوہاٹ جائیں اور ویسے تو لاہور کے پاس شرق پور میں بہت زیادہ امرود پیدا ہوتے ہیں جو بہت ہی خوبصورت اور مزیدار بھی ہوتے ہیں لیکن اس معاملے میں کوہاٹ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اہلِ کوہاٹ یہی کہتے ہیں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے سلمان سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہاں سے امرود کے چھوٹے پودے لے جاؤں اور ہم اسے لاہور میں اگائیں؟ اس نے کہا کہ آپ لے جائیں لیکن شاید پانی اور آب و ہوا کی وجہ سے ان کا یہ والا ذائقہ آپ کو لاہور میں نہ ملے۔

کوہاٹ کے بارے چند شعراء کے اشعار

مولانا ظفر علی خان نے کوہاٹ کو ''حیاتِ جاوداں کے گھاٹ'' سے تعبیر کیا تھا:

گر پہنچنا ہے حیاتِ جاوداں کے گھاٹ تک

سر بکف ہو، کر اٹک پار اور پہنچ کوہاٹ تک

یہ بھی کسی شاعر نے کوہاٹ بارے لکھا ہے؛

کھٹ میٹھے لوکاٹ

امرودوں کے جھنڈوں والا

شہر مرا کوہاٹ

میں ہوں اُس کوہاٹ کا باسی کہ جس کی لَے میں ہے

زلف کی مہکار بھی، تلوار کی جھنکار بھی

میرا دل حاجی بہادرؒ اور خمیر احمد فرازؔ

مجھ میں ہے ایوب صابرؔ شعلۂ گفتار بھی

کوہاٹ کے اُمّی شاعر سیّد شیرازی کوہاٹ میں آباد ہوئے تو یہاں کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں اور اس کے گنگناتے چشموں کے گرویدہ ہوئے اور انہوں نے کوہاٹ کے بارے میں ایک نظم میں کہا؛

بہارِ حسن سے سرسبز ہے زمینِ کہاٹ

جہاں میں کیوں نہ ہو یکتا ہر اک حسین کہاٹ

صبا یہاں سے نہ آہستہ کیوں گزر جائے

کہ برگِ گل سے بھی نازک ہے نازنینِ کہاٹ

عجب خان آفریدی: مجاہدِ آزادی یا ایک کچھ اور

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کوہاٹ میں ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہوا اور اس واقعے پر کئی فلمیں بھی بنیں۔ یہ ایک بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔

کچھ لوگوں کے بقول، قصہ کچھ یوں ہے کہ عجب آفریدی، جو درۂ آدم خیل کا رہنے والا تھا، انگریزوں کی فوج میں ملازم تھا۔ فوج میں کسی کی بندوق گم ہو گئی، جس کا عجب خان آفریدی پر شک کیا گیا۔ عجب خان آفریدی کے گھر کی تلاشی لی گئی، جس کا اس نے بہت برا منایا اور انگریزوں کی فوج کے ایک میجر کے گھر چلا گیا، میجر گھر پر نہیں تھا، اس کے گھر میں اس کی بیوی اور بیٹی تھی۔ اس نے انگریز خاتون کو قتل کر دیا اور اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ بیٹی کا نام مولی ایلس تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک فریڈم فائٹر تھا، جس کی بنیاد پر اس نے یہ کام کیا۔ لیکن یہ کام علاقے کی روایات کے خلاف تھا، جسے عام لوگوں نے پسند نہ کیا۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا، کہ ہم لوگ کبھی بھی کسی عورت پر حملہ نہیں کرتے اور اس طرح سے بچیوں کو اغوا بھی نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا تھا، کہ وہ میجر کو ہی مارنے گیا تھا۔ لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ میجر گھر پر نہیں ہے۔ اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر میجر کی بیوی نے شور مچایا، جس پر اس نے گولی چلا دی جو میجر کی بیوی کو لگی۔ اس کے بعد عجب خان آفریدی ان کی سترہ سالہ بیٹی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لیلن اسٹار، اس وقت پشاور میں ایک اسپتال میں کام کرتی تھیں، اس کو ایک ایسے گروپ کی سربراہی دی گئی تھی، جو مولی ایلس کی تلاش کے لیے ترتیب دیا گیا تھا اور جس نے کامیابی سے ایلس کو تلاش کیا اور اسے واپس لے کر آئی تھی۔ لیلن اسٹار نے اس واقعے کا اپنی ایک

کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے[1]۔ یہ کتاب نیٹ پر موجود ہے، میں نے اسے پڑھا ہے۔ میرے خیال میں لیلن کی بات سب سے معتبر ہے، کیونکہ وہ اس واقعے کے کرداروں میں سے ایک ہیں۔

لیلن اسٹار، پشاور مشن ہسپتال میں میٹرن تھیں، وہ ڈاکٹر تھامس ویڈ کی بیٹی تھی۔ جنوری 1863ء میں، ڈاکٹر ویڈ ہندوستان آئے۔ بعد میں وہ پشاور آ گئے اور انھوں نے پشاور مشن ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ للیان اسٹار 18 سال کی عمر میں ہندوستان آئی اور اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ تین سال تک لاہور، بٹالہ اور امرتسر میں مقیم رہیں۔ اس دوران لیلن اسٹار نے نرسنگ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد، اسے بطورِ پیشہ اختیار کر لیا اور اس واقعے کے وقت، وہ پشاور مشن ہسپتال میں کام کر رہی تھیں۔

ان کی شادی ڈاکٹر اسٹار سے ہوئی، جو پشاور ہی کام کرتے تھے۔ انھیں 17 مارچ 1917 کی صبح چار بجے دو آفریدی قبائلی نے ہسپتال میں داخل ہو کر قتل کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ اس طرح لیلن کو ایک بڑا دکھ سہنا پڑا۔

---

[1] Starr, Lilian A. U Tales of Tirah and Lesser Tibet U. Hodder and Stoughton Limited, London. 1924The Afridi Raid

Lilan Astar in local attire

یہ 14 اپریل 1923 کی شام کا واقعہ ہے کہ چند آفریدی قبائلی، جن میں عجب خان آفریدی بھی شامل تھا، کوہاٹ میں تعینات میجر اور مسز ایلس کے گھر میں گھس گئے۔ ایلس فیملی کا بنگلہ کوہاٹ چھاؤنی میں تھا، جہاں ایک بڑی تعداد میں فوجی بھی موجود تھے۔ اس دور میں قبائلی عام طور پر امیر ہندو تاجروں کو لوٹتے تھے۔ کئی بار انھوں نے تاجروں کو تاوان کے لیے اغوا بھی کیا۔ جب یہ قبائلی ایلس کے گھر میں داخل ہوئے، اس وقت میجر ایلس گھر پر نہیں تھے۔ ان لوگوں نے مسز ایلس کو قتل کر دیا اور ان کی 17 سالہ بیٹی مولی ایلس کو اغوا کر لیا۔ یہ اپنے دور کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ قتل اور اغوا جیسا جرم ایک حاضر سروس، برطانوی فوجی افسر کی بیٹی اور بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا۔

مولی ایلس کی بازیابی کے لیے انگریزوں نے بہت بڑے پیمانے پر کارروائی شروع کی۔ اس کام کے لئے اور انھوں نے تین بڑے گروپ بنائے اور انھیں مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو پھر سرکاری مشینری حرکت میں آتی ہے۔ ایک گروپ کی سربراہ مسز لیلن اسٹار تھیں۔ اس گروپ میں چالیس مسلح لوگ تھے، جو اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس گروپ کو مولی ایلس کا پتہ چل

گیا۔ مسز للیان اسٹار نے علاقے کے معززین کو اکٹھا کیا اور جو بھی قبائل آباد تھے، انھیں بھی شامل کیا۔ بالآخر انھوں نے اس بچی کو بازیاب کروالیا۔

یہ سب کیسے ہوا؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے، جسے لیلن اسٹار نے نہایت تفصیل سے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ اس مہم کا ایک مختصر احوال پیش کر رہا ہوں۔

جب یہ واقع پیش آیا، اس وقت سر جان میفی شمال مغربی صوبے کے چیف کمشنر تھے۔ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ قتل اور اغوا عجب خان اور اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ کی واردات ہے۔ دونوں بھائی بدنامِ زمانہ مجرم تھے اور کوہاٹ کے قریب وادی بوستی خیل میں رہتے تھے۔

اس واقع سے کوئی تین سال قبل، عجب خان گینگ نے ایک انگریز فوجی افسر کرنل اور مسز فولکس کو قتل کیا تھا۔ یہ لوگ پکڑے بھی گئے تھے، لیکن عدمِ ثبوت کہ بناء پر انھیں رِہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک واردات ہوئی جس میں ایک پولیس چوکی پر حملہ کیا گیا اور وہاں سے رائفلیں چرالی گئیں۔ رائفلوں کی تلاش میں عجب خان گینگ کے بوستی خیل کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا گیا، کچھ چوری شدہ رائفلیں برآمد بھی کر لی گئیں، مگر عجب خان فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

سر جان میفی کو یہ خبر ملی کہ عجب خان گینگ تیراہ میں چھپا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ تیراہ ایک پہاڑی علاقہ ہے اور عجب کا آبائی گھر میں اسی علاقے میں تھا۔ اس کی شمالی سرحد افغانستان کے ساتھ ملتی ہے۔ تیراہ، ڈاکوؤں کے لیے بھی مشہور تھا اور ان کے لیے ایک بہترین پناہ گاہ بھی۔ اس علاقے میں اگر انگریزوں کی فوج داخل ہوتی تو عجب خان کو افغانستان فرار ہونے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔ اگر ایک بار وہ افغانستان جانے میں کامیاب ہو جاتا، تو انگریزوں کو اس کا پیچھا کرنے میں کافی مشکل پیش آتی۔

سر جان میفی نے تین ریسکیو کی ٹیموں کی قیادت کے لیے تین قابل ذکر افراد کا انتخاب کیا۔ ان میں سے ایک، زمان خان خیبر کے علاقے سے تعلق رکھنے والے قبائلی رہنما تھے۔ دوسرے خان بہادر قلی خان، وادی کرم، خیبر کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ۔ تیسرے گروپ کی سربراہی کے لیے سر جان میفی نے فیصلہ کیا، کہ عورت کو بچانے کے لیے ایک دوسری عورت ہی ہونی چاہیے۔ اس کام کے لیے لیلن اسٹار کا انتخاب کیا گیا، جنھوں نے یہ کتاب لکھی۔

جب لیلن اسٹار کو ایک گروپ کی سربراہی کی ذمہ داری سونپی گئی، تو کچھ لوگوں کو یہ بات بے حد عجیب لگی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ڈاکو کو پکڑنے اور ایک یرغمالی کو آزاد کرنے کے مشن پر، ایک عورت کو بھیجنا ایک انتہائی خطرناک فعل ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے، کہ لیلن اسٹار کو پانچ قبائلی علاقوں سے گزرنا پڑے گا؛ اخیل، علی خیل، علی شیر زئی، خدازئی، منوزئی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس پر یہ طے ہوا کہ اس کا فیصلہ لیلن اسٹار خود فیصلہ کرے گی۔

لیلن اسٹار نے کہا، کہ وہ ایک عورت کی جان بچانے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ لیلن اسٹار، خان بہادر رسالدار مغل باز خان اور چالیس قبائلی لوگوں کے ساتھ ایک خاکی ٹوپی پہن کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئیں۔ لیلن اسٹار نے یہ معرکہ کیسے سر کیا، اس کے لیے ان کی کتاب پڑھنا بے حد ضروری ہے۔

اس مشن ایک میں اہم موڑ اس وقت آیا، جب قلی خان نے عجب خان کو قائل کیا کہ سر جان میفی کو خط لکھے، جس میں مولی ایلس کے لیے لباس اور کھانے کی درخواست کی جائے۔ اس کا مقصد، سر جان میفی کو عجب خان کے ٹھکانے کی تلاش میں مدد دینا تھا۔ قلی خان کی وساطت سے، عجب خان کی تین شرطوں کا بھی پتہ چلا۔ پہلی یہ کہ پچاس ہزار روپیہ دیا جائے، دوسری کرنل اور مسز فولکس کے قتل میں پکڑے گئے تمام لوگوں کے لیے مکمل معافی اور تیسری اس کے گینگ کے باقی چار افراد کی رہائی جنھوں نے پولیس پوسٹ کے چھاپے میں حصہ لیا تھا۔ قلی خان نے ان شرائط کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ ایک مشکل جدو جہد کے بعد 22 اپریل کو لیلن اسٹار کو مولی ایلس کا پتہ چل گیا اور یوں وہ واپس اپنے گھر آ گئیں۔ اس سے زیادہ، اس واقعہ کی تفصیل یہاں مناسب نہیں ہے۔

عجب آفریدی: ایک لوک کہانی

کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ عجب آفریدی کی وہ کہانی یہاں بیان کی جائے، جو اس وقت کوہاٹ کے آفریدی، اپنے جرگوں میں سناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ اس کہانی پر دو طرح کا ردِ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ کچھ پختونوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک بزدلانہ کارروائی تھی، جو پختونوں کو زیب نہیں دیتی۔ کچھ کا کہنا ہے، کہ ایسا کرنا، انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا اور اس کے ساتھ ساتھ، اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا بھی۔

اس کہانی کو مختلف لوگوں نے بیان کیا ہے، کچھ کا مقصد عجب خان آفریدی کو بہادر بنا کر پیش کرنا تھا، ایسے لوگوں نے کسی اور طریقے سے پیش کیا ہے اور جو انگریزوں کا ہمدرد تھا، وہ اسے بیان کرتے ہوئے کچھ اور ہی تصویر پیش کرتا ہے۔

میں نے کئی لوگوں کی تحریر سے جو بات اخذ کی ہے کہ عجب خان آفریدی نے میجر کے گھر حملہ ضرور کیا، لیکن اس کا ارادہ کسی بھی عورت کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ نہ وہ ایسا چاہتا ہی تھا۔ یہ قتل کسی غلط فہمی یا گھر میں داخل ہونے کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ غیر ارادی طور پر یہ قتل ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خاتون نے شور مچانے کی کوشش کی ہو۔ یاد رہے کہ عجب خان آفریدی نے یہ حملہ رات کے وقت کیا تھا اور بنگلے کے باہر پہریدار سو رہے تھے۔ اس سے عجب خان آفریدی کو یہ محسوس ہوا ہو کہ اب اس کی جان کو خطرہ ہے۔ البتہ ایک چھوٹی بچی کو اغوا کرنا اور ننگے پاؤں اسے لے کر پہاڑوں پر جانا اور کئی دن تک اسے چھپائے رکھنا ، یہ کوئی غلط فہمی نہیں تھی، بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا کام تھا۔

عجب خان آفریدی نے ایسا کیوں کیا؟ یہ وہی بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے بچی کو ایک خاندان کے پاس چھوڑا اور خود افغانستان فرار ہو گیا اور مزار شریف میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوا۔

عجب خان آفریدی کی کہانی ڈاکٹر ولیم ہیسٹن اور ممتاز نذیر نے بھی لکھی ہے[1]۔ میں اس کہانی کا خلاصہ پچھلے صفحات میں بیان کر آیا ہوں۔ مجھے یہ کہانی انگلش میں لکھی ہوئی ملی ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کہ اس تحریر کا ترجمہ کرنے سے اس کہانی کا لطف کھو سکتا ہے۔ اگر آپ کو اس واقعے سے دلچسپی ہو تو آپ اسے انگلش میں ہی پڑھیں تو بہتر ہو گا۔

مجھے 2023ء میں مزار شریف، افغانستان جانے کا اتفاق ہوا۔ مزار شریف کی تاریخ پڑھتے ہوئے پتہ چلا کہ عجب آفریدی کوہاٹ سے فرار ہو کر مزار شریف آگیا تھا، یہیں پر اس کی وفات ہوئی اور اس کی قبر بھی مزار شریف میں ہی ہے۔ میں یہ قبر تو نہ دیکھ سکا، البتہ اس کے متعلق جاننے کو کافی کچھ ملا، جس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔

جب ہم درۂ آدم خیل سے گزر رہے تھے، تو سلمان نے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ عجب کا گاؤں ہے۔ مولی ایلس نے 1983ء میں ستتر سال کی عمر میں، بریگیڈیئر محمد جان کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا۔ وہ اپنی والدہ کی قبر پر بھی گئی تھیں۔ محمد جان کے دادا اس ٹیم کا حصہ تھے، جس نے دور دراز علاقوں میں جا کر مولی ایلس کی تلاش کی تھی۔ یہ سب کچھ دلچسپ بھی اور اس میں روایات کے ساتھ ساتھ دشمنی، دوستی اور احترام کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

Ajab Khan Afridi[1]
Dr. Wilma Heston, Mumtaz Nasir
Bazar of the Storytellers, Lok Virsa c. 1998, Pakistan
http://www.khyber.org/people/a/Ajab_Khan_Afridi.shtml

کوہاٹ میں چند اہم مقامات

کوہاٹ میں ٹیکسٹائل ملز

یہ بات بھی شاید آپ کے لئے بڑی حیرت کی ہوگی کہ کوہاٹ کے اندر تین بڑی ٹیکسٹائل ملز ہیں۔ یہ تمام ملز ایوب دَور میں لگائی گئی تھیں۔ کوہاٹ ٹیکسٹائل مل سیف گروپ کی ملکیت ہے۔ عثمان سیف اللہ اس کے مالک ہیں۔ جنانہ دی ملوچو کی بنیاد جنرل حبیب اللہ نے 1960ء میں رکھی تھی۔ بابری ٹیکسٹائل نے 1970ء میں کام شروع کیا۔ اس کے مالکان میں جنرل علی قلی خان اور ان کا خاندان شامل ہے۔

ایک لمحے کے لئے سوچیں کہ یہ ملز کوہاٹ میں کیوں لگائی گئیں اور کس نے انھیں بنایا؟ یہاں تو کپاس پیدا نہیں ہوتی تھی۔ یہ تمام ملز ایوب خان کے دور میں لگیں، یا اس دور میں ان کی پلاننگ ہوئی۔ ان ملز مالکان کا تعلق فوج سے ہے اور یہ تمام لوگ ایک سیاسی میدان میں بہت متحرک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انھیں اپنے علاقے میں ملز لگانے کے لیے تمام تر سہولتیں پہنچائی گئیں۔ ان ملز کی وجہ سے کوہاٹ میں صنعتی ترقی بھی ہوئی اور مقامی لوگوں کو روزگار بھی ملا۔

آفریدی ان : پہاڑ کی چوٹی پر ایک نہ بھولنے والا ریستوران

سلمان خان آفریدی صاحب بہت ہی سمجھدار اور محبت کرنے والے ہمارے دوست ہیں۔ ہم شام کو چراغ بھائی سے ملنے کے بعد، درۂ آدم خیل کی طرف جانے والے پرانے راستے کی طرف چل پڑے۔ یہی وہ ایک راستہ ہے، جو پہاڑ کے اوپر سے گزر کر پشاور کو جاتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ریستوران واقع ہے، جس کا نام آفریدی اِن ہے۔ مقامی لوگ اسے منی منال بھی کہتے ہیں۔ منال نام کا ایک ریستوران اسلام آباد میں ایک پہاڑی کے اوپر بھی واقع ہے۔ علاقے کی روایات کے مطابق قالین پر بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ واجد آفریدی، جو اس ریستوران کے مالک ہیں، نے بتایا کہ ان کی کئی برانچز کراچی میں بھی قائم ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہم ایک ٹریک کی طرف چلے گئے۔

سلمان آفریدی نے بتایا، کہ یہاں پر سات کلومیٹر کے قریب لمبا ایک واکنگ ٹریک بنایا گیا ہے۔ یہ سارا علاقہ فوج کے کنٹرول میں ہے۔ انھوں نے ہی اسے بنایا ہے۔ ہمیں وہاں دو بندوق بردار لوگ ملے، جو خاصہ داروں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ وہاں سیکورٹی کی ڈیوٹی کر رہے تھے۔۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے انھیں خاصہ دار کہا جاتا تھا، لیکن اب انھیں پولیس میں شامل کرلیا گیا ہے۔ درۂ آدم خیل کے لوگ پولیس کی وردی کو پسند نہیں کرتے، اس لیے ہم اپنے روایتی ملیشیا رنگ کے شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی کہ کس طرح سے یہ لوگ شدید سردی اور گرمی میں پہاڑ کے اوپر بیٹھ کر ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، یاد رہے کہ آپ ہر وقت کسی نہ کسی کے نشانے پر ہوتے ہیں۔

سلمان آفریدی نے بتایا کہ یہ علاقہ کسی وقت طالبان کے قبضے میں آگیا تھا۔ فوج نے طالبان کے خلاف آپریشن کرنے کے لیے مقامی لوگوں کو نکلنے کے لئے کہا۔ سلمان آفریدی نے بڑے دکھ سے بتایا ہے کہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ بوڑھی بوڑھی عورتیں دو دو بچوں کو اٹھائے چلی آرہی تھیں۔ کوہاٹ کے لوگوں نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا اور اس مشکل وقت میں ان کی خدمت کی۔ ٹریک کے آغاز میں لکڑی کے ڈنڈوں سے ہی ایک پھاٹک بنایا گیا تھا۔

سلمان نے بتایا کہ گھمکول شریف کے کسی مرید نے بتایا کہ اسے پیر صاحب کی طرف سے حکم ملا ہے کہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کے اوپر اللہ کا لفظ لکھوں۔ اس شخص نے یہ سب بندوبست کیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر لفظ اللہ لکھا گیا اور وہاں پر روشنی کا بندوبست بھی کیا گیا۔ بعد میں ہم نے دیکھا کہ شہر میں بھی مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر آپ یہ سب دیکھ سکتے ہیں۔ اللہ کا لفظ بہت دور سے نظر آتا ہے، لگتا ہے کہ کافی بڑے سائز میں لکھا گیا ہے۔ ٹریک سے واپس آکر کھانا کھایا۔ کھانے کے جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ ہمیں ریستوران میں ہی رات کے گیارہ بج گئے۔ سلمان آفریدی نے ہمیں یتیم بچوں کے لیے بنائے گئے، آغوش میں چھوڑ دیا اور خود اپنے گھر چلا گیا۔ ہم نے رات آغوش میں بسر کی۔

تانڈہ ڈیم، شاہ پور درانی قبرستان

وعدہ کے مطابق اگلے روز سلمان آفریدی بھائی صبح ساڑھے آٹھ بجے آغوش تشریف لے آئے۔ ہم نے بچوں کے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور پوری کوشش کی اور اس پر عمل بھی کیا کہ ہمیں ناشتے میں وہی کچھ دیا جائے، جو بچوں کو دیا جاتا ہے۔ اس دن مینیو کے مطابق پراٹھا، انڈہ اور چائے تھی، جو ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ بچوں کا کھانا ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک بچہ یا ایک سے زائد بچے کھانا کھانے کی دعا پڑھاتے ہیں اور کھانا کھانے کے

بعد شکرانے کے الفاظ بھی ادا کرتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا اور پھر سلمان آفریدی صاحب ہمیں لے کر تانڈاڈیم کی طرف چل پڑے۔

کوہاٹ سے نکلتے ہوئے، ہم نے یہ دیکھا کہ ارد گرد بہت ہی سرسبز علاقہ ہے اور پھر چلتے چلتے ہم ایک جگہ پہنچ گئے، جو کافی اونچائی پر تھی اور وہاں سے کوہاٹ کا منظر بھی بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ کوہاٹ پہاڑوں کے درمیان میں ایک وادی کی مانند ہے۔ اللہ کا لفظ بہت واضح نظر آرہا تھا، جو دور پہاڑ کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ حسب معمول فوٹو گرافی کی گئی اور منظر کو اپنی آنکھوں میں سمویا گیا۔ اور پھر ہم تانڈہ ڈیم کی طرف چل پڑے۔

ایوب خان کے دور میں بہت سارے ڈیم بنے۔ ان میں سے ایک تانڈہ ڈیم بھی ہے۔ اس ڈیم کی تعمیر کا آغاز 1962ء میں ہوا اور یہ پانچ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ یہ ڈیم کئی ہزار ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ سلمان آفریدی نے بتایا کہ یہ ڈیم ایک بڑے کھاڑک یعنی برساتی نالے کے اوپر بنایا گیا ہے۔ اس ڈیم کے متعلق ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سائبریا اور دیگر سرد علاقوں سے آنے والے پرندے سردیوں کے موسم میں اس علاقے میں قیام کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل قوانین کے مطابق دنیا بھر میں پانی کی حفاظت کے لیے جو ڈیم بنائے جاتے ہیں، ان میں اس ڈیم کا شمار ہوتا ہے۔

جب ہم تانڈہ ڈیم پہنچے، تو موسم انتہائی خوشگوار تھا، ہلکی ہلکی دھوپ تھی، لیکن گرمی نہیں تھی۔ بہت ہی پُرسکون ماحول تھا۔ نیلگوں صاف پانی ہمیں نظر آرہا تھا، پہاڑوں کی پرچھائیاں بھی پانی میں صاف نظر آرہی تھیں۔ اب یہ ایک طویل پانی کی جھیل بن گئی ہے۔ یہاں پر کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ ایک صاحب دور سے ہمارے پاس کشتی لے کر آگئے تاکہ ہم کشتی پر سفر کر سکیں، لیکن ہمارے ساتھ بچے تھے، بچوں کی وجہ سے ہم کشتی میں سوار نہ ہوسکے۔ البتہ جھیل کے کنارے پر واقع ایک بہت ہی خوبصورت مقام پر ایک ریستوران تھا۔ ہم جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ایسے موقعوں پر چائے کا ہونا، ایک غیر معمولی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ اگر اس کے ساتھ باقی لوازمات بھی ہوں تو کیا کہنے۔ ہم بڑی دیر تک وہاں خاموش بیٹھے رہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ ان چند لمحات میں سے ہیں، جو کوہاٹ کے دورے میں ہمیشہ یاد رہیں گے، تو غلط نہ ہوگا۔

اس ڈیم میں پانی ذخیرہ کرنے کے بعد بہت سارے علاقوں کو نہروں کے ذریعہ پانی دیا جاتا ہے۔ ایک طرف سے ایک بہت ہی تنگ جگہ سے پانی باہر نکل رہا تھا۔ یہ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ جیسے وہ جیل میں قیدی تھا اور اس دروازے سے نکل کر باہر آکر آزاد ہوگیا

ہے۔ لگتا تھا کہ جیسے پانی کہہ رہا ہوں کہ میں قید سے آزاد ہو گیا ہوں، پہلے ایک جھیل نما جیل میں بند تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل رہا تھااور خوشی سے اونچی چھلانگیں لگا رہا تھااور کئی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ بعد میں سبک رفتاری سے چلتا ہواایک نہر میں داخل ہو رہا تھا۔ ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے، یہ سب کچھ بہت ہی خوبصورت لگا۔

میں نے ایک دن پہلے ہی سلمان آفریدی سے کہا تھا کہ یہاں پر ایک تاریخی جگہ ہے، ہم وہاں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں تصویر دکھائی تو انھوں نے کہا کہ تانڈہ ڈیم سے واپسی پر ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ یہ علاقہ شاہ پور کہلاتا ہے۔ یہاں پر ایک قبرستان جسے درانی قبرستان کہا جاتا ہے، یہ کوئی دو سو سال پرانا قبرستان ہے۔

یہ جگہ ڈیم سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ایک گاؤں کی گلی سے ہوتے ہوئے ہم اس جگہ تک پہنچ گئے۔ قبرستان کے سامنے امام بارگاہ موجود تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس علاقے میں اہل تشیع بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ایک اونچا مینار تھااور اس کے ساتھ بڑا گنبد نما کمرہ تھا۔ ان دونوں میں قبریں بھی موجود تھی اور ان کے باہر بھی کچھ قبریں تھیں، جو ابھی تک صحیح سلامت تھیں۔ فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا، جسے ہم سمجھ نہ سکے۔

جس طرح کا ہمارا رویہ عمارتوں کے ساتھ تھا، انھیں تو اب تک ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لگتا ہے کہ عمارتوں کی تعمیر بہت مضبوط طریقے سے کی گئی تھی، اسی وجہ سے یہ اب تک قائم ہیں۔ اس جگہ کی حفاظت کی سخت ضرورت ہے، ورنہ آنے والی نسلوں کو کچھ معلوم نہ ہوگا کہ یہاں پر کیا تھا۔

میں نے پچھلے صفحات میں آپ سے ذکر کیا تھا کہ کسی وقت میں یہاں پر درانی خاندان کی حکومت تھی۔ جب نادر شاہ نے افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ کوہاٹ کی بجائے پشاور کی طرف چلا گیا۔ اس طرح سے کوہاٹ تباہی سے بچ گیا۔ درانی قبائل کا تعلق بھی افغانستان سے ہے۔ جب افغانستان کے بادشاہ شجاع کی موت واقع ہوئی، تو یہ لوگ اس علاقے میں آ گئے۔ یہ واقعہ 1842ء کا ہے۔ کوہاٹ کے علاقے میں سکھوں کا راج تھا۔ اس کے چند سال بعد یہاں پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ ان لوگوں نے ان کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کیے اور انگریزوں نے ایک درانی جس کا نام سلطان جان سدوزئی تھا، کو اس علاقے کا افسر بنا دیا۔ سلطان اور اس کے والد کی قبر اسی جگہ پر موجود ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پرنس سلطان، احمد شاہ ابدالی کی پانچویں پشت سے تھا۔

احمد شاہ ابدالی کا نام،افغانستان کے بانی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے افغانستان نام کا کوئی ملک نہیں تھا۔ اس نے مختلف قبائل کو ملا کر ایک نیا ملک بنایا اور اس کا نام افغانستان رکھا۔ میں نے قندھار میں احمد شاہ ابدالی کے مزار کو بھی دیکھا ہے۔ وہاں کے لوگ اسے ایک ولی کے طور پر مانتے ہیں۔ اس کے مزار پر لوگ منت مانگنے آتے ہیں۔ منت مانگنے کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مزار کے ارد گرد واقع درختوں میں کیل ٹھونک کر منت مانی جاتی ہے۔ یہ 1999ء کی بات ہے۔ حال ہی میں (2023ء) میں دوسری مرتبہ ابدالی کے مزار پر گیا تھا۔ اب کوئی بھی کیل نظر نہیں آیا، یہ شاید طالبان کے نظریات کی وجہ سے ہے!

احمد شاہ ابدالی کو احمد شاہ درانی بھی کہتے ہیں۔ میں بڑی دیر سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھیں درانی کیوں کہا جاتا ہے۔ کافی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ ان کے قبیلے کا نام ابدالی تھا۔ انھوں نے اپنے لیے شاہ درِ دراں یعنی ہیروں کا ہیرا کا لقب پسند کیا۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد اس کے قبیلے کو درانی کہا جانے لگا۔ اس قبرستان میں قبروں کے علاوہ بھی کچھ عمارتیں تھیں۔ ان کے علاوہ محافظوں کے لیے جگہ بھی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہاں پر درانی لوگ دربار بھی لگایا کرتے تھے۔ ان تاریخی مقامات کی حفاظت کی سخت ضرورت ہے، ایسا کرنے سے ہی ہم اپنی تاریخ کو محفوظ کر پائیں گے۔

ہم نے قبروں کے ساتھ ایک مسجد بھی دیکھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اورنگزیب نے بنوائی تھی، لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ مسجد بند تھی، اس لیے ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ کہتے ہیں کہ سلطان ایک خطاط کے ساتھ ساتھ پشتو اور فارسی کا ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس نے مسجد کی دیواروں پر کیلی گرافی کی تھی۔

یہ جان کر بھی آپ کو خوشی ہوگی کہ عالمگیر کی ساتویں پشت میں سے ایک صاحب حیات ہیں، جو اپنے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ملکہ برطانیہ کو خط بھی لکھا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ ملکہ کے پاس کوہ نور ہیرا ان کے خاندان کی ملکیت تھا۔ وہ انھیں واپس کیا جائے۔ ملکہ کی طرف سے جواب آیا کہ اس ہیرے کے بہت سارے لوگ دعویدار ہیں، اس لیے یہ ہیرا آپ کو نہیں دیا جاسکتا۔

ہیرا انگریزوں نے طاقت کے زور پر حاصل کیا تھا، اب ان سے کوئی طاقت کے زور پر ہی واپس لے سکتا ہے!

ایسا کب ہوگا، معلوم نہیں، لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

سلمان آفریدی کا پٹرول پمپ، جو چوتھی نسل چلا رہی ہے

ہم درانی قبرستان سے واپس شہر کی طرف آ گئے اور شہر میں واقع سلمان آفریدی کے پٹرول پمپ پر کچھ وقت گزارا۔ سلمان خان آفریدی نے بتایا کہ یہ پٹرول پمپ، ان کے پردادا نے بنایا تھا۔ اُس وقت یہاں پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ریل گاڑی پر تیل لایا جاتا تھا اور ان کے پردادا ڈبوں میں تیل بیچتے تھے۔ اب یہ کام چوتھی نسل کر رہی ہے اور یقینی طور پر پہلے سے بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ میں نے وہاں پر دیکھا کہ انھوں نے پٹرول پمپ کے ساتھ دو تین کمرے بہت اچھے طریقے سے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ان کمروں میں جرگہ وغیرہ کرتے ہیں۔ سلمان کے چچا، شہریار آفریدی حکومت پاکستان کے وفاقی وزیر تھے۔ جب وہ وزیر داخلہ تھے، تو اُس وقت ان کی حفاظت کے لیے یہاں پر کئی حفاظتی انتظامات بھی کیے گئے تھے۔

میں وہاں پر موجود باتھ روم میں گیا، تو وہاں پر میں نے ایسی چیز دیکھی، جو اس سے پہلے میں نے کبھی کسی بھی جگہ پر نہیں دیکھی تھی۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا کارڈ لٹک رہا تھا، جس پر لکھا ہوا تھا ٹوائلٹ رولز۔ کوئی دس بارہ کے قریب ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ سب سے اہم ہدایت یہ تھی کہ آپ کو جیسا صاف ستھرا ٹوائلٹ ملا ہے، اسی طرح سے اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر جائیں۔ سلمان آفریدی بہت زیادہ صفائی پسند آدمی ہے۔ اس کی صفائی کی عادت خطرناک حد تک پختہ ہے۔

کافی وقت ہو گیا تھا، ایک بجنے والا تھا اور ہمیں واپس لاہور بھی جانا تھا، لیکن سلمان کا خیال تھا کہ جب تک آپ درۂ آدم خیل کے کباب نہیں کھا لیتے، آپ کا دورہ ادھورا رہے گا۔ ہم نے سرِ تسلیم خم کیا۔ پروگرام کے مطابق درہ آدم خیل جانے سے پہلے ہمیں کھمکول شریف، جہاں ایک بزرگ کا مزار ہے، جانا تھا۔

میں نے بارہا لوگوں سے کھمکول شریف کا نام سنا۔ میں نے اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، جو سلمان نے پوری کر دی۔ سلمان آفریدی نے بتایا کہ ان کے خاندان میں بہت سارے لوگ اس پیری مریدی کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن گھر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہاں آتے ہیں۔ سلمان نے کہا کہ میرے والدین بھی اس طرح کی پیری مریدی کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے جب میں شام کو گھر جاؤں گا، تو اپنے والد کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں کھمکول شریف گیا تھا۔ اس جگہ پر جو بزرگ دفن ہے، انھیں خواجہ زندہ پیر کہتے ہیں۔

ہم گھمکول شریف چلے گئے۔ ہم نے وہاں دیکھا کہ چاروں طرف پہاڑ ہیں اور درمیان میں ایک بہت بڑا علاقہ ہے، جہاں پر مسجد، مہمان خانہ، ملاقات کا ہال اور مزار واقع ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے بڑا اور خوبصورت نظام میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے پاکستان بھر میں کئی مزاروں پر جانے کا اتفاق ہوا، لیکن جس قدر صاف ستھرا یہ مزار تھا، مجھے کہیں دوسرا نظر نہیں آیا۔ البتہ ایران میں واقع مزارات اسی طرح وسیع ہیں اور انتہائی صاف ستھرے بھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ دین اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور ان میں سے اکثر نے کبھی بھی خلاف شریعت باتیں نہیں کی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے مزارات کو، ان کی تعلیمات کے برعکس بنادیا گیا۔ ہر جگہ ایسا نہیں ہوا۔ اکثر مقامات پر ایسا ہی ہوا ہے۔ اس جگہ کی شان و شوکت، گنبد کی بلندی، مہمان خانہ اور لوگوں کی خدمت پر مامور لوگوں کو دیکھ کر لگا کہ یہ بہت ہی کوئی منظّم ادارہ ہے، جو یہ سارا سلسلہ چلا رہا ہے۔

ہمیں بھی انھوں نے کھانے کے لئے کہا، جس پر ہم نے معذرت کرلی کیونکہ ہم درۂ آدم خیل کے کباب کھانا چاہ رہے تھے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہمارے کوہاٹ کے دورہ کا ایک اہم کام رہ جاتا اور میرا پیارا دوست سلمان آفریدی، ہم سے ناراض بھی ہو سکتا تھا، جو ہم نہیں چاہتے تھے۔

ہم کوہاٹ سے ہوتے ہوئے درۂ آدم خیل کے بازار سے گزرے۔ اس موقع پر مجھے 34سال قبل یہاں سے گزرنا یاد آگیا۔ اُس وقت میرے ساتھ میرے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ وہ بھی بڑا ہی یادگار سفر تھا۔ لاہور سے کوہاٹ پشاور اور پھر سوات سے ہوتے ہوئے واپس لاہور۔ یہ ایک طویل سفر تھا، جو اب تک یاد ہے۔

درۂ آدم خیل کے بازار سے گزرتے ہوئے، ہم نے بے شمار اسلحہ کی دکان دیکھیں۔ ایک آدھ مرتبہ فائر کی آواز بھی سنائی دیں۔ اب یہاں پر ہر لحاظ سے امن ہے۔ اس لئے کسی کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے سلمان آفریدی کی وساطت سے میری ایک مرتبہ پھر سے درۂ آدم خیل دیکھنے کی خواہش کو پورا کر دیا۔

کباب کھانے سے پہلے سلمان آفریدی ہمیں ایک چوک میں لے گئے، جہاں ایک شخص کا مجسمہ لگا ہوا تھا، جس نے ایک ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے کندھے پر بندوق تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ عجب آفریدی کا مجسمہ ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ ایک تاریخی مجسمہ تھا۔ یاد رہے کہ جب ملک بھر میں دہشت گردی عروج پر تھی، اس وقت درۂ آدم خیل کے لوگوں نے اپنے علاقہ سے دہشت گردوں کو نکالنے کے لیے ایک جرگہ کا اہتمام کیا۔ ایک بڑی

تعداد میں لوگ اس جگہ پر موجود تھے، خود کش حملہ آوروں نے یہاں پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں سو سے زیادہ لوگ شہید ہو گئے۔ مجسمہ کے نیچے چبوترے کے چاروں طرف ان لوگوں کے نام تھے، جنھوں نے ملک کی خاطر جان قربان کی۔ ان سب کے اوپر ایک قبائلی اپنے روایتی لباس میں بندوق کے ساتھ کھڑا تھا، کہہ رہا تھا کہ ابھی ہم زندہ ہیں۔ ان لوگوں کے نام پڑھ کر جن کو بے گناہ شہید کیا گیا، بے حد دکھ ہوا۔ اللہ رب العزت ان کی شہادت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

اس دہشت گردی کی جنگ میں وہ کون ساز خم ہے، جو قوم نے نہ اٹھایا ہو۔ یہ دہشت گرد کس طریقے سے پاکستان آئے، کس نے انھیں سنبھالا، کس نے انھیں پالا، کس نے انھیں بھروسہ دیا، کبھی تو یہ راز کھلے گا اور بہت سے چہرے بے نقاب ہوں گے۔ ان کے حملوں سے کوئی بھی نہ بچا، بازار نہ بچے، مساجد نہ بچیں، نہ اسکول، نہ ہوٹل، نہ امام بارگاہیں، نہ مزار، ہمارے ہیروں جیسے لوگ شہید کر دیے گئے۔ اتنے بے گناہ لوگوں کی قربانی دینے کی وجہ سے آج ہم امن سے درۂ آدم خیل سے گزر رہے تھے۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، دہشت گردوں کو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عبرت ناک سزا دے اور ہمارے شہداء کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

سلمان خان آفریدی ہمیں ایک کباب والے کی دکان پر لے گئے، جس کا نام پپو کباب تھا۔ عام طور پر اس طرح کے نام پنجاب میں رکھے جاتے ہیں۔ وہاں یہ نام دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک بڑی سی جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لیے بھی بہت مناسب اور صاف ستھری جگہ میسر تھی۔ کباب بڑے گوشت کے قیمے سے بنائے جاتے ہیں۔ عام طور پر قیمہ کے متعلق لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن جو کباب ہم نے کھائے بہت ہی مزے دار تھے اور تازہ گوشت کے قیمہ سے بنے ہوئے تھے۔ سب نے دل کھول کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہمیں تقریباً تین بج چکے تھے۔ اس طرح سے ہم کوئی تین بجے کے قریب، پشاور کے راستے واپس لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک طویل سفر کے بعد رات گیارہ بجے بخیریت گھر پہنچ گئے۔

اس سفر کی داستان میں، میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو کوہاٹ اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں کے متعلق کچھ معلومات دی جائیں۔ کیونکہ یہ سفر نامہ کئی سفروں پر مشتمل ہے، اس لیے آپ کو اس میں تکرار بھی نظر آئے گی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان: نیا شہر، پرانی روایت

میں 1980ء میں ٹیکسٹائل کالج میں پڑھتا تھا، اس وقت میرے ایک کالج فیلو جناب افتخار بنگش صاحب جو کہ میرے انتہائی عزیز دوست بھی ہیں، ڈی آئی خان میں رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اسلامی جمیعت طلبا کے سلسلہ میں بھکر آیا، اس وقت بھکر میں جناب اسلم جاوید صاحب رہتے تھے۔ اسلم جاوید صاحب کے ساتھ مل کر ڈی آئی خان میں افتخار بنگش سے ملنے کا پروگرام بنایا اس وقت ٹیلی فون کا نظام اتنا مضبوط نہیں تھا کہ پہلے سے رابطہ کیا جا سکتا۔ اس لئے اس امید کے ساتھ چل پڑے کہ بنگش صاحب اپنے گھر پر ہی ہوں گے۔ ہم بھکر سے دریا خان آئے۔ اُس وقت دریا خان کے پاس دریائے سندھ کے اوپر ابھی پل نہیں بنا تھا۔ ایک چھوٹا بحری جہاز چلتا تھا، جس میں کافی ساز و سامان بھی آجاتا تھا، بہت سارے جانور بھی اس میں لائے جاتے تھے۔ وہ دریا کے ایک طرف سے دوسری طرف لوگوں کو اور سامان کو لے کر جاتا تھا۔

اس جہاز کا نام "ایس ایس جہلم" تھا۔ اسے "ڈی آئی خان کا ٹائی ٹینک" بھی کہا جاتا تھا۔ اس کا آغاز انگریزوں کے دور میں ہوا تھا۔ میں نے 1980ء میں اس میں سفر کیا تھا۔ یہ دریا کے ایک طرف سے چل کر دوسری طرف جاتا ہے۔ پھر 1985ء میں یہاں پل بن گیا اور جہاز کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایک مرتبہ 25 جولائی 1999ء کو ڈی آئی خان میں ایک شدید طوفان آیا جس کے نتیجے میں یہ تاریخی جہاز دریا میں ڈوب گیا تھا اور نئی نسل ایک قیمتی، قومی اور تاریخی ورثے سے محروم ہو گئی۔

یہ جہاز پہلی عالمی جنگ کے دوران یعنی 1917ء میں بھی استعمال ہوا تھا۔ بعد میں اسے 1935ء میں صوبہ سرحد کی حکومت نے اسے پنجاب حکومت سے خرید لیا۔ اور یوں کوئی پچاس سال تک یہ جہاز مقامی لوگوں کے استعمال میں رہا اور ان کی ایک اہم ضرورت پوری کرتا رہا۔

مجھے یاد ہے کہ اس وقت اس کا کرایہ ایک روپیہ فی کس تھا۔ میں اور اسلم جاوید صاحب اس کے ذریعے دریا کے دوسری طرف ڈیرہ اسمٰعیل خان میں اترے، سامنے دیکھا تو بے شمار سائیکل رکشہ کھڑے تھے۔ جو لوگوں کو شہر کی طرف لے کر جاتے تھے۔ کوئی تانگہ رکشہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ دل میں یہ خیال آیا کہ اس رکشے پر بیٹھنا اس فرد پر ظلم ہے، ہمیں کوئی اور طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن جب کوئی اور طریقہ کار نہ ملا تو ہم نے سائیکل رکشہ کو ترجیح دی اور یہ میرا زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں سائیکل رکشہ پر بیٹھا، ہم دو نوجوانوں کو ایک ادھیڑ عمر آدمی، جو کمزور بھی تھا، کھینچ رہا تھا۔

اس وقت ڈیرہ اسمٰعیل خان اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا۔ ہم اندرون شہر چلے گئے جہاں بڑے بڑے دروازے اور بڑی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ بازار بھی بہت ہی روایتی قسم کا تھا۔ ہم جب افتخار بنگش کے گھر پہنچے تو پتہ چلا افتخار شہر سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں مایوسی تو ہوئی، لیکن ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا کہ ہم واپس چلے جائیں۔ جانے سے پہلے ہم نے شہر کی سیر کا ارادہ کیا، تھوڑا سا گھومے پھرے، ایک ہوٹل سے کھانا کھایا۔ مجھے اب تک وہ ہوٹل یاد ہے کہ کس طرح دھوئیں سے اس کی تمام دیواریں سیاہ تھیں۔ دیواروں پر فلمی اشتہار لگے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہم واپس چلے گئے۔

دوسری مرتبہ مجھے 2015ء میں اس شہر میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ رحمت اللہ اور ایک دو اور لوگ تھے۔ ہم رات کو دریا کے کنارے ایک خوبصورت ہوٹل میں ٹھہرے جس کا منظر نہایت حسین تھا۔ انھوں نے بڑی روایتی چیزوں سے اپنے ڈائننگ ہال کو سجایا ہوا تھا جو بہت ہی خوبصورت لگا۔ گرمیوں کا موسم تھا، دریا کا کنارہ خوبصورت ہوٹل اور ایک تاریخی شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان، ان سب نے مل کر ہماری سیاحت کو خوشگوار بنا دیا۔

اب کی بار یعنی 11 دسمبر 2018ء کو میں اور میرے ساتھ جناب محمد عمر بھٹی، جناب عاصم الٰہی مانگٹ، جناب شعیب ہاشمی اور ہمارے نواسے صاحب جناب احمد عمر بھٹی صاحب لاہور سے کوئٹہ جارہے تھے۔ راستے میں ہم نے ڈیرہ اسماعیل خان میں الخدمت فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے ایک آغوش میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ برادرم منظر مسعود خٹک صاحب نے ہماری رہنمائی کی ہم سیشن چوک چلے گئے، جہاں پر منظر صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہم تقریباً ایک گھنٹہ آغوش میں رہے اور پھر وہاں سے براستہ ژوب کوئٹہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ یہاں آنے کا اتفاق ہوا۔ ان تمام اسفار میں اس علاقے بارے جو کچھ جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان خیبر پختونخوا کا جنوب میں آخری ضلع ہے۔ اس کے بالکل جنوب میں واہواہ نام کا ایک شہر ہے، جو ڈیرہ غازی خان میں واقع ہے اور پنجاب کا آخری شہر ہے۔ اس کے پاس ہی وہ مقام ہے جہاں کے پی کے، بلوچستان اور پنجاب کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ڈی آئی خان کے جنوب میں بلوچستان کا قلعہ سنڈیمان، مغرب میں وزیرستان، مشرق میں پنجاب اور شمال میں لکی مروت واقع ہے۔ یوں ایک طرح سے یہ ایک مرکزی مقام بنتا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان جہاں ایک زرخیز علاقہ ہے، وہیں اس میں وسیع و عریض نخلستان بھی موجود ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ سرائیکی اور ہندکو (اسے ہنکو بھی کہا جاتا ہے) زبانیں بولتے ہیں۔ افغانستان سے ایک کثیر تعداد میں آئے، پختون اب آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ میں نے اس شہر میں پنجاب سے گئے لوگ بھی دیکھے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے، کہ ڈی آئی خان کے پاس لکی مروت، بنوں، اور ملحقہ وزیرستان کے علاقوں میں پختون بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ بھی بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کہ ڈی آئی خان سے کوئی بیس کلومیٹر پہلے، رحمان ڈھیری کے مقام پر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے آثار بھی دریافت ہوئے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی یہاں ایسا ایک شہر آباد تھا، جس کا ڈیزائن موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے شہروں کی طرز کا تھا۔ (باوجود کوشش کہ میں یہاں نہ جا سکا، زندگی رہی پھر سہی)۔ ڈی آئی خان اپنے ہاں کی پیتل سے بنی آرائشی برتن اور دیگر اشیاء کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ ڈی آئی خان کا مشرقی علاقہ جو دریائے سندھ کے ساتھ ہے، بے حد زرخیز ہے جب کہ اس کے مغربی اور جنوبی علاقے پانی کی قلّت کی وجہ سے ایک ریگستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس کے جنوب مغرب میں جنوبی وزیرستان واقع ہے، جس کی سرحد بھی اس سے ملتی ہے۔ ڈی آئی خان اور بلوچستان کے درمیان کوہ سلیمان ایک حدِ فاصل ہے۔ ٹانک بھی اس سے دور نہیں ہے۔

دوسری طرف لکی مروت کے میدان واقع ہیں جہاں مٹی اور ریت کے پہاڑ ہیں۔ یہ علاقہ بھی زیادہ تر خشک ہے۔ ہمیں ساتھیوں نے بتایا کہ دریائے سندھ کے قریب ہی ایک علاقہ ہے جسے چونا پتھر کی پہاڑیاں کہا جاتا ہے۔ اس جگہ کو کافر کوٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک قدیم ہندو مندر بھی پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ڈی آئی خان کو کئی لحاظ سے پاکستان کا مرکز مانا جا سکتا ہے۔ ڈی آئی خان میں ساٹھ فیصد سے زائد لوگ سرائیکی بولتے ہیں جبکہ تیس فیصد لوگ پشتو بولتے ہیں۔ پنجابی اور اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

ڈی آئی خان میں ہندو اور بدھ مت کی ابتداء

میں مدت سے اس بات کی تلاش میں تھا کہ یہ جان سکوں کہ خیبر پختونخوا کے ساتھ ساتھ افغانستان کے دور دراز علاقوں میں جو ہندو اور بدھ مت کے اثرات ملتے ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی یہاں ان مذاہب کے ماننے والی کثرت سے آباد تھے، یہ سب ساتویں صدی سے پہلے کی بات ہے، جب ابھی مسلمان ان علاقوں میں نہیں آئے تھے، یہ مذاہب کب اس علاقے میں آئے، کون لے کر آیا؟ کیونکہ ہندو اور بدھ مت کی ابتداء تو شمالی ہندوستان سے ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ہوگیا؟ یہ بات تو سمجھ آتی ہے کہ اس علاقے میں اسلام عربوں، ایرانیوں اور وسطی ایشیاء کے مسلمانوں کی وجہ سے آیا۔

میں جب ڈی آئی خان کی تاریخ پڑھ رہا تھا تو مجھے کئی مفید کتابیں پڑھنے کو ملیں جن سے مجھے ان سوالوں کے جواب بھی مل گئے۔ یہ جواب میری تسلی کے لیے کافی ہیں۔ ممکن ہے آپ ان جوابات سے مطمئن نہ ہوں۔

میں نے اس تحریر کے ایک بہت ہی قابلِ تعریف جرنل[1] کے مختلف مضامین کے علاوہ بلوچ قبائل متعلق ایک ویب سائٹ[2] سے بھی مدد لی ہے۔ ڈی آئی خان کی مختصر تاریخ ایک

---

[1]Ancient Pakistan is a peer-reviewed journal of the Department of Archaeology, University of Peshawar which publishes high quality articles in the field of Arts and Humanities.

[2]Baloch tribes of the Saraiki Waseb – by Farooq MianaAPRIL 20, 2010 ؛ https://waseb.org/2010/04/20/baloch-tribes-of-the-saraiki-waseb-by-farooq-miana/

انگریز نے بھی 1871ء میں لکھی[1]۔ اس کے علاوہ گل محمد خان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ سے بھی مدد لی ہے[2]۔

ڈی آئی خان کا نام ملک سہراب دودائی کے بیٹے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ملک سہراب دودائی نے ہی ڈی آئی خان کی بنیاد رکھی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کوئی تین صدیاں قبل مسیح یہ علاقے، ہندوستان کی ایک بڑی ریاست نندا کے زیر اثر تھے۔ پھر اس پر چندر گپت موریہ نے کنٹرول میں حاصل کر لیا۔ بعد ازاں اس پر شونگا حکمران بھی قابض رہے۔ اس وقت تک اس علاقے میں ہندو یا بدھ مت مذہب عام نہیں تھا۔ اسی دور میں اس علاقے پر ہندو اور بدھ حاکم بنتے ہیں۔

یہاں وہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندو یا بدھ لوگوں نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا یا ان کی تبلیغ کے نتیجے میں یہاں کے حکمران جن کے مذہب کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا، ان لوگوں نے ہندو یا بدھ مت اختیار کر لیا ہو؟

اگر آپ نے موہن جوداڑو یا ہڑپہ کے عجائب گھر دیکھے ہوں تو آپ کو وہاں تین چیزیں نہیں ملتی؛ لوہا، گھوڑا اور کسی بھی طرح کا کوئی بت جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ کسی خدا

---

[1]The District of Dera Ismail Khan, Trans-Indus

T. W. H. Tolbort

1871 - Dera Ismāīl Khān District (Pakistan) - 21 pages

[2]TRIBAL SETTLEMENT AND SOCIO-ECONOMIC INTEGRATION: A CASE STUDY OE THE BANNU LOWLANDS, PAKISTAN

Gul Muhammad Khan

School of Oriental and African Studies University of London ،April 1983

کی پوجا کرتے تھے۔ میں نے ان مقامات کی سیر کرتے ہوئے، خود بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔ آپ کو بھی موقع ملے تو ضرور اس بات کا مشاہدہ کریں۔

میں جو جان سکا، وہ یہی ہے کہ ڈی آئی خان اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں اسی طرح کی تہذیب موجود تھی، جیسے وادیٔ سندھ کی۔ یہ بھی یاد رہے کہ ڈی آئی خان بھی دریائے سندھ کے مغربی کنارے ہی آباد ہے۔ اسی دریا کے مغربی کنارے پر کئی سو میل کے بعد لاڑکانہ کے پاس موہن جوداڑو کے کھنڈرات پائے گئے ہیں۔ اس لیے دونوں کا ایک جیسا ہونا کوئی بعید نہیں۔

سندھ تہذیب کے خاتمہ کے بعد اس علاقے پر شمالی اور وسطی ہندوستان سے لوگوں نے آکر حکومت کی اور یہاں اپنے مذہب کی بھی ترویج کی۔ یہ سلسلہ ساتویں صدی تک چلتا رہا۔ بعد میں عربوں، ایرانیوں اور وسط ایشیاء سے آنے والے مسلمان اس علاقے کے حاکم بن گئے اور مقامی لوگ بھی اسلام لے آئے اور باہر سے آنے والے پختون اور بلوچ آ بسے۔ یہ علاقے بدھ مت کے حکمران کنشک عظیم کے دور میں بدھ مت کے بڑے مراکز مانے جاتے تھے۔ گپتا سلطنت کے دور میں بھی علاقے میں ہندو اور بدھ فن تعمیر کو فروغ ملا۔

گل محمد خان کے مقالے میں پختون کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ اس مقالے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے بسنے والے کب مسلمان ہوئے؟ ان کی تحریر میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔ یہ تحریر انگریزی میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ صحیح بات جاننے میں مددگار ثابت نہیں ہوگا۔

The origin of the Pathan tribe

The name 'Pathans' is said to be a corruption or mispronunciation of the name 'Pakhtuns', but it is by the former name they are better known. 'Pathan' also means 'rudder' or 'pilot', suggesting a different derivation, as shown below.

There is now a combined population of perhaps up to twenty million 'Pathans' (estimates vary), consisting of both tribesmen and tribal derivatives. Tribesmen live in their own territory which extends between the borders of Pakistan and Afghanistan and

south of the border of the Soviet Union. This territory extends from the Hindu Kush range in the north to the Arabian sea coast of Baluchistan in the south. Tribal Pathans - Afridi, Bhittanis, Ghilzais, Mohmands, Orakzais, Daur, Mahsuds, Wazirs, and many more, are roughly grouped under two, ’Afghans', if they live nearer

Afghanistan, and 'Pathans1, if they live nearer Pakistan, but both groups are often referred to as 'Pathans'. Pathan derivatives live both in Afghanistan proper and in Pakistan's 'frontier' or settled regions. A large number of Pathans are Pakistanis, in what is called the 'North West Frontier Province'. Through genealogy, culture and language, the Pathans and Pathan derivatives, however, remotely and theoretically, are all related.

It is possible that Herodotus was referring to the forbears of modern Pathans when he wrote that the ‘‘Pactyan nation, consisting of the Aparytae, the Satragydae, the Dadica and Gandhari,’’of whom the Pathans proper are the modem representatives, was then in existence. The Aparytae (or Afridis) held the country of Safed Koh, Satragydae (or Khattaks), the Sulaiman range and the northern portions of the plain between it and the Indus, the Dadicas (or Dadic) modern Seistan, and the country between the Kandahar province and the Sulaiman range, and the Gandhari occupied the Peshawar valley north of the Kabul river and the hills circling it to the north(Ridgway 1910), and for those parts of India through which he penetrated with his army were destitute of Gold, and their Diet was no ways delicate. But the inhabitants were strong built, large limbed and taller in stature than are the rest of the Asiaticks many of them being little less than five cubits high. Their complexion is more swarthy than any yet known, except the Ethiopian, and their skill in military affairs far surpasses all the Inhabitants of Asia besides. Even those warlike Persians, by whose valour Cytus, the son of Cambysses, deprived the Medes of the Empire of Asia and brought many nations under subjection, partly

by force and partly by voluntary surrender, are by no means to be compared with those Indians (Arrianus, F., 326 BC). Also, And there are other tribes, differing from one another in stature, shape and courage: the differences are those I formerly mentioned and now will explain more clearly: such as inhabit a country which is mountainous, rugged, elevated, and where the changes of seasons are very great are to be naturally of an enterprising and warlike disposition; and such persons are apt to have no little of the savage and ferocious in their nature. When the country is bare not fenced, and rugged, blasted by the winter and scorched by the sun, there you may see the men hardy, slender, with well shaped joints, well braced and shaggy; sharp vigilance accompanies such a constitution; in morals and passions they are haughty opinionative, inclining to the fierce rather than to mild; and you will find them acute and ingenious as regards the arts, and excelling in military affairs; and likewise all the other productions of the earth corresponding to itself (Hippocrates).

An interesting additional historical insight is that Kais, who was the original 'Pathan', meaning 'rudder' or ’pilot', by similar legend, traces his ancestry to Afghans (in the 37th lineal descent), son of Jeremiah, son of Saul (Talut) who was King Solomon's commander-in-chief, and builder of his temple in BC 1005. Later Saul became King (Malik) of Israel. Another of the derivation stories is that ’Pathan' is a corruption of the word 'Fattchan' or victorious, a title bestowed on the people by Muhammad for their valour. Thus the ancient Pactyan nation of Herodotus and the Afghans of Ghor, are said to have acquired the same name.

About 622 AD, when Muhammad proclaimed himself the Prophet of God, a chief of his own Arabian tribe Quresh, one Khalid bin Walid, was sent by him as an apostle of the new religion to the Afghans of Ghor, who until then professed the Magian religion. The

Afghans embraced the new faith, converted to it by the small body of their own tribe, who had gone to Arabia under the leadership of Kias.
After conversion, Kais became known as Abdul Rashid, who, according to genealogical legend, was father of the three sons from whom sprang the Afghan, Pathan and Ghilzai tribal branches-

اس تحریر کا خلاصہ یہ کہ 'پٹھان' نام دراصل 'پختون کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے (کچھ علاقوں میں خ کی بجائے ش کا حرف استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے کچھ لوگ پختون بولتے ہیں اور پشتون بولتے ہیں۔ میں اس کتاب میں پختون لفظ ہی استعمال کر رہا ہوں) پختون لوگ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک وسیع علاقے اور سوویت یونین کی سرحد سے لے کر کوہ ہندوکش کے وسیع و عریض علاقے سمیت، بحیرۂ عرب کے ساحل تک کے علاقوں میں آباد ہیں۔ میں نے اس بات کا خود تجربہ کیا ہے کہ موجودہ خیبر پختونخوا اور افغانستان کے باہر بھی پاکستان کے کئی علاقوں میں پختون ایک کثیر تعداد میں آباد ہیں۔

گل محمد خان مزید لکھتے ہیں کہ 'پٹھان' لفظ 'فتحان' یا فاتح کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جب آپ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو آپ ﷺ نے 622 عیسوی میں حضرت خالد بن ولید کو تبلیغ کے لیے اس علاقے میں بھیجا۔ وہ اس وقت غور میں آباد افغانوں کے پاس آئے۔ یہ افغان اس وقت تک مجوسی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان افغانوں نے اسلام قبول کیا۔ اوّلین لوگوں میں ایک افغان قبیلے کے سردار قیس تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ بعد میں عرب بھی گئے اور ان کا نام عبدالرشید رکھا گیا۔ ان سے تین بیٹے تھے جن سے آگے افغان، پٹھان اور غلزئی قبائلی نسل چلی۔ یہ سب لوگ موجودہ افغانستان میں آباد تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ اس علاقے میں آن آباد ہوئے۔ کئی تاریخ دان اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے؛ عدمِ تحفظ، مالی خوشحالی کی خاطر یا اپنے ماتحت علاقے میں توسیع کی خاطر۔

کیا یہ سب جان کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پختون صدیوں سے افغانستان کے مختلف علاقوں میں آباد تھے اور وہ اسلام سے پہلے مجوسی یا کسی اور مذہب کے ماننے والے تھے، انھوں نے عربوں کی دعوت پر اسلام قبول کیا یا وہ عرب سے آکر یہاں آباد ہوئے اور بنی اسرائیل سے

ان کا تعلق تھا۔ اس بارے تاریخ دان کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔۔۔ میں بھی ان سب سے جزوی اتفاق کرتا ہوں۔۔۔آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔ ضرور بتایئے۔

سرائیکی وسیب اور بلوچ

اگر آپ ملتان سے شروع ہو کر ڈی جی خان سے ہوتے ہوئے ڈی آئی خان تک آئیں تو آپ کو ایک بڑے علاقے میں سرائیکی بولنے والے لوگ ملیں گے۔ مجھے کسی نے یہ بتایا کہ نصیر آباد، جعفر آباد وغیرہ علاقوں میں بھی کہیں کہیں سرائیکی بولی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تاریخ کے متعلق فاروق میانہ کی ایک تحریر ملتی ہے[1]۔

اس تحریر کے مطابق سرائیکی وسیب یعنی سرائیکی بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد بلوچ عوام پر مشتمل ہے اور کئی اضلاع میں آباد ہیں۔ ان کی جو بھی قدیم زبان تھی، وہ یہ بھول چکے ہیں اور اب سرائیکی کو ہی مادری زبان کے طور پر بولتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ سرائیکی میں ضم ہو چکے ہیں۔ ان کا رہن سہن، بود و باش وغیرہ بلوچستان کے بلوچ قبائل سے بہت مختلف ہے۔ یہ بات بھی درست ہے، کہ ڈیرہ غازی خان، راجن پور اور روجھان میں آباد بعض بلوچ قبائل اب بھی اپنے رسم و رواج میں سرائیکی لوگوں سے مختلف ہیں۔ ان میں سے کئی تو اب بھی بلوچی زبان بولتے ہیں۔

بلوچ کب اس علاقے میں آئے؟

فاروق میانہ کے مطابق پندرہویں صدی کے وسط میں بلوچ، بولان کی طرف سے آ کر سرائیکی وسیب میں آباد ہونا شروع ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کوہِ سلیمان کے قرب وجوار میں واقع علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے کہ کوہِ سلیمان کے مشرق میں پختون آباد تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وسیع علاقے میں جاٹ بھی آباد تھے۔

بلوچ یہاں کیوں آئے؟ یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس کا مختصر احوال یہ کہ پندرہویں صدی کے وسط میں براہوئی قبیلہ نے بلوچوں کو قلات سے بے دخل کر دیا۔ ان

---

[1]Baloch tribes of the Saraiki Waseb – by Farooq Miana

https://waseb.org/2010/04/20/baloch-tribes-of-the-saraiki-waseb-by-farooq-miana/

لوگوں نے ملتان کے لانگاہ حکمرانوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ اسی دور میں ملک سہراب خان کے بیٹوں اسماعیل خان، فتح خان اور غازی خان نے تین ڈیروں کی بنیاد رکھی؛ ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ فتح خان۔

یوں اس علاقے میں بلوچ آکر آباد ہو گئے۔ اب اس طرح اس علاقے میں تین طرح کے لوگ آباد ہیں؛ پختون، بلوچ اور سرائیکی۔ تینوں اپنی زبان بولتے ہیں۔ سرائیکی سب کی مشترکہ زبان ہے۔ جماعت اسلامی کے ایک رہنما جناب اعجاز اعوان بھی ڈی آئی خان میں رہتے ہیں۔ ان کے بقول، اس علاقے میں اعوان بھی ایک بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جب 2022ء میں ڈی آئی خان میں سیلاب آیا تھا، تب انھوں نے متاثرین کے لیے بے حد کام کیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ بھی کئی انٹر نیشنل اداروں سے وابستہ ہیں۔ بہت ہی دور اندیش اور متحرک ساتھی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں ماضی قریب میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے حوالے سے ہونے والے چند اہم واقعات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس شہر کی ایک نسبت مولانا مفتی محمود صاحب اور ان کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن صاحب ہیں، جو یہاں سے الیکشن لڑتے تھے اور جیتتے بھی ہیں۔ وہ 2018ء کا الیکشن ہار گئے اور ان کی جگہ امین گنڈاپور نے جو کہ پی ٹی آئی کے امیدوار تھے، نے سیٹ حاصل کر لی۔ چند سال قبل ایک مشہور فلم اداکارہ مسرت شاہین نے بھی مولانا کے خلاف الیکشن لڑا تھا جو کہ کافی مشہور ہوا تھا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان کے چند شعراء کا ذکر؛

جے کرشن چودھری حبیب کی ایک خوبصورت غزل[1]؛

ہر آنے جانے والے کا منہ دیکھتا رہا

میں رہ گزر پہ زیست کی تنہا کھڑا رہا

اس زندگی نے زخم دیئے بارہا مگر

جانے ہر ایک زخم کو کیوں چومتا رہا

---

https://www.rekhta.org/ghazals/har-aane-jaane-vaale-kaa-munh-dekhtaa-rahaa-jaikrishn-chaudhri-habeeb-ghazals?lang=ur[1]

چھوڑا ہے آندھیوں نے نہ باقی نشان راہ

پھر بھی میں تیرا نقش قدم ڈھونڈتا رہا

تنہا نہیں رہا ہوں میں تیرے فراق میں

دل پر تیرے ہی درد کا پہرا لگا رہا

دن کو تو سلسلے تھے غم روزگار کے

شب بھر ترے خیال کا تانتا لگا رہا

یاد حبیبؐ تھی کہ دھندھلکوں میں کھو گئی

دل میں سوائے خاک کے باقی بھی کیا رہا

ڈاکٹر طالب حسین اشرف کی ایک غزل؛

دیوار کے سائے میں کھڑا سوچ رہا ہوں
دیوار ہوں، سایہ ہوں کہ سانسوں کی صدا ہوں

وہ شخص سرنگوں تھا دشمن کے آستاں پر
جس کے لیے میں اکثر خود سے بھی لڑ پڑا تھا
خود سے شکست کھا کے بھی مانی نہیں ہے ہار
میں کہ انا پرست بڑا با اصول تھا

تیرے کشکول میں پتھر بھی نہ ڈالے گا کوئی
شہرِ بے مہر میں آواز لگاتا کیوں ہے

بسی ہوئی ہے نگاہوں میں درد کی خوشبو
مہک میں درد بھی کالے گلاب جیسا ہے

ہے اُس کا چہرہ کہ تقدیس کا ہے تاج محل
کوئی خیال کی دنیا میں اس کو دیکھ آئے

کاغذ کے پھول کانچ کے گلدان میں سجا
لپکیں گی اس طرف کو بھی معصوم تتلیاں

شکستِ ذات کا احساس انگ انگ میں تھا
کہ بجھنے والا دِیا بھی کسی ترنگ میں تھا

معروف شاعر غلام محمد قاصر کے چند اشعار ؛

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتا
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں دعائیں اس کی خاطر ہیں
میں گویا ہوں کہ میری سب صدائیں اس کی خاطر ہیں
محبت ان کی خاطر ہے' وفائیں اس کی خاطر ہیں
کہ میری ابتدائیں' انتہائیں اس کی خاطر ہیں

ایک سفر نامے میں شعراء کا تعارف بھی ادب کی خدمت سمجھ کر کیا گیا ہے۔ جو بظاہر اجنبی لگتا ہے۔ امید کہ اس سے آپ میں ادب سے دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔

ایک دُور دراز علاقہ : انسانوں اور جانوروں کا مشترکہ تالاب

یہ اکتوبر 2017ء کا واقعہ ہے، کہ ڈی آئی خان کے قریب ایک گاؤں میں کسی دیرینہ دشمنی کی بنیاد پر گاؤں کے ایک لڑکے نے ایک نوجوان لڑکی کے سرِ عام کپڑے پھاڑ دیے جب وہ دیگر خواتین کے ساتھ پانی لے کر آرہی تھی۔ یہ ایک بڑا ہی قابلِ مذمت واقعہ تھا۔ اس پر حکومت نے بھی سخت کارروائی کی۔ اس کے بعد امیر جماعتِ اسلامی پاکستان جناب سراج الحق صاحب نے، اس گاؤں میں پانی کے ایک منصوبے کا اعلان کیا۔ الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے یہاں پانی کے لیے ایک سولر پمپ لگایا اور ساتھ ہی پانی جمع کرنے کے لیے ایک ٹینک بھی بنایا۔ دنیا کو اس وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ اس علاقے میں پانی کی دستیابی نہ ہونے کے برابر ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے اس کے علاوہ بھی کئی اور دیہات میں بھی پانی کے منصوبے مکمل کیے۔ ان منصوبوں کو دیکھنے کے لیے 2 اپریل 2021ء کو میں اور برادرم خبیب بلال صاحب، ڈی آئی خان گئے۔ اس دوران ہم نے اس گاؤں کا بھی دورہ کیا، جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر دیہات میں بھی گئے۔ یہ علاقہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ اس میں بہت کچھ ایسا تھا، جو اس وقت پاکستان کے دیگر علاقوں سے کافی حد تک مختلف تھا۔ اس کا ایک مختصر احوال پیشِ خدمت ہے۔

اگر آپ ڈی آئی خان کا سیٹلائیٹ امیج دیکھیں تو آپ یہ جان سکیں گے کہ اس ضلع کا اکثر علاقہ بنجر ہے۔ جو علاقے، دریائے سندھ کے ساتھ ہیں، وہ بے حد زرخیز ہیں۔ ڈی آئی خان سے چھ بڑی سڑکیں نکلتی ہیں۔

ایک سڑک درابن سے ہوتی ہوئی کوئٹہ کی طرف جاتی ہے، دوسری دریا خان بھکر کی جانب، تیسری چشمہ کی طرف، چوتھی ٹانک کی جانب، پانچویں ہکلہ کی جانب جو آگے پشاور کی طرف جاتی ہے۔ ہکلہ کے مقام تک موٹر وے بن چکی ہے جو اسلام آباد تک جاتی ہے، چھٹی تونسہ شریف کی طرف جاتی ہے۔ اس طرح سے ڈی آئی خان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ہم درابن جانے والی سڑک پر چل پڑے۔ درابن، ڈی آئی خان سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ راستہ زیادہ تر بنجر تھا۔ بہت کم فصلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ پشاور سے آئے ہوئے فدا محمد خان صاحب کے ساتھ ساتھ برادرم منظر خٹک بھی تھے جو ڈی آئی خان میں الخدمت فاؤنڈیشن کے صدر بھی تھے۔ ہمیں راستے میں جماعت اسلامی کے ایک مقامی ساتھی برادرم متین خان جو اس علاقے میں ایک بڑے زمیندار بھی ہیں، ملے۔ ہم ان کی رہنمائی میں اس گاؤں کی جانب چل پڑے، جہاں الخدمت فاؤنڈیشن نے پانی کے منصوبے شروع کر رکھے تھے۔

ہم پہلے ایک گاؤں میں پہنچے، جہاں ہم نے سولر پمپ لگا کر ایک ٹینکی کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔ یہاں ایک مسجد کے ساتھ ایک ہال میں مدرسہ بھی تھا۔ بچوں کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ یہ ایک بہت ہی غریب علاقہ ہے۔ اس کے بعد ہم اس گاؤں گئے جہاں ایک لڑکی کے ساتھ نازیبا سلوک کیا گیا تھا۔ جب ہم اس گاؤں کی گلیوں سے گزر رہے تھے، تو میں چشمِ تصور سے اس واقعہ کو ہوتا دیکھ رہا تھا۔

یقیناً یہ ایک نہایت ہی دلدوز اور اندوہناک واقعہ تھا۔

اس کے بعد ہم ایک ایسے گاؤں بھی گئے، جہاں ہم نے خود دیکھا کہ ایک بڑے تالاب (جوہڑ) سے ایک طرف خواتین پانی بھر رہی تھیں تو دوسری طرف جانور پانی پی رہے تھے۔ تالاب کے دوسری طرف ایک عمارت بنی ہوئی تھی جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہاں پر ایک سولر پمپ لگایا گیا تھا، تاکہ گاؤں کے لوگوں کو صاف پانی مل سکے۔ گاؤں والوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے یہ بند پڑا ہے۔

یہ بھی ایک دکھ دینے والی بات تھی، لیکن ہمارے دیہاتی ماحول میں اس طرح کے مسائل عام ہیں، جو کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔

جب ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے، تو میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو میں نے اپنے بچپن میں بارہا دیکھ رکھا تھا لیکن اب اس کا وجود پنجاب میں تقریباً ختم ہو چکا ہے۔۔۔ لیکن یہاں موجود تھا۔

بات کچھ یوں ہے، کہ چند دہائیاں قبل تک دیہات کے ارد گرد ایک بڑی تعداد میں ویران جگہیں ہوتی تھیں۔ یہ ایک طرح کی چراگاہیں ہوتی تھیں۔ لوگ صبح کے وقت اپنے جانور یہاں لے آتے تھے اور شام کو وہ واپس لے جاتے تھے۔ اسے جانوروں کو چرانا کہتے ہیں۔ میں

بھی اپنے دادا جان کے پاس رہتے ہوئے ایسا ہی کرتا تھا۔ اس طرح سے مفت میں جانوروں کو خوراک مل جاتی تھی۔

اکثر دیہات میں یہ رواج ہوتا تھا کہ گاؤں کا کوئی ایک آدمی لوگوں کے جانور اکٹھے کرتا اور انھیں چرانے لے جاتا۔ اس طرح ہر کسی کو جانور چرانے لے کر نہیں جانا پڑتا تھا۔ سب لوگ اس چرواہے کو مزدوری دیتے تھے۔ اس۔ کام کے لیے گاؤں کے باہر ایک جگہ پر لوگ اپنے جانور چھوڑ جاتے تھے، جہاں سے چرواہا جانور لے کر جنگل یا چراگاہ کی طرف لے جاتا تھا۔

ابھی صبح کا وقت تھا، جب ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھلے میدان میں کافی تعداد میں جانور اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ متین صاحب سے پوچھنے پر پتہ چلا، کہ سب جانور چرنے کے لیے چراگاہ کی طرف لے جائے جائیں گے۔

یوں ایک صدیوں پرانی ریت، جس کا میں بھی حصہ رہا ہوں، دیکھنے کو ملی اور اپنی والدہ کی وہ بکری یاد آئی جسے میری والدہ اس طرح کے ریوڑ میں شامل کرتی تھی۔ جب وہ بکری شام میں واپس آتی تو اس کے تھنوں میں دودھ ہوتا تھا جسے دیکھ کر ہم سب بے حد خوش ہوتے تھے۔

یہ تھا وہ اجتماعی نظامِ زندگی جس پر ہمارے دیہات کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہی امدادِ باہمی ہمارے دیہات کا حُسن بھی تھا، جو اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اپنے دن بھر کی مصروفیات کے بعد برادرم متین خان ہمیں اپنے گھر لے گئے، جہاں ہم نے اس علاقے کی مشہور ڈش صوبت کھائی، جس کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔ اس میں متین خان کی محبت کا بھی کمال ہے۔

اس سے پہلے، کہ میں آپ کو ڈی آئی خان کینٹ میں واقع ایک چرچ اور ایک انگریز آفیسر کی قبر کے متعلق کچھ عرض کروں، میں درابن بارے ایک مختصر تحریر آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

درابن: ایک صدیوں قدیم شہر جہاں کبھی ہندو بھی رہتے تھے

درابن قصبہ ڈی آئی خان سے کوئٹہ جانے والی مین سڑک پر واقع ہے۔ ڈی آئی خان سے اس کا فاصلہ ساٹھ کلومیٹر ہے۔ اس شہر کی اہمیت سمجھنے کے لیے آپ کو اس علاقے کا نقشہ دیکھنا ہوگا۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ درابن کے ذکر سے پہلے اس

علاقے میں واقع درۂ گومل کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ یاد رہے کہ ڈی آئی خان میں قائم یونیورسٹی کا نام بھی، گومل یونیورسٹی ہی ہے۔

افغانستان سے پاکستان آنے کے لیے کہیں تو میدانی علاقے موجود ہیں اور کئی جگہوں پر پہاڑوں کے درمیان سے ہو کر آیا جاتا ہے۔ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والے راستوں کو درّہ یا پاس کہتے ہیں۔ پاکستان بھر میں کوئی تیس سے زائد پاس ہیں۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان تین مشہور پاس ہیں۔ سب سے مصروف پاس، خیبر پاس ہے، جو طورخم میں واقع ہے۔ اس پاس سے، کابل سے آنے والے لوگ گزرتے ہیں، دوسرا گومل پاس ہے جو ڈی آئی خان کے مغرب میں واقع ہے۔ اس پاس سے غزنی سے آنے والے لوگ گزرتے تھے اور اب بھی گزرتے ہیں۔ تیسرا بولان پاس ہے، جو کوئٹہ اور سبی کے درمیان واقع ہے۔ یہ پاس قندھار، ہرات اور ہلمند سے آنے والے لوگوں کے لیے تھے۔

بولان پاس کے راستے سے آنے والے لوگ، درابن کے پاس سے گزر کر ڈی آئی خان پہنچتے تھے۔ یہیں سے وہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کشمور اور پھر سکھر پہنچتے تھے۔ ڈی آئی خان سے ایک راستہ براستہ تونسہ شریف ملتان بھی جاتا تھا۔ کچھ لوگ لاہور جانے کے لیے بھکر اور خوشاب کا راستہ لیتے تھے۔

یاد رہے کہ انگریزوں نے جو پہلی طویل ریلوے لائن 1891ء میں مکمل تھی، وہ کوٹری سے شروع ہو کر اٹک تک جاتی تھی۔ اس کا گزر ڈی آئی خان سے تو نہیں ہوتا تھا، وہ ڈیرہ غازی خان اور بھکر سے گزرتی تھی۔

گومل پاس کا نام دریائے گومل کی وجہ سے ہے۔ یہ جنوبی وزیرستان کے جنوب مشرقی حصے میں ڈیورنڈ لائن پر واقع ایک پہاڑی درہ ہے، جو کہ غزنی کو ٹانک اور ڈیرہ اسماعیل خان ملانے والے شاہراہ پر واقع ہے۔ صدیوں سے یہ راستہ خانہ بدوشوں اور تاجروں کے ساتھ ساتھ حملہ آوروں کا بھی، پسندیدہ راستہ رہا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے، جس پر چل کر کئی مرتبہ محمود غزنوی بھی ہندوستان آیا۔

درابن کے متعلق فہیم اقبال ویر نے تفصیل سے لکھا ہے[1]۔ ان کے مطابق درابن میں کوئی نہری نظام نہیں ہے، بلکہ آبپاشی اور پینے کے لیے ندی نالوں کے ساتھ ساتھ سیلاب کا

HISTORY OF DARABAN ZAM1[1]
Fahim Iqbal, VEER

پانی ہی استعمال ہوتا ہے۔ مقامی دوستوں نے بتایا کہ وہ سیلابی پانی کو روک لیتے ہیں، جس سے کاشتکاری میں آسانی ہوتی ہے۔سیلابی پانی سے کوئی ساٹھ سے زائد دیہات مستفید ہوتے ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ قدیم دور سے ہی پوونده قبائل درابن اور گومل کے راستے ہندوستان اور خراسان کے درمیان تجارت کرتے تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ راستہ مزار شریف اور خراسان کے لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ کچھ قبائل تجارت کی بجائے، اپنے جانوروں کے لیے خوراک کی خاطر اس راستے سے آتے جاتے تھے۔

اس علاقے میں آباد لودھی قبیلہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تیرہویں صدی کے آغاز سے اس علاقے میں آباد تھا۔ ان کے علاوہ سوری اور بھی قبائل،جو لودھی قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں،کے آثار بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ بعد میں لودھی ہندوستان چلے گئے۔ یہی وہ لودھی خاندان ہے، جس نے ہندوستان میں سلاطین دہلی کو شکست دے کر اپنی ریاست قائم کی تھی اور ایک دن پانی پت کے میدان میں وہ بابر کے ہاتھوں شکست کھا کر تاریخ کا حصہ بن گئے۔ البتہ سوری خاندان کی قیادت میں یہ لوگ کچھ عرصے کے لیے، مغلوں کو شکست دے کر دہلی کے تخت پر بھی بیٹھے تھے۔اس کے بعد افغانستان سے آنے والے قبائل اور مقامی لوگوں کے درمیان (یا پہلے سے آئے ہوئے افغان قبائل) کے درمیان جنگ جاری رہی۔ (اس کا تفصیلی ذکر یہاں مناسب نہیں)۔

اس علاقے پر نادر شاہ نے بھی حملہ کیا تھا۔ اس کے حملے کے بعد احمد شاہ ابدالی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ میاں خیل اور بابڑ قبیلے سے جنگ کا واقعہ بھی اسی علاقے میں پیش آیا۔ اب بھی ایک پہاڑی پر بابڑ قبیلے کا ایک قدیم قبرستان موجود ہے۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے، جب یہاں کے قبائل کی باہمی لڑائیوں کی وجہ سے انگریزوں کو مداخلت کا موقع ملتا ہے۔

ان قبائل میں پہلی بار تصفیہ 1878ء میں ہوتا ہے، جو دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ پھر آتا ہے انگریز بہادر، برطانیہ کا نمایندہ کیپٹن کراس ویٹ۔ اس طرح انگریز کو مقامی لوگوں کی آپس کی لڑائیوں کے نتیجے میں مداخلت کا موقع مل جاتا ہے۔ اس کے بعد انگریزوں کے زیرِ اثر 1908ء میں بولٹن کی ایک مشہور رپورٹ لکھی گئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی بولٹن ہیں جن کے نام پر لاہور میں انار کلی کے پاس بولٹن مارکیٹ بھی ہے۔

---

https://studylib.net/doc/8481067/history-of-daraban-zam---spate-irrigation-network

اس دور میں یعنی تقسیمِ ہند سے قبل اس علاقے میں ہندو اور سکھ بھی زمینوں کے مالک تھے۔ ان میں سے اکثر نے نقل مکانی کر لی۔ ان کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں پر مقامی لوگوں نے یا حکومت نے قبضہ کر لیا۔

ان صدیوں پر محیط باہمی جنگوں اور زبردستی کے قبضے کے نتیجے میں بڑے بڑے زمین دار وجود میں آ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے، جو قبائلی جنگوں میں زمینوں کے مالک بنے۔ جب انگریزوں نے زمین کا بندوبست شروع کیا تو انھیں مالک لکھا گیا اور یوں یہ لوگ کاغذات میں بھی مالک ظاہر ہونے لگے۔

یہ تو وہ بات جس کی میں تلاش میں تھا کہ اس علاقے اور اس کے علاوہ بھی ہندوستان بھر میں کچھ لوگ بڑی بڑی زمینوں کے مالک کیسے بنے؟

جو پتہ چلا اس کے مطابق انگریزوں کے نظام سے پہلے طاقتور ہی زمینوں کے مالک تھے، جو جتنا طاقتور ہوتا اتنی ہی زمین کا مالک بن جاتا۔ یہ بھی ہوا، کہ اس وقت کے بادشاہ نے کسی کو ایک بڑی جاگیر دے دی۔ جب انگریزوں نے زمین کی پیمائش اور اس کے ریکارڈ کا نظام بنایا، تو انھوں نے جس کے قبضہ میں جتنی زمین تھی، اسے اس کا مالک بنا دیا۔ ایسا کروانے کے لیے ان بڑے زمین داروں کا انگریزوں کا وفادار ہونا ضروری تھا اور ان کی ہر طرح سے مالی اور جانی مدد کرنا بھی۔ یہ کام ہر جاگیر دار نے کیا۔

یہ زمینداری، پھر جاگیرداری میں بدل گئی اور اب تک نسل در نسل چلتی آ رہی ہے۔ ایوب خان اور بھٹو کے دور میں زمینی اصلاحات کے نتیجے میں کئی بڑی جاگیریں تقسیم ہو گئیں، کچھ عام لوگوں میں اور کچھ ان جاگیرداروں کے ملازموں اور رشتہ داروں میں !

یہ تھا درابن کا ایک مختصر تعارف۔

درابن کے قریب واقع ایک گاؤں میں، حضرت پیر پنجن شاہ کا مزار بھی واقع ہے، ہم اس جگہ تو نہ جا سکے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی اس راستے سے ہند پر حملہ کرنے جا رہا تھا کہ اس کی پیر پنجن شاہ سے ملاقات ہوئی۔ پیر صاحب نے اس کے لیے دعا کی اور یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس جنگ میں فتح دی تو میرے لیے دلی سے مٹی لیتے آنا، تا کہ اس پر میں اپنی قبر بنا سکوں۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

سلطان محمود کامیاب ہوا اور وہ واپسی پر اپنے ساتھ ایک بڑی مقدار میں دہلی سے مٹی لے آیا اور یہاں ایک ٹیلہ بنا دیا۔ اسی ٹیلہ پر پیر پنجن شاہ کی آخری آرام گاہ بنائی گئی، جو کہ ابھی بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ یہاں ہر سال میلہ بھی لگتا ہے۔

یہ ایک ہزار سالہ پرانی کہانی ہے، کیا درست ہے کیا نہیں، معلوم نہیں۔

ڈی آئی خان میں چند قدیم عمارتیں

یوں تو ڈی آئی خان میں کئی پرانی عمارتیں موجود ہیں۔اس کا مرکزی حصہ بھی قابلِ دید ہے۔ ایک چوک میں ایک اونچی عمارت ہے، جہاں اب پولیس کی چوکی ہے۔اس چوک سے چاروں طرف سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک بازار میں ایک قدیم مندر بھی ہے۔ ہم نے منظر بھائی سے کوئی پرانی عمارت دیکھنے کی فرمائش کی۔ وہ ہمیں کوئی سو سال سے زائد پرانی ایک عمارت میں لے گئے۔ یہ عمارت ٹاؤن ہال کہلاتی ہے۔ ایک بڑے سے باغ میں واقع یہ عمارت ہے۔ انگریزوں نے اسے سرکاری کاموں کے لیے بنایا تھا۔ اب اس کی تزئین و آرائش ہو رہی ہے۔

میں کینٹ میں اپنے عزیز ترین دوست افتخار بنگش کے گھر گیا۔ میں نے ان سے یہی سوال کیا اس کینٹ میں کوئی پرانی عمارت ہے۔انھوں نے بتایا کہ ایک چرچ ہے اور ایک انگریز کی قبر۔ ہم چرچ دیکھنے چلے گئے۔ چرچ کے پاس ہی چند گھر بھی ہیں، جہاں کچھ عیسائی خاندان رہتے ہیں۔ چرچ بہت اچھی حالت میں ہے۔ چرچ کے پاس ایک کھیت میں ایک تنہا قبر تھی۔ ہم اسے بھی دیکھنے چلے گئے۔ اُس قبر پر لکھا ہوا تھا کہ یہ اس وقت کے پنجاب کے گورنر سے ہنری میرین ڈیورنڈ کی ہے۔ ان صاحب کے بیٹے ہی نے ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن بنائی تھی۔ (میں نے اس کا تفصیلی ذکر ٹانک کی بات کرتے ہوئے کیا ہے) جو ٹانک میں ایک ہاتھی سے گر کر فوت ہوئے تھے۔

ڈی آئی خان میں اس کے علاوہ بھی کئی تاریخی عمارتیں موجود ہیں۔ اگر آپ کو اس شہر میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے، تو ایک شام دریا پر ضرور گزاریں۔

یہ ایک خوبصورت منظر ہوتا ہے جو ایک مدت تک یاد رہتا ہے!

ڈی آئی خان اور طالبان

آج سے دس سال قبل، جب طالبان کا بہت زور تھا اور وہ قبائلی علاقہ جات میں رہتے تھے، تو اس شہر میں ان کا بہت آنا جانا تھا۔ مجھے ایک صاحب نے یہ بتایا تھا کہ شہر کے لوگ اپنے

معاملات کے فیصلے کے لیے، قبائلی علاقہ جات میں طالبان کے پاس جاتے تھے، لیکن اب حالات ایسے نہیں ہیں۔ اس شہر میں اب بہت سارے تعلیمی ادارے بن چکے ہیں۔ شہر کی عمومی حالت بہت بہتر ہے، صفائی ستھرائی کا معیار بھی قابل تعریف ہے لوگ بھی امن محسوس کرتے ہیں۔اللہ تعالی اس شہر کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھے۔

یہ ایک انتہائی خوبصورت اور تاریخ میں یاد رکھنے والی بات ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس شہر میں گومل یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے پہلے وائس چانسلر نواب اللہ نواز خان نے اپنی گیارہ ہزار کنال زرعی رقبہ اس یونیورسٹی کو وقف کیا ۔مجھے بھی اس یونیورسٹی میں جانے کا موقع ملا ہے، بہت وسیع وعریض جگہ ہے۔دونوں اب اپنے رب کے ہاں پہنچ چکے ہیں، دونوں کا صدقہ جاریہ یقیناً ان کے لیے ان کے رب کی رضا ثابت ہوگا اور یہ ان لوگوں کے لئے بھی ایک مثال ہے جو صرف وراثت اپنی اولاد کے لئے چھوڑ کر جاتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو کچھ نہ کچھ وقف کرکے جانے کی توفیق عطافرمائے۔آمین

ڈی آئی خان: موہن جو داڑو کے دور کا علاقہ

اب کچھ باتیں ڈیرہ اسمٰعیل خان کی تاریخ کے متعلق۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے قریب رحمان ڈھیری سے جو آثارِ قدیمہ ملے ہیں، ان سے پتہ لگتا ہے کہ یہ شہر پانچ ہزار سال سے زیادہ پرانا ہے۔ پندرہویں صدی میں بلوچ قبائل کو اس علاقے میں رہنے کے لئے بلایا گیا اور اُس وقت سے بلوچ یہاں پر رہتے ہیں۔ بعد میں پختونوں نے انھیں اس علاقے سے نکال دیا اور اب علاقے میں رہنے والوں کی اکثریت بلوچ نہیں ہے۔

پرانے وقتوں میں یہ شہر قندھار اور ملتان کی تجارت کے لئے، ایک گزرگاہ کے طور پر کام کرتا تھا۔ نادر شاہ درانی کے حملوں کے وقت یہ شہر نادر شاہ نے اپنے قبضے میں کرلیا اور اسے قندھار کا حصہ بنا دیا۔ اسمٰعیل خان جو ایک بلوچ سردار تھا، اس کی نو نسلوں نے اس علاقے پر حکمرانی کی۔ اور آخری حکمران نصرت خان تھا، جس نے 1750ء میں احمد شاہ درانی سے شکست کھائی، اس کے بعد اس علاقے پر پختونوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ 1823ء میں دریائے سندھ میں آنے والے ایک بڑے سیلاب کی وجہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہو گیا۔ سردار شیر محمد خان نے 1823ء میں اس شہر کو دوبارہ آباد کیا۔اس وقت یہ شہر دریا سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ایک اور اہم بات یہ

ہے، کہ جب شہر کو دوبارہ آباد کیا گیا تو اس کے لئے پنجاب سے آرکیٹیکٹ کو بلوایا گیا۔ شہر کے جنوب میں ہندوؤں کا علاقہ بنایا گیا اور شمال میں مسلمانوں کی بستیاں بسائی گئیں۔ شہر کو دوبارہ بڑے خوبصورت طریقے سے بنایا گیا، آٹھ فٹ اونچی دیوار بنائی گئ بڑے بڑے گیٹ بھی بنائے گئے۔

سکھوں کے نونہال سنگھ نے اس شہر پر قبضہ کیا اور ہندوؤں کو اس شہر کا کاردار بنایا گیا، یعنی حکمران۔ بالآخر 1849ء میں انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور سکھوں کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے 1920ء میں اسے پنجاب سے الگ کر کے موجودہ خیبر پختونخوا کا حصہ بنا دیا۔ اس علاقے میں پہلی مرتبہ میونسپل کمیٹی بنائی گئی۔ ایک اور اہم بات آپ کی دلچسپی کے لیے ہو گی۔ جب 1901ء میں مردم شماری کی گئی تو اس شہر کی کل آبادی فقط 31،737 تھی، جس میں مسلمان 18662، ہندو 11486 اور سکھ 1420 رہتے تھے۔ یعنی مسلمان ساٹھ فیصد، باقی ہندو اور سکھ۔ آج اس شہر میں ہندو اور سکھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندو اور سکھ 1947ء میں، مسلمانوں کی طرف سے ہونے والوں حملوں کی وجہ سے اپنی جان بچا کر اور اپنا سب مال و متاع اور کاروبار چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔

روس کے افغانستان پر حملے کے بعد، اس شہر میں بہت زیادہ مہاجرین آ گئے اور بعد میں طالبان کے دور کے اندر اس شہر کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا، جس میں بہت زیادہ خودکش حملے شامل ہیں۔ یہ شہر پشاور سے تین سو کلومیٹر اور ملتان سے ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ شہر کو جانے کے لئے تین بڑے راستے ہیں؛ یہ ایک چشمہ کی طرف سے دوسرا پشاور کی طرف سے اور تیسرا ژوب کی طرف سے۔

اس وقت الحمدللہ بہت امن ہے۔ اور آخری دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ جب بھی شہر میں جائیں گے تو لوگ آپ کو یہاں کی سوغات حلوہ ضرور دیں گے جسے یہاں کی سوغات سمجھا جاتا ہے اور شوگر کے مریضوں کے لئے شوگر فری حلوہ بھی موجود ہے۔

ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب بھی اس شہر میں سائیکل رکشہ چلتا ہے۔۔۔

نہ جانے یہ کب بند ہو گا۔

ٹانک: جہاں کبھی ایک ریاست کا نواب رہتا تھا

سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے جنوبی علاقوں میں 2022ء کے بدترین سیلاب کے بعد بے شمار لوگ اپنے گھروں سے محروم ہو گئے۔ الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے ان کی مدد کے

لئے گھر بنانے کا پروگرام شروع کیا۔ میں اسی سلسلے میں ڈی آئی خان گیا۔ اس دورے میں ایک دن ہم ٹانک بھی گئے۔ ٹانک ڈی آئی خان کے شمال مغرب میں کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

کافی اچھی سڑک ہے۔ ٹانک سے کچھ ہی فاصلے پر وانا واقع ہے، جو جنوبی وزیرستان کا ایک اہم شہر ہے۔ شمالی وزیرستان کا شہر، میران شاہ بھی زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔ وزیرستان سے آنے والے راستے پر ٹانک پہلا شہر ہے۔اس طرح سے، یہ علاقہ افغانستان کی طرف سے آنے والے تحریک طالبان کے نشانے پر ہوتا ہے۔ جس دن ہم وہاں پر موجود تھے، اس دن بھی ایک سرکاری آفیسر پر حملہ ہوا تھا۔ ہمارا مقصد ٹانک میں بنائے جانے والے مکانات کے لیے فراہم کی جانے والی سہولیات دیکھنا تھا۔

ہم ٹانک کے پاس ہی ایک گاؤں میں بھی گئے، جہاں لوگوں کو گھر بنانے کے لیے بلاکس اور سیمنٹ مہیا کیا جارہا تھا۔اس سے پہلے ٹانک میں الخدمت فاؤنڈیشن کے دفتر میں بھی جانے کا موقع ملا، جہاں سے یہ تمام تر خدمت کی سرگرمیوں کو دیکھا جاتا تھا۔

میں نے حسب عادت مقامی ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا ٹانک میں کوئی تاریخی عمارت بھی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ یہاں پر ایک نواب کا قلعہ موجود ہے۔ وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا، تو دوستوں نے اس کا اہتمام بھی کر دیا۔

یہ قلعہ شہر کے ساتھ ہی واقع ہے اور ایک کھلا سا میدان ہے۔ یہ کئی ایکڑ پر مشتمل ایک بڑا کمپاؤنڈ ہے اور اس کے درمیان میں ایک عمارت بھی موجود ہے۔ عمارت کے اندر ایک بڑا ہال بھی ہے، جہاں کسی وقت نواب آف ٹانک اپنی کچہری لگاتے تھے۔ ہم احاطہ میں جانے کے لیے ایک بڑے دروازے سے گزر کر اندر چلے گئے۔ نواب صاحب کی اولاد میں سے ایک خاندان اب بھی وہاں پر مقیم ہے۔ ان کے بزرگ نواب زادہ خداداد خان جو ریاست کے آخری نواب قطب الدین خان کے فرزند نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اپنے مہمان خانے میں لے گئے۔ ان کا ایک نوجوان بیٹا نواب زادہ وہاب خان بھی ہماری مہمان نوازی میں مصروف رہا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے اگلے سفر کی داستان بیان کروں، میں ٹانک ریاست ایک مختصر احوال ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

ہمارے میزبان نواب زادہ خدا داد خان صاحب تھے جو نواب قطب الدین خان کی اولاد ہیں۔ اب اس خاندان کے سارے لوگ نواب زادہ ہی کہلاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں دیوار پر لگی مختلف تصاویر دکھائیں اور چند پرانی اشیاء بارے بھی بتایا۔ یہ سب دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔

میں نے ان سے ان کی تاریخ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کوئی تین صدیاں قبل ان کے آباؤ اجداد غزنی سے اس علاقے میں آئے تھے۔ ان کے ساتھ سات اور قبائل بھی تھے۔ مقامی لوگوں سے ان کی جنگیں ہوتی رہی اور ان کے نتیجے میں ہمارا خاندان فاتح قرار دیا گیا۔ اس طرح سے ہم نے یہاں ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور یہ قبضہ تادیر برقرار رہا۔ پھر جب انگریز اس علاقے میں آیا تو زمین کی جمع بندی کی گئی، وہ زمین جو ہمارے قبضے میں تھی اسے ہماری ملکیت ظاہر کر دیا گیا اور یوں ہم بہت بڑی زمین کے مالک بن گئے۔ موجودہ قلعہ کوئی تین سو سال پرانا ہے۔ اس کے چاروں طرف مٹی کی ایک بہت ہی چوڑی دیوار ہے۔ بقول نوابزادہ وہاب خان اس دیوار پر بگھی چلتی تھی یعنی یہ بہت ہی چوڑی دیوار تھی۔ اب بھی اس کے کئی حصے سلامت ہیں۔ میں نے بھی یہ دیوار دیکھی ہے، واقعی بہت چوڑی ہے۔

اس قلعے کے ساتھ ایک باغ بھی ہے۔ یاد رہے کہ نواب خاندان کو نوابی انگریزوں کے دور میں ملی تھی جبکہ یہ قلعہ تین صدیاں قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ یہ لوگ پہلے سے یہاں آباد تھے اور ایک طاقت سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے انھیں نوابی سونپی۔

اس کے بدلے میں انگریزوں کے ساتھ وفاداری بھی کرنا پڑی۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے اس شہر کی بنیاد اکبر کے دور میں سردار زمان خان نے رکھی تھی۔ نواب صاحب نے اپنے آباؤ اجداد کے متعلق بتاتے ہوئے انھوں نے جو کچھ بتایا، اس کا ایک مختصر ذکر پیش ہے۔

یہ کوئی 1838ء کی بات ہے کہ سکھوں نے اس علاقے کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر کیا۔ لیکن ایک وقت آیا جب انگریزوں نے (1848ء) میں ایک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ڈیورنڈ لائن سے پہلے وزیرستان کے قبائل افغانستان کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

ڈیورنڈ لائن کا ایک مقصد کابل کا پختون قبائل سے تعلق کمزور کرنا بھی تھا۔ اس کے پیچھے ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح ہندوستان کی مغربی سرحد کو روس کی یلغار روکنے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ اسی سوچ کے تحت وزیرستان کے قبائل کو واضح طور پر انگریزوں کے زیر تسلط قرار دے دیا گیا تھا۔

اس کام میں تیزی اس وقت آئی جب جنوری 1899ء میں لارڈ کرزن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا اور اس کی یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ ہندوستان کی مغربی سرحد کو مزید مضبوط کرے۔ اس نے اس کام کے لیے شمال مغربی سرحد کے آزاد قبائل پر خصوصی توجہ دی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختونخوا) کے نام سے ایک نئے صوبے کی بنیاد رکھی۔ مقامی قبائل نے اس کی سخت مزاحمت بھی کی لیکن ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ایک آزاد علاقے کی شکل میں ان قبائل کو اپنی آزاد زندگی گزارنے کی اجازت دے کر چپ کروادیا گیا۔ یہ آزاد علاقہ پہلے دن سے ہی پاکستان اور افغانستان کے درمیان وجہ تنازعہ رہا، اب بھی ہے۔ اسی وجہ سے افغانستان نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

جب انگریزوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا تو انھوں نے شاہنواز خان کٹی خیل کو یہاں کا نواب مقرر کیا۔ وہاب خان نے یہ بھی بتایا کہ ان کے ایک بزرگ کے پاس ایک بہت اچھا گھوڑا تھا جو رنجیت سنگھ کو پسند آگیا۔ رنجیت سنگھ گھوڑوں کا بے حد شوقین تھا۔ اس نے گھوڑے کے بدلے ہاتھی دیا اور یوں ہاتھی اس خاندان کے پاس آگیا۔ یاد رہے کہ یہ بات نوابی سے پہلے کی ہے کیونکہ جب اس خاندان کو نوابی ملتی ہے اس وقت رنجیت سنگھ فوت ہو چکا تھا۔

شاہنواز خان کٹی خیل کے دور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو نہایت ہی قابل افسوس ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت کے ایک لیفٹینینٹ گورنر پنجاب اور میجر جنرل رائل انجینئرز ہینری میرین ڈیورنڈ ہاتھی پر سوار ہو کر اس قلعے میں آیا۔ وہ کسی وجہ سے دروازے سے گزرتا ہوا گر گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ (یہ اسی انگریز کی بات ہے جس کی قبر میں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں دیکھی تھی)۔

اس پر نواب نے کہا کہ یہ کوئی قتل نہیں ہے، یہ ایک حادثہ ہے۔ انگریزوں نے کہا نہیں، یہ ایک قتل ہے، جو آپ نے کیا ہے۔ جب کہ ہمارا مؤقف تھا کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انھوں نے کسی بہانے ہمارے پہلے نواب شاہنواز خان کو لاہور بلوایا اور وہاں انھیں پھانسی دے دی۔ نواب شاہنواز خان نے ان سے یہ گزارش کی

تھی کہ آپ مجھے لاہور ہی میں بی بی پاک دامن کے قبرستان میں دفن کرنا۔یوں ان کی قبر بھی لاہور میں بی بی پاک دامن قبرستان میں ہے۔

ایک اور تاریخ دان شمیم خان نے اپنی فیس بک وال پر اس کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ صاحب کون ہیں؟ معلوم نہ ہو سکا[1]۔ ان کے مطابق یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ سر ہنری ماریون ڈیورنڈ کی موت کا مقدمہ کی سماعت ڈی آئی خان کے ڈی سی بنگلے میں ہوئی۔

نواب زادہ خدا خان کا کہنا ہے کہ مقدمہ لاہور میں چلایا گیااور وہیں سزا بھی دی گئی۔ جب کہ شمیم خان یہ کہتے ہیں کہ مقدمہ ڈی آئی خان میں چلا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سزا لاہور میں کیوں دی گئی اور تدفین بھی لاہور ہی میں کیوں ہوئی؟

شمیم خان کے مطابق لارڈ ڈیورنڈ کی بیٹی نے کہا کہ میں بھی اپنے والد اور نواب شاہ نواز کے ہمراہ ہاتھی پر سوار تھی۔ ہاتھی کے مہاوت نے کہا کہ دروازہ اونچا نہیں ہے،اس لیے آپ لوگ اتر جائیں۔ وہ اتر گئیں لیکن اس کے والد اور نواب نہیں اترے جس پر دونوں نیچے گر گئے۔ دونوں زخمی ہوئے۔ لارڈ کو زیادہ زخم آئے، اس لیے اس کی موت واقع ہو گئی۔یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ وہ سر ہنری ماریون ڈیورنڈ، سر ہنری مورٹیمر ڈیورنڈ کے والد تھے جو ڈیورنڈ لائن معاہدے کے بانی ہیں۔

نواب زادہ خداداد خان صاحب نے اپنے والد کے متعلق بھی بہت کچھ بتایا۔ ان کے مطابق نواب قطب الدین خان ایک انتہائی پڑھے لکھے آدمی تھے۔

نواب قطب الدین خان کٹی خیل ٹانک کے آخری نواب (1896-1970) تھے۔ انھوں نے پُر تعیش زندگی گزاری۔ وہ شکار کے بے حد شوقین تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے پورے خاندان اور کئی نوکروں کے ساتھ انگلینڈ بھی گئے تھے۔ وہ سیاسی میدان میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔انھوں نے 1933ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیااور کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے۔ سبھی پولو کے ماہر کھلاڑی تھے۔اس طرح باپ بیٹوں کی اپنی ہی ٹیمیں تھیں۔ان کے پاس ایک بڑی تعداد میں گھوڑے تھے۔ میں نے ان کی تصاویر دیکھی ہیں۔

---

[1] https://www.facebook.com/profile.php?id=100058885463532&sk=photos

انھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر امن قائم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بدلے میں انگریزوں نے انھیں حکومت کرنے کے لیے محدود خود مختاری بھی دی تھی۔ نواب قطب الدین کٹی خیل آل انڈیا مسلم لیگ کے ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر بھی رہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ 1933ء میں صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوئے اور اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے۔

نواب صاحب نے بھی ہمیں اپنے بہن بھائیوں کے متعلق بھی بتایا جن میں سے اکثر فوج میں بڑے عہدوں پر فائز رہے اور سیاست میں ان کا اہم مقام رہا۔اب بھی ٹانک ضلع میں سیاسی طور پر وہ ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

نواب صاحب اپنی طبیعت اور عادات کے لحاظ سے ایک نہایت ہی شاندار آدمی ہے اور ان میں کسی بھی طرح کی کوئی بھی غرور اور تکبر دیکھنے کو نہیں ملا۔ میرا اب بھی اس خاندان کے ساتھ رابطہ رہتا ہے اور یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔

صوابی: جہاں ایک چھوٹا لاہور بھی ہے

جب مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ صوابی کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام چھوٹا لاہور ہے تو بہت ہی دلچسپ لگا اور دل میں اسے دیکھنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ پھر ایک مدت تک مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا کہ میں صوابی جاتا۔ جہادِ افغانستان کے موقع پر میرے کمانڈر بہت خوبصورت اور انتہائی خوب سیرت نوجوان مجاہد عالم زیب شہید تھے جن کا تعلق صوابی سے تھا۔اس طرح سے ان کی معرفت صوابی سے واقفیت ہوئی لیکن جانے کی کوئی سبیل پھر بھی نہ پیدا ہوئی۔

یہ 2019ء کی بات ہے کہ صوابی میں الخدمت فاؤنڈیشن کی ڈونر کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مجھے اس میں شرکت کی دعوت ملی اور اس طرح مجھے صوابی جانے کا موقع ملا۔

صوابی ایک تاریخی مقام ضرور ہے اور مجھے تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق بھی ہے لیکن صوابی کے ساتھ ایک عقیدت اور محبت کا تعلق عالم زیب شہید کی وجہ سے بھی ہے۔ مجھے ان کی شہادت کا پتہ چلا تو میں نے ان کی یاد میں عالم زیب فاؤنڈیشن بنائی جس کے تحت ہم ضرورت مند طالبعلموں کو درسی کتب مہیا کرتے تھے۔یہ سلسلہ کافی سالوں تک چلتا رہا۔ پھر صوبائی حکومتوں نے طالبعلموں کو مفت درسی کتابیں فراہم کرنا شروع کر دیں، جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

لیکن عالم زیب کی یاد کل بھی تازہ تھی اور آج بھی تازہ ہے۔

حالیہ کارگل کی جنگ میں شہید ہونے والے کرنل شیر خان شہید کا تعلق بھی صوابی سے ہی ہے اور ان کی وجہ سے بھی صوابی دنیا بھر میں پہچانے جانا لگا۔اس طرح سے ایک دوسرے شہید کی وجہ سے صوابی سے تعلق مضبوط ہوتا گیا۔ صوابی کے سفر میں جو میں نے ڈونر کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے کیا تھا، مجھے کافی کچھ دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔اس سفر کی رُوداد اور اس کے ساتھ صوابی کی تاریخ اور اس کی معاشرت کے متعلق چند معلومات پیشِ

خدمت ہیں۔ یاد رہے کہ صوابی خیبر پختونخوا کے ان علاقوں میں سے ایک علاقہ ہے جو سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔

میں ایک بات سمجھنے سے قاصر ہو کہ جتنی چیزیں صوابی میں دیکھنے کے لئے ہیں، اس قدر صوابی سیاحت کے لئے مشہور نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

مجھے تو اس کی وجہ کوئی خاص معلوم نہ ہو سکی!

صوابی میں بدھ مت کی تاریخی عمارتیں بھی ہیں جو اس کی دنیا بھر میں شہرت کا سبب بھی ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے صوابی میں امن و امان کی صورتِ حال بھی ابتر رہی ہے جس کی وجہ سے شاید لوگوں کا یہاں آنا جانا کم ہو۔

میں صوابی کی تاریخی حیثیت اور اس کی خوبصورتی بیان کرکے اپنا فرض ادا کر رہا ہوں جو میں نے یہ سوچ کر اپنے ذمے لیا ہے کہ مجھے جس جگہ بھی جانے کا موقع ملے گا، میں اس کے متعلق معلومات آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا تاکہ آپ جان سکیں اس علاقے کی تاریخ، جغرافیہ معیشت اور معاشرت کیسی ہے اور آپ بھی کسی دن اس کی سیر کو جائیں۔

میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ بہتر انداز سے کر سکتے ہیں۔

صوابی: محلِ وقوع

اگر آپ صوابی کو نقشہ میں دیکھیں تو آپ جان سکیں گے کہ صوابی کی جنوب مغربی سرحد پنجاب سے ملتی ہے۔ پنجاب کے شہر کامرہ اور اٹک اس کے ساتھ واقع ہیں۔ اس کے مشرق میں ٹوپی نام کا ایک قصبہ ہے جبکہ اس کے شمال کی طرف بونیر اور اس سے آگے سوات جیسا خوبصورت علاقہ ہے۔ اس کے مغرب میں مردان ہے۔ اس کے جنوب میں پنج پیر، شاہ منصور اور امبر کے ساتھ ساتھ چھوٹا لاہور بھی ہے۔

صوابی جانے کے لیے آپ پشاور اسلام آباد موٹروے کے صوابی انٹر چینج سے جا سکتے ہیں۔ جہاں سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر صوابی واقع ہے۔ اگر آپ مردان سے آنا چاہیں اس کے لیے موٹروے کا راستہ بھی لیا جا سکتا ہے یا پھر موٹروے بننے سے پہلے والا راستہ جو شہباز گڑھی کے ذریعے آتا تھا، وہاں سے بھی آیا جا سکتا ہے۔ اس راستے سے مردان سے صوابی کا فاصلہ کوئی پچاس کلومیٹر ہے۔ اگر آپ ہری پور سے جانا چاہیں تو غازی (یہ وہ غازی ہے جہاں پر غازی

بروتھا ڈیم بنایا گیا ہے) سے آپ براستہ ٹوپی صوابی پہنچ سکتے ہیں۔ صوابی سے براہ راست کوئی بڑی سڑک بونیر کی طرف نہیں جاتی، یہ شاید پہاڑی علاقے کی وجہ سے ہے۔ اس کا اسلام آباد سے فاصلہ ایک سو دس کلومیٹر ہے جبکہ پشاور سے نوے کلومیٹر۔ اس طرح یہ شہر اسلام آباد اور پشاور کے درمیان واقع ہے۔

اس علاقے کا نقشہ دیکھتے ہوئے آپ یہ جان سکیں گے کہ مردان ایک مرکزی شہر ہے جہاں سے کوئی سات مختلف علاقوں کی طرف سڑکیں جاتی ہیں۔ صوابی سطح سمندر سے کوئی ایک ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس ضلع کی آبادی بھی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ زیادہ تر علاقہ میدانی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی مقامات پر پانی کی بڑی جھیلیں بھی ہیں اور کچھ پہاڑی علاقہ بھی ہے۔

زیادہ اونچائی پر واقع نہ ہونے کی وجہ سے گرمیوں میں مناسب گرمی ہوتی ہے۔ اس علاقے میں سب سے مشہور ادارہ غلام اسحاق خان سابق صدر پاکستان کے نام پر بنایا گیا ہے (غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ)۔ اس کے علاوہ یہاں پر یونیورسٹی آف صوابی بھی ہے اور وویمن یونیورسٹی بھی موجود ہے۔

یہاں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں نجیب الدولہ بھی ہیں جو پانی پت کی تیسری جنگ میں شریک تھے۔ یہ ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ یہ وہی نجیب الدولہ جنہیں نجیب خان یوسف زئی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کا تعلق روہیلہ یوسف زئی افغان قبیلے سے تھا۔ آپ کا تعلق بھی صوابی کے علاقے سے ہی تھا۔ یہ صاحب مغل دربار سے وابستہ تھے۔ ایک سپاہی کے طور پر دہلی پہنچے پھر ترقی کرتے کرتے ایک اونچے مقام تک پہنچ گئے۔

جب مغلوں پر برا وقت آیا اور احمد شاہ ابدالی نے مغل سلطنت کا خاتمہ کرنے کے لیے 1757ء میں دہلی پر حملہ کیا تو وہ ابدالی کے ساتھی بن گئے اور مغلوں کے خلاف پانی پت کی تیسری جنگ جیتنے میں ایک اہم کردار ادا کیا[1]۔ ان کی خدمات کے عوض ابدالی نے انھیں مغل بادشاہ کا میر بخشی مقرر کیا تھا۔ اس بندوبست کی وجہ سے مغل بادشاہ برائے نام بادشاہ تھا جبکہ سب اختیارات نجیب کے پاس تھے۔ اس نے اپنے لیے کئی القابات بھی چنے جیسے امیر الامراء،

---

[1] Chisholm, Hugh, ed. (1911). "Najibabad". Encyclopædia Britannica. Vol. 19 (11th ed.). Cambridge University Press. p. 156.

شجاع الدولہ وغیرہ۔ ایک وقت میں وہ سہارنپور کا گورنر بھی رہا۔ اس نے کئی خوبصورت عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ نجیب آباد شہر کی بنیاد بھی اسی نے رکھی[1]۔

اس سے یہ بات بھی پتہ چلتی ہے جس کا ذکر میں نے اپنی کئی کتابوں میں بھی کیا ہے کہ جب ایک طرف پختون ابدالی تھا اور دوسری طرف مغل تھے، تو پختونوں نے مغلوں سے وفاداری ختم کرکے اپنے پختون بھائی کی مدد کی۔ ایسا ہی شیر شاہ سوری نے کیا تھا، ایسا ہی نجیب الدولہ نے کیا۔

نجیب الدولہ نے ایک سپاہی سے لے کر گورنر تک کا سفر کیا، یہ سب کیسے ہوا؟ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی اور بہت سے سیاسی اور غیر سیاسی لوگ بھی صوابی سے تعلق رکھتے ہیں جن میں صاحبزادہ عبدالقیوم جو کسی زمانے میں موجودہ خیبر پختونخوا کے وزیرِاعلیٰ تھے، بھی شامل ہیں۔ حال ہی میں نشانِ حیدر پانے والے شیر خان بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔

میں نے ایک ویڈیو دیکھی جس میں کچھ لوگ خیبر پختونخوا کا مشہور ساز رباب بجا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دلیپ کمار کا خاندان بھی اسی علاقے سے جا کر پشاور میں آباد ہوا تھا۔

اس ویڈیو میں تو انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہندوستان کی مشہور اداکارہ مدھو بالا کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ میں نے جب اس کے متعلق مزید جانا تو پتہ چلا کہ مدھو بالا کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ مدھو بالا نے مغل اعظم فلم میں انارکلی کا کردار کیا تھا۔ یاد رہے مدھو بالا ایک مسلمان اداکارہ تھیں۔ ان کے والد کا نام عطاء اللہ خان تھا اور وہ یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خاندان اسی علاقے سے دہلی گیا تھا۔ عام طور پر اس کے نام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کی ایک مثال دلیپ کمار صاحب کی ہے جن کا اصل نام محمد یوسف خان تھا۔ مدھو بالا کا اصل نام ممتاز جہاں بیگم دہلوی تھا لیکن ان کا فلمی نام مدھو بالا تھا۔ ان کے علاوہ جناب مشتاق احمد خان (سینیٹر) اور جناب اسد قیصر بھی صوابی سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] Nuruddin Husain (1952). *An Account of Najibuddaulah*. p. LIII. in the year 1708 in the village of Manri about 25 kos from Peshawar.

وویمن یونیورسٹی صوابی کے مطابق[1] مولانا محمد علی جوہر، وی پی سنگھ (ہندوستان کے ساتویں وزیر اعظم) عبدالقادر (سابق ٹیسٹ کرکٹر) جنید خان (فاسٹ باؤلر)، یاسر شاہ (لیگ اسپنر) اور معین اختر (عظیم کامیڈین) بھی صوابی میں ہی پیدا ہوئے۔ میرے لیے معین اختر کے متعلق بات بالکل ہی نئی تھی۔

صوابی: تاریخ کے اوراق پر

ہم صوابی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصہ شمالی پہاڑی علاقے پر مشتمل ہے اور دوسرا اس کا جنوبی علاقہ ہے جو ہموار ہے، ہم اسے میدانی علاقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس علاقے میں بڑے پہاڑوں کی بجائے کم اونچائی کی پہاڑیاں ہیں جو سطح سمندر سے 750 سے 1400 میٹر تک بلند ہیں۔

ضلع صوابی دریائے سندھ اور دریائے کابل کے درمیان واقع ہے جس کی وجہ سے یہ ایک زرخیز علاقہ ہیں۔ عام طور پر یہاں رہنے والوں کو صوابی وال کہا جاتا ہے۔ اس میں آباد لوگوں کی اکثریت کا تعلق پختونوں کے یوسف زئی قبیلہ سے ہے۔ صوابی سے جنوب کی طرف ہنڈ کے مقام پر دونوں دریا اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہنڈ متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ سکندر نے اسی جگہ سے دریائے سندھ عبور کیا تھا[2]۔

صوابی میں گندھارا تہذیب کے کافی آثار ملے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کبھی گندھارا اسلطنت کا حصہ تھا۔ ہنڈ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر تین سو سال سے زائد عرصے تک ہندو اور ترک شاہی کا صدر مقام رہا ہے۔ اس علاقے میں ہندومت کے ماننے والوں کے مطابق ان کے کئی مقدس مقامات بھی تھے۔

رانی گھاٹ کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر ایک تاریخی محل اب بھی موجود ہے جو اس وقت شاہی خاندان کے زیرِ استعمال تھا۔ اس کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں۔ جاپان کی مدد سے یہاں کافی کام ہوا ہے۔ سیاحوں کی ایک کثیر تعداد بھی یہاں آتی ہے۔ ان کی سہولت کے لیے تاریخی مقامات تک جانے کے لیے ایک واک وے بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی حفاظت کے لیے باڑ بھی لگائی گئی ہے۔ اس علاقے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ مولانا عبدالقادر جنھوں نے پشتو کی پہلی لغت لکھی ہے، کا تعلق بھی ایک قریبی گاؤں پبینی سے ہے۔ اس علاقے میں آج بھی ہندو

---

[1] http://www.wus.edu.pk/about-history.aspx
[2] /https://thandkoi.wordpress.com/history-of-swabi

اور سکھ آباد ہیں۔ یہ لوگ کئی صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ صوابی کے ایک خوبصورت گاؤں بٹاکرا کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں۔ یہ گاؤں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کی مچھلیاں بے حد لذیذ ہوتی ہیں۔

چند سال قبل ماہرین آثار قدیمہ کو صوابی میں واقع باہو ڈھیری میں جاری کھدائی کے دوران گندھارا تہذیب سے تعلق رکھنے والے کوئی چار سو سے زائد نئے نوادرات ملے ہیں[1]۔ سب سے اہم دریافت 73 میٹر اونچا اسٹوپا ہے جو اب تک پائے جانے والے نوادرات میں انتہائی اہم مانا جاتا ہے۔ یہ اسٹوپا اس خطے میں اب تک پایا جانے والا اپنی نوعیت کا سب سے بڑا اسٹوپا ہے۔ اس کے علاوہ گوتم بدھ کا 10 فٹ کا ایک نایاب مجسمہ بھی ملا ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ موجودہ کھدائی سے ملنے والے نوادرات سے گندھارا تہذیب کو مزید بہتر انداز سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس سے اس بات کی بھی تصدیق ہو گی کہ قدیم گندھارا تہذیب ایک صدی قبل مسیح میں ایک وسیع خطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کابل اور شمالی افغانستان کے علاوہ پشاور، مردان، صوابی، سوات، بونیر، اور باجوڑ شمال مغرب میں اور آج کے پاکستان کے شمال مشرق میں ٹیکسلا کے ساتھ ساتھ کئی اور علاقے بھی شامل تھے۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ گندھارا تہذیب کا مرکز تخت بائی تھا۔ (مجھے یہ جگہ بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے)۔ یہاں ایک بڑی تعداد میں بدھ مت کے پیروکار آتے ہیں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کے مطابق خیبر پختونخوا میں کوئی بیس ہزار سے زائد مقامات سے آثار قدیمہ ملے ہیں جن میں سے دو ہزار کا تعلق بدھ مت سے ہے۔

آثار قدیمہ سے متعلق ممتاز ماہر آثار قدیمہ اور میوزیم اینڈ آرکیالوجی کے سابق صوبائی ڈائریکٹر ڈاکٹر شاہ نذر خان کی خدمات بے حد اہم ہیں۔ انھوں نے ضلع صوابی سمیت پورے خیبر پختونخوا میں تحقیق کی ہے اور کئی لاجواب خزانے دریافت کیے ہیں[2]۔ ان کے مطابق

Anadolu Agency[1]

https://www.pakistantoday.com.pk/2022/02/15/
/ancient-buddha-artifacts-found-in-swabi

[2]Dr Muhammad Ali Jauhar Yusufzai February 05, 2023

سب سے اہم اور غیر معمولی دریافت عزیز ڈھیری ہے جو مردان صوابی روڈ پر گوہاٹی سے تقریباً 12 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔

ان کے مطابق عزیز ڈھیری کا رقبہ کوئی سو کنال سے زائد ہے۔ اس جگہ کا نام اس علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور مذہبی اسکالر عزیز خان کے نام پر رکھا گیا ہے جو کوئی دو سو سال قبل اس جگہ قیام پزیر تھے۔ اس علاقے کا پہلی بار سروے 1976ء میں کیا گیا تھا۔ بعد میں 1998ء میں دوبارہ کھدائی شروع کی گئی۔

ماہرین کے مطابق عزیز ڈھیری میں دوسری صدی سے ساتویں صدی تک بڑی تعداد میں لوگ آباد تھے۔ یہاں تین طرح کی عمارات پائی گئی ہیں؛ پہلی شہر کے کھنڈرات، دوسری اسٹوپا کی بڑی عبادت گاہ اور تیسری ایک کالونی ہے جہاں لوگ عبادت کے لیے بیٹھتے تھے۔

اس جگہ پر کوئی بارہ کے قریب کمرے بھی ہیں۔ ان کمروں کو بنانے میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے جو بونیر میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عزیز ڈھیری سے ایک بڑی تعداد میں مجسمے، برتن، آگ میں پکے مٹی کے برتن اور روزمرہ استعمال کی اشیاء بھی ملی ہیں۔ اناج پیسنے کے لیے پتھر کی چکی کا ملنا بھی ایک دریافت ہے۔

ایسی جگہیں دنیا بھر سے ایک بڑی تعداد میں سیاحوں کی دلچسپی کا سبب بن سکتی ہیں۔ اس لیے ان کی دنیا بھر میں تشہیر بے حد ضروری ہے۔

Aziz Dheri and the footprints of Buddhism in K-P

Buddhist remains in Swabi of the Gandharan civilisation, include the largest stupa found in the subcontinent.

https://tribune.com.pk/story/2399496/aziz-dheri-and-the-footprints-of-buddhism-in-k-p

تھنڈ کوئیس بھی صوابی کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں پر بھی پہاڑ پر ایک ریسٹ ہاؤس اور زیتون کے باغات ہیں۔ کہتے ہیں کہ تھنڈ کوئیس میں دس سے زیادہ اسکول ہیں جو شاید پورے پاکستان میں اپنے سائز کے کسی بھی گاؤں میں پائے جانے والے اسکولوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

کیا یہ بات درست ہے کہ ہندوستان کا نام ہند اسی گاؤں کے نام یعنی ہنڈ سے نکلا ہوا ہے اور یہاں پر واقع چھوٹا لاہور اصل لاہور سے پہلے سے آباد تھا؟

کاشف رحمان کے مطابق یہ بات درست ہے[1]۔

کاشف رحمان لکھتے ہیں کہ یہاں پر بیکا گاؤں بھی موجود ہے جو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ اس گاؤں کی تاریخ یہ ہے کہ اس میں اکبر بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو رہنے کے لیے بھیجا تھا۔ دریا میں پانی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ دریا کے دوسری طرف نقل مکانی کر گئے۔ یہاں ایک نیک دل شخص کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ ان کا نام حاجی محبت خان تھا۔ وہ ایک عظیم سماجی بہبود کے کارکن تھے۔ انھوں نے تعلیم کی خاطر اپنی زمین گرلز پرائمری سکول، گرلز ہائی اسکول ، قبرستان اور اسپتال کے لیے عطیہ کی۔ ایسے عظیم لوگوں کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔اسی علاقے میں ایک سبز وادی بھی جسے گدون کہتے ہیں۔ اس کی حدود ہری پور اور بونیر سے ملتی ہیں۔

صوابی کے پاس ہی ایک گاؤں نواں کلے نامی تھا۔ کرنل شیر خان شہید کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ ان کی شہادت کے بعد اس گاؤں کا نام کرنل شیر خان شہید رکھا گیا۔ اسی گاؤں میں ان کی قبر بھی بنائی گئی ہے۔ میں نے ان کی قبر کی ایک ویڈیو بھی دیکھی ہے۔ ان کی قبر مردان صوابی شاہراہ پر شیوا اڈہ کے قریب واقع ہے۔

اس علاقے میں واقع ایک اور اہم گاؤں مرغوز بھی ہے، جہاں سے کئی نامور ہستیاں تعلق رکھتی ہیں، ان میں خدائی خدمتگار تحریک کے ایک اہم رہنما غلام حیدر (جرنال) اور عظیم پختون رہنما باچا خان کی والدہ بھی شامل ہیں۔

ہر علاقے کی طرح صوابی میں بھی یوسف خان اور شیر بانو کے پیار کی ایک کہانی مشہور ہے۔ یہ ایک پختون مشہور لوک کہانی ہے۔ یوسف خان کا مقبرہ شیر اغنڈ گاؤں کے قریب

[1] /https://thandkoi.wordpress.com/history-of-swabi

ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ ایک بڑی تعداد میں سیاح اس مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی صوابی میں کئی دلکش میدان ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو جی بھر کر اللہ کی پیدا کردہ ان حسین وادیوں کو پورے طور پر نہ دیکھ سکے۔ زندگی رہی تو پھر سہی!

دو دریاؤں کی وجہ سے یہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے ندی نالے ہیں۔ اس کی وجہ یہاں پر دو عظیم دریاؤں، سندھ اور کابل کا ملنا ہے۔ جہاں یہ دریا ملتے ہیں وہ ایک نہایت ہی خوبصورت مقام ہے اور سیاحوں کی ایک بڑی تعداد یہاں آتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس علاقے میں دونوں دریا ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی شکل پیش نہیں کرتے جیسے جھنگ کے پاس چناب اور جہلم دریا ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی ایک جگہ نہیں ہے جہاں یہ دریا آپس میں ملتے ہوں۔ یہ ایک سے زائد مقامات ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں دریا خیر آباد کے قریب ملتے ہیں۔

یہاں کئی قدیم کھیل اب تک کھیلے جاتے ہیں جن میں ایک کوڈا بھی ہے جسے ہم بھی اپنے علاقے میں کھیلتے تھے۔ میرے خیال میں اب تک میں نے خیبر پختونخوا کے جتنے بھی شہر دیکھے ان میں صوابی کے لوگ اپنی خوش مزاجی، خوش خوراکی کھیل اور تفریح جیسے کاموں میں سب سے آگے ہیں۔

اس شہر سے خاص انس کی وجہ یہاں سے میرے بہترین دوست، میرے کمانڈر، شہید عالم زیب کا تعلق ہونا بھی ہے۔ جب میں 1989ء میں افغانستان میں جہاد کے لیے پاراچنار سے آگے ایک فوجی چوکی پر تھا، اس وقت شہید عالم زیب ہمارے کمانڈر تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک جہاد میں مصروف رہے، بعد میں ایک معرکے میں ان کی شہادت ہو گئی۔ ان کی یاد میں نے عالم زیب بک فاؤنڈیشن بھی بنائی تھی۔

موقع ملے تو یہاں ضرور آنا چاہیے۔ صوابی ایک خوبصورت جگہ ہے۔

چارسدہ: ایک روایتی پختون علاقہ جہاں تین دریا بہتے ہیں

ایک دن محترم خالد وقاص صاحب صدر الخدمت خیبر پختونخوا کا فون آیا ۔ مجھے انھوں نے کہا کہ میں الخدمت فاؤنڈیشن چارسدہ میں والنٹیرز کنونشن میں شریک ہوں۔ کنونشن میں آٹھ سو سے زائد الخدمت کے والنٹیرز نے حلف بھی لینا ہے اور اس کے علاوہ ان کے درمیان بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو شیلڈ بھی دی جائیں گے۔میں نے خالد وقاص صاحب کے کہنے پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم 25فروری 2023 ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب لاہور سے روانہ ہوئے۔ میرے ساتھ سنان اکبر جو الخدمت فاؤنڈیشن کے مرکزی دفتر میں والنٹیرز ڈیپارٹمنٹ کے انچارج ہیں بھی تھے۔راستے میں کلر کہار رک کر ہم نے گھر سے ساتھ لائے ہوئے ناشتے سے انصاف کیا اور دو بجے کے قریب چارسدہ پہنچ گیا۔ہم سب سے پہلے آج سے دس سال قبل الخدمت فاؤنڈیشن چارسدہ کے تحت بنائے گئے اسپتال گئے جو پچاس بیڈ کا ایک اسپتال ہے۔یہ ایک بہت ہی خوبصورت منصوبہ ہے جس سے اہل علاقہ بے حد مستفیض ہوتے ہیں۔بعد میں قریب ہی ولی خان سپورٹس کمپلیکس میں چلے گئے جہاں پر یہ پروگرام منعقد ہو رہا تھا۔یہ کمپلیکس دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔یہ منصوبہ اے این پی کی حکومت کے دوران بنایا گیا تھا لیکن اس کا افتتاح موجودہ حکومت نے کیا تھا۔

داخل ہوتے ہی سامنے محمود خان سابقہ وزیر اعلی خیبر پختونخوا کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔اس کمپلیکس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ایک سپورٹس کمپلیکس سے جہاں پر ہاکی کھیلنے والوں کے لیے آسٹر وٹرف بھی بچھائی ہوئی ہے۔ان ڈور گیمز کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اور ایک بڑا میدان بھی ہے جہاں پر اس طرح کے پروگرامات کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ آج ہو رہا تھا۔

پروگرام کے بعد ہم قریبی دریا کے کنارے چلے گئے جہاں پر ہم نے بہت ہی مزیدار مچھلی کھائیں اور مقامی دوستوں کی محفل سے لطف اندوز بھی ہوئی۔اس کے بعد مقامی دوستوں نے ہمیں مٹھائی بھی دی، میں نے اس طرح کی مٹھائی پہلے کبھی نہیں کھائی تھی،کافی مختلف تھی اور بہت ہی مزیدار بھی۔

آپ کے علم میں ہے کہ چارسدہ چپل بنانے کے معاملے میں مشہور ہے یہاں پر کئی سو چھوٹے بڑے کارخانے کام کرتے ہیں۔بڑی بڑی مارکیٹیں ہیں جہاں پر صرف چپل کا کاروبار ہی ہوتا ہے۔ ہم ایک مارکیٹ میں چلے گئے اور مقامی دوستوں نے مجھے، سنان صاحب کو ہمارے ڈرائیور عباس کو چپل بھی لے کر دی۔ جس پر ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد ایک مرتبہ باچا خان یونیورسٹی میں جانے کا موقع ملا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ہم نے چارسدہ میں واقع چند اہم مقامات دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ان اسفار میں جو کچھ دیکھا، جو جانا سب پیشِ خدمت ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کو چارسدہ کی ایک مختصر تاریخ سے بھی روشناس کرانا چاہتا ہوں۔امید ہے کہ آپ کو یہ پسند آئے گی اور اب بھی چارسدہ کی سیر کے لیے جائیں گے۔

چارسدہ پشتو کا ایک لفظ ہے جس کا ایک مطلب ہے چار راستے۔ چارسدہ سے چار راستے مختلف علاقوں کی طرف جاتے ہیں۔ چارسدہ، پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کے ضلع چارسدہ کا ایک قصبہ اور اس کا صدر مقام بھی ہے۔ چارسدہ پشاور کی وادی میں واقع ہے اور پشاور سے تیس کلومیٹر کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس دور میں کئی عمارتیں بھی بنائی گئی تھیں جن کے آثار اب تک موجود ہیں۔اسی دور سے تعلق رکھنے والی اشیاء سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں قدیم زمانہ سے چارسدہ کے باشندے لوہے سے کئی قیمتی اشیاء بناتے تھے۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک گندھارا کا دارالحکومت بھی اسی جگہ واقع تھا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ چارسدہ کا قدیم نام پشکلاوتی تھا۔ اسی وجہ سے اس جگہ جو میوزیم بنایا گیا ہے، اس کا نام پشکلاوتی رکھا گیا ہے۔ سنسکرت میں پشکلاوتی کا مطلب کنول کا پھول ہے۔ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ سنسکرت گرامر کے گرو پانینی کا تعلق بھی اس علاقے سے تھا (کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا تعلق اٹک سے تھا، کیا سچ ہے معلوم نہیں)۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ پر درانی، سکندر اعظم، موریا، یونانی، ہندپارتھی، کشان، ہن، ترک اور گپتا حکمران رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے ہمیشہ ہی بیرونی حملہ آوروں کا پسندیدہ مقام رہا ہے۔چارسدہ کے قرب وجوار میں تین دریا بہتے ہیں؛ دریائے جندی، دریائے کابل اور دریائے سوات۔ اس علاقے میں ایک نہر بھی موجود ہے جس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ چارسدہ کی زمین بے حد زرخیز ہے۔ چارسدہ کی سرحدیں

پشاور، نوشہرہ اور مہمند کے اضلاع سے ملتی ہیں۔ یہی تین دریا اس علاقے میں سیلاب کا باعث بھی بنتے ہیں۔

عبدالغفار خان (باچا خان) جدو جہد آزادی کا ہیرو جسے بھلا دیا گیا

چارسدہ کے قرب اتمان زئی نام کا گاؤں موجود ہے جہاں عبدالغفار خان پیدا ہوئے جو ایک مشہور سیاسی رہنما تھے۔ اس کے قریب ہی ولی باغ نام کا ایک علاقہ بھی ہے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے۔ مجھے خان عبدالغفار خان صاحب المعروف باچا خان (1890-1988) کی اپنی لکھی ہوئی آپ بیتی پڑھنے کا موقع ملا۔

ان کی کتاب کا پیش لفظ جی پرکاش نارائن نے سن 1969ء میں لکھا تھا اور یہ کتاب 165 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں خان عبدالغفار خان نے اپنے بچپن سے لے کر تقسیم ہند کے بعد کے واقعات کو تفصیل سے لکھا ہے۔ زیر بحث کتاب کا پیش لفظ یہ بتاتا ہے کہ 1969ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔ کتاب میں صرف ان واقعات کا ذکر ہے جو قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے واقعات غفار خان صاحب نے صرف دو صفحات میں لکھے ہیں۔ ان میں انھوں نے صرف یہی لکھا ہے کہ انھیں کس طرح سے اس دوران پندرہ سال تک مختلف جیلوں میں رکھا گیا اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس دوران ان پر جتنا ظلم و تشدد ہوا، وہ انگریزوں کے دور میں بھی نہیں ہوا۔

کتاب کے آغاز میں انھوں نے چارسدہ کے قریب گاؤں اتمان زئی میں اپنی پیدائش، اپنے والدین اور اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خان جن کا اصل نام خان عبدالجبار خان تھا، کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم اور تعلیم کے لیے صوبہ سرحد میں مدارس کے قیام کی جدوجہد اور بعد میں لوگوں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا اور عمر بھر پختونوں کی بہتری اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ سرگرداں رہے۔ اس کا انھوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

انھوں نے تفصیل سے یہ بھی لکھا ہے کہ کس طریقے سے انھوں نے اپنی تنظیم بنائی اور بعد میں جب انگریزوں نے ان پر ظلم کیے تو وہ مسلم لیگ سے مدد لینے کے لیے پہنچے لیکن مسلم لیگ نے ان کی مدد نہ کی۔ اس پر وہ کانگریس کے پاس پہنچے۔ کانگریس نے ان کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس طرح کانگرس کے ساتھ مل کر انھوں نے تحریک آزادی ہند میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

اس دوران انھوں نے جس انداز سے اس وقت کے صوبہ سرحد میں انگریزوں کے ظلم و ستم کا ذکر کیا ہے وہ میرے لیے بھی انتہائی نئی باتیں تھیں اور مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ آزادی ہند کے لیے صوبہ سرحد کے لوگوں نے کتنی قربانیاں دیں اور پھر انھوں نے مختلف الیکشنز

میں اپنی پارٹی کی جیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کانگریس کا حصہ بھی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی جماعت کا کام بھی کرتے رہے۔

گاندھی، نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کی ملاقاتیں رہیں۔ تقسیم ہند پر ان کی سوچ کانگریس سے ملتی تھی۔ وہ تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے۔ آخر میں انھوں نے تقسیم ہند کے مسئلہ پر کانگریس کے رویہ کی بہت شدت سے مذمت کی ہے اور ان کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ٹھیک نہیں کیا۔

جناب غفار خان صاحب صوبہ سرحد میں ریفرینڈم کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب اس وقت کی موجود صوبائی اسمبلیوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں جیسے پنجاب اسمبلی نے کیا تو یہ حق صوبہ سرحد کی اسمبلی کو کیوں نہیں دیا گیا؟ کانگریس نے ان کے اس مسئلے پر کوئی ساتھ نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے عبدالولی خان کے متعلق اور دیگر بچوں کے متعلق بھی بہت ساری باتیں لکھی ہیں۔

عام طور پر جو ان کے متعلق تاثر ہے، اس کے مطابق انھیں صوبہ سرحد کا گاندھی کہہ کر ان کے نام کے ساتھ ایسا ٹیگ لگا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لوگ انھیں پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور بعد میں ان کا جلال آباد میں دفن ہونا اس بات کو تقویت دیتا ہے۔

انھوں نے اپنی دوسری بیوی اور ہمشیرہ کے ساتھ 1926ء میں حج کیا، اس وقت تمام تر سفر اونٹوں پر کیا جاتا تھا۔ اس دوران وہ فلسطین بھی گئے جہاں ان کی دوسری بیوی سیڑھیوں سے گر کر فوت ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔

میں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کے خیالات اور نظریات سے اختلاف اپنی جگہ، کئی لوگوں کو ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ یہ ہر کسی کا بنیادی حق ہے۔ لیکن غفار خاں صاحب کی اپنی قوم سے محبت، انگریزوں سے جنگ، آزادی کی خاطر قربانیاں، دیانت، شرافت اور وضع داری پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ انھوں نے پندرہ سال تقسیم ہند سے قبل اور پندرہ سال قیام پاکستان کے بعد جیلوں میں گزارے۔ انھیں اپنے لوگوں سے دور رکھنے کے لیے صوبہ سرحد سے باہر دور دراز علاقوں میں قید رکھا جاتا رہا۔ ان کی اکثر قید، قید تنہائی تھی۔ میرے علم کے مطابق اتنی طویل مدت کی قید ہندوستان بھر میں شاید ہی کسی کے کاٹی ہو۔ انھوں نے خلافت بچاؤ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

مکمل آزادی اور ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں غفار خاں صاحب نے بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں اپریل 1930ء میں قصہ خوانی بازار میں خاں صاحب نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس پر انگریزوں نے بکتر بند گاڑیاں چڑھا دیں اور اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ جس

کے نتیجہ میں کئی سو لوگ شہید ہوئے۔ اس واقعہ کا اس طرح ذکر نہیں کیا جاتا جس طرح جلیانوالہ باغ کے واقعہ کا کیا جاتا ہے۔ خدائی خدمت گار ایک پُر امن تحریک پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے وہ کبھی بھی مسلح نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تمام تر قربانیاں بھلا دی گئیں اور ان کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ ایسا کیوں ہوا؟

معلوم نہیں، لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے!

میرے خیال میں جتنا ظلم انگریزوں نے صوبہ سرحد کے لوگوں پر کیا ہے، اتنا شاید ہی کسی اور صوبہ میں کیا ہو۔

میں نے بہت سے لوگوں سے یہ بات سنی ہے کہ مولانا مودودیؒ نے غفار خان صاحب کا گھر سے باہر آ کر استقبال کیا تھا۔ اس پر جب لوگوں نے پوچھا کہ یہ اس غیر معمولی استقبال کی کیا وجہ ہے؟ تو مولانا نے جواب دیا تھا کہ غفار خان صاحب ایک غیر معمولی شخص ہیں۔ اس کی تصدیق کسی کتاب سے نہیں ہوتی مگر کئی لوگ اسے بیان کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک درست بات ہے۔

میں ان لوگوں سے جو پاکستان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، جاننا چاہتے ہیں کہ قیام پاکستان کے مقاصد کیا تھے اور کن لوگوں نے اس میں کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں، ان سے ضرور یہ کہوں گا کہ اس آپ بیتی کو ضرور پڑھیں۔ اس کتاب کے آغاز میں ایک بہت ہی خوبصورت سطر لکھی ہوئی ہے کہ اس کتاب سے ہر شخص بلا اجازت استفادہ کر سکتا ہے۔

نعیم اشرف نے غفار خاں بارے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

نعیم اشرف لکھتے ہیں کہ افغانستان میں اپنی طویل جلا وطنی کے بعد باچا خان 1972ء کو پاکستان آئے اور انھوں نے پشاور کے مشہور جناح پارک میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ وہ برسرِ عام قائدِ اعظم محمد علی جناح، مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام پر سخت تنقید کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے جناح پارک میں ہی محمد علی جناح پر تنقید کی۔ عبدالغفار خان نے اپنے نظریات اور خیالات کی وجہ سے جنوبی افریقہ کے نیلسن مینڈیلا کی طرح کوئی تیس سال تک کا عرصہ برطانوی، ہندوستانی اور پاکستانی جیلوں میں گزارا۔ یہ بھی ایک افسوس ناک بات ہے کہ 1988ء میں 98 سال کی عمر میں جب ان کی وفات ہوتی ہے، اس وقت بھی وہ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے خلاف بیان دینے کی پاداش میں اپنے گھر میں نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے۔

عبدالغفار خان کا تعلق ایک خوشحال خانوادے سے تھا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد ایک ہمدرد اور کنبہ پرور انسان تھے۔ یہ بھی اس مضمون میں لکھا ہے کہ باچا خان نے کم عمری میں ہی ''مُلّا مستان'' کا نام سن رکھا تھا جو اس زمانے میں پٹھانوں کے دل کی دھڑکن تھے کیونکہ وہ قابض برطانوی فوج کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔

ملا مستان بھی تاریخ کا ایک گمشدہ کردار ہے۔ مُلّا مستان نے دس ہزار مجاہدین کا ایک لشکر تیار کیا تھا، جس نے برطانوی فوج سے کئی جنگیں لڑیں۔ باچا خان، مُلّا مستان سے بے حد متاثر تھے۔ علاقے کے رواج کے مطابق عبدالغفار خان برطانوی فوج میں بھرتی بھی ہوئے۔ یہ اس دور میں ایک بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مگر عبدالغفار خان نے یہ کہہ کر بھرتی ہونے سے انکار کر دیا کہ یہ نوکری، غلام بننے کے مترادف ہے۔

جب عبدالغفار خان جوان ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ پختون جہاں بہادری، سخاوت اور امانت داری جیسی عظیم الشان اقدار رکھنے والے ہیں، وہیں ان میں مخالفین سے بدلہ لینے جیسی قباحتیں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ چاہتے تھے یہ نہیں ہونا چاہیے۔

نعیم اشرف مزید لکھتے ہیں کہ عبدالغفار نے جب اپنے علاقے کے دیہات میں غربت اور جہالت دیکھی تو اس کی بہتری کے لیے کام شروع کر دیا۔ انھوں نے حاجی واحد کے ساتھ مل کر بچوں کے لیے اسکول بنائے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب آپ نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر کانگریس کے ساتھ مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان بھر کے شہروں کے دورے بھی کیے۔ اس دوران ان کی کانگریس کے قومی سطح کے سیاسی رہنماؤں جن میں جواہر لال نہرو، سردار پاٹیل اور عبدالکلام آزاد شامل تھے، ملاقاتیں بھی ہوئی۔ وہ سب سے زیادہ موہن داس گاندھی سے تاثر تھے۔ اس کے بعد وہ کئی بار جیل بھی گئے۔ اسی دوران انھوں نے خدائی خدمت گار کے نام سے ایک جماعت بھی بنائی جس کا نعرہ تھا ''لوگوں کی خدمت کے ذریعے خدا کی خدمت۔''

عبدالغفار خان نے نمود و نمائش اور پر تعیش زندگی چھوڑ کر ایک سادہ اور درویشانہ طرز زندگی کو اپنے لیے بہتر جانا۔ ان کی اس طرح کی خدمات کی وجہ سے لوگوں نے انھیں باچا خان (بادشاہ خان) کا لقب دے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر لوگ ان کو ''سرحدی گاندھی'' بھی پکارنے لگے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے تاریخ کی سب سے پہلی غیر لڑاکا فوج تیار کی، جس کی وردی سرخ تھی۔ آج بھی اے این پی کا جھنڈا سرخ ہے۔ ان کے پیروکار سرخ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔

عبدالغفار خان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انھوں نے خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دینے کی مہم بھی شروع کی۔ وہ موہن داس گاندھی کی طرح یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم غیر فطری ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مختلف ثقافت اور لسانی پہچان کے حامل لوگ صدیوں سے ایک ہی جگہ بس رہے ہیں۔ ان کے بیچ مذہبی اختلافات، تعصب اور نفرت کے بیج بونا خطرناک ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو تشدد اور قتل و غارت کی صورت پیدا ہو جائے گی، جو کبھی بھی ختم نہیں ہو گی۔

ان کا یہ قول بے حد مشہور ہوا کہ ''انگریز عدم تشدد سے خوف زدہ ہیں۔ ایک غیر متشدد پٹھان، ایک لڑاکا پٹھان سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

عبدالغفار خان، پاکستان بننے کے بعد پاکستانی حکومتوں سے بے حد مایوس ہوئے۔ انھوں نے پختونوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے اور ملک کو ایک غیر مذہبی ریاست بنانے کے لیے ایک سیاسی جماعت بنالی جس کا نام ''نیشنل عوامی پارٹی'' رکھا جس کی سربراہی عبدالغفار کے فرزند ولی خان نے سنبھالی تھی۔

چارسدہ میں جلیانوالہ باغ

بابڑہ میں قتل عام، اپنوں ہی کے ہاتھوں ہوا۔ میں نے جب بھی تاریخ کے اوراق پلٹے، اکثر مقامات پر ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام جاننے کا ملا۔ ایسا ہی کچھ جلیانوالا باغ میں بھی ہوا تھا، ایسا ہی چارسدہ کے قریب ایک بڑے گاؤں بابڑہ میں بھی پیش آیا۔ آج جب چارسدہ آنا ہوا تو وہ تمام بے گناہ یاد بھی آئے اور ان خواتین کی آہ وبکا بھی فضا سے سنائی دی جو قرآن ہاتھ میں پکڑے فریاد کر رہی تھیں۔ مارنے والوں میں شاید ایک بھی غیر مسلم نہیں تھا بلکہ شاید کوئی بھی غیر پختون بھی نہیں تھا۔

پختون معاشرے کی بنیاد ہی دو چیزوں پر ہے؛ ایک حجرہ، پختون ولی اور جرگہ، اور دوسرا دینِ اسلام۔ بے دریغ گولیاں چلانے والے اور اس کا حکم دینے والے اور اس کے بعد گولیوں کا معاوضہ حاصل کرنے والے سب پختون ولی بھی جانتے تھے، حجرہ بھی، جرگہ بھی، دین بھی اور سب سے بڑھ کر عورت کی عزت اور احترام بھی۔ ان کا تعلق پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری سے تھا۔

ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا جس نے یہ ظالمانہ حکم ماننے سے انکار کیا ہو۔۔۔
اپنی وردی اور نوکری کی پرواہ نہ کی ہو۔۔۔
کوئی ایک بھی نہیں تھا۔۔۔

اس دن وہ یہ سب بھول گئے تھے۔۔۔
لیکن تاریخ کبھی نہیں بولتی۔۔۔
میں بھی خیبر پختونخوا کا سفر نامہ لکھتے ہوئے ان بے گناہ چھ سو شہیدوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔۔۔

اس واقعہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کے متعلق درسی کتب میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے اس واقعہ کی تفصیل جاننے کے لیے کئی مضامین پڑھے۔ ان میں ایک مضمون رستم شاہ مہمند کا ملا جسے ٹریبون نے شائع کیا ہے۔ جو جانا جو سمجھا، پیشِ خدمت ہے۔

یہ 12 اگست 1948ء کی بات ہے، ابھی قائدِ اعظم حیات تھے اور گورنر جنرل کے طور پر ملک کی بھاگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے قیوم خان صوبے کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اس دن چارسدہ کے قریب واقع گاؤں بابڑہ میں چھ سو سے زائد پُرامن مظاہرین جن کا تعلق خدائی خدمت گار تحریک سے تھا، پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کے ہاتھوں صرف چند گھنٹوں میں شہید کر دیے گئے۔ جو بچ گئے، ان میں ان کی خوش قسمتی سے زیادہ اسلحہ ختم ہونے کا عمل دخل تھا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ صرف چھ لوگ مارے گئے، کچھ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو مارے گئے۔ اگر اس واقعہ کی تحقیقات ہو جاتی تو صحیح صورتِ حال سامنے آ سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا !

اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ خدائی خدمت گار تحریک کے رہنما عبدالغفار باچا خان کی ساتھیوں سمیت گرفتاری اور جائیداد کی ضبطی جیسے اقدامات کے خلاف خدائی خدمت گار تحریک کے کارکنان ایک پرامن احتجاج کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ وزیرِ اعلیٰ تو ایک کشمیری تھا لیکن صوبے کا گورنر سر امبروز ڈنڈاس ایک انگریز تھا۔ گورنر نے جولائی 1948 میں ایک آرڈیننس جاری کیا۔ اس آرڈیننس کے مطابق پولیس کو کسی بھی شخص کو بغیر وجہ بتائے گرفتار کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو ایسے قیدیوں کی جائیداد ضبط کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ یاد رہے کہ گورنر اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل، قائدِ اعظم کے احکامات کے تحت کام کر رہے تھے۔ اس نئے قانون کی آڑ لے کر صوبائی حکومت نے صوبے بھر میں سیاسی مخالفین کی ایک بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کیں۔ اس سے صوبے بھر میں ایک کشمکش کی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تقسیمِ ہند کے وقت ڈاکٹر خان کی حکومت تھی۔ تقسیم کے صرف سات دن بعد 22 اگست 1947ء کو ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت برطرف کر دی گئی تھی۔ یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے ڈاکٹر خان کی جماعت خدائی خدمت گار نے 1946ء کے صوبائی انتخابات میں ایک واضح اکثریت حاصل کی تھی۔ صوبہ

سرحد کی اسمبلی میں کل پچاس ارکان تھے جن میں سے تینتیس کا تعلق خدائی خدمت گار تحریک سے تھا۔

خدائی خدمت گار 12 اگست 1948ء کو چارسدہ سے بابڑہ کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ ہر کسی پر لازم تھا کہ وہ احتجاجی ریلی میں شریک ہوتے وقت بندوق تو دور کی بات تھی کوئی ایک چھڑی بھی نہ لے کر آئے۔ سب نے اس پر عمل کیا۔ مسلم لیگ کے وزیر اعلیٰ قیوم خان کے حکم پر علاقے میں دفعہ 144 نافذ کر دی تھی جس کے تحت کوئی بھی جلوس یا جلسہ منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ جب پولیس نے لوگوں کو منتشر ہونے کا حکم دیا اور لوگوں نے اس پر عمل درآمد نہ کیا تو پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

اس منظر کا تصور ہی مشکل ہے۔۔۔

لاٹھی چارج کیا جا سکتا تھا۔۔۔

آنسو گیس پھینکی جا سکتی تھی۔۔۔

ڈرایا دھمکایا جا سکتا تھا۔۔۔

فیصلہ گولی ہی کا کیوں گیا؟

ان لوگوں کے سینوں میں کوئی دل نہیں تھا۔۔۔ میرا یہی خیال ہے!

اب لوگ زمین پر گرنے لگے۔ قریبی گھروں سے عورتیں اپنے سروں پر قرآن کے نسخے لے کر آگئیں، وہ آہ و بکا کرتی رہیں۔۔۔۔

لیکن گولیاں پھر بھی چلتی رہیں!

رستم شاہ مہمند سمیت کئی اور لوگوں نے بھی تعداد چھ سو لکھی ہے، حکومت کا کہنا تھا کہ چھ لوگ مارے گئے، کچھ کا کہنا ہے کہ ڈیڑھ سو لوگ مارے گئے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک بھی مرا، تو بھی یہ ایک بڑا جرم تھا۔

اس سے بھی بڑا جرم یہ ہوا کہ اس واقعے کے صرف تین ہفتے بعد وزیر اعلیٰ قیوم خان نے فخر سے کہا کہ اگر پولیس کا گولہ بارود کا ذخیرہ ختم نہ ہوتا تو جو پکڑے گئے ہیں، انھیں بھی مار دیا جاتا۔ افسوس تو دور کی بات تھی۔ایک ظلم اور بھی ہوا کہ اس قتل عام کی کبھی بھی غیر جانبدارانہ تحقیقات نہیں کی گئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گولیاں مارنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ میں نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ دنیا بھر مرنے والے سے گولی کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ لیکن بابڑہ میں تو یہ بھی ہوا۔ بابڑہ سانحہ کے بعد خدائی خدمتگاروں پر زمین تنگ کر دی گئی۔ ان کے گھروں کو لوٹا گیا، فصلوں کو آگ لگادی اور مویشیوں کو ذبح بھی کیا گیا۔ یہ بھی ہوا کہ صوابی میں خدائی خدمتگار مردوں کو پکڑ کر ان کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔

ظلم یہ ہے کہ یہ سب سرِ عام ہوا !

حکومت وقت نے لوگوں پر جرمانہ عائد کیا، جواز یہ دیا کہ بابڑہ میں سرکاری گولہ بارود استعمال ہوا ہے۔ کئی لوگوں کا جرمانہ، باچا خان نے اپنی سینکڑوں ایکڑ خاندانی زمین بیچ کر ادا کیا۔

یہ سب جان کر میں یہی کہوں گا کہ اسلام، مساوات، جمہوریت، انصاف، برابری کے نام پر بننے والے ملک میں ایسا نہ ہوتا تو بہت خوب ہوتا !

اس سے بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ اب تک اسی طرح کی روایت جاری ہے۔۔۔

وہ مارشل لاء کے دور میں بھی اور حالیہ جمہوری دور میں بھی۔۔۔ یہ کب ختم ہو گی، معلوم نہیں، دعا اور دوا دونوں کی ضرورت ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس واقعہ پر غنی خان نے بھی چند شعر لکھے ہیں۔

نن دہ ھغہ ورح چی پښتون ژوند پہ مرگ گټلے و

خپلی محبوبی لہ زلمی سر تلی کښی ورے او

تہ ماتاملا بابا دیو اسماعیل کری قیصی

دلتہ پہ ھر گام باندیبیو یو قربانی شوے و

ترجمہ: آج وہ دن ہے جب پختون نے زندگی موت کو شکست دے کر جیت لی۔ اس نوجوان نے اپنا سر اپنی محبوبہ کے سامنے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی میں پیش کیا۔ او ملّا تم مجھے ایک اسماعیل (ع) کی قربانی کا قصہ سناتے رہتے ہو، لیکن یہاں ہر قدم پر قربانی دی گئی ہے۔

یہاں مجھے جناب فیض احمد فیض کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے۔۔۔

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا

وہ جا لگی ہے افق کنارے

اداس رنگوں کی چاند نیا

اتر گئے ساحلِ زمیں پر

سبھی کھویا

تمام تارے

اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکم خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر

اور اس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر

نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو

اب دماغ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے
یہ وقت آئے تو بے ارادہ
کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں

اتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گل بوٹے الفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خون جگر کے دھبے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا

یہ مہر ہے یار مہرباں کی
یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت شیخ بدزباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہن دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوش وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگالو

بابڑہ میں شہداء کی یادگار

8اگست، 2023ء مجھے چارسدہ میں واقع باچا خان یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ الخدمت فاؤنڈیشن خیبر پختونخوا نے وہاں پر پودے لگانے کی ایک تقریب منعقد کی تھی جس میں مجھے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تقریب کی مصروفیات سے فارغ ہو کر میں نے نعمان بھائی سے کہا کہ مجھے چارسدہ کی کچھ تاریخی جگہوں پر جانا ہے۔ دو مقامی ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہو گئے اور اس طرح سے ہم نے چارسدہ میں واقع چار اہم مقامات کی سیاحت کی۔ ان میں سب سے پہلے ہم چارسدہ سے بالکل قریب ہی واقع بابڑہ گئے۔ بابڑہ میں شہداء بابڑہ کی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔

جس جگہ یہ واقعہ ہوا تھا، اس جگہ پر ایک چبوترے پر چورس شکل کا ایک مینار بنایا گیا ہے۔ ہم چند سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ شہداء کے لیے فاتحہ خوانی بھی کی۔ وہاں پر لال رنگ کے جھنڈے بھی لگے ہوئے تھے۔ خوشی اس بات کی تھی کہ کسی نے تو ان شہداء کی یاد میں چند پتھر اکٹھے کیے ہیں۔ امید اس بات کی جانی چاہیے کہ آنے والی نسل اس سے بھی زیادہ خوبصورت یادگار تعمیر کرے گی اور اسے ارد گرد کی آلودگی سے بھی بچائے گی۔

خان عبدالغفار خان صاحب کا آبائی گھر

بابڑہ کی یادگار کے بعد ہم خان عبدالغفار خان صاحب عرف باچا خان کے گھر چلے گئے جو اتمان زئی میں واقع ہے۔ ان کا پرانا گھر جو مٹی سے بنا ہوا ہے، دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ایک

محتاط اندازے کے مطابق یہ گھر کوئی سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ جب وہاں پر گئے تو ہمیں ان کے کچھ عزیز و اقارب مل گئے جو ہمیں لے کر ان کے گھر چلے گئے۔ ان کے گھر میں اس وقت کچھ لوگ رہ رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں گھر کے کئی کمرے بھی دکھائے اور بتایا کہ اسی گھر میں رہتے ہوئے ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔

گھر کی حالت کوئی بہت اچھی نہیں ہے میرے خیال میں اس گھر میں کو محفوظ بنایا جانا چاہیے۔ یہ باچا خان صاحب کا گھر نہیں ہے، بلکہ ایک تاریخ ہے جہاں پر بہت بڑے بڑے سیاسی رہنما آتے رہے اور ہندوستان اور پاکستان کی تقدیر کے فیصلے بھی یہیں پر ہوتے رہے۔

ڈاکٹر خان : ایک اجڑا گھر جو کبھی ایک بادشاہ کا محل تھا

عبدالجبار خان، عبدالغفار خان صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ انھیں عام طور پر ڈاکٹر خان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو انھیں ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد قیوم خان وزیر اعلیٰ بنے اور انھوں نے انھیں جیل میں ڈال دیا۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور آپ 1954ء میں آپ مرکزی وزیر بنے اور اس کے بعد ون یونٹ کے تحت مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ ایک دن وہ اپنے بیٹے کے گھر جی او آر لاہور میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے انھیں قتل کر دیا جو ایک پٹواری تھا۔ اس کے بعد انھیں، اتمانزئی میں ان کی یورپین بیوی کی قبر کے پاس دفنایا گیا۔

ڈاکٹر خان نے پہلے بمبئی میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی پھر وہ لندن میں میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں انھوں نے برطانوی افواج کے ساتھ بھی کام کیا اور اسی دوران انھوں نے ایک یورپی خاتون سے شادی بھی کی۔ انھوں نے پہلی جنگِ عظیم میں برطانوی فوج میں خدمات سر انجام دیں۔ بعد میں انھوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا کیونکہ برطانوی فوج انھیں وزیرستان بھیجنا چاہ رہی تھی جہاں پر وہ وزیر لوگوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر خان اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ڈاکٹر خان کا گھر اتمان زئی میں گاؤں سے ذرا فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک بڑا گھر ہے۔ اس میں کوئی بیس سے زائد کمرے ہیں۔ اس کے ارد گرد کھلی جگہ ہے جو کئی ایکڑ پر مشتمل ہے۔ بہت بڑے بڑے درخت لگے ہوئے ہیں۔

کھنڈر تو بتا رہے ہیں
عمارت تو خوب ہو گی

اب اس کی حالت بہت اچھی نہیں ہے دروازے وغیرہ بہت ٹوٹ چکے ہیں، ایک کمرے میں تو چمگادڑ بھی بڑی تعداد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک الماری میں پرانی کتابیں بھی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان کی اگر کوئی حقیقی اولاد نہیں تھی تو یقینی طور پر ان کے بھتیجے اور بھانجے تو ہوں گے۔ خیبر پختونخوا میں اے این پی کی حکومت بھی رہی ہے۔ ان سب کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اس عمارت کی حفاظت کی جائے۔ ابھی اگر اس کی حفاظت کی جائے تو شاید یہ بچ جائے۔ اگر کچھ وقت اور گزر گیا تو یہ اور بری حالت میں چلی جائے گی۔

کسی کو ڈاکٹر خان کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں عمارات سے جو تاریخ کا ایک حصہ ہوتی ہیں، آنے والی نسلوں کو تاریخ سیکھنے اور پڑھنے میں بے حد مدد ملتی ہے۔ اس طرح سے باچا خان صاحب کے گھر کو سنبھالنا چاہیے، اسی طرح اس گھر کو بھی سنبھالنا ضروری ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ایک طرح سے یہ جگہ لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔

ہم نے کچھ وقت وہاں پہ گزارا۔ وہاں پر موجود ایک گھر بھی ہے جو وہاں پہ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ جب ہم وہاں پر تھے تو اس گھر سے پانی ہمارے لیے ایک کولر میں ٹھنڈا پانی بھیجا گیا جو پختون روایات کی مہمان نوازی کی نشانی سمجھی جا سکتی ہے۔

اس جگہ لے جانے کے لیے ہمیں نعمان صاحب اور مقامی ساتھی، آصف جان، شکیل بھائی اور ہم میں سے سب سمارٹ ساتھی نے رہنمائی مدد بھی کی اور ہمیں مٹھائی بھی لے کر دی جس کے لیے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

عبدالغفار خان صاحب کے بیٹے عبدالغنی خان صاحب کی ڈھیری پر گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ ان کی لائبریری تھی۔ وہ ایک شاعر بھی تھے۔ اس دن وہ عمارت بند تھی۔ اس کے ساتھ ہی پشکلاوتی کا میوزیم بھی ہے وہ بھی اس روز بند تھا۔ اس لئے ہم یہ دونوں مقامات کو اندر سے نہ دیکھ سکے۔

زندگی رہی تو اسے ضرور دیکھوں گا، اگر اس کے لیے محمد نعمان صاحب نے ہماری رہنمائی فرمائی تو۔

خان عبد الغنی خان المعروف غنی خان: جدید دور کا رحمان بابا

خان عبد الغنی خان المعروف غنی خان 1914 میں کو ہشت نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے ایک تفصیلی مضمون پڑھنے کو ملا[1]۔ اس مضمون کے مطابق وہ ابتدائی تعلیم گاؤں کی مقامی مسجد میں حاصل کرنے کے بعد، پشاور شہر کے نیشنل ہائی سکول اور پھر بعد ازاں عثمان زئی میں واقع ایک سکول میں داخل ہوئے۔ اس سکول کی بنیاد ان کے والد باچا خان نے 1921ء میں رکھی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے آپ نے 1927ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ جامعہ ملی (نیشنل کالج) دہلی چلے گئے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب 1934ء کو جواہر لعل نہرو نے غنی خان اور اپنی بیٹی اندرا (بعد میں ہندوستان کی وزیر اعظم) کے لیے شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ اس ادارے میں غنی خان کو اسٹوڈنٹس یونین کا صدر منتخب کیا گیا اور اندرا بطور سوشل سیکریٹری ان کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ یہیں پر غنی خان نے مشہور اور ماہر فنکاروں سے صحافت، مجسمہ سازی اور مصوری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہ ان کے مصوری سے لگاؤ کی ایک نشانی ہے۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ 1934ء کو بمبئی گئے جہاں وہ روشن نامی ایک پارسی خاتون کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ جن سے آپ کی شادی ہو گئی۔ روشن ایک پڑھی لکھی خوبصورتی، ثقافت اور نفاست کی حامل خاتون تھیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ شادی کے بعد وہ تقریباً چھ ہزار کتابیں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ یہ تھا ایک خوبصورت جہیز۔۔۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ غنی خان اور روشن کے ہاں دو بیٹیاں، شاندانہ (1940) اور زرین (1944-)، اور ایک بیٹا، فریدون (1951-1987) پیدا ہوا۔ فریدون کا انتقال 36 سال کی عمر میں ہوا، جو اس خاندان کے لیے ایک المیہ سے کم نہ تھا۔

پاکستان کے قیام کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہو گئے۔ پختونوں کے حقوق کی آواز اٹھانے کی پاداش میں وہ چھ سال تک پاکستان بھر کی مختلف جیلوں میں قید بھی رہے۔ یہی وہ دور ہے جب غفار خان صاحب بھی قید کاٹ رہے تھے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی نظموں کا مجموعہ "دا پنجرے چاغار" لکھا۔ اس کے علاوہ پنوس، پلوشے، کلیات غنی اور لطون بھی ان کی اہم تصنیفات ہیں۔

---

https://loferwriter.wordpress.com/2020/06/22/ghani-khan/[1]

وہ لکھتے ہیں کہ پشتون محض ایک نسل کا نام نہیں بلکہ یہ نہیں بلکہ در حقیقت ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ اس لیے ہر شخص میں ایک پشتون موجود ہوتا ہے جو کبھی نہیں مرتا۔ یہ کبھار جاگ بھی جاتا ہے اور شخص پر غلبہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ پشتون بارش میں بوئی گئی گندم کی مانند ہیں۔ جو ایک نہ ایک دن اُگ آتی ہے۔

مجھے ایک پشتون سے پیار کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب وہ لڑنے اور مرنے کے لیے نکلے گا تو وہ اپنا چہرہ دھوئے گا اور اپنی داڑھی پر تیل لگائے گا اور اپنے تالوں کو خوشبو لگائے گا اور اپنے بہترین کپڑوں کو پہنائے گا۔

وہ یہ چاہتے تھے کہ میں "اپنے لوگوں کو تعلیم یافتہ اور روشن خیال دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک وژن اور انصاف کے مضبوط احساس کے حامل لوگ، جو فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ اپنے لیے مستقبل بنا سکتے ہیں۔"

ایسے لوگوں کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ موجودہ دور کے لوگوں کو تصویر کا دوسرا رخ بھی پتہ چلے۔

غنی خان کی ایک نظم[1]:

حسن دے بس حسن چی هم خدائے او هم جانان دے
دے فانی مکان کبنی بل مثال د لامکان دے
یو د گلاب مخ کبنی چی بنکارہ کوم جوابونہ دی
نشتہ یو هم نشتہ د منطق پہ کتابونو کبنی

ترجمہ: حُسن بس حُسن ہے جو خدا بھی ہے اور جانان بھی، اس فانی دنیا میں یہ مثال ہے لافانی کی۔ گلاب کو دیکھنے سے جو جواب آپ کو ملتے ہیں، وہ آپ کو منطق کی کتابوں میں نہیں ملیں گے۔

---

https://www.bbc.com/urdu/entertainment/story/2005/08/050815_haroon_bookreview[1]

حرفِ تمام

میں نے جب اپنے سفر نامے لکھنے شروع کیے تو اس کا آغاز بھارت کے سفر ناموں سے کیا۔ بعد میں بھارت کے علاوہ کئی دیگر ممالک کے سفر نامے بھی لکھے اور انھیں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ ان سفر ناموں کا مقصد ایک آسان طریقے سے ان علاقوں کی تاریخ، معیشت، معاشرت کے متعلق معلومات آپ لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اب تک میں پاکستان کے صوبہ سندھ اور بلوچستان کے ساتھ ساتھ گلگت بلتستان متعلق اپنی تین کتابیں شائع کر چکا ہوں۔

میں نے 1980ء سے لے کر 2023ء تک خیبر پختونخوا کے بیشتر علاقے دیکھے ہیں۔ ابھی بھی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں میں نہیں جا سکا، جیسے باجوڑ، مہمند، وانا، جنوبی وزیرستان وغیرہ۔

میں نے سوچا کہ مجھے اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ میں پہلے یہ علاقے دیکھ لوں پھر اس کتاب کو مکمل کروں۔ اللہ جانے ان علاقوں میں جانے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مجھ سے بھی بہتر ان علاقوں متعلق لکھے۔اس لیے جہاں ہے، جیسے ہے، کی بنیاد پر یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔

اس پر آپ کے تبصروں کا انتظار رہے گا۔

میرے نزدیک جو آپ جانتے ہیں، وہ دوسروں تک پہنچانا آپ پر لازم ہے۔ میں نے یہ کتاب اسی نیت سے لکھی ہے۔ میں اسے اپنے لیے ایک صدقہ جاریہ کے طور پر لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے اپنے کنبے کے لیے مفید بنائے۔ آمین !

At Pushklawati Museum Charsada with Daud and Sajawal my grandsons

At Pushklawati Museum Charsada with
Daud and Sajawal my grandsons

At Babe Khyber

At Kalam

At Kalam with Muhammad Yousuf Mangat

In a village near D I Khan

At Kala bagh

At Kalam with Muhammad Yousuf Mangat

At Kalash Museum with Sajawal Hussain

At Ilaysi Masjd Abbottabad with Saad Murtaza

Nagar Fort Chitral my favorite place

At Pamir Hotel Chitral, a beautiful place

With Ahmed and Daud … my grandsons

At Dara Adam Khel with Shoaib Hashmi, Ahmed Umer, Daud and Abbas

In a restaurant Kohat

In Chitral .. traditional tea house

With kids at Aghosh Kohat

Mir Ali North Wazirastan

Town Hall DI Khan built in 1850s

Kalash festival